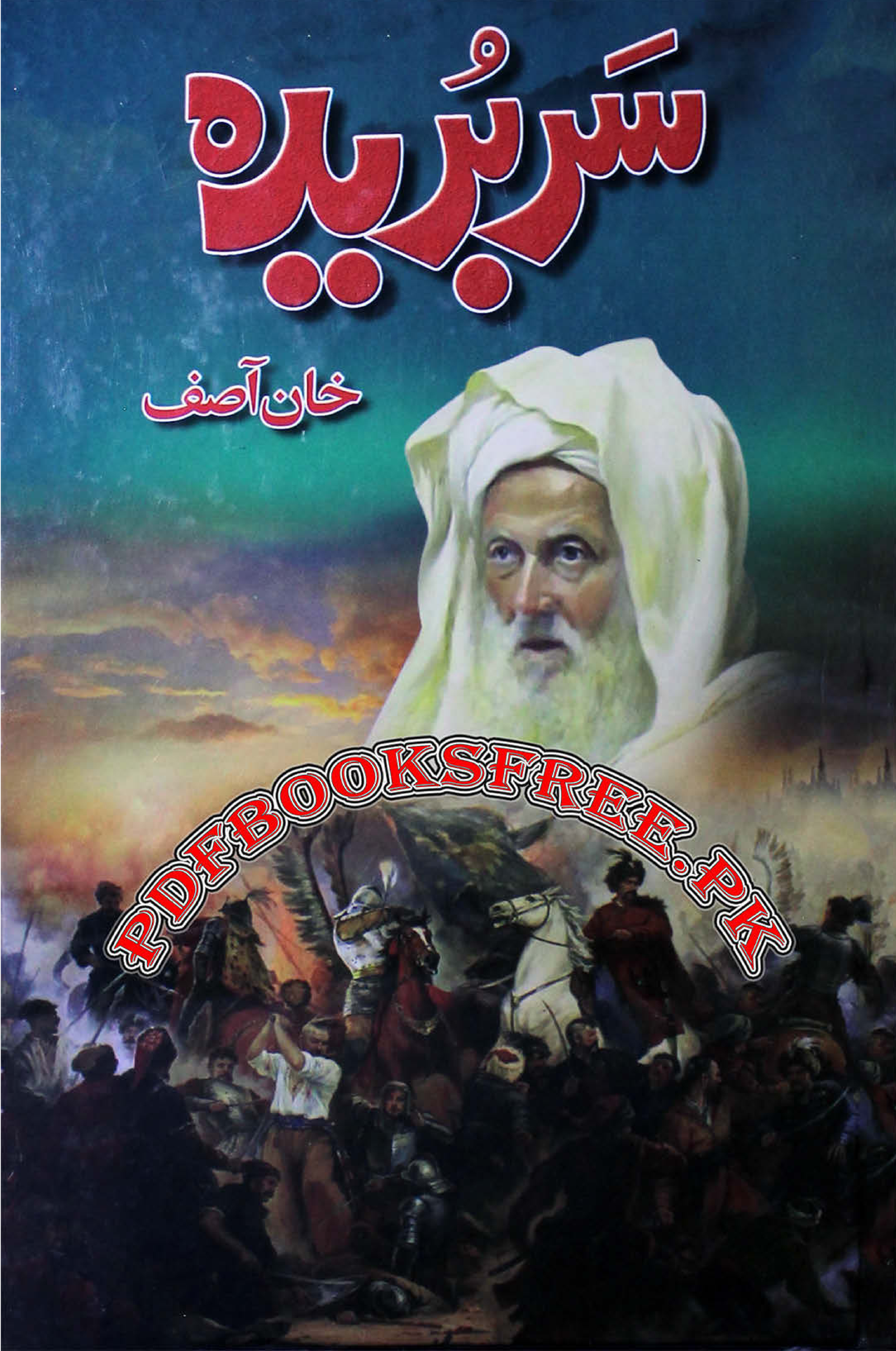

سَربُریدہ
خان آصف
PDFBOOKSFREE.PK



خان آصف

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546, 37668958
www.alqurajsh.com email: info@alquraish.com

بہترین کتابیں۔۔۔۔۔۔

جدید انداز اور معیار کے ساتھ

ناشر: محمد علی قریشی

بار اوّل 2015ء

مطبع .... نیرّ اسد پریس لاہور

کمپوزنگ .... القریش گرافکس

قیمت .... -/600روپے

ترتیب

⊛---⊛---⊛

پیش لفظ

یہ ناول بساطِ تاریخ سے شاطرانہ جرائم کی سچی کہانیوں پر مبنی ہے۔ والد صاحب نے یہ مختصر تاریخی کہانیاں 1997ء میں اخبارِ جہاں میں لکھیں۔ موجودہ حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کہانیاں کسی نہ کسی عنوان اس معاشرے میں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں...... پھر چاہے وہ اقتدار کا ایوان ہو یا کسی عام فرد کی زندگی۔

آج بھی کارِ سیاست کا وہی گھناؤنا رنگ ہے جو صدیوں پہلے تھا۔ نام، کردار اور حالات و واقعات ضرور بدل جاتے ہیں مگر فطرتِ انسانی نہیں...... دولت و اقتدار کی جنگ میں جو جتنا منافق اور دھوکے باز ہے وہ خود کو اُتنا ہی کامیاب سمجھتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ انسانی ہوس نے ہمیشہ اپنی ہی جنس کا خون پی کر اپنی طاقت کو پروان چڑھایا ہے۔ اس بازارِ سیاست میں انسانی جسموں سے لے کر تاریخ و روایات، نام و نسب، قانون و اخلاق، رسم و رواج، مذہبی اقدار اور ضمیروں کے سودے بڑے سستے ہوتے ہیں۔ کیا شرافت، کیا ذلالت اِس بازار میں سب کچھ با آسانی فروخت ہو جاتا ہے...... ماضی میں بھی اس بازارِ سیاست کا یہی وطیرہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ کیا باپ، کیا بیٹا، کیا ماں، کیا بہن، کیا انسانی رشتے اور کیا نام نہاد انسانیت یہاں سب بکتا ہے۔

مصنوعی آنسو بہاتے ہوئے یہ سفاک ترین مخلوق، اللہ کی زمین کو خونِ انسانی سے رنگنے والے ظلم و تشدد کے جیتے جاگتے پیکر، عزت و ناموس کے نام نہاد ٹھیکیدار، مذہب کے دلّال دراصل دنیا کے بدلے آگ خرید چکے ہیں اور پوری انسانیت کو اپنے ناپاک ہاتھوں سے اس آگ میں جھونکنے کے درپے ہیں۔ مگر انتہائی خسارے میں رہنے والے یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ جب قانونِ قدرت حرکت میں آتا ہے اور بے شک آتا ہے تو ان کی ساری چالیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور یہ لوگ قیامت تک کے لیے نشانِ عبرت بنا دیئے جاتے ہیں۔ چیخ چیخ کر رونے والی انسانیت کے دکھ تو بہت

ہیں کہ وہ اپنے کمزور بازوؤں کی ناتوانی کا ماتم کریں یا اپنی لاشوں کو خود اپنے ہی کندھوں پر اٹھا کر کسی نجات دہندہ کا انتظار کریں۔ بہرحال یہ داستانِ الم تو قیامت تک چلتی رہے گی۔

یہ ناول بھی ایسے ہی واقعات کی کڑی ہے جو دلخراش ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہیں۔

اس ناول میں قارئین کرام کو ہر رنگ نظر آئے گا چاہے وہ عہد و پیماں اور محبت و انکساری کا رنگ ہو یا خونی سازشوں کا۔

اُمید کرتی ہوں کہ آپ کو یہ ناول پسند آئے گا۔

آپ کی پذیرائی کی منتظر

اسماء خان آصف

راندۂ درگاہ

یمامہ کا رئیس مسیلمہ بن کبیر نئی شادی کی تیاریاں کر رہا تھا۔
اس وقت اُس کی عمر 90 سال سے زیادہ تھی۔ مسیلمہ کی ایک ہی خواہش تھی کہ وہ سدا جوان رہے۔ اور شباب کی ہنگامہ خیزیوں سے لطف اندوز ہوتا رہے۔ اپنے اسی شوق کی تکمیل کے لیے مسیلمہ دن رات قدیم طبّ کی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ اُس کی مجلسِ خاص میں نامور طبیب و حکیم جمع رہتے تھے۔ وہ انہیں مخاطب کر کے پُر جوش تقریریں کیا کرتا تھا۔
''قدرت کا کمال یہ ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اور انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑھاپے کو اپنے قریب نہ آنے دے۔''
مسیلمہ بن کبیر اور طبیبوں میں طویل بحثیں ہوتیں اور پھر ایک نئی دوا ایجاد ہو جاتی۔ مسیلمہ اس دوا کو استعمال کرتا۔ پھر کچھ دن بعد حکیموں کے سامنے اپنے تجربات بیان کرتا۔ اگر وہ دوا انسانی جسم کے لیے سازگار ہوتی تو مسیلمہ اس کا استعمال جاری رکھتا۔ اگر ضرر رساں ثابت ہوتی تو یمامہ کا رئیس اسے ترک کر دیتا..... اور پھر نئی شباب آفریں دوا پر تحقیق شروع ہو جاتی۔ آخر مسیلمہ اپنی کوششوں میں کامیاب رہا۔ وہ عمر کی زیادتی کے سبب چہرے پر رونما ہونے والی جھریوں کو تو نہ روک سکا مگر اس کا جسم بہت مضبوط و توانا تھا۔ اُس وقت کے جوانوں سے بھی زیادہ طاقتور۔ مسیلمہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے کسی جوان کو طلب کرتا اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتا۔ پھر بڑے فخریہ لہجے میں نوجوان کو مخاطب کر کے کہتا۔
''اے شباب کے دعویدار! اگر تُو حقیقتاً جوان ہے تو میرا پنجہ موڑ دے۔''
نوجوان اپنے جسم کی پوری طاقت صرف کر دیتا مگر مسیلمہ کے توانا بازو کو موڑنے میں ناکام رہتا۔
مسیلمہ بن کبیر اسی قسم کے ہنگاموں میں مصروف تھا کہ ایک رات اس نے عجیب خواب دیکھا۔
ایک طویل و عریض قصرِ زرنگار ہے، جس کی دیواریں نیلم کی ہیں۔ محرابیں اور ستون زمرد کے اور مینار

یاقوت کے..... مسیلمہ اس محل میں داخل ہوتا ہے۔ دروازے پر مسلح پہرے دار کھڑے ہیں، ان کی تلواریں سونے کی ہیں جن میں قیمتی لعل و جواہر جڑے ہوئے ہیں۔ مسیلمہ کو دیکھتے ہی تمام پہریدار نصف قد تک خم ہو جاتے ہیں اور بیک وقت کئی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔

''اے بزرگ! تجھ پر سلامتی ہو..... سلامتی ہو۔''

مسیلمہ بن کبیر حیران ہو کر قصرِ زرنگار کے محافظوں کو دیکھتا ہے۔

''خوش آمدید..... خوش آمدید..... کب سے آپ کا انتظار تھا۔'' محافظ پکارنے لگتے ہیں۔

''کون میرا انتظار کر رہا ہے؟'' مسیلمہ حیران ہو کر پہریداروں سے پوچھتا ہے۔

''بزرگ! آپ اس کمرے میں چلے جائیے۔ پھر آپ کو خود پتہ چل جائے گا کہ کون منتظر ہے۔'' محافظ بڑے ادب سے جواب دیتے ہیں۔

مسیلمہ جھجکتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاتا ہے۔ کمرے میں گھپ اندھیرا ہے۔ مسیلمہ گھبرا کر چیخنے لگتا ہے۔

''میں کہاں آ گیا ہوں؟..... یہ تاریک مقام کیا ہے؟ مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟ اور کون میرا انتظار کر رہا ہے؟''

''خوف زدہ نہ ہو مسیلمہ!..... تُو مقامِ عافیت میں آ پہنچا ہے۔'' یکایک کمرے کے گوشے سے ایک بارعب آواز اُبھری۔

مسیلمہ نے گھبرا کر اس طرف دیکھا۔ وہاں ایک تیز روشنی نظر آ رہی تھی۔ مسیلمہ کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ آواز تو صاف سنائی دے رہی تھی مگر بات کرنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''تم کون ہو؟'' فرطِ حیرت سے مسیلمہ کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''میں ہی میں ہوں..... میرے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔'' روشنی کے ہیولے سے وہی بارُعب آواز دوبارہ اُبھری۔

''میں تمہیں نہیں پہچانتا۔'' شدتِ خوف سے مسیلمہ کا جسم بھی لرزنے لگا تھا۔

''اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر مسیلمہ!'' آواز نے اسے تنبیہہ کی۔ ''اگر تُو اسی طرح ڈرتا رہا تو پھر ان نعمتوں سے محروم ہو جائے گا جو عنقریب ہم تجھ پر نازل کرنے والے ہیں۔''

مسیلمہ بن کبیر نے اپنے لرزتے ہوئے جسم کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر اس کا دل بدستور کانپ رہا تھا۔

''میں اپنے مخاطب کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ مہربان ہستی کون ہے؟ اور مجھ پر اپنی نعمتوں کی بارش کیوں کرنا چاہتی ہے؟''

''ہم تیرے پروردگار ہیں مسیلمہ!'' روشنی کے ہیولے سے آواز اُبھری۔ ''ہم نے تجھے نبوت کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ تُو اپنے آپ کو دنیا کی فروعات سے الگ کر لے اور ہمارے بندوں کے سامنے ایسے

لبادے میں ظاہر ہو کہ ان کے دلوں پر تیری ہیبت قائم ہو سکے۔ ہم عنقریب ایک کارِ عظیم تیرے سپرد کرنے والے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ روشنی غائب ہو گئی۔

مسیلمہ بن کبیر واپس پلٹا اور تاریک کمرے سے نکل کر باہر آیا۔ مسلح پہریدار اسی انداز سے ایستادہ تھے۔ مسیلمہ کو دیکھتے ہی سب کے سب تعظیماً خم ہو گئے۔

''بزرگ! آپ کو یہ گراں بہا نعمت مبارک ہو۔''

قصرِ زرنگار پُرشور آوازوں سے گونج اٹھا۔

ابھی آوازوں کا یہ شور جاری تھا کہ مسیلمہ بن کبیر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے بستر پر گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور حیران و پریشان نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اب نہ وہ قصرِ زرنگار تھا، نہ مسلّح پہریدار..... اور نہ وہ روشنی جس نے مسیلمہ سے کہا تھا۔ ''میں تیرا پروردگار ہوں۔''

مسیلمہ نے باقی رات جاگ کر گزار دی۔ وہ عجیب و غریب خواب اس کے ذہن پر مسلط ہو کر رہ گیا تھا۔

صبح ہوتے ہی مسیلمہ بن کبیر نے اپنے قریبی دوست عبداللہ بن نواحہ کو تنہائی میں طلب کیا اور اپنا رات کا خواب پوری تفصیلات کے ساتھ بیان کر ڈالا۔

عبداللہ بن نواحہ ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ اس نے مسیلمہ کا خواب سنا اور تعبیر دیتے ہوئے بولا۔

''یہ بہت بڑی بشارت ہے، آپ کے لیے...... میرے اندازے کے مطابق بہت جلد اس کا ظہور ہونے والا ہے۔''

''کیا یمامہ کے لوگ مجھے نبی تسلیم کر لیں گے؟'' مسیلمہ بن کبیر نے اپنے دوست عبداللہ بن نواحہ سے پوچھا۔

''کیوں نہیں؟'' عبداللہ بن نواحہ نے پُرجوش لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ دنیاوی اعتبار سے ایک بااثر شخصیت ہیں۔ قبیلے کے لوگ آپ کی سرداری کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہی تاثر انہیں ایک دن مجبور کر دے گا کہ وہ آپ کی نبوت کو بھی مان لیں۔''

مسیلمہ بن کبیر قبیلۂ بنو حنیفہ سے تعلق رکھتا تھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں پر میرا یہ تاثر کس طرح قائم ہو گا؟'' مسیلمہ بن کبیر تذبذب کی کیفیت سے دوچار تھا۔

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔'' عبداللہ بن نواحہ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''آپ بلاتاخیر مذہبی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیں تاکہ جب علمی مجلسیں آراستہ ہوں تو لوگ آپ کے علم و فضل کے قائل ہو جائیں۔''

مسیلمہ بن کبیر پہلے ہی پڑھا لکھا انسان تھا، شعر و ادب سے بھی اسے گہری دلچسپی تھی۔ عبداللہ بن نواحہ کے مشوروں کے بعد مسیلمہ قدیم مذہبی کتابوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نبوت کا خواب دیکھنے سے پہلے

زرق برق لباس پہنا کرتا تھا جس سے امارت کی شان جھلکتی تھی۔ عبداللہ بن نواحہ نے اسے سمجھایا کہ اب وہ ایسے پیرہن استعمال کرے جو روحانیت کی طرف اشارہ کرتے ہوں۔ نتیجتاً مسیلمہ بن کبیر نے سیاہ عبا پہننا شروع کر دی۔

قبیلہ بنو حنیفہ کے لوگوں نے بہت غور سے اپنے سردار کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ مسیلمہ کی بدلتی ہوئی عادتوں کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ کہاں وہ کیف و نشاط کی محفلیں...... اور کہاں یہ سیدھی سادی مجلسیں جن میں دنیا سے بیزاری کی باتیں ہوتی تھیں۔

کبھی کبھی قبیلے کے معززین مسیلمہ سے پوچھ بیٹھتے۔ ''سردار! آپ نے تو اپنی دنیا ہی بدل ڈالی...... آخر اس انقلاب کی وجہ......؟''

مسیلمہ بن کبیر ان سوالات کے جواب میں بڑی پُر اثر تقریریں کرتا۔

''دنیا کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں...... ایک فریب ہے جو انسان مسلسل کھا رہا ہے...... اور پھر وہ اسی فریب کی چادر میں لپٹا ہوا دنیا سے چلا جاتا ہے۔ پھر کچھ دن بعد اس کے جسم کو مٹی کھا جاتی ہے۔ بس اتنی سی حقیقت ہے انسان کی جسے وہ نہیں سمجھتا۔ زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتا ہے، نفسانی خواہشات کے لیے بے دریغ اپنے ہم جنسوں کا خون بہاتا ہے...... تاج و تخت سجانے کے لیے مقتل کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ پھر ایک دن اسے ٹھوکر لگتی ہے، اوندھے منہ گر جاتا ہے، پھر سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ یہاں تک کہ چند لوگ اسے اٹھا کر ایک تاریک گڑھے میں ڈال دیتے ہیں..... یہ ہوتی ہے فانی انسان کی آخری آرام گاہ۔''

مسیلمہ بن کبیر کی باتیں سن کر حاضرینِ مجلس حیران رہ جاتے۔ ''کل تک تو وہ فلسفۂ عیش و نشاط کی تبلیغ کر رہا تھا اور آج اسے انسان کا عبرت ناک انجام نظر آ رہا ہے؟''

بعض دریدہ دہن لوگ مسیلمہ بن کبیر کے منہ پر ہی کہہ دیتے۔ ''مسیلمہ! ہم نے تیرا دورِ جوانی دیکھا ہے۔ اس وقت تُو کیا رنگین مزاج انسان تھا۔ پھر جب تیرا عہدِ شباب گزر گیا تو تُو ہمیں موت سے ڈرا رہا ہے؟ ذرا اپنے گریبان کی طرف تو دیکھ کہ وہاں کیسے کیسے گناہوں کا عکس موجود ہے۔''

مسیلمہ بن کبیر بڑے صبر و تحمل سے اپنے مخالفین کی بات سنتا اور مسکراتے ہوئے جواب دیتا۔ ''میرے کل کو نہیں، میرے آج کو دیکھو۔ میں نے اپنے تجربات و مشاہدات ہی سے تو سیکھا ہے کہ گناہگاروں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ جس قدر جلد ممکن ہو، وادیٔ معصیت سے باہر نکل آؤ ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔''

دوسری طرف مسیلمہ کا دوست عبداللہ بن نواحہ پورے زور و شور کے ساتھ اس کی شخصیت سازی کا کام کر رہا تھا۔ وہ چند افراد کو جمع کرتا اور ان سے سرگوشیوں میں کہتا۔

''میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ عنقریب تم ایک بڑی خبر سنو گے اور وہ خبر مسیلمہ بن کبیر سے متعلق ہو گی۔''

''کیسی خبر؟'' لوگ حیران ہو کر پوچھتے۔

''ایسی خبر کہ جسے سن کر لوگوں کی سماعتوں میں لرزہ پڑ جائے گا۔'' عبداللہ بن نواحہ پُراسرار انداز میں

گفتگو کرتا۔ ''تم لوگ مسیلمہ کے دامن کے سائے میں چلے جاؤ...... اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔''

عبداللہ بن نواحہ کی اس فریب کارانہ سیاست کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ لوگ مسیلمہ بن کبیر کی طرف رجوع کرنے لگے۔ وہ ایک دولت مند شخص تھا۔ اس نے کچھ مال و زر سے اور کچھ اپنی پُر جوش تقریروں سے یمامہ کے با اثر لوگوں کو خریدنا شروع کر دیا۔ ابھی مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا..... مگر عبداللہ بن نواحہ کی منصوبہ سازی کی وجہ سے عوام کی اکثریت اُسے ''ترجمانِ یمامہ'' کے نام سے پکارنے لگی۔

❁---❁---❁

مسیلمہ بن کبیر اپنے اس خواب میں گم رہا جو کئی سال پہلے اسے دکھایا گیا تھا۔ دراصل وہ ایک شیطانی خواب تھا، جس کے ذریعے مسیلمہ کے دل و دماغ کو جکڑ لیا گیا تھا۔ شیطان کو بہت سے اختیارات دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق ابلیس رجیم انسانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، اندیشے پیدا کرتا ہے۔ اگر کسی انسان کا عقیدہ درست اور ایمان مضبوط نہ ہو تو یہی شیطان مخلوقِ خدا کو گمراہی کی آخری منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ یہی اندیشے اور وسوسے تھے، جن سے مغلوب ہو کر فرعون اور نمرود نے خدائی کے دعوے کیے تھے۔

مشہور روایت ہے کہ عظیم صوفی بزرگ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ ایک رات ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے کہ آپؒ کو فرش سے عرش تک ایک نور نظر آیا۔ پھر اسی غیر معمولی نور سے ایک آواز اُبھری۔

''عبدالقادر! ہم تمہاری عبادت و ریاضت سے خوش ہوئے اور ہم نے اس کے صلے میں تمہاری باقی نمازیں معاف کر دیں۔''

حضرت غوثِ اعظمؒ اس طرزِ کلام سے فکر و تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ ''نماز تو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی معاف نہیں ہوئی۔'' اس خیال کے آتے ہی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے ''لاحول'' پڑھی اور وہ نور غائب ہو گیا۔ اب اس روشنی کی جگہ ایک کریہہ المنظر چہرے والا انسان کھڑا تھا جو اصل میں شیطان تھا۔

اسی طرح دوسرے بزرگانِ دین نے اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعے عوام الناس کو بتایا ہے کہ ابلیس کیسے کیسے لباسوں اور صورتوں میں ظاہر ہو کر انسان کو گمراہ کرتا ہے۔ یہ شیطان ہی کا کرشمہ تھا کہ اس نے مسیلمہ بن کبیر کے سینے میں کجی کا بیج بو دیا تھا۔ پھر یہی بیج پھوٹا اور اس نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی۔ ابھی مسیلمہ بن کبیر نبوت کی بشارت کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ اُسے سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں خبر ملی کہ اللہ کے آخری رسول کا ظہور ہو چکا ہے اور دینِ اسلام تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔

مسیلمہ یہ خبر سن کر بہت رنجیدہ ہوا۔ پھر اس نے اپنے خلیفہ عبداللہ بن نواحہ کو طلب کر کے کہا۔

''میری تمام ریاضت برباد ہو گئی اور تیری ساری کوششیں رائیگاں ہو گئیں۔'' مسیلمہ بن کبیر کے لہجے میں غصہ بھی جھلک رہا تھا اور حزن و ملال بھی۔

''وہ کس طرح؟'' عبداللہ بن نواحہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''نبوت کے لیے تو ایک قریش محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو منتخب کر لیا گیا۔'' مسیلمہ بن کبیر کے لہجے سے شکستگی کے آثار نمایاں تھے۔ ''آخر وہ وعدہ کیا ہوا جو میرے پروردگار نے مجھ سے کیا تھا؟''

عبداللہ بن نواحہ بھی یہ خبر سن کر پریشان ہو گیا۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے یہ کہہ کر مسیلمہ بن کبیر کو مطمئن کر دیا۔

''آپ صبر و سکون سے حالات کا مشاہدہ کرتے رہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا پروردگار آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔

❁---❁---❁

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس سے نمودار ہونے والی روشنی جزیرۃ العرب کے تاریک ترین گوشوں میں پھیلتی چلی گئی۔ مختلف علاقوں سے قبائلی وفد آتے اور پیغمبرِ اسلام کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے کفر و باطل کی زندگی سے نجات پا جاتے۔ آخر یمامہ کے مشہور قبیلے بنو حنیفہ کے لوگوں نے بھی طے کر لیا کہ وہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیں گے۔

اس خبر نے مسیلمہ بن کبیر کو بدحواس کر دیا۔ جس بساط کو وہ برسوں سے بچھا رہا تھا، ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اُسے اُلٹ دیا تھا۔ مسیلمہ کے لیے وہ دن سب سے زیادہ فکر انگیز اور پریشان کن تھا جب بنو حنیفہ کے لوگ اس کے پاس آئے اور اصرار کرنے لگے۔

''سردار! تم بھی اس روشنی کی طرف چلو جس نے پورے عرب کو روشن کر دیا ہے۔''

یہ سن کر مسیلمہ کے دل پر قیامت سی گزر گئی۔ خود اسی کی قوم کے لوگ اسے منزلِ ہدایت کی طرف بلا رہے تھے۔

''ابھی نہیں..... ابھی نہیں۔'' مسیلمہ شدید اضطراب کے عالم میں بول رہا تھا۔ ''ہم اپنے باپ دادا کے مذہب کو اتنی آسانی سے قربان نہیں کر سکتے۔ ابھی ٹھہر جاؤ اور انتظار کرو..... اگر تم نے عجلت کی تو منزل سے بہت دُور چلے جاؤ گے..... کچھ دن صبر کر لو..... میں اس وقت کی نشاندہی کروں گا کہ کب تمہیں مدینے جانا ہے۔''

مسیلمہ بن کبیر اپنی پُرفریب تقریروں کے ذریعے قبیلۂ بنو حنیفہ کے لوگوں کو اسلامی انقلاب کی ہواؤں سے دُور رکھنا چاہتا تھا۔ اگر ان ہواؤں کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی یمامہ کے باشندوں کو چھو لیتا تو ان کی دنیا ہی بدل جاتی۔ دل و دماغ کی کثافتیں دُور ہو جاتیں اور روح ایمان کی خوشبو سے مہک اُٹھتی۔

عبداللہ بن نواحہ بھی یمامہ کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا مگر وہ اپنی تمام تر تدبیروں میں ناکام رہا۔ قبیلۂ بنو حنیفہ کے لوگ قطار در قطار مدینہ منورہ میں داخل ہوتے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اسلام قبول کر لیتے۔ پھر یہ لوگ واپس آ کر مسیلمہ بن کبیر کو پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کے بارے میں بتاتے۔

''محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے روشن چہرے والے ہیں کہ ان کے بعد کوئی دوسری صورت آنکھوں میں نہیں جچتی۔ وہ ایسے شیریں بیان ہیں کہ ان کے لفظوں کے آگے شہد کی حلاوت بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔''

مسیلمہ اہلِ یمامہ کی بیان کردہ روایتیں سن کر خاموش رہتا مگر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہتا۔ پھر تنہائی میں اپنے خلیفہ عبداللہ بن نواحہ سے انتہائی تلخ لہجے میں کہتا۔

''وقت ہماری گرفت سے نکل گیا اور اہلِ یمامہ کے سادہ ذہنوں نے محمد عربی (ﷺ) کے اثرات قبول کر لیے۔ اب وہ نقوش کھرچے نہیں جا سکتے۔''

عبداللہ بن نواحہ کیا جواب دیتا؟ اُس کا عیار ذہن بھی سوچتے سوچتے تھک گیا۔

❁---❁---❁

ایک رات مسیلمہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ اس کے قبیلے کے بیشتر لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ نتیجتاً اُس کی سردارانہ حیثیت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ مسیلمہ شراب نوشی کا عادی تھا۔ اس رات مایوسانہ خیالات کی یلغار ہوئی تو مسیلمہ نے معمول سے زیادہ شراب پی اور اپنے مخصوص کمرے میں چلا گیا۔

''میرے پروردگار! تم کہاں ہو؟'' مسیلمہ مضطربانہ انداز میں پکار رہا تھا۔ ''تمہیں لات و ہبل اور منات و عزیٰ کی قسم! میری سیادت کو بچاؤ۔ اہلِ یمامہ کدھر جا رہے ہیں؟ انہیں روکو۔''

پھر اسی طرح چیختے چیختے مسیلمہ کے ہوش و حواس سلب ہو گئے اور وہ گہری نیند سو گیا۔

رئیسِ یمامہ نے اُسی رات پھر وہی خواب دیکھا۔ اب کی بار مسیلمہ کا پروردگار اس سے یہ کہہ رہا تھا۔

''مسیلمہ! تیرے اعلانِ نبوت کا وقت آ گیا ہے..... یمامہ سے نکل اور مدینے کی طرف کُوچ کر۔''

''وہاں تو قبیلۂ بنو ہاشم کے محمد مصطفیٰ (ﷺ) نبوت کا اعلان کر چکے ہیں۔'' مسیلمہ بن کبیر نے بڑے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''اور لوگوں نے ان کی نبوت کو تسلیم بھی کر لیا ہے۔ خود میرے قبیلے کے ہزاروں افراد حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ پھر میری نبوت کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے؟''

''جب ہم نے تجھے نبی مقرر کر دیا تو گنجائش جیسے لفظ بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔'' روشنی کے ہیولے سے آواز آئی۔ ''مسیلمہ! تُو نبی ہے اور ہزاروں افراد تیرا اعلانِ نبوت سننے کے لیے بے چین ہیں۔''

''مگر ایک وقت میں دو نبی کیسے ہو سکتے ہیں میرے پروردگار.....؟'' مسیلمہ بہت زیادہ غمزدہ نظر آ رہا تھا۔

''تجھے انسانی تاریخ کا پتہ نہیں مسیلمہ!'' اس روشنی نے جواب دیا جس سے آواز آیا کرتی تھی کہ میں تیرا پروردگار ہوں۔ ''حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت یعقوبؑ کے ساتھ ان کے فرزند حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ان کے بھائی حضرت ہارونؑ، اسی طرح محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ مسیلمہ بن کبیر......''

چند لمحوں کے لیے مسیلمہ کے چہرے پر بے پناہ خوشی کی لہر اُبھری مگر پھر فوراً ہی ڈوب گئی۔ ''یہ کیسے ہو گا میرے پروردگار! میں تو محمد عربی (ﷺ) کا دور کا رشتے دار بھی نہیں ہوں۔''

''تم مدینے جاؤ اور محمد مصطفیٰ (ﷺ) سے صاف صاف کہہ دو کہ تم کارِ نبوت میں ان کے شریک ہو۔'' یہ کہتے ہی وہ روشنی غائب ہو گئی۔

مسیلمہ بن کبیر خواب سے بیدار ہوا تو اس کی خوشی ناقابلِ بیان تھی۔ بشکلِ نور خواب میں نظر آنے والے پروردگار نے بالآخر اُسے رسالتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا شریک قرار دے دیا تھا۔

❁---❁---❁

دوسرے دن مسیلمہ نے معززینِ یمامہ کو طلب کر کے یہ ''خوشخبری'' سنائی۔ اس وقت قومی عصبیت اس قدر عروج پر تھی کہ ایک قبیلے کے افراد دوسرے قبیلے کے لوگوں کو انسان ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ اگر کوئی ایک فرقہ اپنی شجاعت یا علم و فن کی وجہ سے دوسرے فرقوں پر سبقت لے جاتا تو پیچھے رہ جانے والے لوگ کاروانِ شوق کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتے تا کہ وہ سرخرو قبیلہ یا تو پیچھے کی طرف لوٹ جائے یا پھر آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکے۔

جب قبیلۂ بنو حنیفہ کے سربرآوردہ لوگوں نے مسیلمہ کی زبان سے یہ بات سنی تو بے اختیار ہو کر کہنے لگے۔ ''اہلِ یمامہ قریش سے کم نہیں ہیں..... بنو حنیفہ کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا نبی پیدا کریں۔ ہم کیوں کسی کے محتاج رہیں۔''

دراصل واقعہ یہ تھا کہ جب سے بنو حنیفہ کی اکثریت داخل اسلام ہوئی تھی، قبیلے کے سرداروں کی عزت و تکریم ختم ہو گئی تھی۔ اسلام کی تو بنیادی تعلیم ہی یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت اور رسالتؐ کی گواہی کے بعد معاشرے کے تمام بتوں کی نفی کر دی جائے۔ سردارانِ یمامہ نے اسلامی انقلاب کو بڑی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ دن رات اسی فکر میں غلطاں و پریشان رہتے تھے کہ کس طرح اپنے عماموں اور پگڑیوں کو اسلام کی تند و تیز لہروں سے محفوظ رکھا جائے۔ پھر جب مسیلمہ بن کبیر نے اپنا خواب بیان کیا تو سردارانِ یمامہ یہ سوچ کر اس کے قدموں میں جھک گئے کہ مسیلمہ کیسا ہی سہی مگر قریش سے بہتر ہے۔ یہ قومی عصبیت کی بدترین شکل تھی۔

آخر مسیلمہ بن کبیر اپنے خلیفہ عبداللہ بن نواحہ اور دیگر معززینِ قبیلہ کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ پہنچا۔

❁---❁---❁

پھر وہ مبارک ترین ساعت طلوع ہوئی، جب سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسیلمہ بن کبیر اور دوسرے سردارانِ یمامہ کو شرفِ باریابی بخشا۔ اگر ان لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ نہ ہوتی تو بنو حنیفہ کی یہ مختصر ترین جماعت دنیا اور آخرت کی سب سے بڑی سعادت حاصل کر لیتی مگر ان لوگوں کا معاملہ ابوجہل سے مختلف نہیں تھا۔ اس راندۂ درگاہ شخص نے ہزار بار سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ انور دیکھا لیکن اس کے اندر کی سیاہی نے اسے فیضانِ رسالت سے محروم رکھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف انداز سے بنو حنیفہ کے اس وفد کی دلداری کی اور اس شیریں بیانی کے ساتھ اسلام کی دعوت دی جسے سن کر پتھر بھی موم ہو جاتے تھے۔

مسیلمہ بن کبیر نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ پیغامِ رسالت سنا مگر اس کی خباثتِ نفسی نے اس کے دل پر قفل لگا دیئے تھے اور آنکھوں پر گہرے پردے ڈال دیئے تھے۔ وہ نورِ رسالت سے نہ اپنی بے بصری کو دُور کر سکا اور نہ کلامِ نبوت سے اپنے دل و دماغ کے زنگ کو دھو سکا۔ مسیلمہ بن کبیر کی عقل نے اسے بڑا فریب دیا اور پھر یہی فریب خوردہ عقل سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حجت کرنے لگی۔

''میں ایمان لاتا ہوں اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں..... مگر اس کی ایک شرط ہے۔'' مسیلمہ بن کبیر نے پیغمبرِ اسلام سے نہایت مبہم انداز میں گفتگو شروع کی۔

''کیسی شرط.....؟'' رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتہائی خوش گفتاری کے ساتھ فرمایا۔

''اگر آپ مجھے اپنا جانشین مقرر فرما دیں تو میں آپ کی رسالت پر ایمان لے آؤں گا۔'' مسیلمہ بن کبیر نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر اپنی خواہش کا ردِعمل تلاش کرنے لگا۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص عادت تھی کہ غم کی سنگین ترین ساعتوں میں بھی آپؐ کے مقدس ہونٹوں پر ایک جاں فزاء اور دل نواز تبسم رہتا تھا۔ آپ اپنی ذاتِ مبارک کی حد تک مخاطب کی گراں سے گراں اور تلخ سے تلخ بات کا بھی برا نہیں مانتے تھے۔ مگر جب مسیلمہ نے کارِ رسالتؐ میں اپنی جانشینی کی شرط رکھی تو پیغمبرِ اسلام ﷺ کے چہرۂ انور پر شدید ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔ مگر پھر بھی آپؐ نے بے مثال صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اس وقت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے سامنے کھجور کی ایک شاخ رکھی ہوئی تھی۔ آپؐ نے اس شاخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''اے مسیلمہ! اگر تم امرِ خلافت میں مجھ سے یہ شاخِ خرما بھی طلب کرو تو میں دینے کے لیے تیار نہیں۔''

مسیلمہ بن کبیر اور اس کے ساتھی بارگاہِ رسالتؐ سے مایوس ہو کر اُٹھ گئے۔

شیطان نے سردارِ یمامہ کو جو خواب دکھایا تھا، اس کی تعبیر ممکن نہیں تھی۔

بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسیلمہ بن کبیر نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی تھی۔ مگر مؤرخین کی اکثریت نے اس روایت کی صحت سے انکار کیا ہے۔ جب

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اُس کی شرط نہیں مانی تو وہ مجلسِ نبوت سے اُٹھ کر چلا گیا۔ پھر تقریباً پندرہ دن تک مدینہ میں مقیم رہا۔ مختلف لوگوں سے ملا اور کارِ رسالتؐ کے بارے میں مسلسل معلومات حاصل کرتا رہا۔ اس کے بعد مسیلمہ بن کبیر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یمامہ کی طرف لوٹ گیا۔

❁---❁---❁

عبداللہ بن نواحہ کے مشوروں کے مطابق مسیلمہ بن کبیر کئی سال تک قدیم مذہبی تاریخ کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ اسے عرب شعراء کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ اس نے عربی زبان میں مہارت حاصل کر لی تھی اور عوام کو متاثر کرنے کے لیے تقریر کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ مدینہ سے واپس آنے کے بعد مسیلمہ کچھ دنوں کے لیے ایک کمرے میں بند ہو گیا اور عبداللہ بن نواحہ سے مشورے کرنے لگا۔

''میں نے مدینہ جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ نبوت کا کام زیادہ مشکل نہیں ہے۔ عوام الناس کے ذہنوں کو پُر جوش تقریروں اور مضبوط دلیلوں سے اسیر کیا جا سکتا ہے۔''

''پھر کس بات کی دیر ہے؟ بلا تاخیر اپنی نبوت کا اعلان کر دیجئے تاکہ یمامہ کے باشندے مدینے کا رُخ نہ کریں اور انہیں اپنے گھر میں رہتے ہوئے ہدایت حاصل ہو جائے۔''

عبداللہ بن نواحہ نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ وہ خود بھی مسیلمہ بن کبیر کی قیادت میں بہت دنوں سے عزت و احترام کی زندگی کا خواب دیکھ رہا تھا۔

آخر مسیلمہ کی عیار عقل نے ایک نیا منصوبہ تراش لیا اور اس نے اپنے منادیوں کے ذریعے پورے شہر میں اعلان کرا دیا کہ سردارِ یمامہ فلاں تاریخ کو سب سے بڑے میدان میں ایک اہم اعلان کریں گے جو تمام انسانوں کے لیے نجات کا باعث ہو گا۔

مسیلمہ کے منادی گلی گلی اور کُوچے کُوچے چیختے پھر رہے تھے اور یمامہ کے باشندے حیرت میں ڈوبے سوچ رہے تھے کہ آخر وہ کون سا اعلان ہو گا جس میں انسانیت کی نجات پوشیدہ ہے۔

پھر وہ دن بھی آ گیا، جب شہر یمامہ کا وسیع و عریض میدان لوگوں سے بھر گیا۔ ہر طرف انسانی سر ہی نظر آ رہے تھے۔ ہجوم کی نظریں اس اونچی مسند پر جمی ہوئی تھیں جہاں مسیلمہ بن کبیر کے قریبی ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر جب لوگوں میں بے چینی کے آثار نظر آنے لگے تو ایک شخص نے پوری طاقت سے چیختے ہوئے کہا۔

''سردارِ یمامہ جلوہ گر ہو رہے ہیں۔''

حاضرین کی بے چین نظریں ایک بار پھر مسند پر جم گئیں۔

چند لمحوں بعد مسیلمہ بن کبیر اس طرح نمودار ہوا کہ اس کے سر پر سیاہ دستار تھی اور وہ کالے رنگ کی ایک لمبی عبا پہنے ہوئے تھا۔ حاضرینِ جلسہ احتراماً اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے اور پورا میدان پُر جوش نعروں سے گونج اٹھا۔

مسیلمہ بن کبیر نے اپنا ہاتھ چاروں طرف لہرایا جیسے اس نے یمامہ کے باشندوں کی عقیدت کے اظہار کو قبول کر لیا۔ یہ 10ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت مسیلمہ بن کبیر کی عمر سو سال کے قریب تھی۔ اس عمر کے اکثر لوگ یا تو بستروں پر پڑے ہوئے اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہے ہوتے ہیں یا پھر خمیدہ کمر کے ساتھ کھڑے ہوئے لرز رہے ہوتے ہیں..... مگر سن و سال کی زیادتی کے باوجود مسیلمہ بن کبیر کا جسم تیر کی طرح سیدھا تھا اور اس کے چہرے پر ضعیفی کے آثار تک نہ تھے۔

''اے یمامہ کے لوگو! تم پر سلامتی ہو۔'' مسیلمہ بن کبیر کی آواز میں نوجوانوں سے بھی زیادہ گرج تھی۔

حاضرینِ جلسہ ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''خوشخبری ہو کہ میں نے تمہیں قریش کے برابر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔'' مسیلمہ بن کبیر بڑے پُر جوش لہجے میں بول رہا تھا۔

''اے ہمارے سردار! وہ کس طرح......؟'' ہجوم میں بہت سی آوازوں کا شور اُبھرا۔

''ربِ کعبہ نے قبیلہ بنو ہاشم میں محمد مصطفیٰ (ﷺ) کو ایک رسول اور نبی کی حیثیت سے مبعوث فرمایا ہے۔'' مسیلمہ بن کبیر پوری طاقت سے بول رہا تھا تاکہ دُور تک اس کی آواز سنائی دے سکے۔ ''میں نے چند روز پہلے محمد عربی (ﷺ) سے ملاقات کی تھی۔ رسولؐ اللہ نے مجھے بھی اپنی نبوت میں شریک فرما لیا ہے۔ اب رُوئے زمین پر دو نبی ہیں...... ایک ارضِ مدینہ میں اور دوسرا دیارِ یمامہ میں۔''

مسیلمہ بن کبیر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ہزاروں کا مجمع سناٹے میں آ گیا۔ عوام الناس میں سے کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ ان کا سردار ایسی بات کہے گا۔ جب مسیلمہ نے شریکِ نبوت کا اعلان کیا تو اس کے چند مصاحبین جو مجمع میں جگہ جگہ کھڑے ہوئے تھے، نے چیخ کر نبی ہونے کی گواہی دی۔

بہت دیر تک ان فتنہ پردازوں کے نعرے گونجتے رہے..... مگر عوام میں سے کسی شخص نے ان کی آواز میں آواز نہیں ملائی۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر مسیلمہ بن کبیر دوبارہ انسانی ہجوم سے مخاطب ہوا۔

''تمہیں میری بات کا یقین کیوں نہیں آتا؟ کیا میں نبوت کے قابل نہیں ہوں؟''

ایک بار پھر مجمع پر سناٹا چھا گیا۔

''یاد رکھو کہ میں دنیاوی معاملات میں بھی تمہارا سردار ہوں..... اور آخرت کے بارے میں بھی تمہاری نجات کا ذمے دار۔'' مسیلمہ بن کبیر کی آواز میں پہلے سے بھی زیادہ جوش پیدا ہو گیا۔ ''اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا تو مدینے چلے جاؤ اور محمد عربی (ﷺ) سے میری عظمت و جلال کے متعلق دریافت کرو۔ اللہ کا رسولؐ تمہیں بتائے گا کہ میں بھی کارِ رسالت میں اس کا برابر کا شریک ہوں۔''

یہ کہہ کر مسیلمہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور عقابی نظروں سے ان پرندوں کی طرف دیکھنے لگا جنہیں وہ عنقریب شکار کرنے والا تھا۔

''یہ بات مشکل بھی ہے اور آسان بھی......'' مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد مسیلمہ بن کبیر کی آواز اُبھری۔ ''مشکل اس لیے کہ میری ذاتِ جلیل و عظیم تک تمہارے ذہنوں کی رسائی ممکن نہیں، آسان اس لیے کہ ایک نبی دوسرے نبی کی نبوت پر گواہی دیتا ہے۔ پس تم اس کی شہادت تسلیم کرلو اور مجھے کسی حیل و حجت کے بغیر نبی مان لو۔ اسی میں تمہارے لیے خیر ہے......اور یہی نجات و عافیت کا آخری راستہ ہے۔ اگر تمہارے ذہن اُلجھتے ہیں تو میرے پاس آؤ۔ میں تمام اُلجھنیں دُور کر دوں گا۔ پھر تمہارے منتشر دماغ بھی قرار پا جائیں گے اور مضطرب دل بھی۔''

مسیلمہ بن کبیر کی تقریر سن کر مجمع بکھر گیا۔

یمامہ کے ایک ایک گھر میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص ایک دوسرے سے سوال کر رہا تھا۔ ''کیا ہمارا سردار بھی نبی ہوسکتا ہے؟''

مسیلمہ کے چھوڑے ہوئے زبان دراز جاسوس ان سادہ دل لوگوں کے ذہنوں میں شکوک کے طوفان اٹھا رہے تھے جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے۔

''یاد رکھو! کہ ایک سردار ہی نبوت کے منصب پر فائز ہوسکتا ہے۔'' مسیلمہ کے مخبر یمامہ کے باشندوں کو قائل کرنے کی کوشش کرتے۔ ''محمد عربی (ﷺ) کی شخصیت کا جائزہ لو، پہلے وہ قریش کے سردار ہیں، بعد میں انہوں نے اپنی نبوت کا اعلان کیا۔ اسی طرح مسیلمہ بن کبیر بھی قبیلۂ بنو حنیفہ کے سردار ہیں.....اور اب وہ اپنی نبوت کا اعلان کر رہے ہیں۔''

ابھی اہلِ یمامہ کا ایمان مستحکم نہیں ہوا تھا کہ مسیلمہ کے حاشیہ بردار، نومسلموں کے ذہنوں پر منطق کی ضربیں لگانے لگے۔ نتیجتاً کچھ لوگ بہک گئے اور سردارِ یمامہ کی خود ساختہ نبوت پر ایمان لے آئے۔

❁---❁---❁

پھر یوں ہوا کہ گمراہوں کا سلسلہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ مسیلمہ بن کبیر کے معمولات و اطوار میں روز بروز تبدیلیاں آنے لگیں۔ ایک دن وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا اور کئی گھنٹے تک ایک ہی زاویے سے لیٹا رہا۔ پھر اس نے چادر اتار کر پھینک دی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مسیلمہ کے چند عقیدت مند اس کے سامنے دست بستہ بیٹھے تھے۔ یکایک وہ پریشان لہجے میں کہنے لگے۔

''اے نبی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''کیوں؟......میری طبیعت کو کیا ہو گیا ہے؟'' مسیلمہ بن کبیر نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیا میں تمہیں چہرے سے بیمار معلوم ہوتا ہوں؟''

''آپ کی آنکھیں بہت زیادہ سرخ ہو رہی ہیں۔'' ایک حاشیہ بردار نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''بس ایک اسی بات سے ہمیں آپ کی طبیعت کی ناسازی کا گمان گزرا۔''

''تمہیں نہیں پتہ کہ میں کیسے سخت مرحلے سے گزرتا ہوں۔'' مسیلمہ بن کبیر نے بڑے عیارانہ انداز

میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’اگر وہ مرحلہ تم پر گزر جاتا تو تمہارے دل و دماغ پھٹ جاتے۔‘‘
’’اس میں کیا شک ہے؟‘‘ دوسرے حاشیہ بردار نے مسیلمہ کے سامنے احتراماً اپنا سر زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ ’’آپ نبی ہیں۔ یہ حقیر زمین، عرشِ اعلیٰ کی ہم سری کا دعویٰ کس طرح کر سکتی ہے؟‘‘
’’مجھ پر وحی نازل ہو رہی تھی۔‘‘ مسیلمہ بن کبیر نے پُر جلال لہجے میں کہا۔ ’’تم جانتے ہو کہ وحی کیا ہوتی ہے؟‘‘
’’آپ بہتر سمجھتے ہیں۔‘‘ مسیلمہ کے پیروکار ایسے مواقع پر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے انداز میں گفتگو کیا کرتے تھے۔
’’مجھ پر کلامِ الٰہی نازل ہو رہا تھا۔ اسی کی سختی سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔‘‘ مسیلمہ بن کبیر نے بڑی عیاری کے ساتھ آنکھوں کے بدلے ہوئے رنگ کی توجیہہ کی۔ حالانکہ اس نے چادر اوڑھ کر لیٹنے سے پہلے جی بھر کے شراب پی تھی اور آنکھوں کی سرخی اسی شراب نوشی کا نتیجہ تھی۔
پھر اس نے اپنے معتقدین کو نازل ہونے والی تازہ وحی سنائی۔ (معاذ اللہ)
’’اے مینڈکی..... مینڈکی کی بچی..... اسے صاف کر جسے تو کرتی ہے، تیرا بالائی حصہ تو پانی میں ہے اور نچلا حصہ مٹی میں ہے۔ نہ تو تُو پانی پینے والے کو روکتی ہے اور نہ پانی کو گدلا کرتی ہے۔‘‘
مسیلمہ بن کبیر عربی داں تھا، وہ قرآن پاک کی نقل میں چند کلمات گھڑ لیتا تھا اور انہیں آیاتِ آسمانی کہہ کر اپنے ماننے والوں کو سنا دیا کرتا تھا۔ مسیلمہ نے اس وقت بھی یہی کیا۔ معتقدین کی آنکھوں اور دل و دماغ پر گمراہی کے دبیز پردے پڑ چکے تھے۔ ان میں سے کسی نے نہیں پوچھا کہ ان مہمل کلمات کا کیا مطلب ہے؟...... اور اس سے بنی نوع آدم کو کیا ہدایت ملتی ہے؟

❀---❀---❀

پھر مسیلمہ کے شریکِ نبوت ہونے کی خبریں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سماعتِ اقدس تک بھی پہنچنے لگیں۔ آپؐ نے ان خبروں پر بے حد تشویش کا اظہار فرمایا۔ اتفاق سے ان ہی دنوں یمامہ کا ایک معزز شخص نہار، یمامہ سے مدینہ منورہ پہنچا۔ (نہار کا دوسرا نام رحال بھی ہے)
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نہار کو طلب کر کے فرمایا۔
’’مجھ تک عجیب عجیب باتیں پہنچی ہیں۔ مگر تم بتاؤ کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ مسیلمہ، یمامہ کے باشندوں کے سامنے کیا کہتا ہے؟‘‘
نہار کے ذہن میں کوئی کجی نہیں تھی۔ اس نے فوراً ہی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے مسیلمہ بن کبیر کا راز فاش کر دیا۔
’’سردارِ یمامہ علی الاعلان کہتا ہے کہ آپ نے اُسے اپنی نبوت میں شریک بنا لیا ہے۔‘‘
مسیلمہ کی اس بہتان طرازی پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو شدید اذیت پہنچی مگر آپؐ نے نہار

کے سامنے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ اپنی عدیم المثال قوتِ برداشت اور شیریں کلامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''مسیلمہ نے میرے سامنے بھی اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مگر میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ حق تعالیٰ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ تمام جن وانس مل کر بھی اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ مسیلمہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا ہے، اسے سمجھا بجھا کر صراطِ مستقیم پر لانے کی کوشش کرو۔ میری رسالت کے اقرار ہی میں اس کے لیے فلاح و خیر ہے۔''

نہار نے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وعدہ کیا کہ وہ مسیلمہ کو سمجھانے کی کوشش کرے گا اور دوسرے دن ہی یمامہ کی طرف لوٹ گیا۔

اپنے وطن پہنچتے ہی نہار کی نیت بدل گئی۔ اس نے مسیلمہ سے تنہائی میں ملاقات کی اور پورا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں اہلِ یمامہ کے سامنے یہ بات کہہ دوں کہ محمد عربی (ﷺ) نے تجھے شریکِ نبوت نہیں بنایا ہے؟''

یہ سن کر مسیلمہ بن کبیر گھبرا گیا مگر اس نے فوراً ہی اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔ ''نہار! میری بات غور سے سن۔ قریش سے اسی طرح نجات ممکن ہے کہ ہم اپنا نبی پیدا کریں۔''

پھر مسیلمہ نے نہار کو دولت و اقتدار کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔ ''آج میں تجھ سے ایک معاہدہ کرتا ہوں کہ اگر میری نبوت کامیاب ہوگئی تو تُو میرا جانشین اور نائب ہوگا۔ اس طرح دنیا بھی تیری ہے اور آخرت بھی......''

نہار، مسیلمہ کی باتوں میں آ گیا اور پھر اس نے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''لوگو! میں گواہی دیتا ہوں کہ مسیلمہ بن کبیر، اللہ کے رسول ہیں۔''

''تمہاری گواہی سے کیا ہوگا؟'' ہجوم میں سے بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔

''میں کل ہی محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مل کر آ رہا ہوں۔'' نہار نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''پیغمبرِ اسلام ﷺ نے میرے سامنے فرمایا کہ مسیلمہ بن کبیر کارِ نبوت میں میرے شریک ہیں۔''

اس جھوٹے اعلان اور بہتان طرازی نے اہلِ یمامہ کے ذہنوں میں تلاطم برپا کر دیا اور قبیلۂ بنو حنیفہ کے تقریباً تمام لوگ دینِ حنیف سے منحرف ہو کر مسیلمہ کی نبوت کا کلمہ پڑھنے لگے۔

❀---❀---❀

کچھ دن بعد بنو حنیفہ کا ایک اور وفد مدینہ منورہ آیا۔ یہ لوگ کسی جھجک کے بغیر عام مسلمانوں کے سامنے مسیلمہ کے اقوال کو آسمانی وحی کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ ایک دن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کی موجودگی میں قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھا۔ اس وقت مجلس میں مسیلمہ کی نبوت کا ماننے والا ایک شخص بھی موجود تھا۔ اس نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ

سنتے ہی بلند آواز میں کہا۔

''اس میں رحمان یمامہ کی طرف اشارہ ہے۔'' اعلانِ نبوت سے پہلے مسیلمہ ''رحمان یمامہ'' کے نام سے مشہور تھا۔

پھر جب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ اندوہناک خبر ملی کہ بنو حنیفہ کے لوگ مسیلمہ کی پُرفریب باتوں میں آ کر اس کی نبوت پر ایمان لے آئے ہیں تو آپؐ نے مومنین کی ایک بڑی جماعت کو مسجدِ نبوی میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ پہلے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی، پھر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اہلِ ایمان یاد رکھیں کہ مسیلمہ ان تین کذابوں میں سے ایک کذاب (جھوٹا) ہے جو دجّال سے پہلے اس زمین پر ظاہر ہونے والے ہیں۔''

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم کے اس خطبے کے بعد سے لوگ مسیلمہ بن کبیر کو مسیلمہ کذاب کے نام سے پکارنے لگے۔

یہ خبر مسیلمہ تک بھی پہنچ گئی کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُسے کذاب (جھوٹا) قرار دے دیا ہے۔ مسیلمہ پریشان ہو گیا کہ کہیں اہلِ یمامہ پر اس کا فریب عیاں نہ ہو جائے۔ اس خیال سے اس نے اپنے مشیرِ خاص نہار کو طلب کر کے نئی صورتِ حال بیان کی۔

''یہ سچ ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پہلے دن ہی مجھے شریکِ نبوت بنانے سے انکار کر دیا تھا...... مگر یہ بات اس وقت چند لوگوں تک محدود تھی۔ اس لیے میرے دعوے کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ مگر اب مدینے سے آنے والوں کا کہنا ہے کہ بے شمار اہلِ یمامہ اس راز سے واقف ہو چکے ہیں۔''

نہار ایک نہایت شاطر انسان تھا۔ وہ اس سنگین صورتِ حال میں بھی ہراساں نہیں ہوا۔ اس نے جگہ جگہ مجمع لگانا شروع کر دیا۔

''جو لوگ مدینے سے یہ خبر لے کر آئے ہیں کہ محمد عربی (ﷺ) نے ہمارے رسول مسیلمہ کو کذاب قرار دے دیا ہے، دراصل وہ خود جھوٹ بولتے ہیں۔ انہیں سردارِ یمامہ اور قبیلۂ بنو حنیفہ کی سربلندی گوارا نہیں۔ اس لیے وہ ایک کھلی ہوئی نشانی کی نفی کر رہے ہیں۔ یاد رکھو کہ چند اختراء پردازوں کے بیانات سے حقیقت مسخ نہیں ہوتی۔''

نہار کی ان پُرجوش تقریروں کا فوری طور پر یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ قبیلۂ بنو حنیفہ کے جو لوگ متزلزل ہو گئے تھے، وہ دوبارہ اپنے عقائد پر جم گئے۔ دراصل نہار نے مسیلمہ کذاب کی نبوت کی بنیاد ہی قومی عصبیت پر رکھی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب قریش اپنا نبی پیدا کر کے پورے عرب میں ممتاز و سربلند ہو سکتے ہیں تو پھر اہلِ یمامہ کیوں پیچھے رہیں؟ مسیلمہ کذاب اور نہار کی گمراہی یہ تھی کہ وہ نبوت اور رسالت کو بھی (معاذ اللہ) خانہ ساز چیز سمجھتے تھے۔ حالانکہ یہ محض عطائے الٰہی ہے کہ وہ جس خطۂ ارض سے چاہتا ہے، اس کارِ عظیم کے

لیے اپنے بندے کو منتخب کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے جسموں میں شیطان حلول کر جاتا ہے، وہ نبوت کو بھی بادشاہت نما شے تصور کرتے ہیں۔ چند ہم نوا لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا اور سرداری کا اعلان کر دیا۔ مسیلمہ کذاب نے بھی قومی عصبیت کے جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہی کیا تھا۔ اس کی جھوٹی نبوت کی بنیاد روحانی کمالات کے بجائے اس بات پر تھی کہ وہ قریش کے مقابلے میں بنو حنیفہ کو صف آراء کرنا چاہتا تھا۔ شروع میں مسیلمہ کذاب کو بہت دُشواریاں پیش آئیں مگر جب سے نہار اس کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہوا تھا، گمراہوں کی اس جماعت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

نہار وہ خبیث فطرت انسان تھا جو ہدایت پا کر شیطان کے راستے پر چل پڑا۔ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ وہ مسیلمہ کذاب کو صراطِ مستقیم پر لے آئے گا مگر جب مسیلمہ نے اس کے قومی عصبیت کے جذبات کو جھنجوڑا تو وہ خود بھی مرتد ہو گیا اور ہزاروں اہلِ ایمان کو بھی ارتداد کے فتنے میں ڈال دیا۔ اب اس کی ہر تقریر کا ایک ہی موضوع تھا کہ وہ مسیلمہ کی سچائی ثابت کر سکے۔ نتیجتاً وہ قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں چیختا پھر رہا تھا۔

''لوگو! میری بات سنو...... تمہارا رسول مسیلمہ سچا اور برحق ہے۔ تم قریش کے فریب میں نہ آ جانا۔ مسیلمہ ہرگز جھوٹا نہیں ہے۔ قریش، بنو حنیفہ کی قومی عظمتوں سے جل اُٹھے ہیں۔ اپنے ایمان و عقائد کی حفاظت کرو اور مسلسل گواہی دیتے رہو کہ مسیلمہ سچا ہے۔''

❀---❀---❀

اسی دوران ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے مسیلمہ کذاب کی جھوٹی نبوت کو تقویت بخشی۔ طلیمہ نمری ایک شخص تھا جس کا تعلق یمامہ سے تھا اور وہ بہت دن پہلے مدینہ منورہ میں آ بسا تھا۔ پھر جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش و انصار کے سامنے اسلام پیش کیا تو طلیمہ نمری بھی ایمان لے آیا۔ بظاہر وہ برسوں تک مسلمان ہی رہا مگر ذہنی طور پر طلیمہ نمری ایک خلفشار کا شکار تھا۔ اس کے اندر بھی قومی عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور وہ قریش کی سیادت کو دل سے پسند نہیں کرتا تھا۔ پھر جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خطبۂ مبارک میں مسیلمہ بن کبیر کو ''کذاب'' قرار دیا تو طلیمہ نمری سوچ میں ڈوب گیا کہ یہ کون شخص ہے جو نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے؟

پھر جب طلیمہ نمری نے تحقیق و جستجو کی تو اسے پتہ چلا کہ مسیلمہ کذاب کا تعلق بھی یمامہ سے ہے۔ آخر یہی تعلق طلیمہ نمری کو کھینچ کر یمامہ لے گیا۔

پھر جب طلیمہ نمری، مسیلمہ کذاب کی مجلسِ خاص میں داخل ہوا تو وہاں سینکڑوں لوگ ادب سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''میں آپ سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔'' طلیمہ نمری نے مسیلمہ کذاب سے درخواست کی۔ ''میں ایک نہایت اہم خبر لے کر مدینے سے آ رہا ہوں۔''

مسیلمہ کذاب نے فوراً ہی اپنے پیروکاروں کو مجلس سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ پھر جب مکمل تنہائی ہوگئی تو مسیلمہ نے طلیمہ نمری سے پوچھا۔

''تم کون ہو؟ اور میرے پاس کیوں آئے ہو؟''

''کیا تم ہی مسیلمہ ہو؟'' طلیمہ نمری نے طنزیہ لہجے میں جھوٹے نبی سے پوچھا۔

''مسیلمہ رسول اللہ کہو۔'' مسیلمہ اچانک غضب ناک نظر آنے لگا۔

''کسی روشن دلیل کے بغیر تمہیں رسول اللہ کیسے کہہ دوں؟'' طلیمہ نمری نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''کوئی سوال کرو۔'' مسیلمہ کذاب پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ ''پھر تمہیں یقین آ جائے گا کہ میں رسول اللہ ہوں یا نہیں.....؟''

طلیمہ نمری مسکرایا۔ ''تمہارے پاس کون آتا ہے؟''

''رحمان.....!'' مسیلمہ کذاب نے بلند آواز میں کہا۔ ''رحمان کے سوا میرے پاس کون آ سکتا ہے؟''

''روشنی میں یا تاریکی میں.....؟'' طلیمہ نے دوسرا سوال کیا۔

''رحمان میرے پاس ہمیشہ اندھیرے میں آتا ہے۔'' مسیلمہ کذاب نے فخریہ لہجے میں کہا۔

مسیلمہ کا جواب سن کر طلیمہ نمری مسکرانے لگا۔ وہ انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں جھوٹے نبی سے مخاطب ہوا۔ ''مسیلمہ! میں شہادت دیتا ہوں کہ تُو کذاب ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صادق ہیں۔''

طلیمہ نمری کی بات سن کر مسیلمہ کذاب غضب ناک ہو گیا۔ ''طلیمہ! آخر تُو نے کس بنیاد پر مجھے جھوٹا کہا؟''

''اس لیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انبیائے سابقہ کی طرح دن کے اُجالے میں وحی نازل ہوتی ہے۔'' طلیمہ نمری نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا۔

''پھر تُو میرے پاس کیوں آیا ہے؟'' غصے کی شدت میں مسیلمہ کذاب اپنی مسند پر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر تک طلیمہ نمری، مسیلمہ کذاب کی بدحواسی کا جائزہ لیتا رہا، پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''بیٹھ جا مسیلمہ!...... بیٹھ جا۔ میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔''

مسیلمہ کذاب غصے میں بھرا ہوا اپنی مسند پر بیٹھ گیا۔

''مسیلمہ! میں جانتا ہوں کہ تُو جھوٹا ہے مگر میری محبتیں اور عقیدتیں تیرے ساتھ ہیں۔'' طلیمہ نمری کی گفتگو ناقابلِ فہم تھی۔

''میں اب تک نہیں سمجھا کہ تُو کیا کہنا چاہتا ہے؟'' مسیلمہ کذاب کے لہجے سے قہر و نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''یہ ہے تیری عقیدت کہ تُو میرے منہ پر مجھے جھوٹا کہہ رہا ہے؟''

''وہ اور بات ہے مسیلمہ.....!'' طلیمہ نمری بدستور مسکرا رہا تھا۔ ''مجھے تجھ سے اس لیے محبت ہے کہ تُو اپنے قبیلے کا ہے۔ بے شک قریش کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سچے ہیں مگر مجھے ان کے مقابلے میں

اپنے قبیلے کا جھوٹا نبی زیادہ محبوب ہے۔''

آخر قومی عصبیت نے وہ گل کھلائے کہ ہزاروں ہدایت یافتہ انسان مرتد ہو گئے۔ نہار اور طلیمہ نمری ان میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ پھر ان دونوں نے مل کر مسیلمہ کذاب کی جھوٹی نبوت کے فروغ کے لیے بھرپور تبلیغی مہم چلائی اور فتنہ وفساد کا چھوٹا سا پودا بڑھتے بڑھتے ایک تناور درخت بن گیا۔

❁---❁---❁

جب قبیلۂ بنو حنیفہ کے تمام لوگ مسیلمہ کذاب کے زیر اثر آ گئے تو اس خبیث نے انتہائی جسارت کرتے ہوئے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام ایک خط تحریر کیا۔

''مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے، محمد رسول اللہ کے نام..... معلوم ہوا ہے کہ میں امرِ نبوت میں آپ کا شریکِ کار ہوں۔ عرب کی سرزمین نصف ہماری اور نصف قریش کی ہے۔ مگر قریش کی قوم ہمارے ساتھ زیادتی اور بے انصافی کر رہی ہے۔''

مسیلمہ کذاب کے دو قاصد اس کا خط لے کر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسیلمہ کذاب کا خط پڑھا۔ بڑی سے بڑی پریشانی میں بھی مسکرانے والا چہرۂ انور متغیر ہو گیا۔ پھر آپؐ نے مسیلمہ کذاب کے دونوں قاصدوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اگر قاصد کا خون بہانا جائز ہوتا تو میں تم دونوں کو قتل کرا دیتا۔''

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمودۂ مقدس اور عملِ مبارک کے بعد دنیا بھر میں یہ اصول طے پا گیا کہ قاصد یا سفیر کا قتل جائز نہیں۔

پھر مسیلمہ کذاب کے خط کے جواب میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تحریر کرایا۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ منجانب محمد رسول اللہ، بنام مسیلمہ کذاب..... سلام اُس شخص پر جو ہماری پیروی کرے، اس کے بعد معلوم ہو کہ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے..... اور عاقبت کی کامرانی پرہیزگاروں (متقیوں) کے لیے ہے۔''

❁---❁---❁

مسیلمہ کذاب نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکتوبِ گرامی پڑھا مگر کوئی ہدایت حاصل نہیں کی۔ شیطانِ رجیم اُس کے دل و دماغ پر مکمل غلبہ حاصل کر چکا تھا۔ پہلے اسے کبھی کبھی اس قسم کے خواب دکھائے جاتے تھے کہ پروردگار اس سے مخاطب ہوتا تھا۔ اب یہ خواب عام ہو چکے تھے۔ مسیلمہ کذاب سوتے میں کبھی جنت کی سیر کرتا، کبھی حوریں اس کے ہمراہ ہوتیں اور کبھی وہ آسمانوں کی بلندیوں پر پرواز کر رہا ہوتا۔ کبھی چاند اور سورج اس کی گود میں اُتر آتے..... اور کبھی ستارے اُس کا طواف کرنے لگتے۔ الغرض گمراہی کے جتنے مناظر تھے، شیطان خواب کے ذریعے اسے دکھاتا رہتا۔ مسیلمہ کذاب اپنے حاشیہ

برداروں کے درمیان یہ خواب بیان کرتا اور بڑے پُر جوش لہجے میں کہتا۔

''میں نبوت کے اعلیٰ ترین مراحل طے کر رہا ہوں...... عنقریب روحانیت کا یہ سفر ختم ہونے والا ہے اور میں اپنی انتہا کو پہنچنے والا ہوں۔''

نہار، عبداللہ بن نواحہ اور طلیمہ نمری، مسیلمہ کذاب کے ان خوابوں کو بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ عوام میں بیان کرتے۔ نتیجتاً سادہ لوح بندے شیاطین کے فریب میں آ جاتے اور زور وشور کے ساتھ مسیلمہ کذاب کی نبوت کا اقرار کرنے لگتے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی۔ مسیلمہ نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی تبلیغی مہم کو تیز تر کر دیا۔ پھر جب بیماری شدید ہو گئی تو ایک دن سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

''ابوبکرؓ! میرے بعد اس کذاب کو زندہ نہ چھوڑنا۔ ورنہ اس زمین پر بڑی گمراہی پھیلے گی۔''

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے روتے ہوئے فرمایا۔

''میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! اگر اللہ کی مدد شاملِ حال رہی تو میں ایک دن بھی اس فتنے کو سانس لینے کا موقع نہیں دوں گا۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔

''تم اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا۔ وہ ہر حال میں تمہاری مدد فرمائے گا۔''

اس کے بعد پیغمبرِ اسلام ﷺ اپنے خالقِ حقیقی کے پاس تشریف لے گئے۔

مسلمان اس صدمۂ جانکاہ سے بے حال تھے۔ انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان سنگین اور جاں گداز لمحوں میں حضرت صدیق اکبرؓ ہی کی ذاتِ گرامی ایسی تھی جس نے اہلِ ایمان کو تقویت اور حوصلہ بخشا۔

❀---❀---❀

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کی خبر سن کر مسیلمہ کذاب اور اس کے پیروکاروں میں ناقابلِ بیان خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نہار نے نعرہ بلند کرتے ہوئے کہا۔

''اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔''

عبداللہ بن نواحہ نے تجویز پیش کی۔ ''اب ہمارے رسول کو چاہیے کہ وہ اپنا نام اذان میں شامل کر لیں۔ اس طرح ہماری تبلیغی مہم کو زیادہ تقویت پہنچے گی۔''

مسیلمہ کذاب نے عبداللہ بن نواحہ کی تجویز کو بہت غور سے سنا۔ پھر انتہائی پُر مسرت لہجے میں بولا۔

''عبداللہ! ہمیں تیری تجویز بہت پسند آئی، آج سے تُو ہی ہمارا مؤذن ہے۔''

یہ کہہ کر مسیلمہ کذاب نے عبداللہ بن نواحہ کو گراں قدر انعام سے نوازا۔

پھر اسی روز اس شیطان نے بلند آواز میں پورے زور وشور کے ساتھ اذان دی اور سرکارِ دو عالم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مسیلمہ کذاب کا نام بھی شامل کر لیا۔

اہلِ یمامہ نے نئی اذان سن کر جشنِ خاص منایا۔ گھر گھر مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ جگہ جگہ جلسے کیے گئے۔ ان جلسوں میں نہار اور طلیمہ نمری نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''مسیلمہ کا نام بلند ہو، یہاں تک کہ پوری دنیا کی فضائیں اس نام سے گونج اُٹھیں۔''

یمامہ میں حجیر بن عمیر نام کا ایک شخص نماز میں اقامت کرتا تھا۔ وہ دل سے مسیلمہ کذاب کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتا تھا مگر جبر کا شکار تھا۔ ایک دن مسیلمہ کے کسی پیروکار نے حجیر بن عمیر کو کلمہ پڑھتے سنا۔ یہ کلمہ اس کلمے سے مختلف تھا جو مسیلمہ کذاب کے پیروکار پڑھا کرتے تھے۔

اس شخص نے مسیلمہ کذاب سے حجیر بن عمیر کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔

''اے ہمارے رسول! آپ نے کس شخص کو نماز کی اقامت کے لیے مقرر کیا ہے؟''

''کیا حجیر بن عمیر سے کوئی غلطی ہوگئی؟'' مسیلمہ کذاب نے حیران ہو کر پوچھا۔

''وہ آپ کی رسالت کا اقرار تو کرتا ہے مگر بڑے مبہم انداز میں۔'' اس شخص نے کہا۔ ''حجیر بن عمیر کے اقرار سے لوگوں کے ذہنوں میں وسوسے اور اندیشے پیدا ہوتے ہیں۔''

مسیلمہ کذاب نے فوراً ہی حجیر بن عمیر کو طلب کر لیا اور اس سے کلمہ پڑھنے کے لیے کہا۔

''میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ مسیلمہ، رسول اللہ ہونے کا مدعی ہے۔'' حجیر بن عمیر نے اسی کلمے کا اعادہ کیا جو وہ اکثر پڑھا کرتا تھا۔

کلمہ سن کر مسیلمہ کذاب برہم ہوگیا اور اس نے انتہائی غضب ناک لہجے میں اپنے پیروکار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''حجیر! تیری زبان کو کیا ہوگیا ہے؟ بات صاف صاف کہا کر۔ کیونکہ بات کو ادل بدل کرنے میں کوئی خیر نہیں۔''

حجیر بن عمیر کے کلمے کا مطلب یہ تھا کہ ہم مسیلمہ کذاب کو اللہ کا رسول نہیں مانتے۔ وہ خود اس بات کا مدعی ہے۔

مسیلمہ کذاب نے یہ کلمہ سن کر حجیر کو تنبیہہ کی کہ اگر آئندہ اس کی زبان لڑکھڑائی تو وہ سخت ترین سزا کا مستحق قرار پائے گا۔ موت کے خوف سے حجیر نے اپنا کلمہ بدل ڈالا۔ اب وہ صاف صاف کہا کرتا تھا کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ (معاذ اللہ)

❁---❁---❁

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد مسیلمہ کذاب کی دریدہ دہنی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اب وہ دینِ اسلام کے بنیادی عقائد میں بھی مداخلت کرنے لگا۔

مسیلمہ کذاب نماز ادا کرتے وقت قبلہ کی طرف رخ کرنے کا اہتمام نہیں کرتا تھا۔ جب مسیلمہ سے

اس کا سبب پوچھا گیا تو اس نے نہایت جاہلانہ اور گستاخانہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔
''محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں قبلے کی سمت مقرر نہ تھی۔ کبھی آپؐ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرماتے تھے، کبھی کعبہ کی طرف اور کبھی تیسری جانب توجہ فرماتے تھے۔ ہمیشہ کعبے کی طرف منہ کرنا، محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اصحاب کی جاری کردہ بدعت ہے۔'' (معاذ اللہ)
اس کے بعد مسیلمہ کذاب نے اپنی بے جہت نماز کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے کہا۔
''جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دنیا سے رخصت ہو گئے تو مجھے حکم ہوا کہ محراب کی طرف منہ کرنا اور جہتِ معیّن کی طرف متوجہ ہونا کفر و شرک کی علامت ہے۔ نماز کے وقت جدھر چاہیں منہ کر لیا کریں۔''

❁---❁---❁

مسیلمہ کذاب نے یمامہ کے جاہل باشندوں کو متاثر کرنے کے لیے قرآن کریم کی آیات کے طرز پر بہت سی آیات وضع کر لی تھیں اور انہیں گمراہوں کے مجمع میں باآواز بلند سنایا کرتا تھا۔ جب کوئی شخص اعتراض کرتا کہ یہ آیات قرآن حکیم میں شامل نہیں ہیں تو مسیلمہ کذاب بڑی بے حیائی کے ساتھ کہتا۔
''محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد وحی کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں دوسرا نبی موجود ہے۔ یہی وہ آیاتِ الٰہی ہیں جو مجھ پر نازل ہوتی ہیں۔''
یہ آیات اس قدر مہمل ہیں کہ مسلمان تو کجا، دوسرے مذاہب کے عالم بھی انہیں پڑھ کر ہنستے ہیں۔
پھر جب کوئی شخص برسرِ مجلس یہ کہتا کہ تمام انبیائے پاک علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس سے معجزات ظاہر ہوئے ہیں تو مسیلمہ کذاب پُرجوش ہو جاتا اور بے اختیار پکار اُٹھتا۔
''اس قسم کے معجزات تو میں دکھا سکتا ہوں۔''
یہ کہہ کر مسیلمہ کذاب اپنے خادم کو حکم دیتا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ خادم ایک بوتل لیے ہوئے مجلس میں داخل ہوتا۔
مسیلمہ کذاب اس بوتل کو حاضرین کے سامنے پیش کرتا جس کے اندر مرغی کا ایک بڑا انڈا موجود ہوتا۔ دیکھنے والے یہ منظر دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ ایک تنگ منہ والی بوتل میں مرغی کا انڈا کس طرح داخل ہوا ہے؟
پھر جب حیرت زدہ لوگ مسیلمہ کذاب سے انڈے کے بارے میں سوال کرتے تو وہ خبیث بڑے متکبرانہ لہجے میں جواب دیتا۔
''یہ میرے بے شمار معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ اگر کوئی شخص میری روحانی قوت کا منکر ہے تو پھر ایسی کوئی دوسری مثال پیش کر دے۔ میں اس کی عظمت کا قائل ہو جاؤں گا۔''
یمامہ کے باشندے مسیلمہ کذاب کی اس شعبدہ بازی کو معجزہ تصور کر لیتے اور اس کی خانہ ساز نبوت پر ان کا ایمان مضبوط تر ہوتا چلا جاتا۔

مسیلمہ کذاب کی اس شعبدہ بازی کی بنیاد ایک طبّی اصول پر تھی جس کے تحت اگر انڈے کو چند روز تک ''سرکے'' میں رکھا جائے تو وہ انتہائی نرم ہو جاتا ہے اور پھر اسے آسانی کے ساتھ بوتل کے اندر داخل کیا جا سکتا ہے۔ مسیلمہ کذاب طب میں ماہر تھا، اس لیے اس پر ایک راز فاش ہو گیا تھا۔ پھر جھوٹے نبی نے اسی طبّی راز کا سہارا لے کر بے خبر لوگوں کو بے وقوف بنایا۔

بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسیلمہ کذاب دنیا میں پہلا شخص ہے جس نے ''سرکے'' کے ذریعے انڈے کو نرم کر کے بوتل میں داخل کیا۔ اپنی اس شعبدہ بازی کا مظاہرہ کرتے وقت وہ کہا کرتا تھا۔

''یہ کام بشری قوت سے باہر ہے مگر چونکہ میں نبی ہوں، اس لیے بار بار اس کام کو انجام دے سکتا ہوں۔''

کئی بار مسیلمہ کذاب نے حاضرینِ مجلس کے سامنے نیا انڈا بوتل میں داخل کیا۔ بس یہی وہ تنہا شعبدہ تھا جسے مسیلمہ کذاب اپنے معجزات سے تعبیر کیا کرتا تھا۔ مگر اس کے ماننے والوں نے اس کے نام سے کئی معجزات منسوب کر دیئے تھے۔

محمد قلی نام کا ایک شخص مشہد میں رہا کرتا تھا۔ اس نے مسیلمہ کذاب کا ایک معجزہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''ایک دن رات کے وقت ہمارا رسول اپنے اصحاب کے ساتھ مجلس میں جلوہ افروز تھا۔ یکایک اُس کی نظر چودھویں کے چاند پر پڑی۔ مہتابِ کامل کو دیکھ کر مسیلمہ کذاب پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر اس نے ایک خاص انداز سے چاند کو اشارہ کیا۔ چاند فوراً ہی اپنے محور سے ہٹ کر زمین کی طرف اُترنے لگا۔ حاضرینِ مجلس دم بخود تھے۔ پھر چاند یہاں تک نیچے آیا کہ مسیلمہ کذاب کی خانقاہ میں داخل ہو گیا۔ دیکھنے والوں کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے چاند کو دیکھ رہے تھے یہاں تک کہ چاند مسیلمہ کذاب کی گود میں بیٹھ گیا۔''

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشہور معجزے ''شق القمر'' کے جواب میں مسیلمہ کذاب کے پیروکاروں نے یہ مضحکہ خیز واقعہ تراشا ہے جسے پڑھ کر انسانی ذہن کی فریب خوردگی پر ہنسی آتی ہے۔

دوسرا معجزہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار مسیلمہ کذاب کسی جنگل سے گزر رہا تھا جس کے سارے درخت خشک ہو گئے تھے۔ مسیلمہ کذاب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل ہرا بھرا ہو گیا۔

غرض اسی قسم کے مضحکہ خیز اور بے سر و پا واقعات بیان کر کے مسیلمہ کذاب کی جھوٹی نبوت کو فروغ دیا جاتا تھا۔

❁---❁---❁

پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ مسیلمہ کذاب کی نبوت پر سے اہلِ یمامہ کا ایمان متزلزل ہونے لگا۔ اکثر پیروکار جھوٹے نبی کے معجزات بیان کرتے تھے مگر جب عوام کے سامنے آزمائش کا وقت آتا تھا تو مسیلمہ

کذاب اپنی روحانی طاقت کا مظاہرہ کرنے میں ناکام ہو جاتا تھا۔

ایک دن مسیلمہ کذاب اپنی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت داخل ہوئی اور نہایت شکستہ لہجے میں کہنے لگی۔

''ہمارا نخلستان سرسبزی و شادابی سے محروم ہے اور تمام کنوئیں بھی خشک ہو چکے ہیں۔ آپ ہماری اس مصیبت کو دُور کرنے کے لیے اس طرح دعا کیجئے جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہزمان کے باشندوں کے لیے دعا فرمائی تھی۔''

اس وقت مسیلمہ کذاب کا نائب نہار قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مسیلمہ اپنے نائب سے مخاطب ہوا۔ ''نہار! کیا تو جانتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اہلِ ہزمان کے لیے کس طرح دعا فرمائی تھی؟''

ہزمان نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور کہنے لگا۔

''سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہزمان کے کنوؤں کا پانی لیا اور غرارہ کر کے دوبارہ وہی پانی کنوؤں میں ڈال دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کنوئیں متلاطم ہو گئے اور پانی چشموں کی طرح اُبل پڑا۔ اسی طرح حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعا سے خرما کے سوکھے درخت ہرے بھرے ہو گئے تھے اور چھوٹے چھوٹے پودوں میں کلیاں نکل آئی تھیں۔

مسیلمہ کذاب نے نہار کو ساتھ لیا اور سوالی عورت کے ہمراہ ان کنوؤں پر پہنچا جن کا پانی تقریباً خشک ہو چکا تھا۔ مسیلمہ نے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نقل کرتے ہوئے کنوؤں کا پانی لیا اور غرارہ کر کے اسے دوبارہ کنوؤں میں ڈال دیا۔ پھر کنوؤں کے اُبلنے کا انتظار کرنے لگا۔ قدرتِ خداوندی سے مسیلمہ کذاب کے اس عمل کا اُلٹا اثر ہوا۔ کنوؤں میں جس قدر پانی موجود تھا، وہ بھی خشک ہو گیا۔ اسی طرح جب مسیلمہ کذاب نے نخلستان کی شادابی کے لیے دعا کی تو دیکھتے ہی دیکھتے سارے درخت خشک ہو گئے۔ مسیلمہ نے گھبرا کر اپنے نائب سے پوچھا۔

''نہار! یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری دعاؤں میں اُلٹا اثر کہاں سے آ گیا؟''

نہار جانتا تھا کہ مسیلمہ جھوٹا نبی ہے، اس لیے اس کی دعائیں بھی نحس اثر رکھتی ہیں مگر وہ دولت و اقتدار کے لالچ میں مسیلمہ کا ساتھ دے رہا تھا۔ مصلحتاً باتیں بناتے ہوئے بولا۔

''آپ کی نبوت میں کوئی کمی نہیں۔ یہ گردشِ وقت ہے جس نے آپ کی دعاؤں کو ناکام لوٹا دیا ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ خاموشی کے ساتھ یہاں سے واپس لوٹ جائیں اور اس علاقے کے بدنصیب لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔''

مسیلمہ کذاب اپنی جھوٹی نبوت کے دامن پر ناکامی کا بدنما داغ لے کر واپس چلا گیا اور اس علاقے کے لوگ طویل مدت تک مسیلمہ کذاب کو بددعائیں دیتے رہے کہ اسی کی نحوست کے اثر سے ان کے نخلستان برباد اور کنوئیں خشک ہو گئے تھے۔

ایک بار نہار نے مسیلمہ کذاب سے ذکر کیا کہ حضرت سیّدِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برکت کے لیے بچوں کے سروں پر دستِ مبارک پھیرا کرتے تھے۔

مسیلمہ کذاب نے بھی سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نقل میں قبیلۂ بنو حنیفہ کے چند بچوں کے سروں پر اپنا ناپاک ہاتھ پھیرا جس کے نتیجے میں تمام بچوں کے بال اُڑ گئے اور وہ ہمیشہ کے لیے گنجے ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی زبانیں لکنت اور توتلے پن کا شکار ہو گئیں۔ ان بچوں کے ماں باپ نے بھی جی بھر کے مسیلمہ کذاب کو بددعائیں دیں۔

مدینہ منورہ میں ایک مسلمان برسوں سے آشوبِ چشم کے اذیت ناک مرض میں مبتلا تھا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دیکھا اور اپنا لعابِ دہن اس کی آنکھوں میں لگا دیا۔ وہ شخص فوراً ہی شفایاب ہو گیا۔ مسیلمہ کذاب نے یہ واقعہ سنا تو اپنی نبوت کا مظاہرہ کرنے کے لیے اس نے آشوبِ چشم کے ایک مریض کی آنکھوں میں اپنا لعاب لگایا تو وہ شخص ہمیشہ کے لیے اندھا ہو گیا۔

اسی طرح ایک بار مسیلمہ کذاب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نقل میں دودھ کی زیادتی کے لیے ایک بکری کے تھنوں پر ہاتھ پھیرا۔ نتیجتاً بکری کا سارا دودھ خشک ہو گیا۔

ایک بار مسیلمہ کذاب کی ایک پیروکار عورت اس کی مجلس میں حاضر ہوئی اور غم زدہ لہجے میں کہنے لگی۔ ''میرے کئی بیٹے مجھے داغِ مفارقت دے کر دوسری دنیا میں جا چکے ہیں۔ اب صرف دو باقی ہیں۔ آپ ان کی درازیٔ عمر کے لیے دعا فرمائیے۔''

مسیلمہ کذاب کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا، پھر اس نے درخواست گزار خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تیرا بڑا بیٹا بڑھاپے کی منزل کو پہنچے گا اور چھوٹے بیٹے کی عمر چالیس سال ہو گی۔''

عورت، مسیلمہ کذاب کی زبان سے یہ خوشخبری سن کر نہایت مسرت کے عالم میں رخصت ہوئی۔ پھر جیسے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا، ایک جاں گداز خبر اُس کی منتظر تھی۔ بڑا بیٹا کنوئیں میں ڈوب کر مر چکا تھا اور چھوٹا لڑکا جس کے بارے میں مسیلمہ کذاب نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ چالیس سال تک زندہ رہے گا، نزع کے عالم میں گرفتار تھا۔ پھر اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ماں کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیا۔ غم زدہ عورت بین کر رہی تھی اور چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

''یہ کیسا پیغمبر ہے؟ اور کیسی اس کی دعائیں ہیں؟''

یہ قدرت کی عجیب کارفرمائی تھی کہ مسیلمہ کذاب اپنی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جس عملِ مقدس کی نقل کرتا تھا، اُسے رُسوائی و ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ دراصل یہ ایک غیبی تنبیہہ تھی جس کے ذریعے مسیلمہ کذاب کو مہلت دی جا رہی تھی کہ وہ اپنے جہل سے باز آ جائے اور اپنے گناہِ عظیم سے تائب ہو کر اہلِ ایمان کی طرح حلقۂ اسلام میں داخل ہو جائے۔ مگر ہدایت اس کے مقدر میں نہیں تھی۔ وہ انتہائی گمراہی میں غلطاں و پیچاں تھا اور مسلسل کثافت و غلاظت کے سمندر

میں غوطے لگا رہا تھا۔
مسیلمہ کے نائب نہار نے جب اپنے پیغمبر کی ناکامیاں دیکھیں تو خلوت میں مشورہ دیتے ہوئے کہا۔
''آپ گوشہ نشیں رہیں اور لوگوں کے سامنے آنے سے گریز کریں۔ دعاؤں کی نامقبولیت عقیدت مندوں کے ایمان کو متزلزل کر رہی ہے۔''
اس مشورے کے بعد مسیلمہ کذاب اپنی خانقاہ کے ایک گوشے میں سمٹ گیا۔ بس چند خاص لوگ تنہائی میں حاضر ہو کر اسے بتایا کرتے تھے کہ تبلیغی مہم زور و شور کے ساتھ جاری ہے۔

❁---❁---❁

پھر وقتِ معلوم آ پہنچا اور اللہ کی طرف سے دی ہوئی مہلت ختم ہوگئی۔
خلیفۂ اوّل امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تمام مرتدینِ عرب کی سرکوبی کا فیصلہ کر لیا۔ پہلی جنگی مہم یمامہ کی طرف بھیجی گئی۔ اس مہم کی قیادت ابوجہل کے بیٹے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔
حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو رخصت کرتے وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا۔
''تم یمامہ کے قریب خیمہ زن ہو کر شرجیل بن حسنہ کا انتظار کرنا۔ اس دوران حالات کا جائزہ لینا اور پھر جب نئے لشکر کی کمک پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر مسیلمہ کذاب اور اس کے پیروکاروں پر اس طرح حملہ کرو کہ دشمنانِ رسالت کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔''
حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اس معاملے میں اس قدر حساس اور جذباتی تھے کہ انہوں نے صورتِ حال کا جائزہ لیے بغیر مسیلمہ کذاب کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بہت زیادہ پُراعتماد تھے اس لیے وہ شرجیلؓ بن حسنہ کا انتظار نہ کر سکے۔ اس وقت مسیلمہ کذاب کے سپاہیوں کی تعداد چالیس ہزار کے قریب تھی۔ حد سے زیادہ جوش اور ناتجربہ کاری کے باعث حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو شکست ہوگئی اور مسیلمہ کذاب کی فوج فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے میدانِ جنگ سے واپس لوٹی۔
شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ اس وقت راستے ہی میں تھے کہ انہیں اسلامی لشکر کی شکست کی تکلیف دہ خبر ملی۔ شرجیلؓ اسی جگہ خیمہ زن ہو گئے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نئی ہدایت کا انتظار کرنے لگے۔
حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے ایک قاصد کے ذریعے اپنی شکست کا حال امیرالمومنین کو لکھ بھیجا۔
جواب میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تحریر فرمایا۔
''افسوس! تم نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا، حالانکہ میں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ شرجیلؓ بن حسنہ کے پہنچنے تک جنگ کا آغاز نہ کرنا۔ خیر! جو ہوا، سو ہوا..... مگر اب تم مدینے کی طرف رخ نہ کرنا کیونکہ تمہیں دیکھ کر یہاں کے لوگ شکستہ دل ہو جائیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آگے بڑھ کر حذیفہؓ اور عرفجہؓ

سے مل جاؤ اور ان کے ماتحت رہ کر عمان والوں کا مقابلہ کرو۔ پھر جب تمہیں اس جنگ سے فراغت حاصل ہو جائے تو اپنا لشکر لے کر مہاجرؓ بن اُمیہ کے پاس یمن اور حضر موت چلے جاؤ۔''

اس کے ساتھ ہی امیر المومنین، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے شرجیلؓ بن حسنہ کو تحریر فرمایا۔

''تم بلا تاخیر خالدؓ بن ولید کے صوبوں کی طرف چلے جاؤ۔ پھر جب مسیلمہ کذاب سے لڑائی میں فتح حاصل کر لو تو ''قضاعہ'' کا رخ کرو اور عمر بن العاصؓ کے ساتھ اس علاقے کے مرتدین سے جہاد کرو۔''

اسی اثناء میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ پہنچ کر امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام واقعات زبانی سنا ڈالے۔

''خالد! اب میری ایک ہی خواہش ہے کہ تمہارے عسکری ہنر اور فنونِ جنگ ایک ہی محاذ پر مرکوز ہو جائیں۔'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہایت پُر اثر لہجے میں فرمایا۔

''امیر المومنین! میری ایک ایک سانس آپ کے ارشاد کی تابع ہے۔ حکم دیجئے۔'' حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لہجۂ مبارک سے سرفروشی اور جاں نثاری کی ایک عجیب شان ظاہر ہو رہی تھی۔

''مسیلمہ کذاب نے میرے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مطہر کو بڑی اذیت پہنچائی ہے۔'' یہ کہتے کہتے حضرت صدیق اکبرؓ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ''میں اپنی زندگی میں اس جھوٹے مدعیٔ نبوت کو خاک و خون میں ملتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم اپنے تمام حربی کمالات کے ساتھ یمامہ پر یلغار کرو اور مجھے میری باقی ماندہ زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری سناؤ کہ وہ کذاب اپنی ساری شعبدہ بازیوں اور سحر کاریوں سمیت پیوندِ زمین ہو گیا۔''

❀---❀---❀

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لشکرِ اسلام برق و باد کی طرح یمامہ کی طرف بڑھا۔ مہاجرین کے فوجی دستے پر حضرت ابوحذیفہؓ اور حضرت زیدؓ بن خطاب کو امیر مقرر کیا گیا تھا۔ (حضرت زیدؓ بن خطاب، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی تھے) حضرت ثابت بن قیسؓ اور حضرت براء بن عازبؓ کو انصار کے فوجی دستے کا نگراں بنایا گیا تھا۔

پہلی فتح کے بعد مسیلمہ کذاب کے پیروکاروں کا حوصلہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اب اس لشکرِ باطل کی تعداد چالیس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔

حضرت عکرمہؓ کی طرح شرجیلؓ بن حسنہ نے بھی جلد بازی سے کام لیا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پہنچنے سے پہلے ہی یمامہ پر حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں شرجیلؓ کو بھی میدانِ کارزار سے ناکام و نامراد لوٹنا پڑا۔ مسلمانوں کی دوسری شکست کے بعد مسیلمہ کذاب اور اس کے سپاہی خود کو ناقابل تسخیر سمجھنے لگے تھے۔

جب شکست خوردہ شرجیلؓ بن حسنہ واپس لوٹ رہے تھے تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا لشکر آ

پہنچا۔ شرجیلؓ کی حالت دیکھ کر سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے انہیں سخت ملامت کی۔
''صرف تمہاری عجلت کی وجہ سے لشکرِ اسلام کو ہزیمت کی ذلت گوارا کرنا پڑی۔ اب دشمنانِ رسالت کی ہمت اور بڑھ جائے گی۔''

اور یہ واقعہ تھا کہ شرجیلؓ بن حسنہ کی شکست کے بعد مسیلمہ کذاب کے حامیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں ایک عورت سجاح بنت حارث نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ مسیلمہ کذاب کی مقبولیت اور فتوحات کو دیکھ کر سجاح بنت حارث کی فوج بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ مسیلمہ کذاب اور سجاح بنت حارث کے گٹھ جوڑ کے بعد دشمنانِ اسلام کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

اس کے برعکس حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا لشکر صرف تیرہ ہزار غازیوں پر مشتمل تھا۔ اگر عددی قوت کو سامنے رکھا جائے تو مسیلمہ کذاب کا لشکر، اسلامی فوج کے مقابلے میں چار گنا زیادہ تھا۔ اسی عددی برتری نے مسیلمہ کے پیروکاروں کو سرمست و بے خود بنا دیا تھا۔ پھر جب اس جھوٹے نبی کو یہ خبر ملی کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یمامہ کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں تو وہ سنبھل گیا۔ مسیلمہ کو حضرت سیف اللہ کی جنگی فتوحات کا بخوبی اندازہ تھا۔ اس لیے وہ خود بھی زرّہ بکتر سے لیس ہو کر میدانِ جنگ کی طرف بڑھا۔ مسیلمہ نے اپنے مشیروں کو جمع کر کے ایک مختصر تقریر کی۔

''اگر اس معرکہ آرائی میں خالدؓ بن ولید کو شکست ہو گئی تو پھر قیامت تک ہمیں کسی فوجی یلغار سے کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ اے میری نبوت کے حامیو! یہ تمہاری جاں نثاری کی آخری آزمائش ہے۔ اس کے بعد کوئی امتحان نہیں ہو گا۔ یہ قیادت و سیادت کا مسئلہ بھی ہے اور موت کا حیات کا بھی..... اس طرح لڑو کہ تمہیں قریش پر مکمل غلبہ و برتری حاصل ہو جائے۔''

دونوں لشکر صف آراء ہوئے۔ جنگ چھڑنے سے پہلے مسیلمہ کذاب کا بیٹا شرجیل جنگی علم اٹھائے ہوئے آگے بڑھا اور اپنے سپاہیوں کو مخاطب کر کے رجز خوانی کرنے لگا۔

''اے بنو حنیفہ! آج تم اپنی قومی شرم و غیرت کو بچانے کے لیے جنگ کرو۔ اگر تم نے میدانِ کارزار میں پیٹھ دکھائی تو ساری عورتیں اور لڑکیاں مسلمانوں کی لونڈیاں بن جائیں گی۔ اس لیے تم پر فرض ہے کہ اپنے ننگ و ناموس پر اپنی جانیں قربان کر دو۔''

دوسری طرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اتمام حجت کے لیے مسیلمہ کذاب کے لشکر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اے قبیلۂ بنو حنیفہ کے لوگو! تم ایک فریب میں پڑ گئے ہو۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، اللہ کے آخری رسول ہیں۔ آپؐ کے بعد نہ کوئی دوسرا نبی ہے اور نہ شریکِ نبوت۔ تم ہمارے بچھڑے ہوئے بھائی ہو، اس لیے میں تمہیں ہدایت اور خیر کی طرف بلاتا ہوں۔''

مسیلمہ کذاب اور اس کے مقلدین کے دلوں پر مہریں لگا دی گئی تھیں، اس لیے حضرت خالدؓ بن ولید

کی پُر اثر تقریر بھی رائیگاں گئی۔

❁---❁---❁

پھر مبارز طلبی کی رسم ادا ہوئی۔ مسیلمہ کذاب کی طرف سے اس کا امیرِ لشکر نہار آگے بڑھا۔ مسلمانوں کی جانب سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ نمودار ہوئے۔ دونوں امیرانِ لشکر میں شدید انفرادی جنگ ہوئی۔ یہاں تک کہ حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شمشیرِ خارا شگاف نے مسیلمہ کذاب کے خلیفہ نہار کا سر قلم کر دیا۔ نہار کے خون آلود جسم کو تڑپتا دیکھ کر مسیلمہ کذاب کے سپاہی مشتعل ہو گئے اور جنگ مغلوبہ چھڑ گئی۔

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اہلِ ایمان! میں نے بحکمِ خدا، نہار کی زندگی کا چراغ گُل کر دیا۔ اب میں اس وقت تک کلام نہیں کروں گا، جب تک دشمنانِ رسالت کا صفایا نہ کر دوں یا پھر خود ہی جامِ شہادت پی کر بارگاہِ رب ذوالجلال میں حاضر نہ ہو جاؤں۔''

اس کے بعد حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ اس قدر شجاعت سے لڑے کہ دشمن کی صفیں اُلٹ دیں، یہاں تک کہ جانِ بے قرار کو قرار آ گیا اور حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنے خون میں نہا کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ایک مردِ مومن نے اپنی جان کے ساتھ اپنا عہد پورا کر دیا۔

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سن کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مضطرب ہو گئے اور آپؓ نے پوری طاقت کے ساتھ مسیلمہ کذاب کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ دشمنانِ رسالت کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مسیلمہ کذاب اپنے چند ہزار محافظوں کے ساتھ ایک باغ میں داخل ہو گیا جس کی دیواریں بلند اور دروازہ نہایت مضبوط تھا۔

❁---❁---❁

مسیلمہ کذاب کے محصور ہو جانے کے بعد حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ نے حضرت سیف اللہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے درخواست کی۔

''خدا کے لیے مجھے اس باغ میں ڈال دو۔''

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''براء! ہم اپنے ہاتھوں سے تمہیں دشمن کے نرغے میں کس طرح بھیج دیں؟''

حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ بار بار یہی عرض کرتے رہے۔ ''اے میرے امیر! اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

آخر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے حکم پر حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ کو باغ کی دیوار پر چڑھا دیا گیا۔ پھر آپؓ تن تنہا باغ میں کُودے اور بڑی جانبازی سے لڑتے ہوئے دروازے تک پہنچے اور لشکرِ اسلام کے داخلے کے لیے دروازہ کھول دیا۔

یہ باغ "اباض" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں بڑی خونریز لڑائی ہوئی۔ مسلمانوں کا بھی بہت زیادہ جانی نقصان ہوا مگر مسیلمہ کذاب کے ہزاروں پیروکار بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیے گئے۔

مسیلمہ کو اپنی شکست چند قدموں کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی، اس لیے اس نے اپنے پورے جسم کو زرّہ بکتر اور فولاد سے ڈھانپ لیا۔ پھر وہ ایک فوجی دستے کے ساتھ بمشکل باغ سے باہر نکلا۔ ابھی مسیلمہ جائے پناہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ اس پر وحشیؓ کی نظر پڑ گئی۔ وحشیؓ وہ شخص ہیں جنھوں نے حالتِ کفر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے محبوب چچا سیّد الشہداء حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو ابوسفیانؓ کی بیوی ھندہ کے کہنے پر شہید کیا تھا اور پھر آپؓ کا شکم مبارک چاک کر کے کلیجہ نکال لیا تھا۔ مشہور روایت ہے کہ ھندہ نے جوشِ انتقام میں حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبا ڈالا تھا۔ پھر وحشیؓ مسلمان ہو گئے مگر آپؓ کی آنکھوں سے اشکِ ندامت بہتے ہی رہتے تھے۔ اکثر اپنی دعاؤں میں ایک ہی جملہ بار بار دہراتے۔

"اے اللہ! میں تیرے انتہائی برگزیدہ بندے امیر حمزہؓ کا قاتل ہوں، یہ احساس مجھے سونے نہیں دیتا۔ میں تیری پناہ مانگتا ہوں، اے میرے معبود! تُو مجھے اس گناہِ عظیم کے کفارے کی توفیق عطا فرما دے۔"

برسوں سے وحشیؓ کی یہی حالت تھی۔ آج جب مسیلمہ کذاب کو باغ سے نکل کر بھاگتے دیکھا تو وحشیؓ نے اپنے گھوڑے کو اس کے تعاقب میں دوڑایا پھر ایک نیزہ پھینک کر مارا جو مسیلمہ کذاب کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ مسیلمہ گھوڑے کی پشت پر لڑکھڑانے لگا۔ اتنے میں وحشیؓ اپنی شمشیرِ بے نیام کے ساتھ قریب پہنچ گئے پھر اُن کی پُر ہیبت آواز فضا میں گونجی۔

"اے مسیلمہ کذاب!..... اے دشمنِ خدا!..... تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں اپنی حالتِ کفر میں بہترین مسلم حضرت امیر حمزہؓ کا قاتل تھا اور آج حالتِ ایمان میں بدترین مخلوق مسیلمہ کا قاتل ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ میرے گناہ کے اس کفارے کو قبول کر لے اور مجھے معاف فرما دے۔"

پھر وحشی کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ دوسرے ہی لمحے مسیلمہ کذاب کا سر کٹ کر زمین پر گر پڑا۔

پھر اہلِ یمامہ نے یہ ہولناک منظر دیکھا۔ مسیلمہ کذاب کا سر وحشی کے نیزے پر بلند تھا۔

"لوگو! اس شخص کو پہچانو۔" یمامہ کی فضاؤں میں وحشیؓ کی پُر جلال آواز گونج رہی تھی۔ "یہ تمہارا سردار مسیلمہ کذاب ہے۔ یاد رکھو! جھوٹے نبی کا یہی حشر ہوتا ہے۔"

جنگ کے خاتمے پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، مجاعہ کو لے کر مقتولین کی لاشوں پر پہنچے۔ مجاعہ، مسیلمہ کذاب کا دست راست تھا جو لڑائی کے دوران گرفتار ہو گیا تھا۔ دراصل حضرت سیف اللہ رضی اللہ عنہ کو مسیلمہ کذاب کی تلاش تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ لاشوں کو دیکھ کر مجاعہ سے تصدیق کرتے

جاتے تھے کہ یہ کون ہے؟ آخر ایک وجیہہ چہرے والے شخص کی لاش دیکھ کر آپؓ نے فرمایا۔
''کیا یہی تمہارا سردار مسیلمہ ہے؟''
''یہ خوب صورت شخص تو محکم بن طفیل ہے جسے مسیلمہ کی قربت حاصل تھی۔''
''یہ کون ہے؟'' حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک سر بریدہ لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
مجاعہ نے غور سے لاش کی طرف دیکھا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''لباس اور قد و قامت سے تو یہ ہمارا سردار ہی معلوم ہوتا ہے۔''
''مگر اس کا سر کہاں ہے؟'' حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دوسرا سوال کیا۔
ابھی مجاعہ جواب دینے نہیں پایا تھا کہ وحشیؓ نیزے پر بلند مسیلمہ کا سر لیے ہوئے پہنچے اور اسے اپنے سالار کے قدموں میں رکھ دیا۔
''یہی ہے وہ شخص جس کی آپ کو تلاش تھی۔'' مجاعہ نے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہا۔
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مسیلمہ کے کٹے ہوئے سر کو دیکھا۔ مسیلمہ چپٹی ناک والا ایک بدصورت انسان تھا، جس کی رنگت زرد تھی۔
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کچھ دیر تک یہ عبرت ناک منظر دیکھتے رہے، پھر آپؓ نے مسیلمہ کذاب کے سر پر اپنی شمشیر کی ہلکی سی ضرب لگاتے ہوئے فرمایا۔
''یہی ہے وہ لعنت زدہ شخص جس نے تمہیں گمراہ کر کے تمہاری دنیا اور آخرت برباد کر دی۔''

❀---❀---❀

سیاہ آندھی

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے، جب سلطان غیاث الدین بلبن کا پوتا، معزالدین کیقباد ہندوستان کا حکمراں تھا۔ اس کی عمر بمشکل بیس بائیس سال ہو گی۔ مگر عیش کوشی میں اس نے بڑے بڑے فرمانرواؤں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

سلطان معزالدین کیقباد فطرتاً ایک اوباش نوجوان تھا۔ پھر جب وہ مطلق العنان بادشاہ بن گیا تو اس کی ہوس پرستی کی بھی کوئی انتہا نہ رہی۔ زمانہ ساز وزیروں اور خودغرض مشیروں نے اسے شراب نوشی کے ہلاکت خیز راستے پر لگا دیا..... تاکہ وہ کیقباد کی بدمستی سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ اپنی نوعمری کی وجہ سے سلطان کیقباد مشیروں کی اس خوفناک چال کو سمجھ ہی نہیں سکا۔

الغرض اُس کے مشیروں نے سلطان معزالدین کیقباد کو راہ سے بے راہ کر دیا۔ پھر یہ بے راہ روی اس حد تک بڑھی کہ سلطان معزالدین کیقباد وادیٔ گناہ میں محصور ہو کر رہ گیا۔ اب اس کے گرد صراحی و ساغر تھے اور زنانِ بازاری کا ہجوم..... کثرتِ شراب نوشی اور حُسن پرستی نے دیمک کی طرح کیقباد کی صحت کو چاٹ لیا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس پر فالج کا شدید ترین حملہ ہوا اور وہ بسترِ علالت پر اس طرح دراز ہو گیا کہ خدمت گاروں کے سہارے کے بغیر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ہندوستان کے گوشے گوشے سے ماہر طبیب جمع کیے گئے مگر سب نے بیک زبان کہا۔

''مرض اتنا شدید ہے کہ طویل عرصے تک علاج کرنے کے بعد بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر سلطانِ معظم شراب نوشی کو ترک کر دیں تو ہلکی سی اُمید پیدا ہو سکتی ہے۔''

سلطان معزالدین کیقباد شراب نہیں پیتا تھا بلکہ اس رنگین پانی سے غسل کیا کرتا تھا۔ نتیجتاً یہ تباہ کار سیال اس کے خون میں شامل ہو کر رگ و پے میں اُتر گیا تھا۔ طبیبوں کی سخت ہدایت کے باوجود کیقباد ساغر و صراحی کو منہ لگانے سے باز نہ آ سکا اور اس کی صحت روز بہ روز بگڑنے لگی۔

پھر ایک دن اس کے ایک خدمت گار نے تنہائی میں عرض کیا۔ ''میرے شہنشاہ! کیا آپ روحانی علاج

پر یقین رکھتے ہیں؟''

''روحانی علاج سے تیری کیا مراد ہے؟'' سلطان معزالدین کیقباد نے چونک کر کہا۔

''درویشوں کا طریقۂ علاج۔'' خدمت گار نے عرض کیا۔''یہ بڑے عجیب لوگ ہوتے ہیں، ایک پھونک سے بیماری کو اُڑا دیتے ہیں۔ یہ دنیا دار طبیب ہزاروں جڑی بوٹیاں استعمال کراتے ہیں پھر بھی مریض کو افاقہ نہیں ہوتا..... اور یہ گوشہ نشین فقیر..... اگر مریض کو چھو بھی لیں تو بیماری ہوا ہو جاتی ہے۔

اپنے خادم کی بات سن کر سلطان معزالدین کیقباد کے بے رنگ چہرے پر زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔

''کیا تُو نے کسی ایسے درویش کو دیکھا ہے صمصام......؟''

''آج کل دہلی میں ان کی بہت دھوم ہے۔'' کیقباد کے خادمِ خاص صمصام نے عرض کیا۔''سیدی مولہؒ اُن کا نام ہے۔ میری ایک عزیزہ برسوں سے دق کے مرض میں مبتلا تھیں اور بہت دنوں سے خون تھوکتے تھوکتے قبر کے کنارے جا پہنچی تھیں۔ پھر کسی نے اُنہیں سیدی مولہؒ کا پتہ دیا۔ وہ ڈولی میں پڑ کر اُن بزرگ کی خانقاہ پر پہنچیں۔ سیدی مولہؒ نے اُنہیں اپنا جھوٹا پانی پینے کے لیے دیا۔ وہ ایک گھونٹ پانی اکسیرِ اعظم تھا، حلق سے اُترتے ہی تریاق ثابت ہوا۔ دق ایک لاعلاج مرض ہے مگر سیدی مولہؒ کی دعا سے ناممکن بھی ممکن ہو گیا۔ اب میری وہ عزیزہ صحت مندانہ زندگی گزار رہی ہیں۔''

صمصام کی زبانی یہ انوکھا واقعہ سن کر سلطان معزالدین کیقباد بہت زیادہ پُرجوش ہو گیا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

''کیا مجھ جیسا ناکارہ انسان بھی دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے گا؟'' کیقباد کے لہجے میں بڑی خلش تھی۔

''مجھے تو یقین ہے کہ آپ سیدی مولہؒ کی دعاؤں سے ٹھیک ہو جائیں گے۔'' خادمِ خاص صمصام بہت زیادہ پُریقین نظر آ رہا تھا۔

''تو پھر ان درویش کو ہمارے پاس لے آؤ۔ ہم ان سے اپنی صحت کا سوال کریں گے۔'' سلطان معزالدین کیقباد کا لہجہ ایک ضرورت مند کا لہجہ تھا، اس لیے وہ بہت زیادہ عاجزی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''سیدی مولہؒ کسی امیر یا وزیر کے یہاں نہیں جاتے۔'' صمصام نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تُو خود چلا جا ان کے پاس۔'' کیقباد نے درخواست گزاری کے انداز میں کہا۔''اگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوں تو پھر ہم خود چلے جائیں گے ان کی خانقاہ میں۔''

جب صمصام رخصت ہونے لگا تو کیقباد نے اسے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔''درویش سے کہنا کہ اگر ہم صحت یاب ہو گئے تو انہیں سونے میں تول دیں گے۔''

''سیدی مولہؒ کسی کی نذر قبول نہیں کرتے۔'' صمصام نے ڈرتے ڈرتے کہا

''پھر بھی ان سے کہہ دینا۔'' مفلوج حکمراں اپنی کھوئی ہوئی صحت پانے کے لیے ایک بوریا نشین

درویش کو سونے کے بہت بڑے ذخیرے کی پیشکش کر رہا تھا۔ ''ہم قصرِ شاہی کی طرح ان کی خانقاہ بھی تعمیر کرا دیں گے.....بس یہ کہہ دینا کہ جو کچھ وہ چاہیں گے، وہی ہوگا۔''

❀---❀---❀

سلطان معزالدین کیقباد کا خادمِ خاص صمصام جب سیدی مولہؒ کی خانقاہ کے دروازے پر پہنچا تو وہاں ضرورت مندوں کا ایک بڑا ہجوم تھا۔ لوگ قطار در قطار سر جھکائے کھڑے تھے، صمصام نے قطار سے ہٹ کر دروازے کے اندر داخل ہونا چاہا تو خانقاہ کے منتظم نے اسے سختی سے روکتے ہوئے کہا۔

''تُو نے یہ کجی کیوں اختیار کی؟.....کیا تجھے نظر نہیں آتا کہ یہاں سب لوگ سیدھے کھڑے ہیں۔''

''میں سلطانِ معظم کا خادمِ خاص ہوں.....اور ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔'' صمصام نے احساسِ فخر کے ساتھ کہا۔

''یہ سیدی کا دربار ہے......اور یہاں سب برابر ہیں۔'' خانقاہ کے منتظم نے بے نیازانہ کہا۔

''چپ چاپ کھڑے رہو، جب تمہاری باری آئے گی، تمہیں سیدی کی خدمت میں حاضر کر دیا جائے گا۔''

صمصام خاموشی سے پیچھے ہٹا اور ایک قطار میں شامل ہو گیا۔ آخر مغرب سے ذرا دیر پہلے اُس کا بلاوا آ گیا۔ صمصام دھڑکتے دل کے ساتھ سیدی مولہؒ کے حجرے میں داخل ہوا۔ صمصام نے درویش کی خدمت میں سلام عرض کیا اور دوزانو ہو کر سیدی کے سامنے بیٹھ گیا۔

سیدی مولہؒ نے بڑے دل آویز لہجے میں صمصام کے سلام کا جواب دیا اور بہت آہستہ سے فرمایا۔

''بہت دیر ہو گئی۔''

صمصام درویش کی بات کا مفہوم نہ سمجھ سکا اور عاجزانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔

''شیخ! میں تو صبح سے کھڑا تھا......مگر ضرورت مندوں کی قطاریں اتنی طویل تھیں کہ اب بمشکل اِذنِ باریابی حاصل ہو سکا ہے۔''

سیدی مولہؒ نے ایک اچٹتی سی نظر صمصام کے چہرے پر ڈالی۔ سلطان معزالدین کیقباد کا خادمِ خاص لرز کر رہ گیا۔

''اگر تم ایک سال پہلے بھی آتے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' سیدی مولہؒ نے آہستہ سے فرمایا۔

''دیر ہونا تھی، سو ہو چکی۔''

صمصام اب بھی سیدی مولہؒ کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا۔ ''میں سلطانِ معظم کی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔''

''میرا اشارہ بھی اسی طرف تھا۔'' سیدی مولہؒ نے فرمایا۔ ''لوحِ محفوظ پر جو کچھ لکھ دیا گیا ہے، وہی عالمِ اسباب میں ظاہر ہو کر رہے گا۔ اگر تمام جن و انس مل جائیں، تب بھی اُس کے حکم کو نافذ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

اب صمصام کی سمجھ میں آ گیا کہ سیدی مولہؒ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ وہ بھکاریوں کی طرح گڑگڑانے لگا۔

''آپ کی دعاؤں میں بڑی تاثیر ہے، آسمان کے فیصلے بدلے بھی جا سکتے ہیں۔''

''یہ تمہارا جہل اور گمراہی ہے۔'' یکایک سیدی مولہؒ کے چہرے پر رنگِ جلال اُبھر آیا تھا۔ ''یہ نظامِ قدرت ہے، کوئی بازیچۂ اطفال (بچوں کا کھیل) نہیں۔''

''سلطانِ معظم نے فرمایا ہے کہ وہ آپ کو سونے میں تول دیں گے۔ اور اس خانقاہ کو قصرِ شاہی کی طرح تعمیر کرا دیں گے۔'' صمصام پر بدحواسی کی کیفیت طاری تھی اور اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سیدی مولہؒ کو رشوت پیش کر رہا ہے۔ ''سلطانِ معظم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو آپ چاہیں گے، وہی ہوگا۔''

''تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہوگا کہ اس فقیر کو ان چیزوں کی کوئی حاجت نہیں۔'' سیدی مولہؒ نے نہایت صبر و تحمل کے ساتھ فرمایا۔ ''میرا شکم بہت معمولی غذا پر رضامند ہو گیا ہے.....اور میرے جسم کے لیے یہ ایک چادر کافی ہے۔''

صمصام ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ مغرب کی اذان شروع ہو گئی اور کائنات کی بسیط فضاؤں میں ''اللہ اکبر'' کی صدا گونجنے لگی۔

''اب تم جاؤ۔ ہمارا بلاوا آ گیا ہے۔'' یہ کہہ کر سیدی مولہؒ کھڑے ہو گئے۔ بڑے بے نیازانہ انداز میں کاندھے پر چادر ڈالی اور صمصام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

'نظامِ خانقاہی اور ہے.... نظامِ شاہی کچھ اور.... دونوں کبھی ہم رنگ نہیں ہو سکتے۔'' یہ کہہ کر سیدی مولہؒ دوسرے کمرے میں مغرب کی نماز ادا کرنے کے لیے چلے گئے۔

سلطان کیقباد کا خادمِ خاص کچھ دیر تک مبہوت سا کھڑا رہا، پھر تھکے تھکے قدموں سے باہر آیا اور قصرِ شاہی کی طرف واپس جانے لگا۔ راستے بھر اس کے کانوں میں سیدی مولہؒ کے الفاظ گونجتے رہے۔

''بہت دیر ہو گئی۔''

پھر اسی رات پچھلے پہر جلال الدین کے اشارے پر ترک زادوں کی ایک مسلح جماعت سلطان معزالدین کیقباد کی خلوت میں داخل ہوئی اور ہندوستان کے مفلوج حکمراں کو زد و کوب کرنے لگے۔ یہ وہی ترک زادے تھے جن کے باپوں کو سلطان کیقباد نے بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کرا دیا تھا۔ ہندوستان کا مفلوج حکمراں زندگی کی بھیک مانگتا رہا مگر ترک زادوں کے ہاتھ اس وقت تک نہیں ٹھہرے، جب تک معزالدین کا دم نہیں نکل گیا۔ پھر اس کی لاش کو ایک قالین میں لپیٹ کر دریائے جمنا کے حوالے کر دیا گیا۔

بڑا عبرت ناک منظر تھا۔ اطلس و کم خواب و دیبا و زربفت جیسے قیمتی کپڑوں میں لپٹا ہوا جسم..... دنیا کی نایاب خوشبوؤں اور عطریات میں بسا ہوا بدن، اب مُردہ خور مچھلیوں اور مگرمچھوں کی خوراک تھا۔ کیسی بے چارگی اور بے کسی تھی کہ کروڑوں انسانوں پر حکومت کرنے والے شخص کا نہ جنازہ اُٹھا اور نہ مزار بنا۔ ایک بے نام

سی قبر جو پانی کے اندر بنی ہوئی تھی، اب اس قبر پر کون چراغ جلاتا؟ اور کون فاتحہ پڑھتا؟
جب سلطان معزالدین کیقباد اپنے انجام کو پہنچ گیا تو اس کے خادمِ خاص صمصام کی سماعت میں سیدی مولہؒ کی پُرجلال آواز گونجی۔ ''بہت دیر ہوگئی۔'' اب اُس کی سمجھ میں آیا کہ بہت دیر ہونے سے سیدی کا کیا مفہوم تھا۔

❀---❀---❀

سیدی مولہؒ کے بارے میں کسی معتبر تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ آپ کا خاندانی پسِ منظر کیا تھا اور کس علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض مؤرخین نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ سیدی مولہؒ نے جرجان سے نکل کر مختلف ممالک کی سیر کی تھی اور اپنا بہت سا وقت صوفیاء کی صحبتوں میں گزارا تھا۔ چند سال تک درویشوں سے فیض یاب ہونے کے بعد سیدی مولہؒ دوبارہ جرجان تشریف لے گئے تھے۔
ایک دن آپؒ کی مجلسِ روحانی آراستہ تھی۔ سیدی مولہؒ، مشائخ کرام سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کر رہے تھے کہ ایک شخص نے عرض کیا۔
''سیدی! کیا آپ نے حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ سے بھی ملاقات کی؟''
سیدی مولہؒ نے حضرت بابا فریدؒ کا نام پہلے بھی سنا تھا مگر شرفِ ملاقات حاصل نہ کر سکے تھے۔
''حضرت بابا فریدؒ عجیب شان کے بزرگ ہیں۔'' کہنے والے نے کہا۔ ''ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کو آپ کے دم سے بہت فروغ حاصل ہو رہا ہے۔''
اس واقعے کے بعد سیدی مولہؒ، حضرت بابا فریدؒ سے ملنے کے لیے بے قرار رہنے لگے۔ پھر ایک دن یہی شوقِ دید اُنہیں جرجان سے کھینچ کر اجودھن (پاک پٹن) لے آیا۔ سیدی مولہؒ نہایت عقیدت کے ساتھ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ نے بڑے والہانہ انداز میں انہیں گلے سے لگایا اور اپنے قریب مسند پر بٹھایا۔
سیدی مولہؒ کچھ دن تک اجودھن میں مقیم رہے پھر ایک دن حضرت بابا فریدؒ سے عرض کرنے لگے۔
''شیخ! اگر آپ اجازت دیں تو میں دہلی کو اپنی اقامت گاہ بنالوں؟''
حضرت بابا فریدؒ نے سیدی مولہؒ کی درخواست سنی اور فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔
''شیخ! کیا اس میں کوئی قباحت ہے؟'' سیدی مولہؒ نے دوبارہ عرض کیا۔
حضرت بابا فریدؒ نے اس بار بھی سکوت اختیار فرمایا۔
سیدی مولہؒ مضطرب نظر آنے لگے۔
حضرت بابا فریدؒ نے اپنے مہمان درویش کی بے قراری کو دیکھ کر فرمایا۔ ''فقیر اس کا نام ہے کہ انسان اپنے آپ کو چھپائے۔'' یہ ایک مبہم اشارہ تھا مگر سیدی مولہؒ دہلی جانے کے لیے بضد رہے۔
''شیخ! میں مخلوقِ خدا کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔'' سیدی مولہؒ بہت زیادہ پُرجوش نظر آرہے تھے۔

اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت بابا فریدؒ اس حق میں نہیں تھے کہ سیدی مولہؒ دہلی کا سفر اختیار کریں..... مگر جب اُنہیں غیر معمولی طور پر بے چین پایا تو فرمانے لگے۔

''درویش کے لیے نام و نمود کی خواہش بہت سے فتنوں کا سبب بنتی ہے اس لیے وہی راستہ اختیار کرنا جس میں تمہیں اپنی فلاح کا پہلو نظر آئے۔''

''اللہ نے تمہیں نظر کے ساتھ فکر بھی بخشی ہے لیکن میری ایک نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا۔'' یہ کہہ کر حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔

''فرمائیے!..... فرمائیے!'' سیدی مولہؒ نے پُر شوق لہجے میں عرض کیا۔

''ضرورت مندوں پر اپنی خانقاہ کے دروازے بِلا تکلف کھول دینا مگر کسی حاکم کو داخل نہ ہونے دینا۔'' حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا۔ ''اُمراء سے میل جول نہ رکھنا اور ان کی آمد کو اپنے لیے مہلک سمجھنا۔ جو درویش اربابِ اقتدار سے تعلقات کے دروازے کھولتا ہے، وہ اپنی عاقبت خراب کر لیتا ہے۔''

سیدی مولہؒ نے گوشِ ہوش سے حضرت بابا فریدؒ کی نصیحت سنی اور اجودھن سے دہلی روانہ ہو گئے۔

❀---❀---❀

دہلی پہنچ کر سیدی مولہؒ نے ایک عام سی خانقاہ بنوائی اور خدمتِ خلق میں مصروف ہو گئے۔ سیدی مولہؒ میں قدرتی طور پر کچھ ایسی روحانی کشش تھی کہ کسی تشہیر کے بغیر دہلی کے باشندے آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ شروع میں کچھ ایسے بیمار، سیدی مولہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے جنہیں سارے طبیب اور حکیم لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ بیماروں کے سلسلے میں شیخ کا طریقِ کار مختلف تھا۔

کسی مریض سے پوچھتے کہ بیماری کا مرکز جسم کا کون سا حصہ ہے؟ اگر وہ شخص اشارے سے بتاتا کہ دل کے مرض میں مبتلا ہے تو سیدی مولہؒ اس کے دل پر ہاتھ رکھ دیتے۔ ساری بے چینی ختم ہو جاتی اور دل ٹھہر جاتا۔

کبھی کسی لاعلاج مریض کے چہرے پر دم کر دیتے اور وہ ہنستا مسکراتا خانقاہ سے چلا جاتا، کبھی یوں بھی ہوتا کہ کوئی بیمار دردِ قولنج سے تڑپ رہا ہوتا اور سیدی مولہؒ اُسے مخاطب کر کے فرماتے۔

''درد سے متاثرہ جگہ پر اپنا ہاتھ پھیر...... اللہ تجھے اس تکلیف سے نجات بخشے گا۔''

پھر ایسا ہی ہوتا۔ برسوں پرانا مرض چند ساعتوں میں دُور ہو جاتا۔ اس قسم کے واقعات نے بہت تیزی سے شہرت حاصل کی اور دہلی کے رہنے والے سیدی مولہؒ کو مسیحا کہہ کر پکارنے لگے۔

یہ سلطان معز الدین کیقباد کا زمانہ تھا۔ مفلوج حکمراں، سیدی مولہؒ کی دعاؤں سے فیض یاب نہ ہو سکا اور نہایت دردناک انداز میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

معز الدین کیقباد کے بعد جلال الدین نے نئی چال چلی۔ وہ سلطان کیقباد کے تین سالہ بیٹے کیومرث کو لے کر دربارِ شاہی میں داخل ہوا اور اس معصوم بچے کو تختِ شاہی پر بٹھا کر حاضرین سے مخاطب ہوا۔

''اقتدار، سلطان غیاث الدین بلبن کے گھرانے کا حق ہے اور میرے جیتے جی اس خاندان سے یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔ اگر کسی نے میرے کم سن شہزادے کی طرف بدنیتی کے ساتھ دیکھا تو اس ملک میں اس شخص کے لیے عافیت کا کوئی سائبان نہیں ہوگا۔ میں اپنے آقا کا نمک خوار ہوں.....اور اس وقت تک حقِ نمک ادا کرتا رہوں گا، جب تک میرے کاندھوں پر میرا سر موجود ہے۔''

اس وقت جلال الدین خلجی ستر سال کا تھا......مگر اُس کی آواز جاہ و جلال سے لبریز تھی۔ جس کے اثر سے دربارِ سلطانی کے در و دیوار گونج رہے تھے۔

پھر جلال الدین خلجی نے اپنے ہاتھوں سے کیومرث کو تاجِ زرنگار پہنایا، پھر تین سالہ بچے کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا، کیومرث کے ہاتھوں کو بوسہ دیا..... اور پھر سیدھا ہو کر دوبارہ حاضرینِ دربار سے مخاطب ہوا۔

''یہ ہیں ہم سب کے شہنشاہ، سلطان شمس الدین......''

شمس الدین کا لقب بھی جلال الدین نے تراشا تھا۔ جیسے ہی رسمِ تاجپوشی ختم ہوئی، پورا دربار مبارکبادوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ امراء کی اکثریت جلال الدین کی تعریف و ستائش میں مصروف تھی۔

''اب ایسے وفادارانِ سلطنت کہاں کہ اپنے آقا کی نشانیوں کو سر پر سجائے پھریں۔''

بظاہر وہ کم سن حکمراں مدارالمہام تھا مگر درپردہ جلال الدین خلجی کے احکام جاری تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے بعض امراء نے اس صورتِ حال کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا مگر وہ حلفِ وفاداری اُٹھانے کے لیے مجبور تھے۔ ان امراء کو سلطان کیقباد کے بیٹے سے نفرت نہیں تھی بلکہ وہ جلال الدین کو با اختیار دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی سیاسی کشمکش نے ایک خوفناک صورت اختیار کر لی تھی۔

سلطان غیاث الدین کے وفادار امیروں نے کئی بار جلال الدین کو قتل کرانے کی کوشش کی لیکن وہ بوڑھا شاطر پہلے ہی سے دشمنوں کے اس اقدام کے لیے تیار تھا۔ نتیجتاً مخالف امراء کے ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکے۔ جلال الدین نے اپنے گرد ایسا حفاظتی حصار کھینچ رکھا تھا کہ اسے توڑنا آسان نہیں تھا۔

❀---❀---❀

دو گروہوں میں حصولِ اقتدار کی کشمکش نے شدید بدنظمی کی صورتِ حال پیدا کر رکھی تھی۔ ہر طالع آزما اپنے آپ کو بچانے اور حریف پر غالب آنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اقتدار کے بھوکوں کی نیندیں حرام تھیں.....مگر سیدی مولہؒ نہایت اطمینان سے خدمتِ خلق میں مصروف تھے۔ سلطان معزالدین کیقباد کے دورِ حکومت میں سیدی کی خانقاہ نہایت سادہ تھی......لیکن کیقباد کے قتل کے بعد اچانک سیدی مولہؒ نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا۔

''پرانی خانقاہ کو توڑ کر اس کی جگہ ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کی جائے۔''

خدام نے بڑی حیرت سے اپنے شیخ کی بات سنی۔ پھر نہایت ادب سے عرض کرنے لگے۔

''سیدی! جس خانقاہ کا نقشہ آپ نے پیش کیا ہے، اس کی لاگت کا تخمینہ لاکھوں سے کم نہیں ہوگا۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟ آپ حکم دیں تو امراء کے پاس جا کر تعاون کا سوال کریں کہ یہ ایک کارِخیر ہے۔''

خدمت گاروں کی بات سن کر سیدی مولہؒ برہم ہو گئے۔

''جو امراء ایک فقیر کے آستانے پر دستِ سوال دراز کیے پڑے رہتے ہیں، تم ان کے دروازوں پر بھیک مانگنے جاؤ گے؟''

سیدی مولہؒ کا رنگِ جلال دیکھ کر خدمت گار کانپ اُٹھے۔ کئی برسوں کی صحبت میں ان لوگوں نے پہلی بار شیخ کی یہ کیفیت دیکھی تھی۔

''سیدی! ہم خطا کار لوگ ہیں، ہمارے ذہن اس سے زیادہ نہیں سوچ سکتے۔'' ایک خدمت گار نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

''تم اپنا کام شروع کر دو۔'' سیدی مولہؒ نے فرمایا۔ ''جس ذاتِ پاک نے اس فقیر کو پیدا کیا ہے، وہی اپنے خزانۂ غیب سے خانقاہ کی تعمیر کے لیے اخراجات بھی عطا کرے گا۔''

پھر ایسا ہی ہوا۔ خدمت گار جب بھی تعمیری خرچ کے لیے رقم مانگتے، سیدی مولہؒ اپنے مصلیٰ کے نیچے سے چاندی اور سونے کے سکّے نکال کر خدام کے حوالے کر دیتے۔ تمام سکّے اس قدر چمک دار ہوتے کہ جیسے ابھی ابھی ٹکسال سے ڈھل کر آئے ہوں۔ خدمت گاروں کو شیخ کا یہ طریقِ کار دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی۔ خانقاہ کی تعمیر پر اب تک ہزاروں روپے خرچ ہو چکے تھے اور کسی ایک موقع پر بھی سیدی مولہؒ نے نہیں فرمایا تھا کہ آج ان کے پاس رقم نہیں ہے۔ خدام اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے شیخ نہ کوئی کاروبار کرتے ہیں اور نہ کسی امیر و وزیر کی نذر قبول فرماتے ہیں۔ پھر یہ دولت کہاں سے آتی ہے جس کا سلسلہ کہیں ختم ہی نہیں ہوتا۔ تمام خدمت گار اکثر یہی سوچا کرتے تھے کہ شیخ نے سیم و زر کا یہ انبار کس طرح جمع کیا ہے؟ کبھی کبھی خدام کا اضطراب حد سے بڑھ جاتا۔ وہ سیدی مولہؒ کا مصلیٰ اُٹھا کر دیکھنے لگتے مگر وہاں انہیں کوئی نقرئی یا طلائی سکّہ نظر نہیں آتا۔

آخر چھ ماہ کے عرصے میں ایک عالیشان خانقاہ تیار ہوگئی۔ اور اس کی تعمیر میں سیدی مولہؒ نے کسی بھی شخص سے مالی تعاون طلب نہیں کیا تھا۔ نتیجتاً خدمت گاروں نے یہ بات مشہور کر دی کہ ان کے شیخ کو دستِ غیب حاصل ہے۔ تصوف میں دستِ غیب کی اصطلاح اس درویش کے لیے استعمال ہوتی ہے جو بظاہر کوئی کام نہیں کرتا مگر اُس کی خانقاہ کے کثیر اخراجات کسی کے تعاون کے بغیر پورے ہوتے رہتے ہیں۔ یہی حال سیدی مولہؒ کا تھا۔

کچھ لوگوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ بہت طاقتور مؤکلین سیدی مولہؒ کے تابع تھے جو ان کی ضرورت کے مطابق سونے اور چاندی کے سکّے ڈھالتے رہتے تھے۔ عملیات کے اصولوں کے مطابق ہر

حرف اور ہر آیت کا ایک مؤکل ہوتا ہے جسے قدرت کی طرف سے ایک خاص قوت بخشی جاتی ہے اور اسی طاقت کے ذریعے وہ مؤکل اپنے عامل کے احکام پر عمل کرتا ہے۔ مؤکل غیر مرئی جسم کا مالک ہوتا ہے جو عام انسانوں کو نظر نہیں آتا۔

بعض مؤرخین کے قیاس کے مطابق سیدی مولہؒ علم ''سیمیا'' جانتے تھے۔ سیمیا اس علم کو کہتے ہیں جس میں چیزوں کا حقیقی وجود نہیں ہوتا۔ دیکھنے والا فریبِ نظر یا وہم کا شکار ہو جاتا ہے۔ جدید دور کی اصطلاح میں ہم اسے شعبدہ بازی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر اس بات کو درست مان لیا جائے کہ سیدی مولہؒ علم سیمیا جانتے تھے تو پھر مذکورہ واقعے کی توجیہہ اس طرح ہو گی کہ سیدی مولہؒ خانقاہ کی تعمیر کے سلسلے میں سونے چاندی کے جو سکّے مزدوروں یا معماروں کو دیا کرتے تھے، ان کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ بالفرض ایسا ہوتا تو چھ ماہ تک تعمیر کا یہ کام کس طرح جاری رہتا؟ لوگ صرف ایک بار ہی فریب کھا سکتے تھے، طویل عرصے تک بار بار لوگوں کا دھوکا کھانا ممکن نہیں تھا۔

بعض مؤرخین کے خیال میں سیدی مولہؒ کیمیا (سونا بنانے کا فن) جانتے تھے۔ اس علم کے مطابق معمولی دھاتوں کو سونے اور چاندی میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی جو ظاہر پرست لوگ روحانی طاقتوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں سیدی مولہؒ ایک بڑے کیمیا گر تھے جو حسبِ ضرورت سونا بنا کر عوام کے درمیان اپنی فیاضی اور سخاوت کے مظاہرے کیا کرتے تھے۔

پھر جب سیدی مولہؒ کے خدمت گاروں نے اپنے شیخ کے متعلق دستِ غیب حاصل ہونے کے قصے مشہور کر دیئے تو دہلی کے بہت سے محتاج سیدی مولہؒ کی خانقاہ میں حاضر ہو کر شیخ کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے لگے۔ سیدی مولہؒ ضرورت مندوں کی حاجت پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کیا کرتے تھے.....

مگر اس سلسلے میں شیخ کا طریقِ کار بڑا عجیب ہوتا تھا۔ مانگنے والوں میں بہت کم لوگ ایسے تھے جنہیں سیدی مولہؒ نے براہِ راست مطلوبہ رقم بخشی تھی۔ شیخ عام طور پر سائل سے یہی کہا کرتے تھے۔

''تم اپنے گھر کے فلاں گوشے میں چلے جاؤ۔ اللہ تمہاری ضرورت پوری کر دے گا۔''

وہ شخص بڑی حیرت کے عالم میں اپنے گھر جاتا اور اس مخصوص گوشے کو تلاش کرتا جس کے بارے میں شیخ نے حکم دیا تھا۔ پھر اس شخص کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ گھر کا وہ گوشہ جو کچھ دیر پہلے خالی پڑا تھا، وہاں اتنی رقم موجود ہوتی جو فی الوقت اُس کی کفالت کر سکتی تھی۔

کسی حاجت مند سے شیخ اس طرح فرماتے۔

''تم جنگل میں فلاں درخت کے نیچے چلے جاؤ۔ حق تعالیٰ تمہاری مشکل دُور فرما دے گا۔''

وہ شخص حیران و پریشان جنگل میں جاتا اور مخصوص درخت کے نیچے سے مقررہ رقم حاصل کر لیتا۔

سیدی مولہؒ کسی کو اس طرح حکم دیتے کہ فلاں پتھر کو اُٹھاؤ، بامراد ہو جاؤ گے۔ وہ شخص ایسا ہی کرتا اور اپنی مراد کو پہنچ جاتا۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ سیدی مولہؒ سائل سے فرماتے۔

''فلاں مقام پر خاموشی کے ساتھ چلے جاؤ، وہاں تمہیں ایک شخص نظر آئے گا، اُسے میرا سلام کہنا۔ وہ تمہاری ضرورت پوری کر دے گا۔''

اس طرح سیدی مولہؒ مختلف اوقات میں لوگوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتے۔ مگر ان سارے معاملات میں ایک بات مشترک ہوتی کہ جس شخص کو سونے چاندی کے جس قدر سکّے ملتے تھے، وہ سب کے سب تازہ ڈھلے ہوئے نظر آتے تھے۔ دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سیدی مولہؒ کسی ٹکسال کے مالک ہیں اور ان کے مزدور دن رات سکّہ سازی کے کام میں مصروف ہیں۔

آخر اس داد و دہش اور بخشش و عطا نے اس قدر شہرت حاصل کی کہ پورا شہر دہلی اور گرد و نواح کے علاقے سیدی مولہؒ کی کرامتوں کے شور سے گونجنے لگے۔ اور آپؒ کی خانقاہ کے دروازے پر انسانی ہجوم نظر آنے لگا۔ مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ سمندر اور خشکی کے راستوں سے آنے والے مسافر اور ہزاروں مقامی باشندے خانقاہ کے وسیع و عریض میدان میں جمع رہتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے دو وقت دسترخوان بچھایا جاتا تھا۔ اور دسترخوان پر وہ نعمتیں موجود ہوتیں جو متوسط طبقے کے لوگوں کو میسر نہیں تھیں۔ ایک وقت میں دو ہزار من میدہ، پانچ سو بھیڑوں کا گوشت اور تین سو من شکر استعمال ہوتی تھی۔ خود سیدی مولہؒ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ چاول کی نرم روٹی، گوشت کے شوربے سے کھاتے تھے۔ معمولی کپڑے کا صرف ایک لباس اور چادر پہنتے تھے۔

سیدی مولہؒ سخت ریاضت کرتے تھے۔ پابندی کے ساتھ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھا کرتے تھے مگر نماز باجماعت کے لیے مسجد میں نہیں آیا کرتے تھے۔

❁---❁---❁

مسلسل کرامات کے ظہور نے سیدی مولہؒ کو دہلی کے باشندوں میں بہت زیادہ مقبول بنا دیا تھا۔ دنیا پرست علماء کی ہمیشہ سے یہ روایت رہی ہے کہ جب وہ خود کشف و کرامت کے اظہار سے قاصر رہتے ہیں تو پھر اولیاء کو شعبدہ باز اور جادوگر کہہ کر پکارنے لگتے ہیں۔ اسی روایت کے تحت ایک دن سیدی مولہؒ بھی انہیں تہتوں کی زد میں آ گئے۔ بعض دنیادار اور خوفِ خدا سے بے نیاز علماء نے ایک درویش کے خلاف نہایت خوفناک منصوبہ بنایا۔ ان لوگوں نے دہلی کی ایک خوبصورت بازاری عورت کو خلوت میں بلایا اور اسے بہت بڑی رقم کا لالچ دیتے ہوئے کہا۔

''تُو سیدی مولہؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بیعت کی درخواست کر..... پھر رسم و راہ بڑھا اور موقع ملتے ہی اس شعبدہ باز درویش کو گناہوں کے راستے پر لگا دے۔''

گل بانو نے بڑی حیرت سے ان علماء کی طرف دیکھا جن کے چہرے نورانی تھے اور جن کے سروں پر اُونچی اُونچی ریشمی دستاریں چمک رہی تھیں۔

''بے شک! میں ایک بہت گناہگار عورت ہوں اور مجھے میری مجبوریوں نے انتہائی پستیوں میں گرا دیا ہے۔ لیکن میں کبھی کسی کو ورغلانے کے لیے اس کے گھر نہیں جاتی۔''

''مگر آج تجھے ایسا کرنا ہوگا۔'' دہلی کے ایک امیر نے انتہائی غضب ناک لہجے میں کہا جو علماء کے ساتھ اس سازش میں شریک تھا۔

''آخر آپ حضرات ایسا کیوں چاہتے ہیں؟'' گل بانو نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں کبھی سیدی مولہؒ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئی مگر لوگوں سے ان کے بارے میں یہی سنا ہے کہ وہ محتاجوں اور مسکینوں کے بہت ہمدرد ہیں، ان کی دعاؤں سے ہزاروں بیمار شفایاب اور ہزاروں ضرورت مند فیض یاب ہو چکے ہیں۔ پھر آپ ایک ایسے شفیق و مہربان کو بربادی کے راستے پر کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟''

گل بانو کی اس بات کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا مگر ایک عالم نے نہایت ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ درویش نہیں، ایک جادوگر ہے۔ اس کی شعبدہ بازیوں سے سادہ دل اور کم نظر مسلمان گمراہی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ تیری زندگی تو ویسے ہی دوزخ کا ایندھن بننے والی ہے لیکن اگر تُو نے بندگانِ خدا کو فتنہ و فساد میں پڑنے سے بچا لیا تو اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ وہ اس خدمت کے صلے میں تیرے عمر بھر کے گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔''

گل بانو پر ایک انجانا سا خوف طاری تھا۔ اس نے زمانہ ساز عالم کی دلیل ماننے سے انکار کر دیا۔

''آپ کے نزدیک سیدی مولہؒ ایک جادوگر ہی سہی مگر میں اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتی۔''

گل بانو کا جواب سن کر امیر طغرل مزید غضب ناک ہو گیا۔ ''فحاشی پھیلانے کے جرم میں عدالتِ عالیہ تیرے قتل کا حکم بھی جاری کر سکتی ہے..... اور اگر بالفرضِ محال عدالت نے چھوڑ بھی دیا تو میں تجھ پر اور تیری ماں پر زندگی کے دروازے بند کر سکتا ہوں۔''

آخر موت کے خوف نے گل بانو کو سیدی مولہؒ کی خانقاہ میں جانے پر مجبور کر دیا۔ توبہ شکن حُسن رکھنے والی دہلی کی ایک بدنام عورت سیاہ برقع میں روپوش تھی اور نہایت شائستہ لہجے میں خدمت گاروں سے درخواست کر رہی تھی۔

''مجھے اپنے شیخ کے پاس لے چلو۔ میں اُن کے دستِ مبارک پر بیعت ہونا چاہتی ہوں۔''

''عورت تو کجا، شیخ کسی مرد کو بھی مرید نہیں کرتے۔'' ایک خادم نے گل بانو کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میں زندگی کے تباہ کُن ہنگاموں میں گھِر چکی ہوں۔'' گل بانو نہایت پُر اثر لہجے میں گفتگو کر رہی تھی۔ ''میرے چاروں طرف آگ ہی آگ ہے۔ اگر شیخ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے شعلوں سے باہر نہیں نکالا تو میں ایک دن جل کر راکھ ہو جاؤں گی۔''

''دہلی میں اور بھی کئی بزرگ موجود ہیں۔'' سیدی مولہؒ کے دوسرے خدمت گار نے گل بانو کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''تم ان شیوخ کے سامنے عرضِ حال کر سکتی ہو۔''

گل بانو، سیدی مولہؒ کی خانقاہ سے ناکام و نامراد لوٹ آئی اور امیر طغرل سے سارا واقعہ بیان کر دیا۔

''تم بار بار خانقاہ میں جا کر گریہ و زاری کرتی رہو یہاں تک کہ شیخ کے خدمت گار تمہیں ان کی خدمت میں پیش کرنے پر مجبور ہو جائیں۔'' امیر طغرل نے انتہائی سخت لہجے میں کہا۔

موت کے خوف سے سہمی ہوئی گل بانو روزانہ سیدی مولہؒ کی خانقاہ میں داخل ہوتی اور خدام کے سامنے جھوٹے آنسو بہا کر اپنا حال زار بیان کرتی۔ آخر ایک دن ایک غم زدہ عورت پر ترس کھا کر خدام نے کہا۔

''ہم تمہیں حضرت شیخ کے روبرو پیش کیے دیتے ہیں۔ اب آگے تمہاری قسمت.......''

گل بانو نے سیدی مولہؒ کے حجرۂ خاص میں داخل ہوتے ہی اپنے چہرے پر پڑا ہوا ریشمی نقاب اُلٹ دیا۔ شیخ نے دہلی کی حسین ترین عورت پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور نہایت پُر جلال لہجے میں فرمایا۔

''اپنے چہرے کو پردے میں چھپا لو، اس طرح کسی نامحرم کے سامنے آنا کھلی بے حیائی ہے۔''

سیدی مولہؒ ایک کمزور جسم رکھنے والے درویش تھے مگر ان کی آواز میں ایسی ہیبت تھی کہ گل بانو پر لرزہ طاری ہو گیا اور اس نے گھبرا کر دوبارہ اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیا۔

''اب اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔'' سیدی مولہؒ نے اسی پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ شیخ کی نظریں چٹائی پر مرکوز تھیں۔ اگرچہ سیدی مولہؒ نے عالیشان خانقاہ تعمیر کرائی تھی مگر آپؒ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور کسی مسندِ زرنگار پر جلوہ افروز ہونے کے بجائے ایک معمولی چٹائی پر تشریف فرما ہوتے تھے۔

گل بانو نے حضرت شیخ کے سامنے وہی فرضی قصہ بیان کر دیا کہ وہ دنیا کے ہنگاموں سے تنگ آ چکی ہے اور سیدی مولہؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر فتنوں سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔

سیدی مولہؒ نے گل بانو کی درخواست کا جواب دینے کے بجائے اپنے مصلےٰ کا کونا اُلٹ دیا۔

''ادھر دیکھو۔''

گل بانو نے گھبرا کر شیخ کی طرف دیکھا۔ پھر جب اُس کی نظر مصلےٰ پر گئی تو وہاں اشرفیوں کا ایک دریا بہہ رہا تھا۔

''ان نادان لوگوں نے مجھے رسوا کرنے کے لیے جو کچھ تمہیں دیا ہے، اس سے دس گنا رقم یہاں سے اٹھا لو اور چپ چاپ چلی جاؤ۔'' سیدی مولہؒ نے گل بانو کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اور اُن عاقبت نااندیشوں سے کہہ دینا کہ جب تک اللہ نہ چاہے، انسان اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔''

گل بانو، حضرت شیخ کی قوتِ کشف پر حیران رہ گئی۔ پھر اس پر شدید احساسِ ندامت طاری ہو گیا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔

''شیخ! جب آپ یہ راز جانتے ہیں کہ دہلی کے چند علماء اور با اثر امراء آپ کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں تو پھر آپ پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوگی کہ میں کتنی مجبور عورت ہوں۔''

''میں تمہاری مجبوریوں سے باخبر ہوں۔'' اب سیدی مولہؒ کا لہجہ نہایت مشفقانہ تھا۔

''تو پھر مجھے بیعت کر کے اپنی غلامی کا شرف بخش دیجئے۔'' گل بانو کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں میں کچھ اور تیزی آگئی تھی۔ ''میں گناہوں کی اس عذاب ناک وادی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانا چاہتی ہوں۔''

''یاد رکھو کہ اسلام میں غلامی کا کوئی تصور موجود نہیں۔'' سیدی مولہؒ نے فرمایا۔ ''تم میری بیٹی کی طرح ہو۔ مجھے حق تعالیٰ کے بے پناہ اور بے مثال کرم پر پورا یقین ہے کہ تم ایک روز مصیبت کی دنیا سے بہت دُور چلی جاؤ گی۔''

شیخ نے زندگی بھر شادی نہیں کی اور کسی کنیز کو بھی اپنی خدمت پر مامور نہیں کیا۔ جب کسی نوجوان سے خوش ہوتے تو اسے بیٹا کہہ کر پکارتے۔ آج ایک بازاری عورت کے اندر نیکی کے لیے تڑپ دیکھی تو اسے بھی بیٹی کہہ کر مخاطب کیا۔

سیدی مولہؒ کی اس کرم نوازی پر گل بانو کچھ اور مضطرب نظر آنے لگی۔ ''تو پھر آپ مجھے اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کیوں نہیں فرما لیتے؟''

''وہ تمہاری مجبوری تھی اور یہ میری مجبوری ہے۔'' سیدی مولہؒ نے متبسم لہجے میں فرمایا۔ ''میں کسی کو مرید نہیں کرتا۔''

''تو پھر مجھے اور میری بوڑھی ماں کو خانقاہ کے ایک گوشے میں پڑا رہنے دیجئے۔'' گل بانو بچوں کی طرح سسک سسک کر رو رہی تھی۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' سیدی مولہؒ نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''تم میری بیٹی ہو، اِن شاء اللہ جہاں بھی رہو گی، امان میں رہو گی۔''

گل بانو کو اپنی گناہگارانہ زندگی میں پہلی بار عجیب سے سکون کا احساس ہوا تھا۔ پھر وہ سیدی مولہؒ کی دعاؤں کے سائے میں واپس چلی گئی۔

❁---❁---❁

دنیا دار علماء کا منصوبہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور وہ سیدی مولہؒ کی شہرت کو داغ دار بنانے میں ناکام رہے۔ گل بانو نے امیر طغرل کے سامنے معذرت پیش کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

''سیدی مولہؒ کسی کو مرید نہیں کرتے اور نہ وہ کوئی کنیز رکھتے ہیں اس لیے ان کی قربت حاصل نہیں ہو سکتی اور انہیں گمراہی کا راستہ نہیں دکھایا جا سکتا۔''

گل بانو کا جواب سن کر امیر طغرل گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کا عیار ذہن نئے منصوبے کے خدوخال تراش رہا تھا۔ پھر کچھ دیر غور و فکر کرنے کے بعد امیر طغرل، گل بانو سے مخاطب ہوا۔

''یہ تو ممکن ہے کہ سیدی مولہٗ پر کوئی سنگین تہمت لگائی جا سکے؟''

گل بانو نے گھبرا کر طغرل کی طرف دیکھا۔ ''امیر! یہ کس طرح ممکن ہے؟''

امیر طغرل کے چہرے پر اس کی غلاظتِ نفس پوری طرح روشن تھی۔ وہ بڑے سفاکانہ انداز میں مسکرایا۔ ''تیرا بے پناہ حُسن ہر تہمت کو ممکن بنا سکتا ہے..... تُو دربارِ سلطانی میں پیش ہو کر صاف صاف کہہ دے کہ سیدی مولہٗ ایک بے راہ رو انسان ہیں اور انہوں نے تنہائی میں تجھ پر دراز دستی کی تھی۔''

''معاذ اللہ!'' گل بانو وحشت زدہ ہو گئی۔ ''امیر! اب یہ ممکن نہیں رہا۔''

''جب تک میرے دستِ جبر میں طاقت ہے، اس وقت تک تیری زبان پر بھی مجھے پورا اختیار حاصل ہے۔'' امیر طغرل کے لہجے سے درندگی جھلک رہی تھی۔ ''جو الفاظ مجھے پسند ہیں، انہیں تیری زبان دہرائے گی۔''

''شیخ کی دعاؤں نے مجھے اتنا حوصلہ بخش دیا ہے کہ اب میں موت سے بھی نہیں ڈرتی۔'' یہ کہتے ہوئے گل بانو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''زبان تو کیا، اگر میرے پورے جسم کو بھی ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا جائے، تب بھی میں شیخ پر الزام نہیں تراشوں گی۔''

امیر طغرل، گل بانو کی جرأتِ گفتار پر حیران رہ گیا۔ پھر چند لمحوں بعد وہ غضب ناک ہو کر بولا۔

''ذلیل عورت! تجھے معلوم ہے کہ تُو کس کے سامنے کیا بات کہہ رہی ہے؟''

''میں اس امیر کے سامنے یہ بات کہہ رہی ہوں جسے اپنی طاقت پر بڑا ناز ہے۔'' گل بانو نے طغرل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''میری یہ ناپاک زبان تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ میں سیدی مولہٗ کی تعریف و ستائش کر سکوں۔ وہ ہم گناہگاروں کے درمیان میں ایک فرشتہ ہیں، ان کا لباس بے داغ اور شفاف ہے۔ اسے دنیا کی کوئی سازش میلا نہیں کر سکتی۔'' یہ کہہ کر گل بانو بے باکانہ انداز میں چلی گئی۔

پھر امیر طغرل کے دستِ جبر نے اپنی بھرپور طاقت کا مظاہرہ کیا۔ وہ آنکھوں میں قہر و نفرت کا طوفان لیے گل بانو کے گھر پہنچا۔

''میں تجھے چند لمحوں کی مہلت دیتا ہوں..... بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔'' امیر طغرل کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

''میں اپنی جان سے گزر جانے کا عہد کر چکی ہوں۔'' گل بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''امیر! اب آپ کے اختیار میں کچھ نہیں رہا۔''

ابھی گل بانو کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ امیر طغرل کا طاقتور بازو فضا میں لہرایا اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک سیم تن عورت کے گلابی رخسار پر نیلا نشان چھوڑتا ہوا گزر گیا۔

گل بانو لڑکھڑائی اور فوراً ہی سنبھل گئی۔ ایک طوائف کی استقامت دیکھ کر امیر طغرل کی وحشی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس کا دوسرا وار اتنا کاری تھا کہ گل بانو اوندھے منہ پختہ فرش پر گر پڑی اور اس کے دلنشین

چہرے سے خون جاری ہو گیا۔

بیٹی پر یہ جبر و تشدد دیکھ کر بوڑھی ماں رو پڑی۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر امیر طغرل کے پاؤں پکڑ لیے۔

''امیر! میری بچی نادان ہے، اس کی خطاؤں کو معاف کرو۔''

امیر طغرل نے غمزدہ ماں کی گریہ و زاری اور فریاد و فغاں کا جواب دینے کے بجائے اس کے منہ پر ایک زوردار ٹھوکر ماری اور وہ بوڑھی عورت دُور جا گری۔

امیر طغرل نے کئی بار گل بانو پر مشقِ ستم ڈھائی۔ یہاں تک کہ وہ مجبور عورت تشدد برداشت کرتے کرتے بے ہوش ہو جاتی۔ اس دوران گل بانو کی زبان پر ایک ہی فریاد ہوتی۔

''میرے عظیم باپ! دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی بیٹی کو کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟''

گل بانو کا پورا جسم زخموں سے بھر گیا تھا۔ جب بوڑھی ماں سے بیٹی کی یہ تکلیفیں برداشت نہ ہو سکیں تو اس نے ایک دن رات کے اندھیرے میں فرار ہونے کی کوشش کی۔ مگر جیسے ہی وہ بدنصیب عورت مکان کے دروازے پر پہنچی تو یہ راز کھلا کہ فرار کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ امیر طغرل نے دو مسلح سپاہی متعین کر دیئے تھے جو گل بانو کے گھر کے دروازے پر دن رات پہرہ دیتے رہتے تھے۔

جب اس جابر و سفاک امیر کے مظالم سے محفوظ رہنے کے لیے یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہو سکی تو ایک دن ماں نے گل بانو کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹی! آخر تُو کب تک یہ ستم برداشت کرے گی؟''

''جب تک میں اس دنیا سے چلی نہیں جاتی۔'' گل بانو نے سر سے پاؤں تک زخمی ہونے کے باوجود بڑی استقامت کا مظاہرہ کیا۔

''کیسے اچھے دن تھے۔'' بوڑھی ماں نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔ ''کیسی پُرسکون گزر رہی تھی زندگی۔ اچانک یہ عذاب کہاں سے ٹوٹ پڑا؟''

''وہ پُرسکون زندگی نہیں، موت تھی۔'' گل بانو نے ماں کو جھڑک دیا۔ ''یہ عذاب نہیں، رحمت ہے۔ شیخ کی دعاؤں کے طفیل قدرت نے ہمیں سنبھلنے کا ایک موقع دیا ہے...... اگر اب بھی ہماری آنکھ نہیں کھلی تو پھر اگلی منزل کبھی نہ بجھنے والی آگ کا ایک دریا ہے۔''

گل بانو کے شدتِ جذبات دیکھ کر بوڑھی ماں لاجواب ہو گئی۔

''بیٹی! مجھ سے تیری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ میں تو تیرے بھلے کی خاطر کہہ رہی ہوں۔''

''آپ میری فکر چھوڑ دیں..... اپنے حال پر نظر رکھیں۔'' گل بانو کا لہجہ تلخ تر ہو گیا۔ ''جلدی کریں... توبہ کا دروازہ بند ہونے ہی والا ہے۔''

آخر ماں خاموش ہو گئی اور اس نے اپنے سفینۂ حیات کو لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

پھر ایک دن عجیب واقعہ پیش آیا۔ امیر طغرل اپنی بات منوانے کے لیے گل بانو پر تشدد کر رہا تھا کہ

اچانک خون کی گردش رُک گئی اور اُس کے دونوں ہاتھ مفلوج ہو گئے۔

اپنے دونوں بازوؤں کی طاقت سلب ہو جانے پر امیر طغرل پہلے تو یہ سمجھا کہ اس کے بازو سُن ہو گئے ہیں۔ مگر جب وہ پوری قوتِ ارادی صرف کر کے بھی اپنے ہاتھوں کو حرکت نہ دے سکا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟..... میرے ہاتھ گردش کیوں نہیں کرتے؟''

نیم جاں گل بانو نے امیر کی چیخیں سنیں اور اس کے زخمی ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ اُبھر آئی۔

امیر طغرل کچھ دیر تک ہذیانی انداز میں چیختا رہا۔ ''یہ کیسا درد ہے؟..... اور میرے ہاتھ پتھر کیوں ہو گئے ہیں؟'' پھر وہ اسی حالتِ کرب میں چیختا ہوا چلا گیا۔

امیر طغرل کے جاتے ہی بوڑھی ماں بیٹی سے لپٹ کر رونے لگی۔

''تم نے دیکھا ماں! کہ ظلم کے طاقتور بازو کس طرح مفلوج ہو گئے؟'' گل بانو بھی رو رہی تھی مگر اشک ریزی کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر ایک ناقابلِ بیان مسرت کا گہرا رنگ بھی نمایاں تھا۔ ''امیر طغرل کا حساب شروع ہو چکا ہے۔ اللہ اپنے پکارنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ شیخ نے یہی فرمایا تھا کہ میں جہاں بھی رہوں گی، امان میں رہوں گی۔''

''اللہ میرے گناہوں کو بھی معاف کر دے۔'' سیدی مولہؒ کی یہ کرامت دیکھ کر گل بانو کی ماں لرز اُٹھی تھی۔ ''مجھے بھی شیخ سے بہت بدگمانیاں تھیں۔ پتہ نہیں، میرا کیا حشر ہو گا۔'' یہ کہتے کہتے گل بانو کی ماں دوبارہ رونے لگی۔

''ماں! تم نہیں جانتیں۔'' گل بانو اُس عورت کو تسلیاں دے رہی تھی جو رشتے میں اس کی ماں تھی اور جسے عمر کے آخری حصے میں اپنے گناہوں پر ندامت کا احساس ہوا تھا۔

''شیخ کے دل میں آسمان جیسی وسعت ہے۔ وہ اپنے بدترین دشمن کو بھی ہنستے ہوئے معاف کر دیتے ہیں۔ تم بھی ان سے غائبانہ معافی مانگ لو۔ وہ تمہیں بھی معاف کر دیں گے۔''

پھر گل بانو نے دیکھا کہ اس کی بوڑھی ماں ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ پچاس سال تک گناہوں کی وادی میں ہنگامہ خیز زندگی گزارنے والی عورت کو آخری وقت میں خدا یاد آ رہا تھا۔ اور اولیاء کی یہی پہچان ہے کہ انہیں دیکھ کر اللہ یاد آ جاتا ہے۔ اگرچہ گل بانو کی ماں نے سیدی مولہؒ کو نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اُن کے روحانی جلال و جبروت سے لرزاں تھی۔

❁---❁---❁

امیر طغرل کے مکان پر دہلی کے کئی نامور طبیب جمع تھے اور اب تک کئی سفوف اور عرقیات استعمال کرا چکے تھے..... لیکن ابھی تک امیر طغرل کے درد میں ذرّہ بھر بھی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ یہ فالجی درد تھا جس کی تکلیف اس جابر و سفاک امیر کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

''اس درد کو روک دو یا میرے دونوں ہاتھ کاٹ کر پھینک دو۔'' تکلیف کی شدت سے امیر طغرل مسلسل چیخ رہا تھا۔

دہلی کے طبیبوں نے اپنی زندگی میں فالج کے بڑے بڑے خوفناک مریض دیکھے تھے مگر درد کی یہ شدت کسی بیمار میں نہیں تھی۔ آخر وہ مجبور ہو گئے اور انہوں نے امیر طغرل کو بے ہوشی کی تیز دوا دے کر سلا دیا تا کہ اہلِ خانہ کو اس کی چیخوں سے نجات مل سکے۔

پھر جب تمام حکیم صبح ہوتے ہی امیر طغرل کو دوبارہ دیکھنے کے لیے آئے تو بے ہوشی کی دوا کا اثر زائل ہو چکا تھا اور وہ گزشتہ رات کی طرح اسی دل ہلا دینے والے انداز میں چیخ رہا تھا۔

''تم اپنے دوا خانے بند کر دو۔ تمہارے خزانۂ حکمت میں میرے لیے کوئی دوا نہیں ہے۔ تم سب جھوٹے اور جاہل ہو۔''

طبیبوں نے امیر طغرل کے مفلوج ہاتھوں کی طرف دیکھا تو حیرت کی شدت سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایک رات کے مختصر سے وقت میں دونوں بازو اس طرح سوکھ گئے تھے جیسے امیر طغرل برسوں سے اس موذی بیماری میں مبتلا ہو۔

''امیرِ محترم! ہم آپ کے علاج سے قاصر ہیں۔'' تمام طبیبوں کی آنکھوں سے ایک عجیب سا خوف جھلک رہا تھا۔

''کیوں؟'' امیر طغرل غضب ناک ہو کر پوری شدت سے چیخا۔ ''کیا میرا مرض ساری دنیا سے انوکھا ہے؟''

''امیرِ محترم! یہ بیماری نہیں، کچھ اور ہے۔'' تمام طبیبوں نے بیک زبان اور دست بستہ عرض کیا۔

''پھر یہ کیا ہے؟'' امیر طغرل دوبارہ اسی انداز میں چیخا۔

''ہمارے محدود اور نارسا ذہن اس راز کو سمجھنے سے عاجز ہیں۔'' دہلی کے ماہر طبیبوں نے امیر طغرل کے قہر سے بچنے کے لیے گداگروں جیسا لہجہ اختیار کیا۔ ''ہم نے آج تک ایک رات میں انسانی گوشت کو اس طرح پگھلتے نہیں دیکھا۔ آپ خود ہی ملاحظہ فرما لیجیے کہ بازوؤں کی ہڈیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔ یہ تو کسی اور ہی بات کی علامت ہے۔''

دراصل طبیب کہنا چاہتے تھے کہ یہ بیماری نہیں، عذابِ الٰہی ہے..... مگر موت کے خوف سے وہ امیر طغرل کے سامنے اپنے دل کی بات نہ کہہ سکے۔

ابھی کمرے میں طبیبوں کے الفاظ باقی تھے کہ امیر طغرل کسی ذبح کیے جانے والے جانور کی طرح دھاڑا۔ ''نمک حرامو! دُور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ ساری زندگی میری بھیک کے ٹکڑوں پر پلتے رہے اور اب کہہ رہے ہو کہ میرا مرض لاعلاج ہے۔'' اس سے پہلے کہ حاذق طبیبوں پر ایک ظالم امیر کا غضب ٹوٹتا، تمام حکیم اپنے سروں کو جھکائے ہوئے واپس چلے گئے۔

امیر طغرل بدستور چیخ رہا تھا۔ بیوی بچے اور خدمت گار، سب کے سب پریشان تھے۔
"فالج کا حملہ کب ہوا؟ اور آپ اس وقت کیا کر رہے تھے؟" امیر طغرل کی بیوی نے شوہر سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اس کے کانوں میں ابھی تک طبیبوں کے الفاظ گونج رہے تھے کہ یہ بیماری نہیں، کچھ اور ہے۔

بیوی کے سوال پر امیر طغرل کے ذہن میں ایک آندھی سی چلنے لگی۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنے خدمت گاروں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا سیدی مولہؒ کی خانقاہ کی طرف جا رہا تھا۔
پھر خانقاہ میں موجود ہزاروں انسانوں نے اپنی آنکھوں سے یہ عجیب منظر دیکھا کہ طغرل جیسا جابر و سفاک امیر، سیدی مولہؒ کے قدموں پر سر رکھے رو رہا تھا۔
"شیخ! میں نے آپ سے بڑی بدگمانی کی۔ آپ کی دستارِ فضیلت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے بڑا شرمناک منصوبہ بنایا مگر خداوند ذوالجلال نے میری ساری تدبیریں میرے ہی منہ پر اُلٹ دیں۔ آپ کے لیے کھودے ہوئے گڑھے میں یہ گناہ گار خود ہی گر گیا۔ اگر آپ نے مجھے معاف نہیں کیا تو میں اہلِ دنیا کے سامنے ایک عبرت ناک تماشا بن کر رہ جاؤں گا۔"
حاضرینِ خانقاہ پیش آنے والے واقعے کی حقیقت سے بے خبر تھے مگر امیر طغرل کے آنسوؤں اور فریاد و فغاں کو دیکھ کر انہیں اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ اس نے حضرت شیخ کو کوئی بڑا نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنے مذموم ارادوں میں ناکام رہا تھا۔
"تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔" سیدی مولہؒ نے نہایت صبر و تحمل کے ساتھ فرمایا۔ "تم جس کے گناہگار ہو، اسی سے معافی طلب کرو۔"
"شیخ! جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گے، اس وقت تک میں اس در سے اُٹھ کر نہیں جاؤں گا۔" امیر طغرل بھکاریوں کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔
"تیرے ظلم کا نشانہ کوئی اور بنا، معاف میں کروں؟ ہرگز نہیں۔" یکایک سیدی مولہؒ کے چہرۂ مبارک پر رنگِ جلال اُبھر آیا۔ "عمر بھر پڑا رہ مگر کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ تُو نے جس کے بدن پر زخموں کی فصل بوئی ہے، وہ میری بیٹی ہے۔ جب تک گل بانو تڑپتی رہے گی، میرا دل بھی روتا رہے گا۔ اس سے پہلے کہ تیرے جسم کا باقی گوشت بھی گل سڑ کر گر جائے، میری بیٹی کو منا لے۔ بس جا! اس فقیر کا وقت مت برباد کر۔"
یہ کہہ کر سیدی مولہؒ خانقاہ سے اٹھے اور اپنے حجرۂ خاص میں تشریف لے گئے۔

❀---❀---❀

اب امیر طغرل کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس عورت کے دروازے پر جا کر دستِ سوال دراز کرے، جسے وہ دنیا کی ذلیل ترین عورت کہہ کر پکارتا تھا۔ آخر موت کا خوف امیر طغرل کو گل بانو کے در پہ لے گیا۔ وہ نہایت عاجزانہ لہجے میں اس عورت سے معافی مانگ رہا تھا جو کئی ماہ تک اس کے

وجبرِ مسلسل کا نشانہ بنی رہی تھی۔
گل بانو نے سختی سے انکار کر دیا۔ ''امیر! یہ معافی اس وقت مانگی جا رہی ہے، جب آپ میں ظلم کرنے کی طاقت باقی نہیں رہی۔ میں نے یہ سارے مظالم سیدی مولہؒ کے لیے برداشت کیے ہیں۔ اگر وہ آپ کو معاف کر دیں تو میں اپنی ساری اذیتوں کو فراموش کر دوں گی۔''
''میں شیخ کے آستانے پر حاضر ہوا تھا اور انہی کے کہنے پر تمہارے پاس آیا ہوں۔ شیخ یہی چاہتے ہیں کہ تم مجھے معاف کر دو۔''
سیدی مولہؒ کا نام سن کر گل بانو کے چہرے پر ایک عجیب سی خوشی کا رنگ اُبھر آیا۔ ''کوئی فرماں بردار شخص سیدی کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ امیر! میں نے آپ کو معاف کیا۔''
امیر طغرل خوشی خوشی دوبارہ سیدی مولہؒ کے سامنے حاضر ہوا اور تمام واقعہ سنانے کے بعد عرض کرنے لگا۔ ''شیخ! گل بانو نے مجھے معاف کر دیا۔ خدا کے لیے اب آپ بھی مجھ پر کرم فرمایئے۔'' یہ کہتے کہتے امیر طغرل رو پڑا۔
حاضرینِ مجلس یہ جاننے سے قاصر تھے کہ امیر طغرل، شیخ سے اپنے کس گناہ کی معافی مانگ رہا ہے۔
سیدی مولہؒ زیرِ لب کچھ پڑھتے رہے۔ پھر آپؒ نے تین بار امیر طغرل کے سوکھے ہوئے بازوؤں پر اپنا دستِ مبارک پھیرا اور نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔
''اللہ ہمارے دلوں کے نفاق کو دُور کر دے اور ہمیں ایک دوسرے کی لغزشوں کو معاف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔''
جیسے ہی سیدی مولہؒ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، امیر طغرل کو اپنے بے جان ہاتھوں میں خون کی گردش محسوس ہونے لگی۔ شیخ کی یہ کرامت دیکھ کر امیر طغرل بے قرار ہو گیا اور اس نے سیدی مولہؒ کے ہاتھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور زار و قطار رونے لگا۔
پھر دوسرے دن امیر طغرل سو کر اٹھا تو اس کے دونوں ہاتھ حسبِ معمول کام کر رہے تھے اور بازوؤں سے غائب ہو جانے والا گوشت حیرت انگیز طور پر اسی حالت میں دوبارہ لوٹ آیا تھا۔
اپنی گم شدہ صحت پانے کی خوشی میں امیر طغرل سونے اور چاندی کے سکوں سے بھرے ہوئے کئی خوان لے کر سیدی مولہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ قیمتی نذر پیش کی۔
سیم و زر سے بھرے ہوئے طشت دیکھ کر سیدی مولہؒ مسکرائے۔ ''امیر! یہ زحمت کیوں کرتے ہو؟ اللہ نے اپنی صمدیت کے صدقے میں اس فقیر کو بھی مال و دولت سے بے نیاز کر دیا ہے۔ میرے خیال میں تم خود ہی زیادہ ضرورت مند ہو۔ اس لیے یہ نذر واپس لے جاؤ اور دوبارہ اپنے خزانے میں جمع کر دو۔''
امیر طغرل بہت دیر تک التجا کرتا رہا۔ آخر سیدی مولہؒ نے تنگ آ کر فرمایا۔
''اس فقیر کی خانقاہ میں ہزاروں ضرورت مند افراد موجود ہیں۔ اگر وہ تمہاری اس نذر کو قبول کر لیں تو

ان کی خدمت میں پیش کر دو۔''

پھر ہزاروں انسانوں نے بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھا کہ ایک ظالم و مغرور حاکم نہایت عجز و انکسار کے ساتھ حاجت مندوں میں طلائی اور نقرئی سکّے تقسیم کر رہا تھا۔

پھر کچھ دن بعد سیدی مولہؒ کی اس کرامت کے شور سے پورا دہلی گونج اُٹھا۔

گل بانو اور اس کی ماں گناہوں سے تائب ہو کر پرہیزگاری کی زندگی گزارنے لگی تھیں۔

امیر طغرل ہر وقت سیدی مولہؒ کی تعریف میں رطب اللسان رہتا تھا۔ نتیجتاً امراء کا ایک بڑا حلقہ بھی سیدی مولہؒ کی روحانی شخصیت سے متاثر ہو کر خانقاہ میں حاضری دینے لگا۔

جلال الدین خلجی کا بڑا بیٹا اختیار الدین خان خاناں، سیدی مولہؒ کا بہت عقیدت مند تھا۔ وہ گھنٹوں شیخ کے سامنے سر جھکائے دست بستہ بیٹھا رہتا تھا۔ سیدی مولہؒ کو خان خاناں کی یہ ادا بہت پسند تھی۔ پھر ایک دن وہ بھی آ گیا، جب امراء اور معززینِ شہر کے سامنے سیدی مولہؒ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''اختیار الدین میرا بیٹا ہے۔ میں اسے دل سے چاہتا ہوں۔ تم بھی اس سے محبت کیا کرو۔''

اختیار الدین خان خاناں کو قدرت نے حسین صورت کے ساتھ حسین سیرت بھی بخشی تھی۔ پھر جب وہ سیدی مولہؒ کی خدمت میں حاضر رہنے لگا تو اس کے کردار میں مزید نکھار پیدا ہو گیا۔ اس نے رقص و سرود کی محفلوں میں جانا ترک کر دیا اور اپنا بیشتر وقت درویشوں اور علماء کی صحبتوں میں گزارنے لگا۔ اختیار الدین خان خاناں اکثر سیدی مولہؒ سے عرض کیا کرتا تھا۔

''شیخ! میری نجات کے لیے دعا فرمائیں۔''

جواب میں سیدی مولہؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''میرے بیٹے! یہ دنیا آفات و مصائب کا گھر ہے۔ انسان کے لیے قدم قدم آزمائش اور نفس نفس امتحان ہے۔ جس نے دل اور زبان قابو میں رکھا، وہ آگ کے دریا کے پار اُتر گیا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمتِ بے کنار پر یقین ہے کہ تم دولت و اقتدار کے فتنوں میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔''

❁---❁---❁

اسی زمانے میں ایک اور دردناک واقعہ پیش آیا..... اور تاریخِ ہند کا ایک اور ورق انسانی خون سے سرخ ہو گیا۔

اختیار الدین خان خاناں کا باپ جلال الدین خلجی بہت دنوں سے اقتدار حاصل کرنے کے لیے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ ایک سال پہلے وہ سلطان معزالدین کیقباد کو ترک زادوں کے ذریعے قتل کروا چکا تھا۔ اب کیقباد کا کم سن بیٹا سلطان شمس الدین تختِ ہندوستان پر جلوہ افروز تھا..... مگر درپردہ جلال الدین ہی حکمرانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

پھر جب جلال الدین نے حکومت کے تمام شعبوں پر مکمل اختیار حاصل کر لیا تو بساطِ سیاست پر آخری

چال چلی اور خوش قسمتی سے اس میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ایک سیاہ رات تھی جب جلال الدین نے اپنے آقا زادے کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

اس وقت چار سالہ شمس الدین اپنے کمرے میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اچانک مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ محل میں داخل ہوا اور سلطان شمس الدین کو اٹھا کر نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گیا۔

''تم لوگ میرے بچے کو کہاں لے جا رہے ہو؟'' شمس الدین کی ماں ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اس کا منہ بند کر دیا تا کہ ایک ماں کی چیخوں سے محل کے دوسرے لوگ بیدار نہ ہو سکیں۔

کچھ دیر بعد سلطان شمس الدین کو مقتل میں پہنچا دیا گیا۔ شمشیر بدست جلاّدوں کو سامنے پا کر چار سالہ بچہ چیخنے لگا۔

''مجھے کیوں قتل کر رہے ہو؟...... میں نے کیا، کیا ہے؟......تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟''

جلاّد اپنے کم سن آقا زادے کو کیا جواب دیتے کہ خود ان کے سروں پر بھی جلال الدین کی تلوار لٹک رہی تھی۔ شہزادہ شمس الدین جلاّدوں سے دوسرا سوال پوچھنے نہیں پایا تھا کہ اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی گئی۔

قتل ہوتے وقت سلطان شمس الدین کی عمر چار سال تھی۔ وہ ایک سال تک ہندوستان کا نام نہاد حکمراں رہا۔

جلال الدین کی قسمت بڑھاپے میں رنگ لائی۔ تاجِ شاہی پہنتے وقت اس کی عمر ستّر سال تھی۔

❀---❀---❀

اقتدار حاصل کرنے کے بعد سلطان جلال الدین نے اعتدال اور بردباری سے کام لیا۔ اگر وہ چاہتا تو مختلف بہانے تراش کر اپنے مخالف امراء کو قتل کرا دیتا...... مگر سلطان نے امورِ سلطنت کے معاملے میں نرمی اختیار کی۔ جس کے نتیجے میں قزاقوں اور راہزنوں کو کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ یہاں تک کہ ملک کے ہر گوشے میں چوری، ڈکیتی، لوٹ مار اور قتل و غارت کی وارداتیں عام ہونے لگیں۔ سیاسی طور پر اس قدر انتشار برپا تھا کہ عدالتوں کا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ پہلے تو مجرموں کو پکڑا ہی نہیں جاتا تھا...... اور اگر کسی کو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے پیش بھی کر دیا جاتا تو فرماں روائے ہند کی نرمی آڑے آ جاتی۔ سلطان جلال الدین مجرموں سے گزشتہ جرائم پر توبہ کرواتا اور آئندہ جرم نہ کرنے کا وعدہ لے کر انہیں چھوڑ دیتا۔

سلطان کی اس نرم روی کی وجہ سے تمام خلجی امراء اس سے بدظن ہو گئے اور امراء کھلے عام سلطان کو ملامت کرنے لگے۔

سلطان جلال الدین اپنے امراء کی تند و تیز اور گستاخانہ گفتگو سنتا اور یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا۔

''شرابی لوگوں کی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہئے۔ انہیں حالتِ مستی میں اپنی جان کا بھی ہوش نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ ہذیان بکتے ہی رہتے ہیں۔''

آخر ایک دن تمام امراء آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ''جلال الدین بے شک اپنی جوانی میں ایک بہادر شخص تھا اور اس نے بارہا بڑی مردانگی کے ساتھ مغلوں کا مقابلہ کیا تھا لیکن اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے اور ضعیفی نے اسے بزدل بنا دیا ہے۔ آج کل اسے شعر کہنے اور شطرنج کھیلنے کے علاوہ کوئی تیسرا کام نہیں ہے۔ اس لیے جلال الدین کو معزول کر کے ملک تاج الدین کوچی کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لینا چاہئے۔''

اس مشورے کے بعد تمام امراء ملک تاج الدین کوچی کے مکان پر جمع ہوئے اور بادہ نوشی کی ایک زبردست محفل سجائی۔ پھر ہر امیر نے اس حد تک شراب پی کہ کسی کو کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

بدمستی کی حالت میں ایک امیر نے چیخ کر کہا۔

''لوگو! میری بات غور سے سنو۔ جلال الدین ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ بن کر تختِ شاہی پر بیٹھے۔ تمہیں چاہئے کہ کسی تاخیر کے بغیر اسے تخت سے گرا دو اور اس کے سر سے تاجِ شاہی اُتار کر ملک تاج الدین کوچی کے سر پر سجا دو۔''

جب محفل میں خاموشی چھا گئی تو دوسرا امیر لہراتا ہوا اُٹھا اور اپنا خنجر نکال کر بولا۔ ''میں سلطان جلال الدین کو اپنے اس خنجر سے موت کے گھاٹ اُتار دوں گا۔'' یہ کہہ کر اس بدمست امیر نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔

پھر جب قہقہے کی گونج ختم ہوئی تو تیسرا سردار اپنی جگہ سے اٹھا اور تلوار لہراتے ہوئے بولا۔

''غور سے دیکھو! یہ ہے وہ تلوار جس سے میں جلال الدین کے بوڑھے اور ناکارہ جسم کو دو حصوں میں تقسیم کروں گا۔''

الغرض تمام امراء رات بھر جی کھول کر جلال الدین خلجی کو برا بھلا کہتے رہے۔

پھر انہی امراء میں سے ایک امیر نے تمام باتیں جلال الدین تک پہنچا دیں جنہیں سن کر سلطان کو شدید اذیت پہنچی۔ پھر اس نے اسی وقت ایک قاصد بھیج کر تمام امیروں کو خلوت میں طلب کر لیا۔ امراء نے اس طلبی کو ایک عام سرکاری کارروائی سمجھا اور نہایت اطمینان سے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے رہے۔

سلطان جلال الدین نے امراء پر ایک نظر ڈالی۔ اور اپنی تلوار میان سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔

امراء اپنے فرماں روا کے اس طرزِ عمل کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

''میں تمام لوگوں کی مشکل آسان کرنا چاہتا ہوں۔'' سلطان جلال الدین نے اپنے امراء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میری تلوار تمہارے سامنے پڑی ہے۔ خوب آنکھیں کھول کر دیکھ لو کہ میں اس وقت بالکل نہتا ہوں۔ تم میں سے جس شخص کو بھی بہادری کا دعویٰ ہو، وہ اُٹھے اور میری ہی تلوار سے میرا کام تمام

کر دے..... تاکہ پتہ چلے کہ تم بھی کسی لائق ہو اور دنیا کا کوئی کام کر سکتے ہو۔" سلطان جلال الدین کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

تمام امراء بارِ ندامت سے سر جھکائے بیٹھے رہے۔

"تم اُٹھتے کیوں نہیں؟ مُردوں کی طرح کیوں بیٹھے ہو؟" سلطان جلال الدین خلجی نے دوبارہ اپنے امراء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کل کیسی کیسی تقریریں کر رہے تھے، آج خاموش کیوں ہو؟ آگے بڑھو اور میرے بوڑھے جسم کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دو۔"

امراء کی گردنیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے ندامت کے پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کی صفوں پر سکوتِ مرگ سا طاری تھا۔

سلطان جلال الدین خلجی بہت دیر تک اس قسم کی طنزیہ گفتگو کرتا رہا۔ اس کے جھریوں زدہ چہرے پر قہر و نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ پھر جب یہ شعلے آہستہ آہستہ مدھم ہو گئے تو ملک نصرت اپنی جگہ سے اُٹھا۔ سلطان جلال الدین خلجی کے جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق ملک نصرت نے محفلِ شراب نوشی میں بدمست ہو کر سلطان کے خلاف سب سے زیادہ بکواس کی تھی۔ ملک نصرت آہستہ آہستہ چلتا ہوا سلطان کی مسند کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور مزاحیہ انداز میں کہنے لگا۔

"حضورِ والا خوب جانتے ہیں کہ بادہ خوار لوگ شراب کے نشے میں نہ جانے کیسی کیسی ہرزہ سرائی کرتے ہیں ہم نے بھی یقیناً ہذیان بکا ہوگا۔ کیونکہ ہم بھی اپنے ہوش میں نہیں تھے۔"

"آخر تُو کیا کہنا چاہتا ہے ملک نصرت؟" سلطان جلال الدین خلجی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"آپ نے ہمیں اپنے بیٹوں کی طرح پالا ہے۔" ملک نصرت کا لہجہ نہایت عاجزانہ تھا۔ "اگر ہم آپ جیسے آقا کو کوئی گزند پہنچائیں گے تو پھر ایسا شفیق مالک ہمیں دوبارہ کہاں میسر آئے گا؟" یہ کہہ کر ملک نصرت چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "اور اگر حضور ہمارے جیسے نمک خوار بیٹوں کو سزا دیں گے تو پھر ہم جیسے جاں نثار آپ کو کہاں سے ملیں گے؟"

ملک نصرت نے یہ بات کچھ اس قدر سادگی اور بے تکلفی سے کہی تھی کہ سلطان جلال الدین خلجی ہنس پڑا...... اور اپنے ہاتھ سے شراب کے پیالے بھر بھر کے امراء کو دینے لگا۔

"اگر میری جگہ کوئی اور بادشاہ ہوتا تو تمہیں ان گستاخیوں کی دردناک سزا دیتا اور بڑی اذیتوں کے ساتھ قتل کرتا۔ لیکن میں یہ راز جانتا ہوں کہ تمہیں شراب نوشی اور عیش کوشی سے فرصت ہی کہاں ہے کہ کوئی دوسرا کام انجام دے سکو۔ کہاں تم اور کہاں شمشیر زنی؟ یہ سب تمہارا زبانی جمع خرچ ہے۔ لاف زنی کرنے والے صف شکنی نہیں کر سکتے۔ میں نے تم سب لوگوں کو معاف کیا لیکن اس کے ساتھ ہی میرا حکم ہے کہ فوراً اپنی جاگیروں پر چلے جاؤ۔ اور اس وقت تک دارالحکومت کا رُخ نہ کرنا، جب تک کہ میں تمہیں یہاں آنے کا حکم نہ دوں۔" سلطان جلال الدین خلجی نے بڑی ذہانت اور خوب صورتی سے اس مشکل اور سنگین مرحلے

کو ٹال دیا تھا۔

❀---❀---❀

سلطان غیاث الدین بلبن کے انتقال کے بعد اس کے بڑے بڑے امراء بے یار و مددگار ہو گئے تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے اس وقت ملک الامراء فخر الدین کوتوال زندہ تھا۔ اس نے تمام امراء کی نگہداشت کی اور شاہی خزانے سے بڑے بڑے وظائف دلواتا رہا۔ پھر وہ نازک گھڑی بھی آئی جب فخر الدین کوتوال دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ملک الامراء کے مرتے ہی سلطان بلبن کے امیروں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہر وقت سامانِ عیش و عشرت میں کھیلنے والے، ایک ایک کوڑی اور ایک ایک دانے کے محتاج ہو گئے۔

اسی طرح بارہ ہزار قرآن حافظ جو روزانہ ایک ہزار قرآن کا ختم کیا کرتے تھے، بیروزگار ہو کر در در بھٹکنے لگے۔

ہزاروں سپاہی اور ہنر پیشہ افراد جو فخر الدین کوتوال کے پروردہ تھے، بھوک کا شکار ہو گئے۔ اس زمانے میں سیدی مولہؒ کی کرامتوں اور بخشش و عطا کا بہت شور تھا۔ مجبوراً عام لوگ شیخ کی خانقاہ میں جمع ہو گئے۔ سیدی مولہؒ نے ان پریشان حال امیروں اور بھوکے سپاہیوں کو بڑے والہانہ انداز میں خوش آمدید کہا۔ سیدی مولہؒ کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ شہر کے شرفاء اور امراء کو ایک ایک ملاقات میں دو دو تین تین ہزار اشرفیاں بطور انعام دیتے تھے۔ امراء اور وزراء کے لیے جو دسترخوان بچھایا جاتا تھا، اس پر انواع و اقسام کے لذیذ کھانے موجود ہوتے تھے۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ سیدی مولہؒ کے دسترخوان کے مقابلے میں شاہی دسترخوان کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

سلطان جلال الدین خلجی کا چھوٹا بیٹا، ارکلی خان، سیدی مولہؒ سے بہت حسد رکھتا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی اختیار الدین خان خاناں کو نیچا دکھانے کے لیے کئی بار سیدی مولہؒ کی خدمت میں حاضر ہو چکا تھا۔ مگر شیخ نے ارکلی خان کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ سیدی مولہؒ، اختیار الدین خان خاناں کو اپنی مسند پر بائیں طرف بٹھاتے تھے اور برسرِ مجلس فرمایا کرتے تھے۔

''شہزادہ اختیار الدین میرا بیٹا ہے۔ جسے میری قربت کی خواہش ہو، اسے چاہیے کہ وہ میرے بیٹے کی عزت و تکریم کرے۔''

شہزادہ ارکلی خان، سیدی مولہؒ کے یہ الفاظ سنتا اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ آخر ایک دن ارکلی خان سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ حاضرینِ مجلس کے سامنے بول اٹھا۔

''شیخ! میں کون ہوں؟''

سیدی مولہؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''تم شہزادے ہو۔''

''آپ کا بیٹا کیوں نہیں؟'' ارکلی خان نے شیخ سے حجت کی۔

''ہر شہزادہ میرا بیٹا نہیں ہو سکتا۔'' سیدی مولہؒ نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''خان خاناں کی

بات ہی کچھ اور ہے۔"

سیدی مولہؒ کا جواب سن کر شہزادہ ارکلی خان زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکا مگر اس کے دل میں شیخ کی طرف سے گرہ پڑ گئی۔ وہ غبار آلود ذہن کے ساتھ خانقاہ سے اُٹھ کر چلا گیا اور پھر اس نے سیدی مولہؒ کی خدمت میں حاضر ہونا چھوڑ دیا۔ دراصل ارکلی خان اپنے بڑے بھائی سے بھی حسد رکھتا تھا۔ وہ اکثر ہم خیال امراء کے سامنے کہا کرتا تھا۔

"چھوٹا ہونا بھی بڑی بدنصیبی ہے۔ پتہ نہیں قدرت نے مجھے چھوٹا کیوں بنا دیا؟"

ارکلی خان کی تنگ دلی کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے سے بھی شکایت کرتا تھا کہ اسے اختیارالدین سے پہلے کیوں پیدا نہیں کیا گیا؟

اختیارالدین خان خاناں اپنی متانت، بردباری اور بلند کرداری کی وجہ سے نہ صرف سلطان جلال الدین خلجی کا منظورِ نظر تھا بلکہ دوسرے اُمراء بھی اُسے احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ مزید یہ کہ وہ بڑا بیٹا تھا، اس لیے سلطان جلال الدین خلجی نے اسے اپنی زندگی میں ہی ولی عہدِ سلطنت نامزد کر دیا تھا۔ پھر جب سیدی مولہؒ نے اختیارالدین خان خاناں کو منہ بولا بیٹا بنا لیا تو شہزادے کی عزت و تکریم میں مزید اضافہ ہو گیا۔ شہزادہ ارکلی خان کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ اپنے بڑے بھائی کا کچھ بگاڑ تو نہیں سکتا تھا...... مگر دل ہی دل میں دعائیں کیا کرتا تھا کہ کسی طرح اختیارالدین کا کانٹا اس کے راستے سے دُور ہو جائے۔

❀---❀---❀

پھر اچانک حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے وہ اُمراء جنہیں سلطان جلال الدین خلجی نے معزول کر دیا تھا، ایک خاص منصوبے کے تحت سیدی مولہؒ کے گرد جمع ہونے لگے۔ اُنہی دنوں ایک فتنہ انگیز اور فسادی ذہن رکھنے والا امیر قاضی جلال الدین کاشانی، سیدی مولہؒ کی خانقاہ میں داخل ہوا۔ وہ ایک نہایت عیار اور چرب زبان انسان تھا۔ قاضی جلال نے اپنی پُر پیچ گفتگو سے کچھ ایسا سماں پیدا کیا کہ سیدی مولہؒ اسے اپنا بہترین دوست سمجھنے لگے۔ پھر اس مکار اور زمانہ ساز قاضی نے سیدی مولہؒ سے اس قدر مراسم بڑھا لیے کہ تین تین، چار چار دن تک خانقاہ میں مہمان رہنے لگا۔

پھر ایک روز قاضی جلال الدین کاشانی نے سیدی مولہؒ کے روبرو بڑے شکستہ لہجے میں عرض کیا۔

"سیدی! ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔"

"فقیر کو بھی اس بات کا شدید احساس ہے۔" جواب میں سیدی مولہؒ نے فرمایا۔ "یہ عاجز درویش اپنے دینی بھائیوں کی فلاح و بہبود کے لیے دن رات دعائیں کرتا رہتا ہے۔"

"شیخ! اب دعاؤں کی نہیں، اس بیمار ملت کو زود اثر اور طاقتور دواؤں کی ضرورت ہے۔" قاضی جلال الدین کاشانی نے نئی شاطرانہ چال چلتے ہوئے کہا۔

''دواؤں سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' قاضی جلال کی بات کے جواب میں سیدی مولہؒ نے فرمایا۔

''میں نے ہندوستان کا گوشہ گوشہ چھان مارا مگر مجھے ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو حکمرانی کے لائق ہو اور ملتِ اسلامیہ کے مسائل حل کر سکے۔'' قاضی جلال الدین کاشانی کا لہجہ کچھ اور اثر انگیز ہو گیا تھا۔

''سلطان جلال الدین ایک نیک دل حکمران ہیں۔'' سیدی مولہؒ نے فرمایا۔''اگر ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جائے تو وہ باآسانی رعایا کے مسائل حل کر سکتے ہیں۔''

یکایک قاضی جلال الدین کاشانی کے چہرے پر نفرت کا رنگ اُبھر آیا۔''بے شک! سلطان کی فیاضیوں اور نیکیوں کے افسانے رعایا میں مشہور ہیں.... مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں پر دو آقا زادوں کے خون کے داغ ابھی تک موجود ہیں۔ پہلے سلطان نے غیاث الدین بلبن کے پوتے معزالدین کیقباد کو ترک زادوں کے ذریعے قتل کروایا..... اور پھر کیقباد کے چار سالہ بیٹے سلطان شمس الدین کو قتل کر کے خود بادشاہ بن بیٹھے۔ آپ ہی بتایئے کہ اپنے محسنوں کا خون بہانے والا، رعایا کا ہمدرد کس طرح ہو سکتا ہے؟ سلطان جلال الدین ایک خودغرض بادشاہ ہیں۔ ان کے دماغ میں بُوئے حکومت کے سوا کچھ نہیں۔'' یہ کہہ کر قاضی جلال الدین کاشانی، سیدی مولہؒ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھنے لگا جہاں اذیت و کرب کے آثار صاف نمایاں تھے۔

''قاضی! اقتدار کے کھیل میں تو یہی ہوتا ہے۔'' سیدی مولہؒ کا لہجہ بہت افسردہ تھا۔''بہرحال، اللہ تعالیٰ سلطان کو ہدایت دے۔''

''سیدیؒ! میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اب اس قوم کو دعا کی نہیں، دوا کی ضرورت ہے۔'' قاضی جلال الدین کاشانی بے تکلفانہ لہجے میں بول رہا تھا۔''اور دوا صرف آپ کے پاس ہے۔ آپ ہی اس بیمار قوم کے مسیحا ہیں۔ اگر آپ نے میری بات پر توجہ نہیں دی تو مسلمانانِ ہند کو ہلاکت و بربادی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

سیدی مولہؒ نے بڑی حیرت سے قاضی جلال الدین کاشانی کی طرف دیکھا۔''ایک گوشہ نشیں فقیر اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

''آپ صرف راضی ہو جائیں۔'' قاضی جلال الدین کاشانی نے نہایت پُرجوش لہجے میں کہا۔''کام کرنے والے تو آپ کے خدمت گار ہوں گے۔ میں بادشاہت کا جابرانہ نظام ختم کر کے خلافت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ یہی طرزِ حکمرانی ہماری مشکلات کا حل ہے۔''

''تمہارے خیال میں یہاں کون سا ایسا شخص ہے جو پوری دیانت داری اور توانائی کے ساتھ بارِ خلافت اُٹھا سکے؟'' سیدی مولہؒ نے فرمایا۔

ابھی سیدی مولہؒ کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ قاضی جلال الدین کاشانی بے اختیار آگے بڑھا اور سیدی مولہؒ کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے بولا۔

''آپ کے سوا کوئی نہیں۔کوئی نہیں۔''

سیدی مولہؒ نے تیزی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔''ہرگز نہیں۔ اس فقیر سے اپنا بوجھ نہیں اُٹھتا کہ تم اس پر پہاڑ جیسا بارِ گراں ڈال دینا چاہتے ہو۔''

سیدی مولہؒ کا انکار دیکھ کر قاضی جلال الدین نے نیا حربہ استعمال کیا۔

''حق تعالیٰ نے آپ کو یہ کشف و کرامت، یہ روحانی طاقت اس لیے عطا کی ہے کہ آپ اس کے بندوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں۔ یہ آپ کا فرضِ منصبی ہے کہ حکومت کو جو اللہ کی نیابت ہے، ظالموں کے ہاتھوں سے چھین لیں اور اس پر قبضہ کر لیں۔ پھر اہلِ دنیا کو اللہ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمانِ مقدس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کریں۔''

قاضی جلال الدین کاشانی کی پُر جوش گفتگو سن کر سیدی مولہؒ کے چہرۂ مبارک پر ذہنی کشمکش کے آثار نظر آنے لگے۔

سیدی مولہؒ کو سوچ میں گم دیکھ کر قاضی جلال الدین کاشانی نے ایک اور چال چلی۔

''شیخ! اگر آپ اس عظیم الشان عہدے کو حاصل کرنے سے کنارہ کشی اختیار کریں گے تو پھر کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟''

قاضی جلال الدین کی دلفریب باتوں نے سیدی مولہؒ کو پس و پیش میں مبتلا کر دیا۔ یہاں تک کہ شیخ بشریت کے تقاضے سے مجبور ہو گئے اور پھر حصولِ سلطنت کے لیے اسباب فراہم کرنے لگے۔

قاضی جلال الدین کاشانی ایک گوشہ نشیں بزرگ کو نظامِ خلافت قائم کرنے پر مسلسل اُکسا رہا تھا۔ آخر سیدی مولہؒ نے خفیہ طور پر اپنے ہر مرید (خدمت گار) کو خطابات اور مناصب سے نوازنا شروع کر دیا۔ برنجبن کوتوال اور نتھائی پہلوان، سیدی مولہؒ کے خاص خدمت گار تھے۔ ان دونوں پر شیخ نے بے شمار احسانات کیے تھے۔ آخر یہ طے پایا کہ جمعہ کے دن جب سلطان جلال الدین نماز کے لیے جامع مسجد جا رہا ہو، برنجبن کوتوال اور نتھائی پہلوان، بادشاہ کے قریب پہنچ کر اسے قتل کر دیں گے۔ ابھی اس تجویز کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جا رہا تھا کہ سیدی مولہؒ کے ایک خدمت گار نے سلطان کو اس سازش سے باخبر کر دیا۔

❁---❁---❁

سلطان جلال الدین نے فوری طور پر سیدی مولہؒ اور قاضی جلال الدین کاشانی کو اپنی مجلسِ خاص میں طلب کر لیا جہاں دوسرے اراکینِ سلطنت بھی موجود تھے۔

''سید صاحب! میری سماعت تک یہ افسوس ناک خبر پہنچی ہے کہ آپ مجھے قتل کروانے کے بعد خلیفۃ المسلمین بننا چاہتے ہیں۔'' سلطان جلال الدین خلجی کا لہجہ کسی قدر نرم تھا۔''اور یہ مکار شخص قاضی

جلال الدین کاشانی اس کام میں آپ کا معاونِ خاص ہے۔'' یہ کہتے ہوئے فرمانروائے ہند نے قاضی جلال کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر نفرت و قہر کا رنگ اُبھر آیا۔

''اے میرے بادشاہ! میں اس قسم کے سارے الزامات سے بری ہوں۔'' سیدی مولہؒ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ ان کے چہرے پر فکر و پریشانی کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا۔

''اور قاضی! سید صاحب کی خانقاہ میں تیرا کیا کام؟'' سلطان جلال الدین نے انتہائی غضب ناک لہجے میں سوال کیا۔

''میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح سید صاحب کا عقیدت مند ہوں۔'' قاضی جلال الدین کاشانی نے نہایت عیارانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''جیسے مخلوقِ خدا، خانقاہ میں حاضری دیتی ہے، ویسے ہی میں بھی سید صاحب سے فیضِ روحانی حاصل کرنے وہاں جاتا ہوں۔''

سلطان جلال الدین نے مختلف انداز میں زاویے بدل بدل کر سیدی مولہؒ اور قاضی کاشانی سے بہت سارے سوالات کیے۔ مگر ان دونوں پر سازش یا بغاوت کا کوئی جرم ثابت نہ ہو سکا۔

آخر والیٔ ہندوستان نے جھوٹ اور سچ کو پرکھنے کے لیے بڑا خوف ناک طریقہ اختیار کیا۔ سلطان جلال الدین نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ بہادر پور کے جنگل کے قریب ایک وسیع و عریض رقبے میں آگ روشن کریں۔ پھر سیدی مولہؒ، قاضی برنجبن کوتوال اور نتھائی پہلوان کو بھڑکتی ہوئی آگ میں سے گزارا جائے۔ اگر وہ اپنے قول میں سچے ہوں گے تو انہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ اور اگر وہ جھوٹے ثابت ہوں گے تو بھڑکتے شعلے انہیں جلا کر راکھ کر دیں گے۔''

حکمِ سلطانی کی فوری طور پر تعمیل کی گئی۔ چوبیس گھنٹے تک آگ بھڑکائی جاتی رہی۔ دوسرے دن سلطان جلال الدین اپنے مصاحبوں اور دوسرے امرائے سلطنت کو ساتھ لے کر آگ کے قریب پہنچا اور ایک خیمے میں ٹھہر گیا۔ سہ پہر کے وقت چاروں مجرموں کو سلطان کے سامنے لایا گیا۔ قاضی جلال الدین کاشانی، برنجبن کوتوال اور نتھائی پہلوان کے چہروں پر خوف کے ہلکے ہلکے سائے لرز رہے تھے..... مگر سیدی مولہؒ نہایت مطمئن نظر آ رہے تھے جیسے وہ موت کے منہ میں ہونے کے بجائے اپنی خانقاہ میں موجود ہوں۔

''یہی بھڑکتی ہوئی آگ تم لوگوں کے جھوٹ اور سچ کا امتحان ہے۔ اگر بے قصور ہوئے تو محفوظ رہو گے۔ ورنہ یہ خوں رنگ شعلے تمہاری ہڈیاں تک جلا ڈالیں گے۔''

سلطان جلال الدین کی بات ختم ہوتے ہی چاروں افراد نے باآوازِ بلند کلمۂ شہادت پڑھا اور پھر آگ میں کُودنے کے لیے آگے بڑھے۔

سلطان جلال الدین کو سیدی مولہؒ اور باقی تینوں افراد کی یہ حالت دیکھ کر رحم آ گیا۔

''ابھی ٹھہر جاؤ۔'' فرماں روائے ہندوستان نے چاروں افراد کو پکار کر کہا۔

سیدی مولہؒ، قاضی جلال الدین کاشانی، برنجبن کوتوال اور نتھائی پہلوان، سلطان کی آواز سنتے ہی

رُک گئے۔

پھر جلال الدین نے اس سلسلے میں دہلی کے علماء سے مشورہ کیا۔

تمام علماء نے بالاتفاق جواب دیتے ہوئے کہا۔

''آگ کی فطرت جلانا ہے۔ بھڑکتے ہوئے شعلے جھوٹے اور سچے میں تمیز نہیں کرتے۔ وہ کسی رعایت کے بغیر ان کو جلا کر خاک کر دیں گے۔ اس قسم کے معاملات کا فیصلہ آگ کے ذریعے کرنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی ہے۔''

علماء کا جواب سن کر جلال الدین خلجی اپنے ارادے سے باز آ گیا اور اس نے آگ بجھانے کا حکم دے دیا۔

❁---❁---❁

سیدی مولہؒ کے عقیدت مند سمجھے کہ یہ مشکل گھڑی گزر گئی ہے۔ مگر فرماں روائے ہند کا دل ابھی شیخ کی طرف سے صاف نہیں ہوا تھا۔ وہ اس معاملے کی مزید کھوج کرنا چاہتا تھا۔ سلطان نے فوری طور پر جلال الدین کاشانی کو بدایوں کا قاضی مقرر کر کے ایک فوجی دستے کی نگرانی میں دہلی سے روانہ کر دیا۔ غیاث الدین بلبن کے باقی امراء کو ہمیشہ کے لیے شہر بدر کر دیا گیا۔

برنجبن کوتوال اور ہتھائی پہلوان جنہوں نے بادشاہ کو قتل کرنے کی سازش کی تھی، اُنہیں اُنہی کے خون میں نہلا دیا گیا۔ الغرض تمام سازشیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے بعد سلطان جلال الدین خلجی، سیدی مولہؒ کو اپنے ساتھ لے کر کوشک (محل) کی طرف چلا۔ سلطان خود تو شاہی سواری پر تھا اور سیدی مولہؒ پابہ زنجیر چلے جا رہے تھے۔

کوشک پہنچنے کے بعد سلطان خود تو اندر چلا گیا اور سیدی مولہؒ کو حکم دیا کہ وہ اس دریچے کے نیچے ہاتھ باندھے کھڑے رہیں جہاں بیٹھ کر بادشاہ رعایا کو دیدار کرایا کرتا تھا۔

اس تمام کارروائی کے دوران جلال الدین کا بڑا بیٹا اختیار الدین خان خاناں کئی بار باپ کے سامنے سیدی مولہؒ کی وکالت کر چکا تھا۔

''سلطانِ معظم! مجھ سے زیادہ شیخ کو کوئی نہیں جانتا، ان کے دل میں ہوسِ اقتدار کا شائبہ تک نہیں۔ وہ ایک مردِ قلندر ہیں اور دنیا کے جھگڑوں سے ہمیشہ دُور رہتے ہیں۔ براہِ کرم! سید صاحب کے خلاف کی جانے والی سازش میں آپ شریکِ کار نہ بنیں۔ اور ایک درویش کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔''

سلطان جلال الدین نے بڑے بیٹے کی ایک نہ سنی۔ ''اختیار الدین! تم ان درویشوں کو نہیں جانتے۔ پہلے یہ رعایا میں مقبولیت حاصل کرتے ہیں، پھر اسی مقبولیت کے سہارے تختِ شاہی تک پہنچنا چاہتے ہیں۔''

سلطان جلال الدین کے ذہن میں سیدی مولہؒ کی طرف سے شکوک و شبہات کا بہت غبار تھا۔ اور اس غبار کی ایک بڑی وجہ شہزادہ ارکلی خان کی چغل خوری بھی تھی۔ وہ سیدی مولہؒ کے خلاف دن رات اپنے

باپ کے کان بھرتا رہتا تھا۔ آخر سلطان جلال الدین کو یقین ہو گیا کہ ایک بوریا نشیں درویش اُس کا تختہ اُلٹنا چاہتا ہے۔ یہ اسی کی بدگمانی کا نتیجہ تھا کہ سیدی مولہؒ دست بستہ کوشک کے سامنے کھڑے تھے اور ہزاروں انسان ایک فقیر کی مجبوریوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جلال الدین دریچے میں نمودار ہوا۔ شہزادہ اختیارالدین خان خاناں، شہزادہ ارکلی خان اور دیگر امرائے سلطنت اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

اپنی نشست پر بیٹھنے کے بعد فرمانروائے ہند نے بغاوت کے سلسلے میں سیدی مولہؒ سے سوالات شروع کر دیئے۔

سیدی مولہؒ نے نہایت جرأت مندی اور دلیری کے ساتھ سلطان کے سوالوں کے جوابات دیئے۔ شیخ کے پیش کردہ دلائل اس قدر مضبوط تھے کہ شرع اور مسلکی قانون کے لحاظ سے ان پر کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا۔

سلطان جلال الدین شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھا۔ سیدی مولہؒ کی محبوبیت اس کے لیے مستقل خطرہ بن کر رہ گئی تھی۔ آخر سلطان نے سیدی مولہؒ کا معاملہ شیخ ابوبکر طوسی حیدری پر چھوڑ دیا جو اپنے ساتھی درویشوں کے ہمراہ اس وقت وہاں موجود تھا۔

''شیخ! تم دیکھ رہے ہو کہ اس درویش سیدی مولہؒ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟'' سلطان نے شیخ ابوبکر طوسی حیدری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اس شخص نے میرے ملک میں بدامنی اور فساد پھیلانے کے کیسے کیسے منصوبے بنائے ہیں...... میں اس مقدمے میں تمہیں منصف بناتا ہوں...... تم جو مناسب سمجھو فیصلہ کرو۔ یہاں تک کہ میں مطمئن ہو جاؤں۔''

سلطان کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی سنجری نام کا ایک درویش اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس شخص پر جلال الدین کے بے شمار احسانات تھے۔

''سلطانِ عالی مقام! میں آپ کا نمک خوار ہوں اور آج حقِ نمک ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔''

یہ کہہ کر سنجری بہت تیزی سے سیدی مولہؒ پر جھپٹا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے سُوئے اور اُسترے سے سیدی مولہؒ کے جسم پر کئی زخم لگائے۔

بڑا وحشت خیز اور دردناک منظر تھا۔ سلطان کا بڑا بیٹا اختیار الدین خان خاناں اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا اور نہایت غم زدہ لہجے میں باپ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''بابا محترم! اس پاگل شخص کو روکیے...... یہ ایک مردِ پاکباز کے ساتھ کیسا وحشیانہ سلوک کر رہا ہے؟''

''اختیار الدین! تم اس معاملے میں مداخلت مت کرو۔'' سلطان نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا اور سنجری کی طرف دیکھنے لگا جو سیدی مولہؒ پر پے در پے حملے کر رہا تھا۔

سیدی مولہؒ کچھ دیر تک سنجری کے وار برداشت کرتے رہے، پھر بلند آواز میں اس بے رحم شخص کو

مخاطب کرتے ہوئے فرمانے لگے۔

''میں اپنی موت سے ہراساں نہیں ہوں مگر میرے ساتھ بہیمانہ سلوک روا نہ رکھو۔ جلدی کرو اور مجھے میری اصلی قیام گاہ پر پہنچا دو۔'' (یعنی ایک ہی وار میں قتل کر کے دفن کر دو)

سنجری نے سیدی مولہؒ کی فریاد پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ اسی وحشیانہ انداز میں حملے کرتا رہا۔

سیدی مولہؒ خون میں نہا چکے تھے۔ مگر موت سے خوف زدہ نہیں تھے۔ وہ پوری استقامت کے ساتھ پلٹے اور جلال الدین کو مخاطب کر کے بولے۔

''مجھے اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں۔ مگر تم اتنا یاد رکھو کہ میرا خون ایک نہ ایک دن رنگ لا کر رہے گا..... درویشوں کی دل آزاری کسی طرح بھی مناسب نہیں......اس کا وبال تم پر اور تمہاری اولاد پر ضرور پڑے گا۔''

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ سلطان جلال الدین، سیدی مولہؒ کو قتل کرنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے شیخ کی بات سن کر وہ پس و پیش میں پڑ گیا۔ شاید وہ اُنہیں معاف کر دیتا یا پھر کسی تاریک زنداں کے گوشے میں ڈال دیتا۔ مگر سیدی مولہؒ کا وقت پورا ہو چکا تھا۔

سلطان کے چھوٹے بیٹے ارکلی خان نے کوشک کے اوپر سے فیل بان کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے مست ہاتھی کو سیدی مولہؒ پر چھوڑ دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دیو پیکر جانور نے اس مردِ درویش کو کچل کر رکھ دیا جو دہلی کے باشندوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔

یہ ہولناک منظر دیکھ کر شہزادہ اختیارالدین خان خاناں نے ایک زوردار چیخ ماری اور شدتِ غم سے بے ہوش ہو گیا۔

سیدی مولہؒ کی شہادت نے پورے شہر دہلی کو سوگوار بنا دیا تھا اور گھر گھر سے شورِ ماتم کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

❁---❁---❁

پھر جب سیدی مولہؒ کے خدمت گار اپنے مخدوم کی لاش کو اٹھا کر خانقاہ میں لے گئے تو اچانک مغرب کی سمت سے ایک خوف ناک سیاہ آندھی اُٹھی اور پھر اس نے آناً فاناً پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس قدر مہیب تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ سیدی مولہؒ کے بعض عقیدت مند دبے دبے لفظوں میں کہہ رہے تھے۔

''یہ سب قتلِ شیخ کا نتیجہ ہے.....ایک دن سلطان کی زندگی بھی اسی طرح گہرے اندھیروں میں ڈوب جائے گی۔''

پھر ایسا ہی ہوا......سیدی مولہؒ کے قتل کے کچھ دن بعد ہی دہلی اور سوالک میں ایسا زبردست قحط پڑا کہ لاکھوں مویشی لقمۂ اجل بن گئے اور ہزاروں انسانوں نے دریائے جمنا میں کُود کر اپنی سسکتی ہوئی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

سلطان جلال الدین کا سفینۂ اقتدار ڈگمگانے لگا اور ملک کے طول و عرض میں انتہائی خطرناک واقعات و حادثات پیش آنے لگے۔

جس دن سیدی مولہؒ کو قتل کیا گیا تھا، اسی روز شہزادہ اختیار الدین خان خاناں کی طبیعت ناساز ہوئی اور وہ بسترِ علالت پر دراز ہو گیا۔ پھر بیماری نے یہاں تک طول پکڑا کہ سلطان جلال الدین نے ہندوستان کے گوشے گوشے سے تمام ماہر طبیبوں کو قصرِ شاہی میں جمع کر لیا، حکمت کی سینکڑوں قدیم کتابیں کھولی گئیں، بہترین نسخے تجویز کیے گئے مگر شہزادے کو کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ جب بھی کوئی حکیم، اختیار الدین خان خاناں کی نبض پر ہاتھ رکھتا تو وہ بے اختیار ہو کر کہتا۔

''تمہاری دوائیں کسی کام نہیں آئیں گی۔ میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔''

سلطان جلال الدین، بیٹے کو بار بار تسلیاں دیتا مگر شہزادے کے ہونٹوں پر بس یہی چند الفاظ ہوتے۔

''میں اپنے روحانی باپ کے پاس جا رہا ہوں..... سیدی نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ یہ فتنہ گر دنیا مجھے زیادہ دنوں تک فریب نہیں دے سکے گی۔''

آخر ایک دن شہزادہ اختیار الدین خان خاناں اس عالمِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ سلطان جلال الدین اپنے محبوب بیٹے کے جنازے پر خون کے آنسو رویا اور پھر آخری سانس تک روتا ہی رہا۔

پھر جلال الدین کے حقیقی بھتیجے اور داماد علاء الدین نے بغاوت کی اور سلطان کا سر کاٹ کر اودھ کی گلیوں، گلیوں میں پھرایا۔

شہزادہ ارکلی خان، جس نے سیدی مولہؒ پر مست ہاتھی چھوڑنے کا حکم دیا تھا، اسے علاء الدین نے اندھا کر کے قید خانے میں ڈال دیا اور اس کے دونوں بیٹوں کو قتل کرا دیا۔

پھر سلطان علاء الدین کو ایک مخنث ملک کافور نے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

علاء الدین کے بعد اس کا بیٹا قطب الدین تخت نشیں ہوا۔ اسے ایک بدکار لڑکے خسرو خان نے انتہائی شرمناک حالت میں قتل کر ڈالا۔

اس طرح عظیم الشان خلجی سلطنت چند سالوں میں تباہ و برباد ہو گئی...... اور سلطان جلال الدین کے خاندان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔

سب کچھ بدل گیا...... مگر ایک عورت نہیں بدلی۔ سردی ہو یا گرمی...... آندھی ہو یا طوفان...... ایک برقع پوش بوڑھی عورت بلا ناغہ سیدی مولہؒ کی قبر پر حاضر ہوتی تھی، پھول چڑھاتی تھی اور بہت دیر تک دونوں ہاتھ پھیلائے دعا مانگتی رہتی تھی۔

یہ بوڑھی عورت گل بانو تھی۔

❁---❁---❁

فاتح کا انجام

ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق یہ دنیا صرف ''برہما'' کی اولادوں کے لیے تخلیق کی گئی تھی۔ اس لیے ''برہمن'' ہی جزو وکُل کا مالک تھا۔ جسے چاہتا جنت سے سرفراز کر دیتا اور جسے چاہتا دوزخ میں ڈال دیتا۔ اس نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے راجپوتوں کو اعلیٰ قوم قرار دیا۔ یہ برہمن کی مجبوری تھی کہ وہ موت سے ڈرتا تھا۔ نتیجتاً اس نے خون بہانے کا کام راجپوتوں کے سپرد کیا۔

راجپوتوں کو برہمن کا آشیرواد حاصل تھا۔ ان کے کانوں میں کہہ دیا گیا تھا کہ ''برہما'' ان سے راضی ہے۔ اس لیے سوَرگ (جنت) پر ہر حال میں ان کا حق ہے۔ وہ اس دھرتی پر کچھ بھی کریں، برہمنوں کی خدمت کے سبب ان کے گناہ بھی ثواب ہیں۔ نسلِ انسانی کے خلاف اس گمراہ کُن سازش نے راجپوتوں کو ایک سرکش ''سانڈ'' بنا دیا تھا۔ جو کمزور لوگوں کے ہرے بھرے کھیتوں کو روندتے پھرتے تھے اور اُنہیں کوئی روکنے والا نہ تھا۔

92ھ میں سندھ کا حکمراں راجہ داہر تھا...... جو ''چچ'' کا بیٹا تھا اور نسلاً برہمن تھا۔ داہر کو بھی وہی عادتیں ورثے میں ملی تھیں جو برہمنوں کی فطرت میں شامل تھیں۔ اس کے خوشامدی مصاحب سرِ دربار با آوازِ بلند قصیدے پڑھ رہے تھے۔

''سندھ سکون اور امن کا گہوارہ ہے۔ پرجا اپنے راجہ کے ''دان'' اور ''دیا'' کے گُن گا رہی ہے۔''

یہ ایک فریب تھا جو راجہ داہر کو دیا جا رہا تھا..... ورنہ صورتِ حال یہ تھی کہ معاشی ناانصافیاں زیرِ زمین ایک خوفناک آتش فشاں کی پرورش کر رہی تھیں۔ ابھی قہر و ستم کا یہ عمل جاری تھا کہ زمین نے ہلکی سی کروٹ لی..... اور زلزلے نے آہستہ سے سندھ کے مکینوں کے دروازوں پر دستک دی۔ مگر طاقت کا نشہ اتنا گہرا تھا کہ حکمراں جماعت اس غیبی تنبیہہ کو محسوس نہ کر سکی۔

واقعہ یوں تھا کہ عرب سوداگروں کا ایک جہاز سامانِ تجارت لے کر واپس جا رہا تھا۔ اسی جہاز میں راجہ سراندیپ کے وہ قیمتی تحائف بھی موجود تھے جو اس نے والیٔ عراق حجاج بن یوسف کی خدمت میں ہدیتاً پیش کیے تھے۔ جب وہ جہاز دیبل کے ساحل کے قریب سے گزرا تو مقامی لٹیروں کی نیت بدل گئی

اور بحری قزاقوں نے مسلمان تاجروں کے جہاز پر شب خون مارا۔ کئی مسافر قتل کر دیئے گئے۔ سامانِ تجارت اور راجہ سراندیپ کے بھیجے ہوئے نادر و نایاب تحائف لوٹ لیے گئے۔ جہاز میں کچھ مسلم خواتین بھی سوار تھیں۔ قزاقوں نے اُنہیں بھی معاف نہیں کیا۔ جب پردہ دار خواتین کے چہروں سے نقابیں نوچی جا رہی تھیں تو ایک لٹیرے نے بڑی رعونت کے ساتھ کہا۔

''اب تم ہماری ملکیت ہو اور اس وقت تک ہمارے تصرف میں رہو گی، جب تک تمہیں موت نہیں آ جاتی۔ اگر تمہارا کوئی مددگار ہے تو اسے پکارو، وہ آئے اور تمہاری قیمت ادا کر کے تمہیں دوبارہ آزاد کرا لے۔''

بڑا حشر خیز منظر تھا۔ اسی ہنگامۂ دار و گیر میں قبیلۂ بنوعزیر کی ایک عورت عراق کی طرف منہ کر کے پوری طاقت کے ساتھ چیخی۔

''یا حجاج!..... یا حجاج!..... اغثنی..... اغثنی.....!''

(اے حجاج!.....اے حجاج! میری مدد کو پہنچو.....میری مدد کو پہنچو)

عورت بہت دیر تک روتی رہی اور دیبل کے لٹیرے، مسلمانوں کا مذاق اُڑاتے رہے۔

❁---❁---❁

خوش قسمتی کے باعث کچھ مسلمان، لٹیروں کی دراز دستیوں سے محفوظ رہے اور کسی نہ کسی طرح جان بچا کر فرار ہو گئے۔ پھر یہ درماندہ اور شکستہ حال لوگ حجاج بن یوسف کے دربار میں پہنچے اور والیٔ عراق کو اس المناک حادثے کی تفصیلات سے باخبر کیا۔

بیشتر مؤرخین کی رائے کے مطابق حجاج بن یوسف ایک سخت گیر اور درشت مزاج انسان تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ وہ پتھر تھا جو کسی طرح بھی نرم نہیں ہو سکتا تھا..... مگر جب اس نے قبیلۂ بنوعزیر سے تعلق رکھنے والی ایک نادیدہ خاتون کی غائبانہ فریاد سنی تو وہ رو پڑا اور اپنی مسند سے یہ کہتا ہوا نیچے اُتر آیا۔

''لبیک! لبیک!.....اے میری بیٹی! میں حاضر ہوں..... میں حاضر ہوں۔''

پھر حجاج نے سفارتی آداب کے مطابق راجہ داہر سے مراسلت کی۔

''حاکمِ سندھ کو چاہئے کہ وہ تمام تحائف اور مسلمانوں کا مالِ تجارت لٹیروں سے حاصل کر کے ہماری خدمت میں پیش کرے..... مسلمان قیدیوں کو پوری حفاظت اور احترام کے ساتھ عراق کی سرحدوں تک پہنچائے.....اور اس غیر اخلاقی حرکت پر ندامت و معذرت کا اظہار کرے۔ اور اس کے ساتھ ہی تاوان بھی ادا کرے۔''

راجہ داہر نے والیٔ عراق کا خط سنا..... اگر اس کی جگہ کوئی گرم خون رکھنے والا راجپوت حاکم ہوتا تو شعلے کی طرح بھڑک اُٹھتا..... مگر راجہ داہر ایک سرد مزاج برہمن تھا۔ وہ انسانی جانوں سے کھیلنے کا عادی تھا۔ اس لیے لفظوں سے کھیلنے لگا۔

''بحری قزاق میری حدودِ مملکت میں نہیں آتے۔ میں ان کے کسی فعل کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اگر والیٔ عراق

سمندری لٹیروں کی سرکوبی کر سکتے ہیں تو شوق سے کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

جس وقت حجاج بن یوسف کے خط کا جواب لکھا جا رہا تھا، راجہ داہر کے سارے مشیر خندہ زن تھے۔ ایک مشیر بدھی من تھا جو خود بھی نسلاً برہمن تھا۔ فطرتاً انتہائی چالاک اور عیار تھا۔ سندھ کی حکومت کو اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس سنگین صورتِ حال سے بدھی من نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ راجہ داہر کا مکتوب تمام ہوا تو بدھی من نے والیٔ سندھ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"آج میں مہاراج کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ ایک حاکم نے دوسرے حاکم کو ایسا خط کبھی نہیں لکھا۔ لفظوں کا عجیب گورکھ دھندا ہے۔ حجاج اُلجھ کر رہ جائے گا۔"

❀---❀---❀

والیٔ عراق کے دربار میں حاکمِ سندھ کا خط پڑھا گیا۔ حجاج بن یوسف لفظوں کی اس شعبدہ بازی کو برداشت نہ کر سکا۔ راجہ داہر نے بڑے ریاکارانہ انداز میں اس کی طاقت کا مذاق اُڑایا تھا۔ جیسے ہی ایک برہمن زادے کا مکتوب ختم ہوا، قبیلۂ بنو ثقیف کا سخت گیر حاکم اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا۔ شدتِ غضب سے حجاج بن یوسف کا برا حال تھا۔

پھر والیٔ عراق نے سندھ و ہند کا نقشہ طلب کیا۔ حجاج کی شعلہ بار اور مضطرب نگاہیں نقشے پر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد اس کی نظریں "دیبل" کے مقام پر مرکوز ہو گئیں۔ سندھ کا یہ وہی قدیم شہر تھا جس کی بندرگاہوں کے قریب مسلمان تاجروں کے جہاز کو لوٹا گیا تھا۔ حجاج بن یوسف کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ پھر اس نے اپنا خنجر نکالا اور دیبل کے مقام پر اس طرح پیوست کر دیا جیسے کوئی شخص اپنے دشمن کے سینے کو ہدف بناتا ہے۔

یہ ایک کھلا اشارہ تھا کہ اب سندھ، لشکرِ اسلام کی یلغار سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔

حجاج بن یوسف کچھ دیر تک اسی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنے خنجر کو اس طرح کھینچا کہ پورے سندھ کا نقشہ چاک کر ڈالا۔

"یلغار..... برسرِ کفار" حجاج کا لہجہ قہر آلود تھا۔

پھر والیٔ عراق نے اپنے آزمودہ کار اور جانباز سالار عبداللہ بن نبہان کو طلب کرتے ہوئے انتہائی غم زدہ لہجے میں کہا۔

"عبداللہ! تمہیں میرے دُکھوں کا اندازہ ہے؟"

"امیر! میں جانتا ہوں کہ آپ عرب تاجروں کی گرفتاری کے باعث بہت پریشان ہیں۔" سالار عبداللہ بن نبہان نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے اندازوں سے بھی زیادہ پریشان ہوں۔" حجاج بن یوسف کا اضطراب ناقابلِ بیان تھا۔

"جس طرح راجہ داہر نے اسلامی سفارت کا مذاق اُڑایا ہے، میں اسے زندگی بھر فراموش نہیں کر سکوں گا۔"

''امیر! پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے؟'' سالار عبداللہ بن نبہان نے عرض کیا۔ ''ہم سپاہی ہیں اور جذبۂ جاں فروشی کے سوا کچھ نہیں رکھتے۔''

''عبداللہ! تم میرے حلقۂ اعتبار میں شامل ہو۔'' والیٔ عراق حجاج بن یوسف نے اپنے سالار کا جواب سن کر کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ سندھ کی فوجی مہم میں تم لشکرِ اسلام کی قیادت کرو۔ راجہ داہر کی تحریر کا جواب تم اپنی شمشیر سے دو گے۔''

عبداللہ بن نبہان نے قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا کہ وہ اس فوجی مہم میں جاں نثاری کا حق ادا کر دے گا۔

حجاج بن یوسف، سندھ پر حملے کے لیے لشکر ترتیب دے چکا تھا مگر عین موقع پر خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

❀---❀---❀

اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک 86ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کا باپ عبدالملک بن مروان ایک عالم و فاضل حکمراں تھا۔ اس کے برعکس خلیفہ ولید کی تعلیم برائے نام تھی مگر وہ آدابِ حکمرانی سے خوب واقف تھا۔ اسی کے عہدِ حکومت میں تین مسلمان سالاروں قتیبہ بن مسلم فاتح چین، موسیٰ بن نصیر فاتح اُندلس (اسپین) اور محمد بن قاسم فاتح سندھ نے ایک نئی عسکری تاریخ رقم کی اور اسلامی فتوحات کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔

پھر جب حجاج نے ولید بن عبدالملک کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو خلیفۂ وقت کچھ دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا۔ وہ اپنی سیاسی حکمتِ عملی کے مطابق اس فوجی مہم کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔

حجاج بن یوسف اس دوران اُمید و بیم کے عالم میں بیٹھا ولید بن عبدالملک کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ خلیفۂ وقت سے خاص قربت اور تعلق کے سبب والیٔ عراق کو اُمید تھی کہ اُس کی تجویز کو شرفِ قبولیت حاصل ہو جائے گا۔ مگر جب ولید کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی تو حجاج کے مشتعل جذبوں پر اوس پڑ گئی اور حرارتِ خون سے دمکتا چہرہ زرد ہو گیا۔

''بے شک! عرب تاجروں کی بربادی ایک الم ناک واقعہ ہے مگر اس کے حوالے سے کسی فوجی مہم کا آغاز نہیں کیا جا سکتا۔''

''امیر المومنین! اسلامی غیرت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے ہم مذہبوں کی فریاد کو پہنچیں۔'' حجاج بن یوسف کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک غیر جذباتی حاکم تھا مگر اس نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دربار میں انتہائی جذباتی دلیل پیش کی۔

''میرے خیال میں یہ ایک پُر پیچ اور دُشوار گزار مہم ہے۔'' خلیفہ ولید بن عبدالملک نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ہمارے مجاہدین اس مشکل مہم کو آسان بنا دیں گے۔" حجاج بن یوسف کی جذباتی کیفیت کا وہی انداز تھا۔

"میں اپنے فوجیوں کو ایک اجنبی اور تاریک منزل کی طرف بھیجنا نہیں چاہتا۔" خلیفہ ولید نے اپنے گورنر کے دلائل کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "بالفرض اگر یہ مہم کسی نہ کسی طرح سر بھی ہو جائے، تب بھی یہ ایک خسارے کی تجارت ہے۔"

امیر المومنین کے اس انکشاف پر حجاج بن یوسف حیران رہ گیا۔

ولید بن عبدالملک نے حاکمِ عراق کی حیرت کو دُور کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اندازہ نہیں کہ اس فوجی مہم پر کس قدر اخراجات ہوں گے۔ قومی خزانہ اس بارِ گراں کو برداشت نہیں کر سکے گا۔"

خلیفہ کی یہ مؤثر اور طاقتور دلیل سن کر حجاج بن یوسف دربارِ خلافت سے اُٹھ کر چلا آیا۔

حاکمِ عراق کے جاتے ہی اس کے مخالفین نے ولید بن عبدالملک کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔

"امیر المومنین کی عنایاتِ خسروانہ نے حجاج کا ذہنی توازن بگاڑ دیا ہے۔ وہ آپ کے والد محترم کے احسانات کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہا ہے۔"

دراصل خلیفہ عبدالملک بن مروان نے حجاج بن یوسف کو عراق کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اس وقت عراق شدید سیاسی انتشار کا شکار تھا۔ حجاج کی انتظامی صلاحیت اور سخت گیری نے مختصر سے عرصے میں حالات پر قابو پا لیا۔ جس کے نتیجے میں حجاج کو عبدالملک بن مروان کے معتمد ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ دوسرے امراء حجاج کی اس مقبولیت سے حسد رکھتے تھے۔

پھر جب اس نے سندھ پر لشکر کشی کے لیے دربارِ خلافت سے اجازت طلب کی تو مخالفین کو ایک سنہری موقع مل گیا۔ مگر ولید بن عبدالملک ایک عاقبت اندیش حکمراں تھا۔ اس نے اپنے درباریوں کی اس روش کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ اپنے دماغ سے فیصلے کرنے کا عادی تھا...... اور اس وقت بھی اس نے اپنی ذہنی صلاحیت سے کام لیتے ہوئے حجاج بن یوسف کے منصوبے کو مسترد کر دیا تھا۔

دربار سے واپس آنے کے بعد حجاج بن یوسف کئی دن تک ایک کمرے میں بند رہا۔ اس نے اپنے تمام دوستوں سے ملاقاتیں ترک کر دی تھیں۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ خلیفہ عبدالملک کو کس طرح آمادہ کیا جائے۔

آخر کئی روز بعد حجاج بن یوسف دوبارہ دربارِ خلافت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔

"امیر المومنین اس لیے گریزاں ہیں کہ سندھ کی جنگی مہم پر بہت زیادہ اخراجات ہوں گے۔"

"یقیناً" ولید بن عبدالملک نے پُرجلال لہجے میں جواب دیا۔ "کیا تمہیں ہماری بات میں کوئی شک ہے؟"

"امیر المومنین کا فیصلہ تمام شبہات سے بالاتر ہے۔" حجاج بن یوسف نے ہوا کے رُخ کو پہچانتے

ہوئے انتہائی پُر جوش لہجے میں خلیفۂ وقت کے الفاظ کی تائید کی

''تو پھر ایک ناقابلِ عمل منصوبے کا بار بار ذکر کر کے ہمارا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟'' یہ کہتے کہتے اُموی خلیفہ کے چہرے پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا تھا۔

''اگر میں امیر المومنین کو یقین دلا دوں کہ یہ نقصان کا سودا نہیں ہے؟'' حجاج نے پُراعتماد لہجے میں عرض کیا۔

''تمہیں جواز پیش کرنے کی اجازت ہے۔ مگر یاد رہے کہ ہم فضول اور کمزور دلیل سننے کے عادی نہیں ہیں۔'' ولید بن عبدالملک کے لہجے سے بے زاری جھلک رہی تھی۔

''میں امیر المومنین سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس جنگی مہم پر جس قدر دولت خرچ ہو گی، اس سے دُگنی رقم قومی خزانے میں داخل کروں گا۔'' حجاج بن یوسف نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''حجاج! تم جذباتیت کا شکار ہو۔ ایک معمولی سا واقعہ تمہارے ذہن پر مسلّط ہو کر رہ گیا ہے اور تم مسلسل اس کی بازگشت سن رہے ہو۔'' خلیفہ ولید بن عبدالملک مسکرایا۔ ''صرف الفاظ سے خزانے کا منہ نہیں بھرا جا سکتا۔ ہم تمہارے دعوے پر کیسے یقین کر لیں جبکہ اس کا کوئی ضامن موجود نہیں ہے۔''

''میں خود اس کا ضامن ہوں۔'' حجاج بن یوسف واقعتاً بہت زیادہ جذباتی نظر آ رہا تھا۔ ''میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ پروردگارِ عالم وہ وقت کبھی نہ لائے کہ مسلمانوں کے جان و مال رائیگاں جائیں۔ اگر میں ناکام ہو گیا تو خود کو دربارِ عالیہ میں ایک مجرم کی حیثیت سے پیش کر دوں گا۔ پھر امیر المومنین کو اختیار ہو گا کہ وہ مجھے میرے عہدے سے معزول کر دیں یا میری موت کا فرمان جاری کر دیں۔''

حجاج کے لہجے میں سچائی کی اس قدر تیز آگ تھی کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک بھی اس کی تپش کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ''اپنے الفاظ یاد رکھنا حجاج! اگر مسلمانوں کا لہو رائیگاں گیا تو میں تم سے مجاہدین کے خون کا قصاص طلب کروں گا۔''

یہ سن کر حجاج بن یوسف نے سر جھکا دیا۔ اور اموی خلیفہ نے دیبل پر لشکر کشی کا فرمان جاری کر دیا۔

❀---❀---❀

حجاج بن یوسف کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر عبداللہ بن نبہان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میرے جانباز! تجھے یہ فتحِ عظیم مبارک ہو۔''

''امیر! ہماری منزل ابھی بہت دُور ہے۔'' سالار عبداللہ بن نبہان نے انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں گے مگر نتائج کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔''

''مت کرو ایسی باتیں۔'' حجاج کا جوش عروج پر تھا۔ وہ دیبل کی شکست و ریخت کے سوا کوئی منظر دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ''اُدھر دیکھو! وہ ہے سامنے ہماری منزل۔'' والیٔ عراق نے ایک طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔ ''میری آنکھیں بتوں کو سجدہ ریز دیکھ رہی ہیں۔ وہ زمین پر اوندھے پڑے اللہ کی وحدانیت اور کبریائی بیان کر رہے ہیں۔ میری نظروں کے سامنے مشرکین کی لاشوں کے انبار لگے ہیں۔ عبداللہ! کیا تمہیں نظر نہیں آتے؟''

عبداللہ بن نبہان اپنے امیر کی جذباتی کیفیت سے باخبر تھے، اس لیے خاموش کھڑے رہے۔

پھر اس جانباز سالار نے دیبل (سندھ) پر یلغار کی۔ راستوں کے پیچ وخم اور سپاہیوں کی کمی کے باعث عبداللہ بن نبہان فتح ونصرت سے ہم کنار نہ ہو سکے۔ لشکرِ اسلام کو شکست کی ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر اس طرح کہ عبداللہ بن نبہان ایک قدم پیچھے ہٹنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ وہ ایک بار آگے بڑھے تو پھر بڑھتے ہی چلے گئے۔ تنہا انسان نے دشمن کی صفیں اُلٹ دیں...... مگر فردِ واحد جنگ کے نتیجے کو تبدیل نہیں کرسکتا تھا۔ شکست کی ذلت اُٹھانے اور اپنے چہرے پر ہار کی سیاہی ملنے کے بجائے عبداللہ بن نبہان نے شہادت کی موت کو ترجیح دی۔ ان کی شمشیر برق و بلا کی طرح لہراتی اور دشمنوں کے کاندھوں سے سروں کا بوجھ کم کرتی رہی۔ جوشِ جہاد میں عبداللہ بن نبہان اتنے آگے نکل گئے تھے کہ دوسرے مسلمان سپاہی ان کی مدد کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔

انجام کار یہ جانباز سالار سینکڑوں دشمنوں کے نرغے میں گِھر گیا۔ زخم پر زخم لگتے رہے۔ بہتے ہوئے خون نے عبداللہ بن نبہان کے جسم اور چہرے پر عجیب عجیب نقش و نگار بنائے تھے۔ پھر ان کے بدن کا کوئی حصہ جراحتوں سے محفوظ نہیں رہا۔ یکایک تیز آندھی چلی۔ اس سخت جان درخت کی جڑیں پہلے ہی کٹ چکی تھیں۔ مسلسل کئی جھونکے آئے اور عبداللہ بن نبہان گھوڑے کی پشت سے نیچے گر پڑے۔ دیبل کے سپاہی، عبداللہ بن نبہان کے زخمی جسم پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے کئی وقت کے بھوکے فقیر لقمۂ تر پر لپکتے ہیں۔

❀---❀---❀

جب عبداللہ بن نبہان کی شہادت کی خبر عراق پہنچی تو شدتِ غم کے سبب حجاج بن یوسف کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ انتہائی رقت آمیز لہجے میں بولا۔

''عبداللہ! تم پر اللہ کی سلامتی ہو۔ بے شک! تم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا مگر میرے ایفائے عہد کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔''

پھر یکایک حجاج کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ والیٔ عراق کی اشکبار آنکھیں نفرت وغصہ کے شعلے برسانے لگیں۔ اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ حجاج نے دیبل کی طرف رخ کیا اور انتہائی قہر آلود لہجے میں بولا۔

''اے دیبل کے لٹیرو! اُس ذاتِ پاک کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ میں اس وقت تک اپنے ارادوں سے باز نہیں آؤں گا، جب تک تمہیں نیست و نابود نہ کر ڈالوں یا پھر خود بے نشان

ہو جاؤں۔"

حجاج بن یوسف کی پہلی جنگی مہم ناکام ہو چکی تھی..... اور عبداللہ بن نبہان اپنے وطن اور عزیز و اقارب سے سینکڑوں میل دُور دیارِ غیر میں آسودۂ خواب تھے۔

(بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ کلفٹن (کراچی) کے مقام پر حضرت عبداللہ شاہ غازی رحمتہ اللہ علیہ کا جو مزار ہے، وہ دراصل عبداللہ بن نبہان کا مقبرہ ہے۔ اکثر محققین کا کہنا ہے، یہ محض عوام کی خوش عقیدگی ہے ورنہ اس کی کوئی تاریخی سند موجود نہیں۔)

عبداللہ بن نبہان کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف نے اپنے دوسرے جانباز سالار بدیل بن طہفہ کے نام خط تحریر کیا۔

"اپنی تمام تر مصروفیات ترک کر کے فوراً دیبل پہنچو۔ تم پر اپنے بھائی عبداللہ بن نبہان کے خون کا قصاص قرض ہے۔ راجہ داہر کے فوجیوں اور دیبل کے لٹیروں سے اس طرح انتقام لو کہ حلقۂ کفار میں صفِ ماتم بچھ جائے اور ان کی آئندہ نسلیں تمہارے قہر و غضب کو ہمیشہ یاد رکھیں۔"

بدیل بن طہفہ اس وقت عمان میں تھے۔

اس کے ساتھ ہی حجاج بن یوسف نے دوسرا خط عاملِ مکران، محمد بن ہارون کے نام تحریر کیا۔

"جیسے ہی بدیل بن طہفہ مکران پہنچیں، تین ہزار تازہ دم سپاہی ان کے ہمراہ روانہ کر دو۔ میں ہر حال میں لشکرِ اسلام کو سربلند دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری طرف سے کسی قسم کی کوتاہی برتی گئی تو یہ ایک ناقابلِ معافی جرم تصور کیا جائے گا۔"

حجاج بن یوسف کا حکم ملتے ہی بدیل بن طہفہ تین سو سپاہیوں کے ہمراہ دیبل پہنچے جہاں محمد بن ہارون کے فراہم کردہ تین ہزار فوجی ان کا انتظار کر رہے تھے۔

جیسے ہی اہلِ دیبل کو لشکرِ اسلام کی آمد کی خبر ملی، انہوں نے ایک تیز رفتار قاصد کو فوجی کمک کے لیے راجہ داہر کے پاس اروڑ بھیجا۔ (مؤرخین کا خیال ہے کہ موجودہ شہر روہڑی کا پرانا نام اروڑ تھا)۔

عبداللہ بن نبہان کی شکست نے راجہ داہر کا دماغ خراب کر دیا تھا اور وہ سمجھنے لگا تھا کہ جیسے بحیرۂ عرب پر اسی کی حکمرانی ہے۔ قلعہ دیبل کے حاکم کی درخواست سن کر برہمن حکمراں کسی شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔

"کیا ابھی عراق والوں کے ہوش ٹھکانے نہیں آئے؟"

"آ جائیں گے مہاراج!..... آ جائیں گے۔" راجہ داہر کا عیار مشیر، بدھی من انتہائی عیارانہ اور خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "پہلے سمندر مسلمانوں کی لاشوں سے تو بھر جائے۔ پھر حجاج کا دماغ بھی درست ہو جائے گا۔"

راجہ داہر نے فوری طور پر اپنے لڑکے، جے سینا کو طلب کیا اور بڑے جابرانہ انداز میں حکم دیتے ہوئے کہا۔ "جے سینا! یہ عراق والے بار بار میرے آرام میں خلل ڈال رہے ہیں۔ تُو ان کی آوازوں کو ہمیشہ کے لیے بند کر دے۔"

ایک تو برہمن، دوسرے نوجوان، جے سینا اپنے باپ داہر سے بھی زیادہ مغرور ثابت ہوا۔ ''اگر مہاراج کا حکم ہو تو میں عراق میں گھس کر مسلمانوں کی اس گستاخی کا جواب دوں؟''

''ابھی مجھے وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' راجہ داہر نے ستائشی نظروں سے جے سینا کی طرف دیکھا۔ ''فی الحال تُو اپنے ہاتھیوں کی طاقت کا مظاہرہ کر اور عربی گھوڑوں کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دے۔''

مشیر بدھی من نے کسی درباری بھانڈ کی طرح راجہ داہر کی شان میں قصیدہ پڑھا۔

''سندھ کے ہاتھی اور عربی گھوڑوں کی ہڈیوں کا سرمہ؟..... اس سے خوب صورت بات کوئی کہہ ہی نہیں سکتا..... اور کیوں نہ ہو کہ مہاراج ہندوسندھ کے سب سے بڑے گیانی بھی تو ہیں۔''

پھر وہ مکار، برہمن نوجوان جے سینا سے مخاطب ہوا۔

''یوراج (شہزادے)! جلدی کرو۔ آپ کا یہ داس بدھی من اپنی آنکھوں میں گھوڑوں کا سرمہ لگانے کے لیے بے چین ہے۔''

راجہ داہر اور اس کے درباری بدھی من کی باتوں پر قہقہے لگا رہے تھے۔ اور وہ فریب کار برہمن بڑی گہری چالیں چل رہا تھا۔ بدھی من کی چال یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح راجہ داہر اور حجاج بن یوسف کے درمیان اس جنگی فضا کو برقرار رکھے۔ یہاں تک کہ عرب شہسوار سندھ پر چڑھ دوڑیں اور پھر ان گھوڑوں کے سم راجہ داہر کے تخت و تاج کو روند ڈالیں..... اور بدھی من کے سینے میں انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے سرد ہو جائیں۔ بعض تاریخی روایتوں کے مطابق ایک زمانے میں سندھ پر بدھی من کے بزرگوں کی روحانی حکومت تھی۔ راجہ داہر کے دادا سیلائج (شیلادت) نے فریب اور دھوکے سے مذہبی اقتدار حاصل کر لیا اور بدھی من کے خاندان والوں کو غلام بنا لیا۔ بدھی من بڑی ہوشیاری کے ساتھ راجہ داہر کے دربار تک پہنچا اور پھر اس نے مشیر کا منصب حاصل کر لیا۔

اسی دن سے وہ حکومت کے خلاف سازشوں میں مصروف تھا مگر راجہ داہر کے اقتدار کی جڑیں بہت مضبوط تھیں، اس لیے بدھی من کی کوئی سازش کامیاب نہ ہو سکی۔ مجبور ہو کر وہ تنہائی میں اپنے دیوتاؤں کو پکارنے لگا۔

''اے برہما! ہمارے وشنو!..... اے شنکر! میری مدد کو آؤ۔ اور میرے پُرکھوں کا راج سنگھاسن مجھے واپس لوٹاؤ۔''

پھر جب عبداللہ بن نبہان نے سندھ پر پہلا حملہ کیا تو بدھی من خوشی سے ناچنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے دیوتاؤں نے اس کی پکار سن لی ہے۔ مگر جب بدھی من نے عبداللہ بن نبہان کی شکست کی خبر سنی تو وہ اُداس ہو گیا۔ پھر بہت دنوں تک اس پر گہرے رنج و الم کی کیفیت طاری رہی۔ بدھی من کا خیال تھا کہ حجاج بن یوسف اس شکست کے بعد مایوس اور بد دل ہو کر سندھ پر لشکر کشی کا ارادہ بدل دے گا۔ مگر جب خلافِ توقع عرب سالار بدیل بن طہفہ دیبل کی حدود میں داخل ہوئے تو بدھی من خوشی سے جھوم اُٹھا۔ وہ بظاہر

عراقی لشکر کا مذاق اُڑا رہا تھا مگر اُس کی دلی خواہش تھی کہ حجاج بن یوسف کے سپاہی سندھ کے ایک ایک گوشے کو پامال کر ڈالیں۔

راجہ داہر کا بیٹا جے سینا چار ہزار کا لشکر لے کر دیبل کی طرف بڑھا۔ اس کے سپاہی گھوڑوں، اونٹوں اور ہاتھیوں پر سوار تھے۔ جے سینا دیبل پہنچا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ بدیل بن طہفہ کا مختصر سا لشکر دیبل کے مقامی سپاہیوں کو میدانِ جنگ سے فرار ہونے پر مجبور کر چکے تھے۔ تازہ دم کمک پا کر مغرور سپاہی پلٹ پڑے۔ اور پھر بدیل بن طہفہ اور جے سینا کے درمیان گھمسان کا رَن پڑا۔

صبح سے شام تک خونریز جنگ ہوتی رہی۔ دونوں طرف کے سینکڑوں سپاہی مارے جا چکے تھے۔ ابھی یہ معرکہ کسی فیصلہ کُن مرحلے تک نہیں پہنچا تھا کہ مسلمانوں پر ایک آفتِ ناگہانی ٹوٹ پڑی۔ بدیل بن طہفہ کا عرب النسل گھوڑا ایک بدمست ہاتھی کو دیکھ کر اچانک بھڑکا۔ گھوڑے کی اس اضطراری حرکت کے باعث بدیل بن طہفہ کے ہاتھوں سے لگام چھوٹ گئی اور وہ زمین پر گر پڑے۔ جے سینا کے سپاہیوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور عرب شہسوار کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر مشرکین کی سینکڑوں شمشیریں بے نیام ہوئیں اور مجاہدِ اسلام کے تنہا جسم پر مشقِ ستم کرتی رہیں۔ بدیل بن طہفہ شہید کر دیئے گئے مگر اس طرح کہ ان کے بدن پر ہزاروں زخموں کی گل کاریاں تھیں۔

مسلمانوں کی دوسری فوجی مہم کی ناکامی پر راجہ داہر نے رقص و سرود کے ایک عظیم الشان جشن کا اہتمام کیا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے سیم تن رقاصائیں اروڑ بلائی گئیں۔ پھر کیف و نشاط کا یہ لذت انگیز ہنگامہ کئی دن تک جاری رہا۔ اسی جشن میں راجہ داہر نے اپنے فاتح بیٹے جے سینا کو قیمتی خلعت پہنائی اور بھرے دربار میں کہا۔

''جے سینا میرا لائق فرزند اور چچ خاندان کا جانباز وارث ہے۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ دیوتا مجھ سے راضی ہیں..... اور ان ہی کی آشیرواد سے جے سینا برہمنوں کے جاہ و جلال میں مسلسل اضافہ کرتا رہے گا۔''

راجہ داہر کے تمام درباری بدمست تھے۔ بدھی من بھی کسی نقال کی طرح جھوم رہا تھا۔ اس کا دل اندر سے رو رہا تھا..... اور بار بار اپنے دیوتاؤں کو پکار رہا تھا۔

''بھگوان! تم کب تک راجہ داہر کی سنتے رہو گے؟..... آخر میں بھی تو تمہارا داس ہوں۔ بس اب دیا کرو اپنے اس سیوک پر۔''

❀---❀---❀

حجاج بن یوسف نے بدیل بن طہفہ کی شہادت کی خبر سنی تو چند لمحوں کے لیے اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر وہ اس قدر رویا کہ شدتِ گریہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ حجاج کو عبداللہ بن نبہان سے زیادہ بدیل بن طہفہ کی موت کا صدمہ تھا۔ کسی شخص نے آج تک والئ عراق کو اس قدر بے قرار و

سوگوار نہیں دیکھا تھا۔

وقت نے حجاج کے دشمنوں کو ایک اور موقع فراہم کر دیا۔ وہ خلیفہ ولید بن عبدالملک سے سرگوشیوں میں کہہ رہے تھے۔

''امیر المومنین! حجاج ایک ضدی اور خود پرست انسان ہے۔ وہ بار بار سندھ پر لشکر کشی اس لیے کر رہا ہے کہ دیبل میں قید ہو جانے والی مسلم خواتین میں سے کسی غم زدہ عورت نے حجاج کا نام لے کر اُسے پکارا تھا کہ وہ ان کی مدد کو پہنچے۔ والیٔ عراق نے ایک عورت کی فریاد کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے جس کے نتیجے میں وہ قومی خزانے کو بے دریغ لٹا رہا ہے۔ اور قیامت یہ ہے کہ مسلمان جانبازوں کو ایک اندھے محاذ پر مسلسل جھونکے جا رہا ہے۔ عبداللہ بن نبہان اور بدیل بن طہفہ جیسے سالار اس کی بچگانہ ضدوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ آخر اس نقصانِ عظیم کو کون پورا کرے گا؟ حجاج کا احتساب کیجئے امیر المومنین! ورنہ اہلِ ایمان کی تاریخ شکست و ہزیمت کے عنوانات سے بھر جائے گی۔'' حجاج کے بدخواہوں کی لفاظی اور چرب زبانی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

والیٔ عراق کے مخالفین کا خیال تھا کہ اُن کی پُر جوش منطقی تقریریں اُموی خلیفہ کو غضب ناک کر دیں گی مگر ولید بن عبدالملک نہایت سکون کی حالت میں بیٹھا رہا۔ پھر بہت آہستہ لہجے میں بولا۔

''حجاج نے اپنے آپ کو ہمارے پاس رہن رکھ دیا ہے۔ جب اس کے منصوبے ناکام ہو جائیں گے اور وہ تھک جائے گا تو خود ہی ایک مجرم کی حیثیت سے ہماری بارگاہ میں حاضر ہو جائے گا۔ پھر ہم اس سے خرچ ہونے والے ایک ایک دینار ...... اور شہید ہونے والے ایک ایک سپاہی کی جان کا حساب مانگیں گے۔ اور یاد رکھو کہ ہمارا احتساب بہت سخت ہوتا ہے۔''

والیٔ عراق سے حسد رکھنے والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

دوسری طرف حجاج بن یوسف کے اضطراب کا یہ عالم تھا کہ اس نے عراق کے تمام خطیبوں کو جمع کر کے بڑے پُرسوز لہجے میں کہا تھا۔

''تم پر لازم ہے کہ اپنے خطبات میں بدیل بن طہفہ کی شہادت کا ذکر اس زور و شور سے کرو کہ اہلِ ایمان کی آنکھیں اپنے بھائی کی موت پر بھیگ جائیں۔ اور ان کے سینے آتشِ انتقام سے جلنے لگیں۔''

اس کے بعد حجاج نے اس مسجد کے مؤذن کو حکم دیا جہاں وہ پانچ وقت کی نماز ادا کرتا تھا۔

''تجھ پر فرض ہے کہ جب تُو اذان دے چکے تو مجھے بدیل بن طہفہ کا نام یاد دلائے تاکہ میں بدیل کے لیے اس وقت تک دعا کرتا رہوں جب تک کہ مشرکین سے اس کا بدلہ نہ لے لوں۔''

والیٔ عراق کے حکم کے مطابق مؤذن اذان دینے کے بعد با آواز بلند پکارا کرتا تھا۔

''میں اپنے امیر کو بدیل بن طہفہ کا نام یاد دلاتا ہوں تاکہ والیٔ عراق اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لے سکیں۔''

موذن کی صدا سن کر حجاج بن یوسف زار و قطار رونے لگتا اور پھر شدید اضطراب کے عالم میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا۔

''اے مالکِ بحر و بر! تمام تعریفیں اور بڑائیاں صرف تیرے ہی لیے ہیں۔ تُو اپنے عاجز و ناتواں بندوں کو استقامت دے اور اُنہیں باطل کے لشکروں کے سامنے فتح و نصرت اور سربلندی عطا فرما۔

کئی ماہ تک حجاج بن یوسف پر سوگواری کی یہی کیفیت طاری رہی۔ اس دوران کسی نے اسے مسکراتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ والئ عراق کی مسلسل خاموشی کے باعث اب عام تاثر بھی یہی تھا کہ حجاج کے حوصلے پست ہو چکے ہیں۔ اور وہ اپنی منصوبہ بندی میں بری طرح ناکام ہو گیا ہے...... مگر کوئی اس راز سے باخبر نہیں تھا کہ حجاج کی نیندیں اُڑ چکی ہیں اور وہ رات رات بھر ٹہلتا رہتا ہے۔ اس کا دماغ ایک لمحے کے لیے خالی نہیں ہوتا۔ وہ مسلسل سوچتا رہتا ہے کہ راجہ داہر سے عبداللہ بن نبہان اور بدیل بن طہفہ کی شہادت کا حساب لے۔ پھر ایک دن اسے اپنے چچا زاد بھائی عماد الدین محمد بن قاسم کا خیال آیا۔

حجاج بن یوسف نے اپنے اکثر خطوط میں محمد بن قاسم کو ''کریم الدین محمد'' کے نام سے مخاطب کیا ہے۔ دراصل یہ ایک لقب تھا جو والئ عراق کی طرف سے عطا کیا گیا تھا۔ ورنہ ان کا خاندانی نام عماد الدین محمد بن قاسم تھا۔ کنیت ''ابوالبہار'' تھی۔ کیونکہ وہ ''بہار البر'' کے پھولوں کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ محمد بن قاسم، حجاج بن یوسف کے بھتیجے اور داماد تھے...... مگر بعض نکتہ رس مؤرخین نے اپنی تحقیق سے ثابت کر دیا ہے کہ محمد بن قاسم، حجاج بن یوسف کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے۔

عماد الدین محمد بن قاسم 75ھ میں طائف کے مقام پر پیدا ہوئے۔ پھر جب حجاج بن یوسف عراق کا حاکم (گورنر) مقرر ہوا تو اس نے ثقفی خاندان کے ممتاز لوگوں کو مختلف عہدوں پر فائز کیا۔ ان نوازے جانے والے لوگوں میں عماد الدین محمد کے والد قاسم بھی تھے۔ حجاج نے قاسم کو بصرے کا عامل مقرر کیا۔ عماد الدین محمد اس وقت بچے تھے۔ ان کی ابتدائی تربیت بصرے میں ہوئی۔ یکایک وقت نے کروٹ لی اور محمد بن قاسم انتہائی نوعمری میں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔ قاسم کا انتقال ہوتے ہی اس خاندان پر غربت و افلاس کے گہرے سائے مسلّط ہو گئے۔ تنگ دستی کے باعث محمد بن قاسم اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ جب وہ پانچ سال کے تھے تو اس قدر ذہانت کی گفتگو کرتے تھے کہ سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ پھر اپنی اسی فطری ذہانت کے سہارے دمشق میں فوجی تربیت حاصل کی۔ (دمشق اس وقت اسلامی حکومت کا دارالخلافہ تھا) 14 سال کی عمر میں ابنِ قاسم نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ جس کے نتیجے میں انہیں اعلیٰ فوجی عہدے پر فائز کیا گیا۔

90ھ کے دوران ایران میں ''کردوں'' نے بغاوت کی۔ حجاج بن یوسف نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے محمد بن قاسم کو روانہ کیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف 15 سال تھی۔ محمد بن قاسم نے ایران پہنچتے ہی کردوں کو شکست دی پھر شہر ''اصطخر'' اور دوسرے علاقوں کو فتح کرتے ہوئے ''جرجان'' کی طرف بڑھے۔ اور

ایک خاص نقشے کے مطابق شہر ''شیراز'' کی بنیاد ڈالی۔ ورنہ اس سے پہلے شیراز ایک معمولی چھاؤنی تھا۔
حجاج بن یوسف نے فوری طور پر محمد بن قاسم کو عراق طلب کیا۔ مخالفین کو اس واقعے کی خبر ملی تو انہوں نے حسبِ عادت والیٔ عراق کے احمقانہ فیصلوں کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔
''اب یہ مخبوط الحواس بوڑھا اپنے نوخیز بھائی کو دیبل کے مقتل کی بھینٹ چڑھا رہا ہے۔ جب عبداللہ بن نبہان اور بدیل بن طہفہ جیسے جہاندیدہ سالار راستے کے غبار میں گم ہو گئے تو یہ سولہ سالہ لڑکا کیا کرے گا؟ ابھی تو اس کے گلیوں میں کھیلنے کے دن ہیں۔''
حاسدین سے قطع نظر فوجی ماہرین کا بھی یہی خیال تھا کہ حجاج بن یوسف اپنے مجنونانہ فیصلوں پر اس نوعمر لڑکے کو بھی قربان کر ڈالے گا۔
اُدھر مخالفین، حجاج بن یوسف پر طنز و تحقیر کے نشتر برسا رہے تھے ......اور اِدھر والیٔ عراق اپنی خلوت میں محمد بن قاسم کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔
''میرے عزیز بھائی! تمہیں اندازہ نہیں کہ مجھے بدیل بن طہفہ کی شہادت کا کتنا غم ہے۔ وہ ہر وقت مجھے پکارتا رہتا ہے.....اور میں دل کے کانوں سے اس کی آوازیں سنتا رہتا ہوں۔ پھر میں اسے جواب بھی دیتا ہوں کہ اس وقت تک میرے غضب کی آگ بھڑکتی رہے گی، جب تک میں راجہ داہر سے تیرے قتل کا بدلہ نہ لے لوں......اور اپنے دامن کا یہ داغ نہ دھو ڈالوں۔''
حجاج کی بے قراریاں دیکھ کر نوعمر محمد بن قاسم بھی دل گرفتہ ہو گیا۔
''برادرِ محترم! اللہ کے نزدیک یہ ایک معمولی بات ہے کہ وہ آپ کے دامن کے تمام داغوں کو دھو ڈالے اور آپ کے چہرے کو پہلے سے بھی زیادہ تابناک بنا دے۔ یہ میری عین خوش نصیبی ہوگی کہ میں لشکرِ اسلام کی کوئی خدمت انجام دے سکوں۔ یہ فوجی مہم چاہے کتنی ہی پُرخطر اور جان لیوا ہو، آپ مجھے ہر حال میں اپنا مطیع و فرمانبردار پائیں گے۔''
محمد بن قاسم کا جواب سن کر بہت دن بعد حجاج کے خشک ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری۔

❀---❀---❀

پھر اہلِ عراق نے دیکھا کہ حجاج بن یوسف تیسری فوجی مہم دیبل کی طرف روانہ کر رہا تھا......اور اس بار لشکرِ اسلام کی قیادت سولہ سالہ عماد الدین محمد بن قاسم کے حوالے کی گئی تھی جو حجاج کا اپنا ہی خون تھا۔
پھر دیکھنے والوں نے ایک اور عجیب منظر دیکھا۔ اس مرتبہ لشکرِ اسلام کو رخصت کرنے کے لیے خود حجاج بن یوسف عراق کی سرحدوں تک آیا تھا۔
جب محمد بن قاسم نے والیٔ عراق کو خدا حافظ کہا تو حجاج بن یوسف شدتِ جذبات سے رو پڑا۔
''میرے پیارے بھائی! تمہیں معلوم ہے کہ یہ بوڑھا بہت دنوں سے سکون کی نیند نہیں سویا ہے؟''
والیٔ عراق کی یہ کیفیت دیکھ کر محمد بن قاسم بھی جذباتی ہو گیا اور نہایت پُرسوز لہجے میں کہنے لگا۔

''امیرِ محترم! اللہ کی بخشی ہوئی تائید ونصرت کے سہارے میں وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد آپ کی کھوئی ہوئی نیندیں واپس لوٹا دوں گا۔''

اکثر مؤرخین نے حجاج بن یوسف کو نہایت شقی القلب اور سفاک انسان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔مگر جب ہم بدیل بن طہفہ کی شہادت کے بعد اس کی گریہ وزاری دیکھتے ہیں تو پھر ان تاریخی روایتوں کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔اس وقت بھی وہ محمد بن قاسم کے گھوڑے کی لگام پکڑے رو رہا تھا۔

''عماد الدین محمد! اب میری نیندیں ہی نہیں، زندگی کی ساری اُمیدیں بھی تجھی سے وابستہ ہیں۔ مجھے مایوس مت کرنا میرے بھائی!''

حجاج بن یوسف کی یہ اضطراری حالت دیکھ کر محمد بن قاسم بھی گھوڑے کی پشت سے نیچے اُتر آیا اور والیٔ عراق کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے بولا۔

''امیرِ عالی مقام! لاف زنی مسلمانوں کا شیوہ نہیں.....مگر آپ میری بات کا یقین کر لیجئے کہ میں ناکام و نامراد واپس نہیں آؤں گا یا تو کفر کے سینے پر اسلام کا پرچم نصب کر دوں گا.... یا پھر اپنے بھائیوں عبداللہ بن نبہان اور بدیل بن طہفہ کی طرح سرزمینِ سندھ کو اپنا مدفن بنا لوں گا۔

''نہیں میرے بھائی!'' جوشِ جذبات میں حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو گلے سے لگا لیا۔''اللہ تجھے وقت کے غبار میں گم ہونے سے محفوظ رکھے۔اگر تُو گم ہو گیا تو وقت میرا نام ونشان بھی مٹا ڈالے گا۔ میرے بارے میں تاریخ کیا کہے گی کہ قبیلۂ بنو ثقیف سے تعلق رکھنے والا یہ بوڑھا اپنی عقل کھو چکا تھا۔اس نے ہزاروں مسلمان جانبازوں کو وادیٔ مرگ کی طرف بھیج کر اسلام کی عسکری قوت کو شدید نقصان پہنچایا اور ایک کارِ فضول کی خاطر قومی خزانے کو برباد کر ڈالا۔''

''نہیں برادر بزرگ! ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔اللہ اپنے بندوں کے دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔'' محمد بن قاسم نوعمر سالار ہونے کے باوجود ذہانت وتدبر اور یقین کی دولت سے مالا مال تھا۔

''کاش! ایسا ہی ہو۔'' حجاج بن یوسف نے سرد آہ کھینچی۔

پھر عماد الدین محمد نے آخری بار والیٔ عراق کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور نہایت پُرجوش انداز میں گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔وہ ایک اجنبی، پُرپیچ، تاریک اور ہلاکت خیز منزل کی طرف رواں تھا۔

حجاج بن یوسف اس وقت تک کسی پتھر کے ستون کی طرح ساکت کھڑا رہا، جب تک لشکرِ اسلام کا ایک ایک سپاہی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ پھر والیٔ عراق نے دیبل کی طرف رُخ کیا اور غائبانہ طور پر سندھ کے حکمراں راجہ داہر سے مخاطب ہوا۔

''اے سندھ و ہند کے مشرکو!.....سرکشو!.....نافرمانو!......اور اے میرے محبوب سالاروں کے قاتلو! اس طوفان کو دیکھو جو دریائے دجلہ وفرات کے سینے سے اُٹھا ہے۔میں اس ہلاکت خیز طوفان کو دیبل کی طرف بھیج رہا ہوں۔ یہ خون آشام موجیں تمہارے ساحلوں، شہروں، عشرت کدوں اور مضبوط پناہ گاہوں کو

مسمار کر ڈالیں گی اور تم ایک دشتِ بے اماں میں لاوارثوں کی طرح تنہا کھڑے رہ جاؤ گے۔ ربِ جلیل کی قسم! میرے قہر و نفرت کی آگ اسی وقت ٹھنڈی ہو گی جب میں تمہاری مکمل تباہی و بربادی کی داستان اپنے کانوں سے سن لوں گا۔"

❁---❁---❁

محمد بن قاسم چھ ہزار شہسواروں کے ساتھ مکران پہنچا۔ یہاں کے گورنر محمد ہارون نے محمد بن قاسم کا نہایت پُر جوش استقبال کیا۔ مگر اسے حیرت بھی تھی کہ ایک سولہ سالہ نوجوان اس خوف ناک جنگی مہم میں کس طرح لشکرِ اسلام کی قیادت کرے گا؟

اس بار حجاج بن یوسف نے دیبل پر لشکر کشی کے لیے بھرپور تیاریاں کی تھیں۔ اس نے چھ ہزار برق رفتار سانڈنیوں کے علاوہ بار برداری کے لیے ہزاروں اونٹ بھی مجاہدین کے ہمراہ کر دیئے تھے تا کہ راستے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ محمد بن قاسم نے ایک ماہ تک مکران میں قیام کیا۔ پھر "پنج گور" پر حملہ کر کے اس علاقے کو اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا۔

راجہ داہر کے جاسوسوں نے محمد بن قاسم کی آمد اور پنج گور پر قبضے کی خبر دی تو سندھ کے حکمراں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

ابھی راجہ داہر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ بوڑھا مشیر، بدھی من درمیان میں بول پڑا۔

"اب مسلمان یہی کریں گے۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی پچھلی ذلتوں اور ناکامیوں کے داغ دھوئیں گے..... مگر وہ دھبے کیسے مٹیں گے جو مہاراج کے داسوں نے ان کے چہروں پر لگائے ہیں۔"

بدھی من کے منہ سے اپنی تعریف سن کر راجہ داہر خوشی سے جھوم اُٹھا۔ پھر گزشتہ فتوحات کے نشے نے اسے بدمست و بے خود بنا دیا۔ وہ محمد بن قاسم کی آمد کو علاقہ مکران کی سیاسی مہم سے وابستہ کر کے گہری نیند سو گیا۔ راجہ داہر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آئندہ چند ماہ میں اس طوفانِ بلا خیز کا رُخ دیبل کی طرف ہو گا۔

پنج گور پر قبضہ کرنے کے کچھ دن بعد محمد بن قاسم نے "ارمن بیلہ" کا محاصرہ کر لیا۔ قدیم زمانے میں ارمن بیلہ، ریاست لسبیلہ کی راج دھانی "بیلہ" کے قریب تھا۔ چند ہفتوں کے محاصرے سے تنگ آ کر ارمن بیلہ کے راجہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور یہ علاقہ بھی کسی خاص دشواری کے بغیر اسلامی سلطنت کی حدود میں شامل ہو گیا۔

ارمن بیلہ کی شکست کے بعد بھی راجہ داہر نے محمد بن قاسم کی فتوحات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کے دو بنیادی اسباب تھے۔ ایک تو وسائل اور افواج کی کثرت، دوسرے راجہ داہر کی کم نظری۔ اب تک اُس نے دو جنگیں محض اس لیے جیتی تھیں کہ عبداللہ بن نبہان اور بدیل بن طہفہ نے مکمل منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ وہ مکران سے نکلے اور براہِ راست دیبل پر حملہ آور ہو گئے۔ اس کے برعکس محمد بن قاسم نے پیچیدہ

طریقِ کار اختیار کیا۔ مختلف علاقوں میں قیام کر کے مسلمان سپہ سالار نے حالات اور فضا کا بھرپور جائزہ لیا۔ پہلے ان شہروں پر لشکر کشی کی جو محمد بن قاسم کے راستے کی رکاوٹ بن سکتے تھے۔ جب یہ ہلکے پتھر راہ سے ہٹ گئے تو وہ برق رفتاری سے آگے بڑھا اور اس نے دیبل کا محاصرہ کر لیا۔ دیبل کی فوج حسبِ روایت قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئی۔

محمد بن قاسم نے اپنے سپاہیوں کو لشکر کے سامنے گہری خندقیں کھودنے کا حکم دیا تا کہ دشمن اچانک حملہ آور نہ ہو سکے۔ خوش قسمتی سے اسی دورانِ حجاج بن یوسف کے بھیجے ہوئے جہاز بھی دیبل پہنچ گئے۔ ان جہازوں میں سامانِ رسد کے علاوہ چھوٹی منجنیقیں اور قلعہ کشائی کے آلات بھی شامل تھے۔ ایک بہت بڑی منجنیق "عروسک" بھی تھی جسے پانچ سو آدمی کھینچا کرتے تھے۔ اسے چلانے والا ایک شامی جعونہ تھا جس کی نشانہ بازی کی پورے عرب میں دھوم تھی۔

محمد بن قاسم نے جگہ جگہ خندقیں کھودیں اور مختلف مورچوں پر منجنیقیں نصب کر دیں۔ دیبل کے سپاہی قلعے کی فصیلوں اور بُرجوں سے یہ منظر دیکھتے اور حیرت کا اظہار کرتے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ حملہ آور کون ہے؟ اور کس انداز سے صف بندی کر رہا ہے؟ وہ تو راجہ داہر کی بے پناہ طاقت پر یقین رکھتے تھے۔ اس لیے محمد بن قاسم کے جنگی انتظامات ان کی نظروں میں بے معنی تھے۔ یہی سوچ کر دیبل کے سپاہی اسلامی خیموں کی طرف حقارت سے دیکھتے اور قہقہے لگاتے کہ چند روز موسم کی سختیاں سہنے کے بعد یہ بے عقل لوگ محاصرہ ترک کر کے واپس چلے جائیں گے۔

ابھی محمد بن قاسم لشکرِ اسلام کی صف بندی میں مصروف تھا کہ ایک دن ایک برہمن چھپتا چھپاتا مسلمانوں کے خیموں تک پہنچ گیا۔ مجاہدین نے اسے دشمن کا جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا اور فوراً ہی اپنے امیر کے سامنے پیش کر دیا۔

محمد بن قاسم نے سوالیہ نظروں سے برہمن کی طرف دیکھا اور پُر جلال لہجے میں پوچھا۔ "اے شخص! تُو کون ہے اور کیا تجھے اپنی جان پیاری نہیں ہے؟"

"میں جاسوس نہیں ہوں۔" برہمن نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "میں تو صرف یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ تم سے یہ قلعہ فتح نہیں ہو گا۔"

محمد بن قاسم نے حیرت سے برہمن کی طرف دیکھا۔ "تیرے اس دعوے کی کوئی دلیل بھی ہے؟"

"یہ قلعہ ایک طلسم کے زیرِ اثر ہے۔" برہمن نے پُرزور لہجے میں کہا۔ "جب تک وہ طلسم برقرار ہے، اس قلعے کو کوئی فتح نہیں کر سکتا۔"

"کیسا طلسم؟" برہمن کی بات سن کر محمد بن قاسم کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

"ایک ایسا طلسم جو صدیوں سے قلعے کا محافظ ہے۔" برہمن نے کہا۔ "ہمیں نجوم کی کتابوں سے معلوم ہوا ہے کہ مسلمان سندھ کو فتح کر لیں گے۔ مگر یہ فتح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ بت خانہ موجود

ہے۔" برہمن نے قلعے کے درمیان میں تعمیر کردہ بت خانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "صنم کدے کا گنبد صاف نظر آ رہا تھا۔

محمد بن قاسم نے بت خانے کی طرف دیکھتے ہوئے بے نیازانہ کہا۔ "جب قلعہ فتح ہو جائے گا تو پھر صنم خانہ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔"

"نہیں امیر!" برہمن نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "یہی تو طلسم ہے کہ پہلے بت خانے کا گنبد گرے گا، پھر آپ کو قلعے پر غلبہ حاصل ہوگا۔"

محمد بن قاسم نے سوچا کہ برہمن خود بھی ہندو قوم سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے وہ مسلمانوں کو غلط راستے پر ڈال کر ان کے حوصلے پست کرنا چاہتا ہے۔

"مجھے تیری باتوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ ایک ہندو ہونے کے ناتے تجھے اس راز کو راز ہی رکھنا چاہئے تھا۔ پھر اپنے دشمنوں پر یہ مہربانی کیوں؟" مسلم سالار نے بڑا منطقی سوال کیا تھا۔

"امیر! میں اپنی زندگی سے بیزار ہوں۔" محمد بن قاسم کا سوال سن کر برہمن رونے لگا۔ "راجہ داہر نے میرے خاندان پر بڑے مظالم ڈھائے ہیں۔ میری ایک خوبصورت جوان بیٹی تھی جسے ایک راجپوت سردار اُٹھا کر لے گیا تھا۔ پھر اس معصوم کی آبروریزی کی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے خوفِ رسوائی سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ میں برسوں سے اپنی جواں مرگ بیٹی کا ماتم کر رہا ہوں۔ آپ سے پہلے بھی یہاں دو اسلامی لشکر آئے تھے مگر وہ ناکام و نامراد واپس چلے گئے۔ میں ان لشکروں کے امیروں سے بھی ملنا چاہتا تھا مگر انتہائی کوشش کے باوجود ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ آئے تو ایک بار پھر میرے دل کے داغ اور سینے کے زخم ہرے ہو گئے۔ میں اپنی زندگی کو ہزار خطروں میں ڈال کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ مجھے راجہ داہر کے ظالمانہ اور بت پرستانہ نظام سے شدید نفرت ہے۔ ایک میں ہی نہیں، میری طرح اور بھی بہت سے مظلوم آپ کو پکار رہے ہیں۔ ان کی پکار سنیے! جبر و تشدد کی چکی میں پستی ہوئی مخلوق کو راجہ داہر سے نجات دلائیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ فتح حاصل کر لیں گے..... مگر پہلے بت خانے کے گنبد کو مسمار کر دیجئے...... اور اس پر جو پیلا جھنڈا لہرا رہا ہے، اسے بھی تار تار کر دیجئے۔ پھر یہ پورا شہر آپ کے قدموں میں جھک جائے گا۔"

یہ کہہ کر برہمن نے سلام کیا اور تیزی سے قلعے کی طرف چلا گیا۔

دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی اس قسم کے طلسم بنائے گئے تھے اور محمد بن قاسم نے ان کے بارے میں سنا بھی تھا لیکن دیبل کے متعلق برہمن کے بیان کردہ طلسم پر اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

محمد بن قاسم کے ساتھیوں کی بھی یہی رائے تھی کہ برہمن نے اپنی لفاظی کے ذریعے مسلمانوں کو اُلجھانے کی کوشش کی تھی۔

"مگر برہمن کی باتوں سے یہ راز ضرور منکشف ہو گیا ہے کہ دیبل کے باشندے توہم پرستی کا شکار

ہیں۔" محمد بن قاسم نے اپنے قریبی ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔" وہ بت خانے کو اپنا نجات دہندہ اور پیلے جھنڈے کو اپنا محافظ سمجھتے ہیں۔ اگر کسی طرح ان دونوں چیزوں کو برباد کر دیا جائے تو ان کی ہمتیں ہمیشہ کے لیے پست ہو جائیں گی۔ پھر وہ کسی جنگ کے بغیر ہتھیار ڈال کر ہمارے مطیع و فرماں بردار ہو جائیں گے۔"

محمد بن قاسم دیبل پر حملہ کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ مگر ابھی تک حجاج بن یوسف کا حکم نامہ موصول نہیں ہوا تھا۔ بالآخر ایک ہفتے کے بعد والئ عراق کا خط پہنچا کہ بلا تاخیر منجنیقوں کا استعمال کر کے قلعہ دیبل میں گہرے شگاف ڈال دیئے جائیں۔

حجاج کا حکم ملتے ہی چھوٹی منجنیقوں نے قلعے پر سنگ باری شروع کر دی۔ فصیل میں چھوٹے چھوٹے شگاف پڑتے رہے مگر اس سے اسلامی لشکر کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر محمد بن قاسم نے شامی نشانے باز جعونہ کو طلب کر کے کہا۔" آخر تیرا ہنر کس دن کام آئے گا؟"

"امیرِ محترم! عروسک نامی منجنیق میرے حوالے کی جائے۔ میں تین پتھروں میں گنبد اور جھنڈے کو گرا دوں گا۔" جعونہ نے دعویٰ کرنے کے انداز میں کہا۔

کچھ دیر بعد پانچ سو طاقتور آدمی منجنیق عروسک کو کھینچتے ہوئے اس مقام پر لیے جا رہے تھے جسے نشانے باز جعونہ نے سنگ باری کے لیے منتخب کیا تھا۔

اسی دوران حجاج بن یوسف کا دوسرا خط پہنچا۔ والئ عراق نے نئی ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جب تم جنگ شروع کرو تو اپنے لشکر کو اس طرح ترتیب دو کہ سورج تمہاری پشت پر رہے تاکہ تم اپنے دشمنوں کی نقل و حرکت کا بھرپور مشاہدہ کر سکو۔ حریف کے ساتھ نبرد آزما ہونے سے پہلے خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثناء بیان کرو۔ پھر دن کے ابتدائی حصے میں جنگ کا آغاز کرو۔ اگر سندھ کا کوئی باشندہ تم سے رحم اور پناہ کی درخواست کرے تو اسے اماں دے دو..... لیکن اگر دیبل کے لوگ پناہ مانگیں تو اپنے دونوں کان بند کر لینا۔ یہ شر پسند لوگ ہرگز پناہ کے قابل نہیں ہیں۔"

حجاج بن یوسف نے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ عروسک نامی منجنیق کو مشرق کی سمت میں نصب کر دیا جائے۔ پھر اس کا ایک پایہ کم کر کے مندر کے گنبد پر سنگ باری کی جائے۔

❀---❀---❀

وہ لمحے بڑے عجیب تھے جب شامی نشانہ باز جعونہ انہی ارادوں کے ساتھ عروسک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آج خلافِ عادت اس کے چہرے پر نفرت و غضب کی آگ روشن تھی۔ محمد بن قاسم اور دوسرے ممتاز عہدیدار اُمید و بیم کی نظروں سے جعونہ کی طرف دیکھ رہے تھے مگر وہ اپنے گرد و پیش کی فضا سے بے خبر عروسک کے قریب پہنچا۔ پہلے اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اللہ کو پکارا۔ پھر بڑے پُرسوز لہجے میں عرض کرنے لگا۔

''اے بے مثال اور لازوال قوتوں کے مالک! تُو نے ہی اپنے بندے جعونہ کو یہ ہنر دے کر ساری دنیا کے سامنے سرفراز کیا ہے۔ آج اس کے ناتواں بازوؤں کی آبرو رکھ! اور لشکرِ اسلام کو سربلندی عطا فرما۔''

اس دعا کے بعد جعونہ نے منجنیق کی کمانی کو کھینچا۔ یہاں تک کہ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپنے لگیں اور پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔ پھر جعونہ نے مندر کے گنبد کی طرف دیکھا اور منجنیق کی کمانی کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ بھاری پتھر برق رفتاری سے نکلا اور گنبد سے ٹکرا گیا۔

محمد بن قاسم اور دوسرے سرداروں نے نشانے کی درستی پر جعونہ کو مبارک باد دی۔

''اب تم لوگ اسی انداز سے پتھر برساتے رہو۔'' جعونہ نے اپنے نائب نشانہ بازوں سے کہا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے گنبد ٹوٹ گیا اور طلسمی جھنڈا زمین بوس ہو گیا۔

لشکرِ اسلام میں ''اللہ اکبر'' کے نعرے بلند ہونے لگے اور دیبل کے قلعے میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے خوف ناک زلزلے نے قلعے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو اور اس کے مکین جان بچانے کے لیے آنکھیں بند کیے ہوئے بھاگ رہے ہوں۔

''مہا پاپ..... مہا پاپ..... انرتھ (غضب) ہو گیا......''

قلعے میں ایک حشر برپا تھا۔ لوگ دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔ ''اے دُرگا کے ماننے والو! مسلمانوں کے سر کاٹ کر دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دو۔ انہوں نے دیبل پر نہیں، ہندو دھرم پر حملہ کیا ہے۔''

جھنڈے کے گرتے ہی دیبل کے شہری بدحواس ہو گئے۔ پھر وہ اسی حالتِ غضب میں قلعے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے اور مسلمانوں سے دست بدست جنگ کرنے لگے۔ محمد بن قاسم کا منصوبہ کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ قلعہ بند ہو جانے والے سپاہی کسی طرح باہر نکل آئیں۔ مسلمان لشکر نے چاروں طرف سے دیبل کی فوج کو گھیر لیا۔ قدم قدم پر دوبدو جنگ ہونے لگی..... مگر یہ مقابلہ بہت عارضی تھا۔ مجاہدین کی شمشیروں نے گاجر مولی کی طرح دیبل کے سپاہیوں کے سر کاٹنے شروع کر دیئے۔

اپنے ہم جنسوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں دیکھ کر دیبل کے سپاہی دوبارہ قلعے کی طرف بھاگے مگر مسلمانوں نے اُنہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ مجاہدین نے کمندیں ڈال کر قلعے کی فصیل پر چڑھنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلا مسلمان جو فصیل پر پہنچا، وہ کوفے کا ایک مردِ شجاع صعدی بن خزیمہ تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی مسلم جانباز فصیل تک پہنچے۔ یہ منظر دیکھ کر دیبل کے باشندوں نے قلعے کے دروازے کھول دیئے اور محمد بن قاسم سے امان طلب کی۔

''میں مجبور ہوں..... مجھے اس کی اجازت نہیں ہے۔'' محمد بن قاسم نے اہلِ دیبل کی درخواست کو مسترد کر دیا کیونکہ حجاج بن یوسف کا یہی حکم تھا۔

پھر تین دن تک دیبل کے فتنہ گروں اور ہتھیار بند لوگوں کو قتل کیا جاتا رہا۔ مگر اس علاقے کا گورنر کسی نہ کسی طرح جان بچا کر بھاگ گیا۔

ہنگامۂ دار و گیر ختم ہونے کے بعد محمد بن قاسم دیبل کے خفیہ تہہ خانوں اور قید خانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک تہہ خانے میں وہ مسلمان عورتیں اور مرد بھی تھے جنہیں دیبل کے قزاقوں نے لوٹ کر قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ محمد بن قاسم کو دیکھ کر تمام مسلمان قیدی رو پڑے۔ قبیلۂ بنو عزیز کی وہ عورت جس نے حجاج کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ گریہ و زاری کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میرے بھائی! مجھے یقین تھا کہ تم ہماری مدد کو ضرور آؤ گے۔''

محمد بن قاسم نے ان تمام قیدیوں کو اسی وقت بصرہ روانہ کر دیا اور حجاج بن یوسف کے نام ایک خط بھی تحریر کیا۔

''امیر کو دیبل کی فتح مبارک ہو۔ میں اس خوشخبری کے ساتھ ان اسیروں کو بھی خدمتِ عالیہ میں روانہ کر رہا ہوں، جن کے مصائب و تکالیف کے بارے میں سوچتے سوچتے آپ اپنی پُرسکون نیندوں سے محروم ہو گئے تھے۔ مزید دعاؤں کا طالب!..... خادمِ اسلام۔ عماد الدین محمد۔''

❁---❁---❁

دیبل کا حاکم فرار ہو کر اروڑ پہنچا۔ اروڑ اس وقت راجہ داہر کا دارالحکومت تھا۔ سندھ کے حکمراں نے شکست کی خبر سن کر حاکمِ دیبل کو بے غیرتی اور بزدلی کے طعنے دیئے۔ مگر بھگوڑا حاکم یہی کہتا رہا۔

''وہ آدم زاد نہیں، جادوگر ہیں جنہوں نے دیبل کے طلسم کو پارہ پارہ کر دیا۔''

حاکمِ دیبل کا عذر سن کر راجہ داہر غضب ناک ہو گیا۔ ''راجپوتوں کو ان کی مٹی میں ملا دینے والے! تُو کس بے شرمی کے ساتھ اپنی نااہلی پر پردہ ڈال رہا ہے۔ تیری ہی وجہ سے میرے بے داغ دامن پر ہار کا یہ بدنما دھبا لگا ہے۔ جب تک میں اس دھبے کو صاف نہیں کر دیتا، اس وقت تک مجھے اپنی منحوس صورت نہ دکھانا۔''

حاکمِ دیبل ذلت و رسوائی کے پسینے میں نہایا ہوا، راجہ داہر کے دربار سے چلا گیا۔

ایک طویل عرصے کے بعد مشیر بدھی من کو ناقابلِ بیان خوشی کا احساس ہوا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے چہرے پر مکر و فریب کی نقاب ڈالے ہوئے راجہ داہر کے گُن گا رہا تھا۔

''مہاراج! دیبل تو آپ کی عظیم الشان سلطنت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ اس ٹکڑے کے چھن جانے پر اتنا دُکھ کیوں کرتے ہیں؟ یہ تو انہونی ہو گئی کہ اُس دودھ پیتے لڑکے کے ہاتھ روٹی کا یہ ٹکڑا لگ گیا۔'' بدھی من کا اشارہ نوعمر محمد بن قاسم کی طرف تھا۔ ''مگر یاد رکھیے مہاراج! کہ یہ چھوٹا سا ٹکڑا اس کو ہضم نہیں ہو گا۔''

''چھوٹے سے ٹکڑے کی بات نہیں ہے بدھی من!'' اپنے مشیر کی بات سن کر راجہ داہر کا غصہ کسی قدر کم ہوا۔ ''بات ہے شیر کے آگے سے نوالہ اٹھانے کی۔ آخر ایک گیدڑ نے یہ جرأت کیسے کی؟''

''پورا جنگل پڑا ہوا ہے مہاراج!'' بدھی من مزے لے لے کر راجہ داہر کو چھیڑ رہا تھا مگر اس بدمست و

مغرور حکمراں کو اس کا احساس تک نہیں تھا۔ ”گیدڑ کو نوالہ اُٹھا کر بھاگ جانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ وہ لذیذ غذا کی تلاش میں دوبارہ آئے گا۔ آپ اسے پورا کا پورا نگل لیجئے گا۔“

بدھی من کی بات سن کر راجہ داہر ہنس پڑا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر رعونت و تکبر کے آثار اُبھر آئے۔

”تُو نے سچ کہا بدھی من! ہم اس کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کریں گے کہ اس کا عبرت ناک انجام تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب بن کر رہ جائے گا۔“

❁---❁---❁

دیبل کا انتظام کرنے کے بعد محمد بن قاسم ”سیسم“ کی طرف بڑھا۔ اس علاقے میں کچھ دن قیام کرنے اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد مسلم سالار کا رُخ نیرون کوٹ کی طرف تھا۔ (نیرون کوٹ کا موجودہ نام حیدر آباد ہے) نیرون کوٹ کے سندر شمنی نے مسلم سالار کی طرف صلح اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ جواب میں محمد بن قاسم نے اسے امان بخش دی۔

❁---❁---❁

نیرون کوٹ کی فتح کی خبر سن کر راجہ داہر اپنے حواس کھو بیٹھا اور پھر اُس نے شدید حالتِ غضب میں محمد بن قاسم کے نام ایک خط تحریر کیا۔

”یہ خط داہر، چچ کے بیٹے کی طرف سے جو سندھ کا بادشاہ اور ہندوستان کا راجہ ہے، جس کا حکم دریاؤں اور جنگلوں پر چلتا ہے..... محمد بن قاسم کے نام ہے جو انسانوں کے قتل کرنے میں بہت حریص اور بے رحم ہے۔ جس نے بے وقوفی سے اپنے لشکر کو تباہی اور ہلاکت میں ڈال دیا ہے..... تم سے پہلے بھی کچھ لوگوں کے دماغ میں یہ خبط سمایا تھا کہ وہ سندھ اور ہند کو فتح کریں...... مگر ہم نے اُنہیں ایسی شکست دی کہ سرزمینِ دیبل ان کا مدفن بن گئی۔ اپنے احمق ساتھیوں کی طرح تمہارے سر میں بھی وہی سودا سمایا ہے۔ دیبل پر تمہیں اس لیے فتح حاصل ہوئی کہ وہ ایک معمولی سا قصبہ ہے جہاں اتفاق سے ہمارا کوئی جانباز سالار موجود نہیں تھا۔ جو گزر گئی، سو گزر گئی..... مگر آئندہ کے لیے تمہیں تنبیہہ کی جاتی ہے کہ اب ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔ بس اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ ابھی تمہارا واسطہ میرے بیٹے جے سینا سے نہیں پڑا ہے جس کے قہر سے بڑے بڑے بادشاہ پناہ مانگتے ہیں..... اور ہند کے بڑے بڑے راجا اس کے سامنے پیشانیاں رگڑتے ہیں۔ جو کہ سندھ، مکران اور توران کے تمام علاقوں پر حکومت کرتا ہے..... جس کے پاس ایک سو بدمست ہاتھی ہیں..... اور وہ خود ایک سفید ہاتھی پر سوار ہوتا ہے...... جس کا مقابلہ نہ گھوڑے کر سکتے ہیں اور نہ کوئی بڑے سے بڑا بہادر...... یاد رکھو کہ اگر تم اس حقیری فتح کے غرور میں مست ہوئے تو تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو اس سے پہلے بدیل کا ہوا تھا۔“

محمد بن قاسم نے ایک مقامی شخص سے راجہ داہر کے خط کا ترجمہ سنا..... اور پھر اسی شخص سے جواب

تحریر کرایا۔

"یہ خط محمد بن قاسم ثقیف کی طرف سے کہ جو سرکشوں اور مغروروں سے مسلمانوں کا انتقام لینے والا ہے...... کافر، جاہل، منکر اور ضدی، داہر بن چچ، برہمن غدار کے نام جو بے وفا زمانے کے ردّ و بدل میں ظالم وقت کے گھمنڈ پر مغرور ہے۔ میں نے تمہارے لکھے ہوئے مضمون کے ایک ایک لفظ کو سنا اور سمجھا.... اے عاجز سوار! ہاتھیوں اور لشکر پر کیا ناز کرتا ہے؟ ہاتھی تو ایک ذلیل اور عاجز ترین چیز ہے جو اپنے جسم پر بیٹھے ہوئے ایک مچھر کو بھی نہیں اُڑا سکتا۔ اور تم جن گھوڑوں اور سواروں کو دیکھ کر حیران ہو گئے ہو، وہ تو اللہ کے سپاہی ہیں..... تمہاری بد اعمالی، بری عادتوں اور تکبر کی وجہ سے ہمیں تم پر لشکر کشی کا خیال پیدا ہوا..... تم نے راجہ سراندیپ کی کشتیاں روک کر مسلمانوں کو قیدی بنایا..... حالانکہ دنیا کے تمام ممالک خلیفہ کی برتری اور حکومت کو تسلیم کرتے ہیں..... مجھے یقین ہے کہ میرا اور تمہارا مقابلہ جہاں کہیں ہو گا، میں حق تعالیٰ کی مدد سے جو ظالموں کو مغلوب کرنے والا ہے، تمہیں ذلیل اور مغلوب کروں گا۔ اور تمہارا سر کاٹ کر عراق بھیجوں گا..... یا پھر اپنی جان، اللہ کی راہ میں قربان کر دوں گا۔"

محمد بن قاسم کا جواب پڑھ کر راجہ داہر نے اسے محض لاف زنی سے تعبیر کیا اور انتظار کرنے لگا کہ مسلمان سالار اگلا قدم کس طرح اٹھاتا ہے۔ محمد بن قاسم صبر و سکون سے آگے بڑھا اور سیوستان (سہون) کو بھی فتح کر لیا۔

اب راجہ داہر کو احساس ہوا کہ نوعمر سالار کے تیور خطرناک ہیں اور وہ اس کی فوجی طاقت سے متاثر ہونے والا نوجوان نہیں ہے۔ ابھی سندھ کا حکمران مسلمانوں کی پیش قدمی روکنے کی تدبیریں کر رہا تھا کہ محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف کا ایک اور خط موصول ہوا جس میں والئ عراق نے صاف صاف تحریر کیا تھا۔

"میرے عزیز بھائی! تم دریائے سندھ عبور کر کے راجہ داہر سے براہِ راست مقابلہ کرو۔ حق تعالیٰ تمہیں نصرت عطا فرمائے۔ میرا خیال ہے کہ جب تم داہر پر غلبہ حاصل کرو گے تو پھر باقی ملک کو فتح کرنے میں تمہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

❁---❁---❁

محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کی ہدایت کے مطابق دریائے سندھ عبور کیا۔ پھر 10 رمضان المبارک 93ھ کو محمد بن قاسم اور راجہ داہر کے درمیان آخری اور فیصلہ کن جنگ ہوئی۔

راجہ داہر بڑی شان و شوکت کے ساتھ میدانِ جنگ میں آیا۔ اس کا بیٹا جے سینا بھی باپ کے ہمراہ فوج کے درمیان میں تھا۔ دس ہزار راجپوت سپاہی جے سینا کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ یہ سب کے سب سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھے۔

راجہ داہر کے لشکر کے سامنے ہاتھیوں کی قطار تھی۔ اس کے بعد دس ہزار زرّہ پوش سوار تھے۔ پھر تیس ہزار پیادے بہترین ہتھیاروں سے لیس تھے۔ لشکر کے وسط میں راجہ داہر سفید ہاتھی پر سوار تھا۔ راجہ کے

ہاتھی کو بڑے بڑے سردار اور امیر اپنے نرغے میں لیے ہوئے تھے۔ ہاتھی پر سونے چاندی کی ایک عماری تھی، جس میں داہر کے ساتھ خوب صورت کنیز بیٹھی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک سندھ کے حکمراں کو شراب کے جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی...... اور دوسری تھوڑی تھوڑی دیر بعد پان کے بیڑے پیش کرتی تھی۔

❁---❁---❁

محمد بن قاسم نے نمازِ فجر کی امامت کی اور پھر طویل دعا مانگنے کے بعد اپنے تمام لشکر کو پانچ صفوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک صف قبیلۂ عالیہ کے لوگوں کی تھی۔ دوسری صف قبیلۂ تمیم کے جانبازوں پر مشتمل تھی۔ تیسری صف میں قبیلۂ بکروال کے سپاہی شامل تھے۔ چوتھی صف میں قبیلۂ عبدالقیس اور پانچویں صف میں ازدی قبیلے کے مجاہدین سربکف کھڑے تھے۔

دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے مسلم سپہ سالار نے مختصر مگر نہایت جامع تقریر کی۔

''حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو دو عظیم الشان نعمتیں عطا کی ہیں۔ ایک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر درود پڑھنا اور دوسرے اپنے گناہوں پر استغفار کرنا۔ اگر میدانِ جنگ میں تمہارے دل مضبوط رہے تو حق تعالیٰ تمہیں دشمن پر ضرور غلبہ عطا فرمائے گا۔''

مسلمانوں کی طرف سے پہلا حملہ ابوفضہ نے کیا اور راجہ داہر کے فوجی دستے کو مار بھگایا اور بیشتر سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ سندھ کے حکمران نے پے در پے مزید دو تازہ دم دستے بھیجے مگر ابوفضہ کی ہنرمندی اور شجاعت نے اُنہیں بھی میدانِ جنگ سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

اس کے بعد دونوں لشکروں میں جنگ مغلوبہ چھڑ گئی۔ مسلمان اس جانبازی سے لڑے کہ میدانِ کارزار راجہ داہر کے فوجیوں کی لاشوں سے بھر گیا۔

سندھ کے حکمراں نے جنگ کا یہ حال دیکھا تو اپنے سفید ہاتھی کو آگے بڑھایا۔ چارسُو راجپوت شہسوار راجہ داہر کے ہاتھی کو گھیرے ہوئے تھے۔ کنیزیں اُسے شراب پلا رہی تھیں۔ راجہ داہر کے ہاتھ میں ایک چکر تھا جس میں بہت سے تیز دھار چاقو لگے ہوئے تھے۔ راجہ داہر بڑی مہارت سے اس چکر کو گھماتا تھا۔ نتیجتاً جو شخص بھی قریب آتا، اُس کا سرتن سے جدا ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی راجہ داہر اپنے ہاتھی کو اسلامی لشکر کو روندنے کے لیے آگے بڑھاتا۔ اُس کا یہ عمل انتہائی خطرناک تھا۔

محمد بن قاسم کے لشکر میں ایک سپاہی شجاع حبشی تھا۔ اُس نے راجہ داہر کا یہ خوف ناک عمل دیکھا تو مسلم سپہ سالار کے قریب آ کر کہنے لگا۔

''امیرِ محترم! مجھ پر اس وقت تک کھانا پینا حرام ہے جب تک کہ میں راجہ داہر کے ہاتھی کو زخمی کر کے معذور نہ بنا دوں۔ یا تو میں سندھ کے حکمران کا سر کاٹ کر لاؤں گا یا خود شہید ہو جاؤں گا۔''

ابھی محمد بن قاسم جواب دینے بھی نہیں پایا تھا کہ شجاع حبشی نے برق رفتاری سے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور پھر وہ آن کی آن میں صفیں چیرتا ہوا راجہ داہر کے ہاتھی کے مقابل پہنچ گیا۔ عربی گھوڑوں نے آج

تک ہاتھی جیسا دیوہیکل جانور نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے شجاع حبشی کا گھوڑا سفید ہاتھی کو دیکھ کر ایک طرف مُڑنے لگا۔ شجاع نے فوراً اپنے سر سے دستار اُتار کر گھوڑے کی آنکھوں پر باندھ دی تاکہ وہ راجہ داہر کے ہاتھی سے خوف زدہ نہ ہو سکے۔ پھر شجاع حبشی کی شمشیر لہرائی اور اس نے ہاتھی کی سونڈ کو زخمی کر دیا۔

راجہ داہر کے محافظ شہسوار ایک مجاہد کی جرأت و شجاعت پر حیران رہ گئے تھے۔ یکایک سندھ کے حکمراں نے پوری طاقت سے ایک دوشاخہ تیر چلایا جو شجاع حبشی کی گردن میں لگا اور یہ سربکف مجاہد شہید ہو گیا۔

شجاع حبشی کی موت سے راجہ داہر کی بد دل فوج کے حوصلے بلند ہو گئے اور راجپوت سپاہیوں نے چاروں طرف سے محمد بن قاسم کے لشکر پر اس قدر شدید حملہ کیا کہ مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ پھر ہر طرف سے شور بلند ہونے لگا۔

''اے سندھ کے سورماؤ! ہماری فتح قریب ہے۔ مسلمانوں کے قدم اُکھڑ چکے ہیں۔''

یہ صورتِ حال دیکھ کر کچھ دیر کے لیے محمد بن قاسم بھی اپنا صبر و ضبط کھو بیٹھا۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے مسلم سالار نے سقہ سے تھوڑا سا پانی مانگا۔ پھر محمد بن قاسم نے اپنے بدحواس سپاہیوں سے چیخنے کے انداز میں پکار کر کہا۔

''اے عرب کے جانبازو! میں تمہارا سپہ سالار محمد بن قاسم ابھی زندہ ہوں۔ پھر تم کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ تمہیں دشمن کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ تمہاری تاریخ تو ہمیشہ تمہارے سینوں پر لکھی جاتی ہے۔ پھر تم نے یہ کون سا زاویہ اختیار کیا ہے؟..... پلٹ کر دیکھو کہ تمہارا حریف کتنا کمزور ہے۔''

محمد بن قاسم کے الفاظ نے منتشر سپاہیوں کے دلوں کو تھام لیا اور پھر وہ اسی جذبے کے ساتھ پلٹے اور پوری شدت کے ساتھ راجہ داہر کی فوج پر حملہ کیا۔ بہت دیر تک گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔ آخر محمد بن قاسم کی ہدایت پر مسلمان تیراندازوں نے راجہ داہر کے سفید ہاتھی کا نشانہ لے کر آگ کے تیروں کی بارش شروع کر دی۔ کچھ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ انجام کار ایک تیر خاص ہدف تک پہنچ ہی گیا اور عماری میں آگ لگ گئی۔ شعلوں کی تپش سے گھبرا کر سفید ہاتھی قریب کی ایک جھیل میں گھس گیا۔ مہاوت (فیل بان) نے بہت کوشش کی مگر ہاتھی جھیل سے باہر نہیں نکلا۔ راجہ داہر کے حفاظتی دستوں نے یہ حال دیکھا تو کچھ پانی میں کُود پڑے اور کچھ جھیل کے کنارے کھڑے ہو گئے۔

پانی پینے کے بعد ہاتھی جھیل سے باہر نکلا۔ اتنی دیر میں جنگ کا نقشہ بدل چکا تھا۔ راجہ داہر نے میدانِ جنگ سے بھاگ کر قلعہ بند ہونا چاہا مگر مسلم تیراندازوں نے اُسے مہلت نہ دی۔ تیروں کی اس تند و تیز بارش میں راجہ داہر بھی زخمی ہو گیا اور اس کا ہاتھی بھی۔ مجاہدین کی شمشیریں سندھ کے سورماؤں کو بے دریغ قتل کر رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر راجہ داہر کے دل میں ایک ہیجان سا پیدا ہوا۔ پھر جوشِ جذبات سے مغلوب ہو کر ہاتھی سے نیچے اُتر آیا۔ پھر شام تک بڑی بہادری سے لڑتا رہا..... مگر سورج غروب ہوتے

ہی اس کی زندگی اور اقتدار کا سورج بھی غروب ہو گیا۔ قبیلۂ طے کے ایک مجاہد قاسم بن ثعلبہ نے راجہ داہر کے سر پر بھرپور وار کیا جو اس کی گردن تک اُتر گیا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے قاسم بن ثعلبہ سندھ کے حکمراں کو پہچان نہیں سکا۔ برہمنوں نے رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھایا اور راجہ داہر کی لاش کو لے جا کر کیچڑ میں چھپا دیا۔

❀---❀---❀

دوسرے دن صبح ہوتے ہی لشکرِ اسلام فاتحانہ انداز میں اروڑ کے قلعے میں داخل ہوا۔ محمد بن قاسم نے کسی تاخیر کے بغیر یہ فرمان جاری کر دیا کہ جو شخص بھی راجہ داہر کا پتہ دے گا، اسے قیمتی انعامات سے سرفراز کیا جائے گا۔ کئی دن تک سندھ کے حکمراں کی تلاش جاری رہی مگر کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ راجہ داہر میدانِ جنگ میں کام آیا یا فرار ہو کر کہیں روپوش ہو گیا ہے۔

پھر ایک دن ایک برہمن، محمد بن قاسم کے دربار میں حاضر ہوا اور بڑے عاجزانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔ ''اگر مسلمانوں کے امیر مجھے اور میرے خاندان والوں کو امان بخشیں تو میں راجہ داہر کا پتہ بتا سکتا ہوں۔''

مسلم سالار اور دیگر حاضرینِ دربار نے بڑی حیرت سے برہمن کی بات سنی۔ پھر محمد بن قاسم نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''اگر تُو نے کسی فریب سے کام نہیں لیا تو پھر تیرے اہلِ خاندان کے لیے صرف امان ہی نہیں، ہماری طرف سے ایک انعام بھی مخصوص ہے۔''

محمد بن قاسم کی یقین دہانی سے برہمن کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ پھر وہ مسلمان سپاہیوں کے ایک دستے کو لے کر جھیل کے کنارے پہنچا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اروڑ کے برہمنوں نے اپنے حاکم کی لاش کو دلدل میں چھپا دیا ہے۔''

مسلمان سپاہیوں نے بڑی حیرت سے برہمن کی بات سنی اور کیچڑ میں اُتر گئے۔ تھوڑی دیر بعد مجاہدینِ اسلام نے کیچڑ سے ایک مسخ شدہ لاش برآمد کر لی۔ نمی کے باعث راجہ داہر کا جسم پھول کر بدہیئت ہو گیا تھا اور اس کی لاش سے بدبو اُٹھنے لگی تھی۔

محمد بن قاسم نے مقامی لوگوں کے مشورے سے ان دونوں کنیزوں کو طلب کیا جو راجہ داہر کے ساتھ عماری میں موجود تھیں اور سندھ کے حکمراں کو شراب کے جام پلا رہی تھیں۔

لرزہ براندام کنیزیں کچھ دیر تک راجہ داہر کے بگڑے ہوئے بدبودار جسم کو دیکھتی رہیں، پھر انہوں نے کانپتی ہوئی آوازوں کے ساتھ اقرار کر لیا۔

''ہاں یہی ہیں، سمراٹ راجہ داہر، سندھ و ہند کے بادشاہ!'' یہ کہتے کہتے کنیزیں رونے لگیں۔

پھر جیسے ہی راجہ داہر کی موت کی خبر عام ہوئی، محل میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ رانی لاڈی شدتِ غم سے پاگل ہو گئی اور اپنے کپڑے پھاڑ کر چیخنے لگی۔

''سمراٹ کو کوئی قتل نہیں کر سکتا۔ وہ کچھ دن کے لیے اروڑ سے چلے گئے ہیں۔ برہمنوں کو چاہئے کہ وہ اپنے دیوتا کا انتظار کریں۔ مہاراج ایک لشکرِ جرار لے کر بس آتے ہی ہوں گے۔ پھر کوئی عرب سپاہی ان کے قہر و غضب سے محفوظ نہیں رہے گا۔''

پھر جب محمد بن قاسم کے حکم پر رانی لاڈی کو راجہ داہر کی لاش دکھائی گئی تو اسے سکتہ سا ہو گیا۔ بہت دیر بعد رانی لاڈی کی یہ کیفیت زائل ہوئی تو رانی لاڈی ہاتھ جوڑ کر محمد بن قاسم سے عرض کرنے لگی۔

''مہاراج کی لاش ہمارے حوالے کر دیں تاکہ ہم اپنے دھرم کے مطابق سمراٹ کا انتم سنسکار (آخری رسمیں) کر سکیں۔''

محمد بن قاسم نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو سیاسی آزادی کے سوا ہر قسم کی رعایت دینے کے لیے تیار ہوں..... مگر راجہ داہر کا سر امیر حجاج بن یوسف کی امانت ہے اور میری قسم بھی۔ نہ میں امانت میں خیانت کر سکتا ہوں اور نہ اپنی قسم توڑ سکتا ہوں۔''

یہ کہہ کر محمد بن قاسم نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''اس مغرور راجہ کا سر تن سے جدا کر دو۔ یہ اسی دن کے لیے دنیا میں آیا تھا۔''

پھر جیسے ہی راجہ داہر کا سر کاٹا گیا، محمد بن قاسم اپنے رب کے حضور میں سجدہ ریز ہو گیا۔ اس نے دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی، پھر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''بے شک! وہ قادرِ مطلق بھی ہے اور بے نیاز بھی۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جسے چاہے ذلیل و رُسوا کر دے۔''

اس کے بعد محمد بن قاسم نے صارم ہمدانی کے ہاتھ راجہ داہر کا سر عراق بھجوا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی حجاج بن یوسف کے نام ایک خط بھی تحریر کیا۔

''امیرِ محترم کو یہ عظیم الشان اور تاریخی فتح مبارک ہو۔ اگرچہ اسلام میں سود حرام ہے لیکن پھر بھی میری طرف سے راجہ داہر کا سر بطور سُود قبول فرمائیے۔''

❁---❁---❁

بعض مؤرخین کے مطابق راجہ داہر کی بیوی، رانی لاڈی نے مسلمان ہو کر محمد بن قاسم سے شادی کر لی تھی مگر اہلِ تحقیق کے نزدیک یہ ایک نہایت ضعیف اور غیر معتبر روایت ہے۔ شوہر کی موت کے بعد رانی لاڈی ذلت و رسوائی کے خیال سے بہت خوف زدہ رہتی تھی۔ اگرچہ محمد بن قاسم نے اُسے اکثر شاہانہ مراعات دے رکھی تھیں لیکن رانی لاڈی نے مسلمانوں کی اس اعلیٰ ظرفی کی قدر نہ کی اور ایک دن وہ اپنی لونڈیوں اور ساز و سامان کے ساتھ آگ میں جل کر ''ستی'' ہو گئی۔ جب محمد بن قاسم کو اس الم ناک واقعے کی خبر ملی تو وہ بہت رنجیدہ ہوا۔ پھر مسلم سالار نے اپنے نقیبوں کے ذریعے پورے سندھ میں اعلان کرا دیا۔

''میں ستی کی اس وحشیانہ رسم کو ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیتا ہوں۔ آئندہ کوئی ہندو عورت اپنے شوہر کی

موت کے بعد آگ کی خوراک نہیں بنے گی۔ اگر مجھے بروقت اطلاع مل جاتی تو میں رانی لاڈی کو بھی جل کر راکھ ہونے سے بچا لیتا۔"

محمد بن قاسم کے اس اعلان سے پورے سندھ میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مظلوم ہندو عورتیں مسلم سالار کو "دیوتا" سمجھنے لگیں کہ اس نوجوان نے انہیں صدیوں کے جبر سے نجات دلائی تھی۔

پھر محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقوں کے ایسے انتظامات کیے کہ بڑے بڑے جہاندیدہ سیاست دان حیران رہ گئے۔ مسلم سالار نے ہندوؤں کے تمام طبقوں کو وہی حیثیت دی جس کے وہ مستحق تھے۔ مگر اچھوتوں کے ساتھ محمد بن قاسم نے خصوصی سلوک کیا اور اس راندۂ درگاہ مخلوق کی گردن سے لعنت کا طوق اتار کر اسے دوسرے انسانوں کے برابر کھڑا کر دیا۔ سندھ کے اچھوت، مسلم سالار کے اس شریفانہ طرزِ عمل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ بے اختیارانہ محمد بن قاسم کے قدموں میں جھک گئے۔

"اُٹھو!" محمد بن قاسم نے پُر جلال لہجے میں اچھوتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں بھی اسی کا بندہ ہوں، جس کے تم بندے ہو۔ اپنے جھکے ہوئے سر اُٹھا کر چلو۔ تم بھی انسان ہو۔"

محمد بن قاسم کی اس رواداری سے متاثر ہو کر بہت سے راجپوت حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

❁---❁---❁

اروڑ کے بعد مسلم سالار نے سندھ کے تمام علاقے فتح کر لیے۔ یہاں تک کہ کیرج کے راجپوتوں نے بھی محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کر لی۔ کیرج کا شہر موجودہ ہندوستان کے نقشے میں "جے پور" کے نام سے مشہور ہے۔ پھر ان فوجی مہمات سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم، ملتان کی طرف متوجہ ہوا اور پھر اس تاریخی خطے کو بھی اسلامی سلطنت کی حدود میں شامل کر لیا۔

شجاعت و مردانگی کی نئی تاریخ رقم کرنے والا یہ جانباز مسلم سالار ابھی ملتان ہی میں موجود تھا کہ وقت نے بڑی تیزی سے کروٹ بدلی۔ 95ھ میں والیٔ عراق حجاج کا انتقال ہو گیا۔ پھر آٹھ ماہ بعد اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ولید نے مرنے سے پہلے اپنے حقیقی بھائی سلیمان بن عبدالملک کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔

اس وقت فاتح سندھ محمد بن قاسم، اودھے پور میں تھا اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو فتح کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ اچانک خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی طرف سے اس کی معزولی کا حکم پہنچا۔

فتح نامہ (چچ نامہ) کی روایت کے مطابق مسلم سپہ سالار کی معزولی کا سبب یہ تھا کہ جب راجہ داہر قتل ہو گیا تو محمد بن قاسم نے اس کی دو کنواری لڑکیوں کو حبشی غلاموں کی نگرانی میں دارالحکومت بغداد بھیج دیا۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا۔

"ان دونوں دوشیزاؤں کو کچھ دن تک آدابِ شاہی سکھاؤ تا کہ وہ خلیفہ کے حرم میں داخل ہونے کے لائق بن جائیں۔"

پھر جب راجہ داہر کی بیٹیوں کی تربیت مکمل ہو گئی تو اُنہیں سلیمان بن عبدالملک کے سامنے پیش کیا گیا۔ دونوں لڑکیاں بہت خوب صورت تھیں اور بظاہر دیکھنے میں ہم عمر نظر آتی تھیں۔ اُموی خلیفہ نے اُن سے پوچھا۔

''تم میں سے بڑی کون ہے؟ تاکہ دونوں کو الگ کر دیا جائے۔ پہلے بڑی بہن ہماری خدمت گزاری کے فرائض انجام دے، پھر اس کی باری ختم ہونے کے بعد چھوٹی بہن کو خلوتِ شاہی میں طلب کر لیا جائے۔''

دربارِ خلافت کے ترجمان نے پہلے دونوں کے نام پوچھے۔ بڑی بہن نے کہا کہ اس کا نام سورج دیوی ہے اور چھوٹی کا نام پرمل دیوی۔

خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے سورج دیوی کو خلوت میں طلب کیا۔ سورج دیوی حُسنِ جہاں سوز کی مالک تھی۔ اُموی خلیفہ پہلی ہی نظر میں اس پر فریفتہ ہو گیا۔ سورج دیوی نے سلیمان بن عبدالملک کی دلی کیفیات کو پڑھ لیا اور اپنے ناز و ادا کا بے باکانہ مظاہرہ کرنے لگی۔ خلیفہ نے مضطرب ہو کر سورج دیوی کو اپنی طرف کھینچنا چاہا مگر وہ گھبرا کر عشرت کدے کے ایک گوشے میں چلی گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے لگی۔

''بادشاہ کی عمر دراز ہو۔ میں کسی طرح بھی آپ کے قابل نہیں ہوں۔''

سلیمان بن عبدالملک نے سورج دیوی کے انکار کو حُسن کی ادائے محبوبانہ سمجھا اور اپنی مسند سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

سورج دیوی کے انکار میں شدت آ گئی۔ ''بھگوان کے لیے میرے قریب مت آیئے۔ میں آپ کی خدمت گزاری کے لائق نہیں ہوں۔''

سلیمان بن عبدالملک سنجیدہ ہو گیا۔ پھر جب اس نے سورج دیوی سے اس کی وجہ پوچھی تو راجہ داہر کی بیٹی نہایت پُر اثر لہجے میں کہنے لگی۔ ''ہم دونوں بہنوں نے تین راتیں محمد بن قاسم کی خلوت میں گزاری ہیں۔ پھر اس نے ہمیں بادشاہ کی خدمت میں بھیجا ہے۔''

یہ انکشاف سن کر سلیمان بن عبدالملک کے چہرے کا رنگ بگڑ گیا۔

سورج دیوی نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خلیفہ کے مشتعل جذبات پر ایک اور ضرب لگائی۔ ''ممکن ہے، آپ کے یہاں کی یہی رسم ہو۔ مگر ہم نے دوسرے بادشاہوں کے بارے میں آج تک ایسی کوئی بات نہیں سنی۔''

سورج دیوی کی گفتگو نے سلیمان بن عبدالملک کو غضب ناک کر دیا۔ پھر اسی وقت خلیفہ نے اپنے قلم سے مندرجہ ذیل فرمان تحریر کیا۔

''محمد بن قاسم جہاں بھی ہو، اُسے فوراً کچے چمڑے میں لپیٹ کر دارالخلافہ روانہ کر دو۔''

جب یہ فرمانِ خلافت اودھے پور پہنچا تو محمد بن قاسم نے اپنے آدمیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے کچے چمڑے میں لپیٹ کر امیر المومنین کے پاس بھیج دو۔''

پھر محمد بن قاسم کو کچے چمڑے میں لپیٹ کر صندوق میں رکھ دیا گیا۔ چمڑا خشک ہونے کے بعد اکڑنے لگا۔ یہاں تک کہ دوسرے دن صندوق میں محمد بن قاسم کی موت واقع ہو گئی۔ پھر مسلم سالار کا مردہ جسم سلیمان بن عبدالملک کے سامنے لے جایا گیا۔ اس وقت سورج دیوی اور پرمل دیوی بھی موجود تھیں۔ خلیفہ نے صندوق کا ڈھکن کھولا۔ سلیمان بن عبدالملک کے ہاتھ میں سبز یاقوت کی نادر و نایاب چھڑی تھی۔ اُس نے اسی چھڑی کو محمد بن قاسم کے ہونٹوں سے مس کیا اور پھر راجہ داہر کی لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تم دونوں نے دیکھا کہ ہمارے آدمی کس طرح ہمارے حکم پر اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔''

یہ سنتے ہی سورج دیوی نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا اور زمین پر سر رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''خدا بادشاہ کو تا دیر سلامت رکھے لیکن یہ فرض بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ اس کے کانوں میں پہنچے، وہ اس پر اچھی طرح غور کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد بن قاسم ہمارے بھائی یا باپ کی طرح تھا۔ اس نے کبھی ہمیں ہاتھ تک نہیں لگایا..... مگر چونکہ اس نے سندھ و ہند کے بادشاہ کو قتل کیا، ہمارے گھروں کو اُجاڑا اور ہماری قوم کو غلام بنایا، اس لیے ہم نے اس پر تہمت لگائی۔ آپ پر لازم تھا کہ پہلے اس واقعے کی مکمل تحقیقات کراتے، پھر کوئی فیصلہ سناتے۔''

یہ کہہ کر سورج دیوی چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے محمد بن قاسم کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور یہ بھی کیسا احمق انسان تھا کہ ادھورے پور سے کچے چمڑے میں لپٹ کر چلا آیا۔ اسے چاہئے تھا کہ وہ بغداد کے قریب پہنچ کر بادشاہ کے حکم پر عمل کرتا تا کہ اس طرح اذیت ناک موت سے محفوظ رہتا۔''

سورج دیوی کی بات سن کر خلیفہ بہت مغموم ہوا اور دانتوں سے اپنا ہاتھ کاٹنے لگا۔

سورج دیوی نے سلیمان بن عبدالملک کو رنجیدہ دیکھ کر کہا۔

''بادشاہ سے ایک بڑی بھاری غلطی یہ ہوئی کہ اس نے دو غلام لڑکیوں کی خاطر ایک ایسے آدمی کو قتل کرا دیا جس نے سندھ و ہند کے بادشاہ کو تختِ شاہی سے تختۂ مرگ تک پہنچایا، مندروں اور بت خانوں کی جگہ مسجدیں تعمیر کرائیں ...... اور اسلامی سلطنت کی حدود میں بے پناہ اضافہ کیا...... بالفرض اگر ایسے شخص سے کوئی غلطی بھی سرزد ہو گئی، تب بھی اسے ایک مخالف کی تہمت طرازی کی بنیاد پر قتل نہیں کرانا چاہئے تھا۔''

ابھی سورج دیوی کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ سلیمان بن عبدالملک غضب ناک ہو گیا اور اس نے حکم جاری کر دیا کہ دونوں بہنوں کو دیوار میں زندہ چنوا دیا جائے۔

''تاریخ معصومی'' کی روایت کے مطابق سورج دیوی اور پرمل دیوی کو گھوڑوں کی دُموں سے باندھ کر اس قدر کھینچا گیا کہ دونوں بہنیں ہلاک ہو گئیں اور پھر ان کے جسم کے ٹکڑے کر کے دریا میں بہا دیا گیا۔

اس من گھڑت داستان اور بے سرو پا روایت کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ سلیمان بن عبدالملک

جیسے ذہین خلیفہ کو ایک انتہائی بے عقل اور دنیا کا احمق ترین حکمراں ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس روایت کا دوسرا بڑا عیب یہ ہے کہ سلیمان بن عبدالملک کے زمانے میں بغداد کو دارالخلافہ ظاہر کیا گیا ہے۔ حالانکہ اُس وقت اس نام کے کسی شہر کا وجود تک نہیں تھا۔ بغداد، عباسی خلیفہ منصور کے دورِ حکومت میں آباد ہوا اور اس کی تعمیر میں امامِ اعظم حضرت ابوحنیفہؒ نے نمایاں حصہ لیا۔ اس فرضی واقعے کا تیسرا عیب یہ ہے کہ اس کا ایک راوی غیر معتبر ہے، دوسرا گمنام۔

❀---❀---❀

اصل واقعہ یوں تھا کہ ولید کی وفات کے بعد سلیمان بن عبدالملک نے یزید بن مہلب کو مشرقی ممالک کا حاکمِ اعلیٰ مقرر کیا۔ یزید، حجاج بن یوسف اور اس کے خاندان سے پرانی دشمنی رکھتا تھا۔ اس نے صالح بن عبدالرحمٰن کو محکمۂ خراج کا افسر نامزد کر دیا۔ صالح اپنے عقیدے کے اعتبار سے خارجی تھا۔ حجاج بن یوسف نے بہت سے خارجیوں کو قتل کرایا تھا اور ان ہی میں صالح بن عبدالرحمٰن کا بھائی آدم بھی شامل تھا۔ صالح بہت دنوں سے اپنی جماعت اور اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے بے چین تھا۔ اس کام میں عبدالملک بن مہلب بھی شریک ہوگیا۔ دونوں نے مل کر حجاج کے نزدیک و دُور کے عزیزوں کو ایک ایک کر کے گرفتار اور قتل کرنا شروع کر دیا۔ اسی سلسلے میں محمد بن قاسم کو بھی مجرم قرار دے کر سندھ کی حکومت سے معزول کر دیا گیا۔ اب اس علاقے کا گورنر یزید بن کبشہ تھا۔

سارے انتظامات مکمل کرنے کے بعد صالح بن عبدالرحمٰن خارجی نے اپنے بھائی معاویہ بن مہلب اور یزید بن کبشہ کو سندھ روانہ کیا تا کہ محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق بھیجا جا سکے۔

عظیم فاتح کو اپنی معزولی کی خبر مل چکی تھی۔ اس کے جاں نثار سپاہیوں نے کہا۔ ''یہ ایک گہری سازش ہے۔ آپ کسی تامل کے بغیر صالح بن عبدالرحمٰن کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیجئے۔''

''واللہ! میں سب کچھ جانتا ہوں۔'' محمد بن قاسم نے اُداس لہجے میں کہا۔ ''مجھے خبر ہے کہ میری ذات کو انتقام کا ہدف بنایا جا رہا ہے۔''

''پھر بھی آپ مفسدین کے احکام کی تعمیل کرنے پر آمادہ ہیں۔'' ایک عراقی سردار نے تلخ لہجے میں کہا۔

''معاملہ صرف میری ذات کا نہیں۔'' محمد بن قاسم نے عراقی سردار کی تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ''مسئلہ مرکزیت کا ہے۔ اگر میں نے باغیانہ روش اختیار کی تو مرکز کا نظام تہہ و بالا ہو جائے گا۔ پھر میں بروزِ حشر حق تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا؟''

''اپنے دفاع کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔'' دوسرے سردار نے بغاوت کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔

''احتیاطی تدابیر اسی وقت اختیار کی جا سکتی ہیں جب میں مرکز کا حکم ماننے سے انکار کر دوں۔'' عظیم فاتح نے اپنے ساتھیوں کے مشوروں کو لائقِ التفات نہیں سمجھا۔ ''میں کسی بھی حال میں یہ گوارا نہیں کروں گا

کہ ایک میری جان کی خاطر ہزاروں جانیں تلف ہو جائیں۔ اور آنے والا وقت مجھے باغی قرار دے کر قیامت تک رُسوا کرتا رہے۔''

کیرج، قنوج اور اودھے پور کے ایک لاکھ راجپوتوں نے بھی محمد بن قاسم کو یقین دلایا کہ وہ ان کے جسم پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آنے دیں گے۔ فاتح سندھ نے راجپوت سپاہیوں کی محبت وعقیدت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''میں مجبور ہوں۔ مجھے اکیلے ہی جانا ہوگا۔''

محمد بن قاسم کو ہزاروں عرب شہسواروں اور لاکھوں مقامی سپاہیوں کی حمایت حاصل تھی۔ اگر وہ چاہتا تو جنگ کرتا ہوا ہندوستان کے دُور دراز علاقوں میں نکل جاتا..... اور پھر صالح بن عبدالرحمٰن خارجی تو کجا، خود خلیفہ سلیمان بن عبدالملک بھی زندگی بھر اس پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ مگر وہ ایک عظیم انسان تھا۔ اس نے اسلامی سلطنت کی مرکزیت برقرار رکھنے اور بے شمار زندگیوں کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔

پھر جب گورنر سندھ یزید بن ابی کبشہ اور معاویہ بن مہلب، محمد بن قاسم کو گرفتار کرنے اودھے پور پہنچے تو عظیم فاتح نے مسکراتے ہوئے بیڑیاں پہن لیں۔ اس کی فوجی وردی اتار کر ٹاٹ کا لباس پہنا دیا گیا پھر جب وہ اپنے لاکھوں ہم نواؤں سے رخصت ہوا تو اس کی زبان پر بڑے عجیب الفاظ تھے۔

''الوداع میرے ساتھیو! مسلمان کہیں بھی ہو اور کسی بھی حال میں ہو، اسے ہر حال میں اپنے امیر کے حکم پر ''لبیک'' کہنا ہی پڑتا ہے۔''

پھر جب محمد بن قاسم کے پیروں میں پڑی ہوئی زنجیروں کا شور اُبھرا تو سندھ کے گلی کوچوں میں درد بھری چیخیں گونجنے لگیں۔ دلوں کو فتح کرنے والا کسی کا دیوتا اور کسی کا مسیحا بڑی بے کسی کی حالت میں، تصویر درد بنا ہوا اپنے آبائی وطن کی طرف واپس جا رہا تھا۔

❀---❀---❀

پھر جب محمد بن قاسم، عراق جانے کے لیے کشتی میں سوار ہوا تو عظیم فاتح نے آسمان کی طرف دیکھا اور بلند آواز میں یہ شعر پڑھا۔

''ان لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا..... اور کیسے جواں مرد کو ضائع کر دیا..... جو رخنہ بندی اور جنگ کے دن کام آتا۔''

عراق پہنچنے کے بعد صالح بن عبدالرحمٰن خارجی نے محمد بن قاسم کو واسط کے قید خانے میں ڈال دیا، جہاں حجاج بن یوسف کے خاندان کے تمام افراد سخت اذیت ناک حالت میں زندگی کے باقی دن گزار رہے تھے۔

محمد بن قاسم کو قید خانے کے ایک الگ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ ایک دن داروغۂ زنداں نے سنا۔ عظیم

فاتح انتہائی پُرجلال لہجے میں یہ اشعار پڑھ رہا تھا۔

''اگر مجھے واسط میں قید کر دیا گیا یا زنجیریں پہنا کر بیکار بنا دیا گیا تو کیا ہوا؟

میں ہی ہوں جس نے شہسواروں کے دل میں ہیبت بٹھا دی اور بہت سے حریفوں کو قتل کیا۔''

صالح بن عبدالرحمٰن نے اپنے بھائی آدم خارجی کے قتل کا انتقام لینے کے لیے محمد بن قاسم کو ''آلِ عقیل'' کے حوالے کر دیا تھا۔ داروغۂ زنداں بھی اسی قبیلے سے تھا۔ اس نے محمد بن قاسم کو اشعار پڑھتے سنا تو بہت تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور چیخ کر بولا۔

''یہ شعر پڑھنا بند کر دو۔''

''کیوں؟'' محمد بن قاسم نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس لیے کہ ان اشعار سے تیرے فاتحانہ غرور کی بُو آتی ہے۔'' داروغۂ زنداں نے انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

''تم نے میرے جسم کو پتھر کی چار دیواری میں محبوس کر دیا..... مگر میری زبان کو کون قید کر سکتا ہے؟'' محمد بن قاسم کے لہجے میں غرور کے بجائے ایک شانِ بے نیازی تھی۔

''زبان بھی کاٹی جا سکتی ہے۔'' داروغۂ زنداں نے اپنی طاقت و اقتدار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ذہن پھر بھی آزاد رہے گا۔'' محمد بن قاسم نے جواب دیا۔ فاتح سندھ چودہ سال کی عمر میں ایسی فصیح و بلیغ تقریر کیا کرتا تھا کہ بڑے بڑے اہلِ دانش دم بخود رہ جاتے تھے۔

''دماغ میں آہنی میخیں بھی ٹھونکی جا سکتی ہیں۔'' داروغۂ زنداں اپنی سفاکی و درندگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے بڑی بے رحمانہ گفتگو کر رہا تھا۔

''پھر میرا طائرِ فکر آزاد ہو جائے گا اور آسمان کی لامحدود وسعتوں میں حشر تک پرواز کرتا رہے گا۔'' محمد بن قاسم نے آمرانہ قوتوں کی نفی کر دی تھی۔

داروغۂ زنداں نے عظیم فاتح کی دلیلوں سے عاجز آ کر محمد بن قاسم کو مارنا شروع کر دیا..... مگر قبیلۂ بنو ثقیف کا جواں مرد اس وقت تک وہی اشعار پڑھتا رہا جب تک اس کے ہوش باقی رہے۔

محمد بن قاسم کو اُنیس سال کی عمر میں حوالۂ زنداں کیا گیا تھا۔ تین سال تک فاتح سندھ پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ اگر یہ عمل پتھروں کے ساتھ روا رکھا جاتا تو وہ بھی چیخ جاتے۔ آخر بائیس سال کی عمر میں تاریخ کی پیشانی پر اپنی فتوحات کے لازوال نقوش چھوڑ کر سالارِ اعظم اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔

مشہور شاعر حمزہ حنفی نے اس جوان مرگ کا مرثیہ لکھا۔

''مروت، دل کی بڑائی اور فیاضی محمد بن قاسم ہی کا حصہ تھی..... جس نے سترہ برس کی عمر میں لشکروں کی سرداری کی...... یہ سرداری اس کی پیدائش سے کس قدر قریب تھی۔

ایک اور شاعر نے عظیم فاتح کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔

''اس نے سترہ برس کی عمر میں مردانِ کارزار کی سرداری کی۔ حالانکہ اس کے برابر کے لڑکے ابھی کھیلوں ہی میں مشغول تھے۔''

جب محمد بن قاسم کی وفات کی خبر سندھ پہنچی تو گھر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ کیا ہندو اور کیا مسلمان، سب کے لبوں پر شورِ فغاں تھا۔ برسوں اہلِ سندھ کا یہ طریقہ رہا کہ وہ محمد بن قاسم کی یاد میں تعزیتی مجالس منعقد کرتے اور فاتح اعظم کے اوصافِ حمیدہ بیان کر کے دیر تک روتے رہتے۔

کیرج (جے پور) کے باشندوں نے محمد بن قاسم کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اس کا مجسمہ ایک چوراہے پر نصب کر دیا تھا۔ جہاں شہر کے لوگ جمع ہو کر اس شخص کا ماتم کرتے تھے، جس نے کسی مفتوح کی جاگیر ضبط نہیں کی...... اور کسی ہندو دوشیزہ کو بری نظر سے نہیں دیکھا۔ اسے دنیا سے رخصت ہوئے زمانے گزر چکے تھے۔ اپنوں نے اسے قبر میں اُتار دیا تھا مگر غیروں کے دلوں پر اب تک اس کی حکومت قائم تھی۔

اگر اُموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک، صالح بن عبدالرحمٰن خارجی کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بنتا، اور محمد بن قاسم کو شہید نہ کیا جاتا تو ہندوستان کی تسخیر کے لیے محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔



سرِ بُریدہ

روہیل کھنڈ شمالی ہندوستان میں وہ مشہور علاقہ ہے جہاں دو سو برس تک روہیلہ افغانوں نے حکومت کی اور تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے۔ یہ خطۂ ارض ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں کے گھنے جنگلات اور سرسبز و شاداب علاقہ اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتا ہے۔

''روہ'' افغانستان میں کوہستان کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ اسی نسبت کے باعث یہاں کے رہنے والے ''روہیلہ'' کہلاتے ہیں۔ پھر جب 1742ھ میں نواب علی محمد خاں نے راجہ ہرنند کو شکست دے کر اُس کے علاقے ''کٹھیر'' پر قبضہ کر لیا تو روہیلہ افغان یہاں آ کر آباد ہونے لگے۔ پھر ہمالیہ کی ترائی کا یہ علاقہ روہیل کھنڈ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ روہیل کھنڈ آنولہ، نجیب آباد، فرخ آباد، بریلی، شاہ جہاں پور، پیلی بھیت، مراد آباد اور رام پور جیسے تاریخی شہروں پر مشتمل ہے۔

اس تاریخ ساز علاقے کی داستان ولولہ انگیز بھی ہے اور خوں ریز بھی۔ شیخ شہاب الدینؒ مشہور افغان بزرگ تھے اور خاص و عام میں کوٹا بابا کے نام سے مشہور تھے۔ شیخ کا مزار ہزارہ میں ہے اور آج بھی مرکزِ دل و نگاہ ہے۔

شاہ عالم خان، شیخ شہاب الدین کے پوتے تھے۔ ان کے والد محمود خان عرف موتی بابا اپنے علاقے کے مشہور بزرگ تھے۔ موتی بابا کے انتقال کے بعد ان کی جائیداد پانچ بیٹوں میں برابر سے تقسیم کر دی گئی۔ شاہ عالم خان کے حصے میں ایک غلام آیا جس کا نام داؤد خان تھا۔

شاہ عالم خان کی شادی کو کئی سال ہو چکے تھے مگر ابھی تک وہ بے اولاد تھے۔ آخر انہوں نے داؤد خان کو اپنا بیٹا بنا لیا اور نہایت توجہ سے اس کی پرورش کرنے لگے۔ پھر جب داؤد خان جوان ہوا تو اُس نے شاہ عالم خان کی زمین کی ذمہ داری سنبھال لی اور کھیتی باڑی کرنے لگا۔ داؤد خان فطرتاً ایک دولت پرست نوجوان تھا۔ وہ بڑے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں کے بیٹوں کے عیش و آرام دیکھتا اور دل ہی دل میں یہ سوچ کر کڑھتا رہتا کہ اُس کے پاس اتنی دولت کیوں نہیں ہے؟ آخر ایک دن یہ دبی دبی حسرت

اُس کی زبان پر آ گئی اور وہ شاہ عالم خان سے کہنے لگا۔

''بابا! ہم اتنے غریب کیوں ہیں؟''

شاہ عالم خان نے اپنے لے پالک بیٹے کی طرف غور سے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

''داؤد خان! تجھے خداوندِ عالم نے سب کچھ تو دے رکھا ہے۔ دونوں وقت عزت و آبرو کے ساتھ پیٹ بھر کر روٹی کھاتا ہے اور صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہے۔ پھر تُو غریب کیسے ہو گیا؟''

''نہیں بابا! یہ کوئی زندگی نہیں ہے۔'' داؤد خان نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''لذیذ کھانے، اونچے اونچے پختہ مکانات، زرق برق لباس اور سبک رفتار عربی النسل گھوڑے۔ زندگی تو اسے کہتے ہیں۔''

''زندگی اسے کہتے ہیں کہ تُو جدھر سے گزرتا ہے، تجھے دیکھ کر لوگ احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں اس لیے کہ تیری ذات کو شیخ کوٹا باباؒ اور شیخ موتی باباؒ کے خاندان سے نسبت ہے۔'' شاہ عالم خان کی مسکراہٹ اب گہری سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی تھی اور وہ نادان بیٹے کو حقیقی زندگی کے اسرار و رموز سمجھا رہے تھے۔

''میں احترام نہیں، دولت چاہتا ہوں۔'' مادہ پرست نوجوان کی سوچ بہت سطحی تھی اور وہ سونے چاندی کے سکوں کو عزت و توقیر کی زندگی پر ترجیح دے رہا تھا۔

''داؤد خان! اللہ تجھ پر رحم کرے اور تیری نادانیوں کو معاف فرمائے۔'' شاہ عالم خان نے نہایت اثر انگیز لہجے میں کہا۔ ''میں تو فقیروں کی اولاد ہوں اس لیے زیادہ کی ہوس نہیں رکھتا۔ اگر تجھے زیادہ دولت کی طلب ہے تو دن رات محنت کر۔ اللہ تیری فصلوں کو زیادہ بار آور کر دے گا..... مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ گندم کی جگہ زمین سے ہیروں اور جواہرات کی فصل اُگا دے۔ حالانکہ یہ کام بھی اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔''

داؤد خان نے اپنے قناعت پسند اور درویش مزاج باپ کی بات سنی ان سنی کر دی اور جاگتی آنکھوں سے، دن کے اُجالے میں دولت کے خواب دیکھنے لگا۔

❀---❀---❀

اسی دوران کچھ افغانوں نے داؤد خان کو بتایا کہ کشمیر کا علاقہ بہت سرسبز و شاداب ہے اور وہاں دولت کی بارش ہوتی ہے۔ اگر کوئی بہادر شخص وہاں جا کر قسمت آزمائی کرے تو یقیناً خوشحال ہو جائے گا۔ کشمیر کی نادیدہ دولت کے متعلق سن کر زر پرست داؤد کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کچھ دن وہ سینے میں دبی ہوئی چنگاریوں کی حرارت کو برداشت کرتا رہا۔ مگر جب آتشِ ہوس بھڑکنے لگی تو وہ بے قرار ہو گیا اور شاہ عالم خان سے کہنے لگا۔

''بابا! مجھے چند معتبر لوگوں نے بتایا ہے کہ علاقہ کشمیر میں دولت کے انبار لگے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی وہاں جا کر اپنا حصہ لے لوں؟''

''کیا وہاں دولت مفت میں تقسیم ہو رہی ہے یا بھیک میں دی جا رہی ہے؟'' شاہ عالم خان نے حسبِ عادت مسکراتے ہوئے کہا۔

باپ کی بات سن کر نوجوان داؤد خان جھنجلا گیا۔ ''میں کسی سے بھیک نہیں مانگوں گا بلکہ اپنا حصہ بزورِ بازو حاصل کروں گا۔''

لے پالک بیٹے کے چہرے کا بگڑا ہوا رنگ دیکھ کر شاہ عالم خان سنجیدہ ہو گئے اور نہایت جذباتی لہجے میں کہنے لگے۔

''داؤد خان! تُو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں بے اولاد ہوں اور تجھے میں نے بیٹے کی طرح پالا ہے۔ کیا کوئی محبت کرنے والا باپ چند سکّوں کے لیے اپنے بیٹے کو اُس نامعلوم منزل کی طرف جانے کی اجازت دے سکتا ہے جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے؟''

داؤد خان نے ایک باپ کے دردِ کی شدت کو محسوس کیے بغیر اُسی خودغرضانہ لہجے میں کہا۔ ''میرے قبیلے میں بہت سے لوگ اپنے وطن اور ماں باپ کی آغوشِ محبت سے دُور خوشحال مستقبل کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں گھوم رہے ہیں اور کیسی کیسی کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں...... مگر ایک میں ہوں کہ آپ نے میرے پیروں میں اپنے حکم کی زنجیر ڈال رکھی ہے۔''

شاہ عالم خان نے داؤد خان کے چہرے سے اس کے جذبوں کی سرکشی کا اندازہ کر لیا تھا۔ پھر بھی اپنی محبت سے مجبور ہو کر سمجھاتے رہے۔ ''تُو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے داؤد خان!...... تُو مجھے آتشِ فراق کے حوالے نہ کر۔''

داؤد خان بہت دیر تک باپ سے حجت کرتا رہا۔

آخر شاہ عالم خان، بیٹے کی دلیلوں سے تنگ آ گئے اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''اگر کوئی مجھے یہ یقین بھی دلا دے کہ تُو کشمیر جا کر وہاں کا حاکم بن جائے گا، تب بھی میں تجھے خوشی سے جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

داؤد خان، باپ کے سامنے سے اُٹھ کر چلا گیا اور پھر ساری رات جاگتا رہا۔ بار بار وہ خودکلامی کے انداز میں ایک ہی جملہ دہراتا تھا۔ ''بابا! میرا نام داؤد خان ہے۔ میں آپ کو کشمیر کا حاکم بن کر دکھاؤں گا۔''

پھر داؤد خان انتہائی خاموشی اور رازداری کے ساتھ منصوبہ بندی کرتا رہا۔ کئی ماہ کی تگ و دو کے بعد اُس نے اپنے ہم خیال بارہ نوجوانوں کو جمع کیا...... اور ایک سب کے سب رات کے اندھیرے میں شہامت پور سے فرار ہو گئے۔

❀---❀---❀

نمازِ فجر کے بعد شاہ عالم خان حسبِ معمول اوراد و وظائف میں مشغول ہو گئے۔ پھر اُس وقت چونکے جب اُن کی بیوی اُنہیں مخاطب کر کے کہہ رہی تھیں۔

''داؤد خان اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ ذرا دیکھیں تو وہ کہاں گیا ہے؟''
شاہ عالم خان نے مطمئن لہجے میں کہا۔''اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ وہ تو اکثر صبح سویرے اپنے کھیتوں پر جایا کرتا ہے۔''
''داؤد خان آج تک اس طرح گھر سے نہیں گیا۔ وہ ہمیشہ مجھے سلام کر کے گھر سے جاتا ہے۔'' داؤد خان کی گمشدگی پر وہ عورت بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی تھی جو حقیقت میں اس کی ماں نہیں تھی۔
بیوی کی اس جذباتیت سے مجبور ہو کر شاہ عالم خان گھر سے نکلے اور کھیتوں پر جا کر داؤد خان کو تلاش کرنے لگے۔ مگر وہاں اُس کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ قرب و جوار کے لوگوں سے پوچھا مگر سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر شاہ عالم خان تھک ہار کر لوٹ آئے اور شام تک داؤد خان کا انتظار کرتے رہے۔
یہ طویل وقت اُن کی بیوی پر بہت گراں گزرا تھا۔ وہ کئی بار شوہر سے اپنے اس خدشے کا اظہار کر چکی تھیں۔ ''خدانخواستہ داؤد خان کو کچھ ہو تو نہیں گیا ہے؟ آج تک وہ اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہا۔''
شاہ عالم خان کی بیوی نے دبے لفظوں میں افغانوں کی اُس روایتی دشمنی کی طرف اشارہ کیا تھا جس کا مظاہرہ کرتے وقت وہ انسانوں کو بے دریغ قتل کر دیا کرتے تھے۔
شاہ عالم خان نہ صرف پڑھے لکھے انسان تھے بلکہ ایک صوفی کے درویش بیٹے تھے..... اور درویشی انسان کو انسان سے محبت کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ اس لیے وہ وحشیانہ رسموں سے بہت دُور نکل آئے تھے اور چٹانوں کے سینے میں گلابوں کی فصل اُگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاہ عالم خان نے اپنی نرم دل بیوی کے وہم اور اندیشے کی نفی کرتے ہوئے کہا۔
''میں امن و آشتی کا نقیب ہوں۔ میں نے اپنے ہم نسلوں سے اتنی محبت کی ہے کہ ہمیشہ ان کی گالیوں کے جواب میں دعائیں دی ہیں۔ پھر کوئی شخص مجھ سے رسمِ دشمنی کیوں نبھائے گا؟ اور کیوں میرے بیٹے داؤد خان کو گزند پہنچائے گا؟''
''پھر وہ کہاں چلا گیا؟'' بیوی کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔
''بی بی! تم قبل از وقت داؤد خان کی موت کا ماتم مت کرو'' شاہ عالم خان نے اپنی شریکِ حیات کو سمجھاتے ہوئے کہا۔''میرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہے اور تمام صدمات سے محفوظ ہے۔ اگر کوئی بلائے ناگہانی اس کے تعاقب میں ہے تو میں اپنے اللہ سے دعا کروں گا۔ وہ داؤد خان کو امان بخشے گا۔'' یہ کہتے کہتے شاہ عالم خان خود بھی آبدیدہ ہو گئے۔
پھر دونوں میاں بیوی رات بھر جاگ کر داؤد خان کا انتظار کرتے رہے۔ مگر داؤد خان تو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کسی اور ہی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔
دوسرے دن شاہ عالم خان کی بے قراری کچھ اور بڑھ گئی۔ پھر وہ محلے کے ایک ایک شخص سے ملے اور داؤد خان کے بارے میں دریافت کیا۔ مگر سب لوگ یہی کہتے رہے کہ وہ اُس کی سرگرمیوں کے متعلق کچھ

نہیں جانتے۔ شاہ عالم خان ایک صاحبِ توکل بزرگ تھے مگر داؤد خان کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ قرب و جوار کے دوسرے محلوں میں بھی گئے اور اپنے گم شدہ بیٹے کے بارے میں پوچھتے رہے۔ آخر شام کے قریب اُن پر یہ راز فاش ہوا کہ صرف داؤد خان ہی نہیں، دوسرے محلوں کے گیارہ نوجوان اور بھی غائب ہیں۔

شاہ عالم خان ناکام و نامراد گھر واپس لوٹے اور انتہائی افسردہ لہجے میں بیوی سے کہنے لگے۔

''داؤد خان کی فکر چھوڑ دو۔ وہ شہامت پور سے فرار ہو کر اُس جگہ چلا گیا ہے جہاں بقول اُس کے دن رات دولت برستی ہے۔''

شاہ عالم خان کی شریکِ حیات نے بڑے تحمل کے ساتھ یہ الم انگیز خبر سنی اور دُکھ بھرے لہجے میں شوہر سے کہنے لگیں۔ ''اُس عاقبت نا اندیش نے آپ کی نصیحت اور حکم کو بھی کوئی حیثیت نہیں دی؟''

شاہ عالم خان کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ وہ بیٹے کی نادانی اور نافرمانی کے باوجود قدم قدم درویشانہ صبر کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

''بی بی! کیا آپ نے فرمانِ الٰہی نہیں سنا کہ مال و اولاد انسان کے لیے سب سے بڑا فتنہ (آزمائش) ہیں؟ داؤد خان اسی امتحان سے گزر رہا ہے اور خود ہم دونوں بھی۔ اس لیے ہمیں ہر حال میں راضی بہ رضا رہنا چاہیے۔ اللہ اس کی منزل آسان کرے۔'' مجبور باپ، مغرور بیٹے کو دعائیں دے رہا تھا۔

''پرایا خون پرایا ہی ہوتا ہے۔'' غم زدہ ماں سے داؤد خان کی یہ باغیانہ حرکت برداشت نہ ہو سکی اور حرفِ شکایت ان کی زبان پر آ ہی گیا۔ ''اگر آج اپنا بیٹا ہوتا تو ہمیں یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔''

''بی بی! یاد رکھیں۔ ہوسِ زر میں اپنے پرائے کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔'' شاہ عالم خان نے اپنی شریکِ حیات کو ایک خاص نکتہ سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں دولت کی فتنہ انگیزیوں سے اپنے رب کی پناہ مانگنی چاہیے۔''

❀---❀---❀

جس زمانے میں داؤد خان، شہامت پور سے ''کشمیر'' کی طرف روانہ ہوا، اُس وقت دہلی کے تخت پر فرخ سیر کی بادشاہت تھی..... لیکن یہ حکومت برائے نام تھی۔ عظیم مغلوں کا اقتدار پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ مرکزیت اس طرح غائب ہو چکی تھی، جیسے اُس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ تمام علاقوں کے حاکموں نے اپنی گردنوں سے فرخ سیر کی اطاعت کا طوق اُتار پھینکا تھا۔ یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے جاگیردار ہی حکمرانی کا خواب دیکھنے لگے تھے۔

جب داؤد خان اپنے بارہ ساتھیوں کے ہمراہ رام پور کے علاقے سے گزر رہا تھا تو اُس کی آنکھوں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔

''ٹھہر جاؤ اور غور سے دیکھو کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟'' داؤد خان نے اپنے دوستوں کو مخاطب کرتے

ہوئے کہا۔

داؤد خان کے دوستوں نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں اور وہیں ٹھہر گئے۔

ایک ہرے بھرے کھیت میں تین کتے ایک گیدڑ کو گھیرے ہوئے تھے اور گیدڑ اپنے روایتی دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ڈٹا ہوا تھا۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی جگہ دس پندرہ گیدڑ جمع ہوں اور وہاں صرف ایک کتا پہنچ جائے تو سارے گیدڑ اسے دیکھ کر فرار ہو جاتے ہیں......مگر یہاں معاملہ بالکل اُلٹ تھا۔ ایک تنہا گیدڑ تین کتوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ داؤد خان اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ وہ اکیلا گیدڑ کئی بار کتوں پر جھپٹا اور بھرپور حملے کیے۔ یہاں تک کہ تینوں کتے بھاگ کھڑے ہوئے اور گیدڑ دُور تک اُن کا تعاقب کرتا رہا۔

یہ منظر دیکھ کر داؤد خان کے تمام ساتھی زور سے ہنسے۔ ''ہماری آنکھوں نے آج تک نہ ایسا واقعہ دیکھا اور نہ کانوں سے سنا۔ کوئی اس بات پر یقین نہیں کرے گا کہ ایک کمزور اور بزدل گیدڑ نے تین طاقتور کتوں کو میدان سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔'' تمام افغان نوجوانوں کی آنکھوں سے شدید حیرت کے رنگ نمایاں تھے۔

اگرچہ اُس وقت داؤد خان کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی زیرک نوجوان تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اس مٹی کا اثر ہے کہ ایک گیدڑ نے اپنے حریف کتوں کو بھگا دیا۔ مجھے اس زمین سے بہادری کی خوشبو آتی ہے۔ اگر وقت نے موقع فراہم کیا تو میں اسی جگہ کو اپنا مسکن بناؤں گا۔'' یہ کہہ کر داؤد خان اپنی منزل کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔

❁---❁---❁

پھر داؤد خان اور اس کے ساتھی اتر پردیش کے تاریخی شہر بدایوں پہنچے۔ بدایوں، ہندوستان کا ایک قدیم ترین شہر ہے جو آج بھی اسلامی اقتدار کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ یہاں سلطان شمس الدین التمش کی تعمیر کردہ عالیشان جامع مسجد موجود ہے جس کے دلکش نقش و نگار کو صدیوں کے غبار نے بڑی حد تک دُھندلا دیا ہے.....مگر اس کے بلند مینار آج بھی نمازیوں کو مسلمانوں کے شاندار ماضی کی داستانیں سناتے رہتے ہیں۔ شہر بدایوں کو ہندوستان کا مدینہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بدایوں میں بڑے بڑے صوفیائے کرام کے مزارات موجود ہیں۔ سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ یہیں پیدا ہوئے تھے۔ آپؒ کے والد ماجد اور دادا محترم حضرت سیّد علی بخاریؒ اور حضرت سید احمد بخاریؒ کے مزارات بھی اسی شہر میں دل و نگاہ کا مرکز ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے دورِ حکومت میں اسی مقام پر کفار کے ساتھ ایک خوں ریز جنگ ہوئی تھی جس میں ہزاروں مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ نتیجتاً بدایوں میں قدم قدم پر زیرِ زمین شہداء کے ایسے بہت سے مزارات موجود

ہیں جن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔

داؤد خان اور اس کے ساتھیوں نے قسمت آزمائی کے لیے اسی تاریخی شہر کا انتخاب کیا تھا۔ یہاں کا حاکم ایک بہت بڑا مسلمان جاگیردار تھا۔ داؤد خان اور اس کے ساتھی حاکمِ بدایوں کے دربار میں پہنچے اور ملازمت کی درخواست کی۔

حاکمِ بدایوں نے بارہ افغان نوجوانوں کو بہت غور سے دیکھا، جن کے سفید چہروں پر خون اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے آگ دہک رہی ہو۔

''آخر تم میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ میں تمہیں اپنے حلقۂ ملازمت میں شامل کرلوں؟'' حاکمِ بدایوں نے افغان نوجوانوں سے پوچھا جو بہت زیادہ پُرجوش اور پُراعتماد نظر آرہے تھے۔

''ہم وفادار بھی ہیں اور جاں باز بھی۔'' داؤد خان نے شمشیر کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہم جاں فروش ہیں اور آپ کے ایک اشارے پر اپنی زندگی قربان کر سکتے ہیں۔'' داؤد خان کے دوسرے ساتھی نے جوش میں اپنی شمشیر بے نیام کر لی۔

''بس، بس۔'' حاکمِ بدایوں نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''میں نے ایسے بہت سے دعوے سنے ہیں..... مگر یاد رکھو کہ ہر دعویٰ روشن اور مضبوط دلیل چاہتا ہے۔ میں تمہیں اپنے خدمت گاروں میں شامل کیے لیتا ہوں..... لیکن تم اس وقت تک حالتِ امتحان میں رہو گے، جب تک کہ مسلسل کامیابیاں حاصل نہیں کر لیتے۔ اب میں دیکھوں گا کہ تمہاری تلواروں سے میرے دشمنوں کا خون ٹپکتا ہے..... یا پھر تم اپنی پشت پر زخم کھا کر میدان سے فرار ہوتے ہو؟''

آخر یہ بارہ افغان نوجوان اس شرط کے ساتھ حاکمِ بدایوں کے ملازم ہو گئے کہ بہتر کارکردگی پر ان کی تنخواہیں بھی بڑھتی رہیں گی۔

❀---❀---❀

داؤد خان اور اس کے ساتھی کئی سال تک حاکمِ بدایوں کے دشمنوں کی سرکوبی کرتے رہے۔ افغان جوانوں کی کارکردگی دیکھ کر حاکمِ بدایوں مطمئن ہوگیا اور اس نے اپنے ان ملازموں کو مزید مراعات بخش دیں۔

اس طویل عرصے میں شاہ عالم خان اور ان کی بیوی کو داؤد خان کی طرف سے کوئی خط یا زبانی پیغام موصول نہیں ہوا۔ بس کچھ لوگوں سے اُڑتے اُڑتے خبر ملی کہ اُن کا لے پالک بیٹا بدایوں کے علاقے میں مقیم ہے۔ پھر جب داؤد خان کے قدم جم گئے تو اس نے اپنے باپ کو ایک طویل خط لکھا۔

''بابا! میں حاکمِ بدایوں کے یہاں ملازم ہو گیا ہوں۔ وہ میری کارکردگی سے بہت خوش ہے..... اس لیے میں روز بروز ترقی کر رہا ہوں۔ عنقریب آپ تک یہ خبریں پہنچیں گی کہ داؤد خان کو اس کے خوابوں کی تعبیر مل گئی ہے۔ ماں کی خدمت میں میرا سلام پیش کیجیے گا اور کہیے گا کہ میں اس وقت تک شہامت پور نہیں آؤں گا، جب تک بہت سی دولت حاصل نہیں کر لیتا۔ دولت کے بغیر انسان کی کوئی حیثیت نہیں۔''

بیٹے کا خط پڑھ کر ماں بہت دیر تک روتی رہیں۔ ''کیا زمانہ آ گیا ہے کہ ایک بیٹا چند سکّوں کے لیے اپنی ماں کو رُلا رہا ہے۔ اسے اندازہ ہی نہیں کہ کتنے قیمتی موتی خاک میں مل رہے ہیں۔''

''بی بی! ایک زر پرست کے لیے کیوں آنسو بہا رہی ہو؟'' شاہ عالم خان نے حسبِ روایت انتہائی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آنسوؤں کی قدر تو اہلِ دل کرتے ہیں..... اور داؤد خان کے سینے میں تو دل ہی نہیں ہے۔''

''داؤد خان کو لکھ دو کہ اب میں اس کا منہ نہیں دیکھوں گی۔'' ماں نے بیٹے کی سنگدلی پر اپنے ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ خود تمہارا منہ دیکھنا نہیں چاہتا۔'' شاہ عالم خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مگر فوراً ہی سنجیدہ ہو گئے۔ ''مجھے داؤد خان کے بچھڑ جانے کا اتنا غم نہیں ہے۔ آخر بیٹے میدانِ جنگ میں جا کر قتل بھی تو ہوتے ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ اُس نے بزرگوں کی سر بلندی اور آزادی کا بہت سستے داموں سودا کر لیا اور غیروں کے سامنے گردن جھکا کر زنجیرِ غلامی پہن لی۔''

داؤد خان کو یقین تھا کہ باپ اس کے خط کا جواب ضرور تحریر کریں گے۔ مگر شاہ عالم خان نے اس طرح خاموشی اختیار کر لی، جیسے انہیں داؤد خان کا کوئی خط موصول ہی نہیں ہوا ہے۔

داؤد خان نے بھی باپ کی خاموشی کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا اور اپنے خوابوں میں گم ہو گیا۔

❀---❀---❀

اس دوران داؤد خان اور اس کے ساتھیوں نے کئی لڑائیاں لڑیں اور کامیابی حاصل کی۔ ان لڑائیوں میں قرب و جوار کے سرکش زمیندار مارے گئے اور داؤد خان نے ان کی جاگیروں پر قبضہ کر لیا۔ اب حاکمِ بدایوں کے دل پر داؤد خان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ وہ اپنے دشمنوں کو قتل کرا کے داؤد خان کو انعامات سے نواز رہا تھا۔ اس عرصے میں افغانستان سے پچاس ساٹھ نوجوان بدایوں آ کر داؤد خان کے گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔ نتیجتاً اس کی طاقت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ داؤد خان کی مسلسل کامیابیاں دیکھ کر اس علاقے کے چھوٹے زمینداروں نے داؤد خان کو پیشکش کی تھی۔

''اگر تم اور تمہارے ساتھی ہماری حفاظت کی ذمے داریاں سنبھال لیں تو ہم اس کے عوض تمہیں معقول رقم ادا کر سکتے ہیں۔''

داؤد خان بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی ذہین نوجوان تھا۔ اس نے چھوٹے زمینداروں کی پیشکش مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ''حاکمِ بدایوں میری کفالت کے لیے کافی ہے۔''

جب حاکمِ بدایوں تک یہ خبریں پہنچیں تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے داؤد خان کو دی جانے والی رقم میں اضافہ کر دیا۔

پھر ہوسِ زر پرستی نے نیا گل کھلایا۔ داؤد خان کئی دن سے خاموش تھا مگر اس کا مضطرب ذہن مسلسل

سوچ رہا تھا۔

"کیا بات ہے سردار؟...... کہاں کھوئے کھوئے رہتے ہو؟" ایک افغان نے داؤد خان سے پوچھا۔

"کیا گھر کی یاد آرہی ہے؟" اب داؤد خان کے ساتھی اُسے سردار کہہ کر پکارنے لگے تھے۔

"میں کئی دن سے سوچ رہا ہوں کہ آخر ہماری جانبازیوں کا کیا صلہ ہے؟" داؤد خان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "صرف چند سکے..... اور چوبیس گھنٹے کی ملازمت۔"

"اس کے سوا ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟" تیسرے ساتھی نے کہا۔

"ایسی خطرناک ملازمت کون کر سکتا ہے؟" داؤد خان نے اپنے ساتھی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ہر وقت اپنا سر ہتھیلی پر لیے پھرتے رہتے ہیں۔ کسی دن بھی موت ہمارا شکار کر سکتی ہے۔"

"پھر ہم کیا کریں؟" چوتھے ساتھی نے کہا۔ "اگر ہم اپنی جانوں کا کاروبار نہ کریں تو بھوکے مر جائیں۔"

"میں یہی تو کہہ رہا ہوں کہ جب وقت نے مہلت بخشی ہے تو ہمیں اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔" یکایک داؤد خان کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ اُبھر آئی۔ "اگر ہم نے اپنی حماقت کی وجہ سے یہ لمحے گنوا دیئے تو وقت ہمیں معاف نہیں کرے گا۔"

"بات کھل کر کرو سردار! ہم اشاروں کی زبان نہیں سمجھتے۔" ایک افغان جوان نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔

"جانوں کی بازی ہم لگاتے ہیں اور خزانے دوسروں کے بھرتے ہیں۔" داؤد خان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مگر آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" تمام افغان ساتھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"اب جس قدر لڑائیاں ہوں گی اور جتنا مالِ غنیمت ہاتھ آئے گا، اس پر ہمارا قبضہ ہوگا۔" داؤد خان لوٹے ہوئے مال کو مالِ غنیمت کہہ رہا تھا۔

"مگر حاکمِ بدایوں کو یہ بات کس طرح گوارا ہوگی؟" داؤد خان کے کئی ساتھیوں نے بیک زبان کہا۔

"حاکمِ بدایوں بھی ہمارا محتاج ہے۔" یکایک داؤد خان کے چہرے پر سرکشی اور بغاوت کا رنگ اُبھر آیا تھا۔ "ہمارے توانا بازو اس کی بھی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ ہمیں کس طرح روک سکتا ہے؟"

افغان نوجوان ذہنی کشمکش کا شکار نظر آنے لگے۔

اپنے ساتھیوں کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر داؤد خان نے بڑی ہوشیاری سے ان کے ذہنوں پر نئی ضرب لگائی۔ "اگر جانوں کا کھیل کھیلنا ہے تو پھر اپنے لیے کیوں نہیں کھیلیں؟ میں بہت دنوں سے ایک افغان ریاست کے قیام کا خواب دیکھ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر داؤد خان کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور ساتھیوں کے چہرے پر اپنی بات کا ردِعمل تلاش کرنے لگا۔

ساٹھ ستر افغان نوجوانوں کے چہروں پر خوشی کی چمک بھی تھی اور حیرت کا تاثر بھی۔

"تمہارے اس خواب کی تعبیر کس طرح ممکن ہے سردار؟" داؤد خان کے کئی ساتھیوں نے بیک وقت

ایک ہی سوال کیا۔

''بس تم چپ چاپ میرے کہنے پر عمل کرتے رہو۔'' یہ کہتے ہوئے داؤد خان کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک نظر آ رہی تھی۔

افغان نوجوانوں کے چہروں پر کئی سوال لرز رہے تھے مگر وہ اپنے سردار کی ہدایت کے مطابق خاموش تھے۔

❀---❀---❀

پھر ایک دن حاکمِ بدایوں نے داؤد خان کو طلب کر کے کہا۔ ''پرگنہ چومحلہ کے زمیندار نے سرکشی کی روش اختیار کی ہے۔ تم بلا تاخیر اس کا اُٹھا ہوا سر کچل دو۔''

داؤد خان کو اسی دن کا انتظار تھا۔ وہ اپنے ساتھ ستّر جاں باز ساتھیوں کو لے کر بدایوں کی حدود سے نکلا اور پھر طوفانِ برق و باد کی طرح ''پرگنہ چومحلہ'' کی طرف بڑھا۔

یہاں کا زمیندار اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے اپنے دفاع کے انتظامات نہ کر سکا اور داؤد خان کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس لڑائی میں کئی افغان نوجوان بھی شدید زخمی ہوئے۔ داؤد خان نے جی بھر کے اس کے علاقے کو لوٹا۔ پھر ہزاروں کی نقد رقم اور دیگر ساز و سامان لے کر آگے بڑھا۔

''پرگنہ چومحلہ'' سے چند میل کے فاصلے پر موضع بانکولی واقع تھا۔ یہاں کی بیشتر آبادی جاٹوں پر مشتمل تھی۔ جاٹوں کو ہندوؤں میں ایک لڑاکا قوم سمجھا جاتا ہے۔ داؤد خان اور اس کے ساتھیوں نے پوری شدت کے ساتھ بانکولی پر حملہ کیا۔ جاٹ بھی فطرتاً بہادر تھے مگر وہ افغانوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس شکست کے دو بنیادی اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ جاٹوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ داؤد خان کسی آفتِ ناگہانی کی طرح ان کے سروں پر نازل ہو جائے گا۔ اس لیے وہ صورتِ حال کو سمجھنے بھی نہیں پائے تھے کہ داؤد خان نے ان کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ دوسرے یہ کہ موضع بانکولی کے جاٹوں کے پاس لاٹھیوں، برچھیوں اور خنجروں پر مشتمل پرانا اور روایتی اسلحہ تھا جس کے ذریعے داؤد خان کی چمکتی تلواروں، تڑپتے نیزوں اور لپکتے تیروں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ افغان نوجوانوں نے آن کی آن میں ایک جیتی جاگتی بستی کو قبرستان بنا ڈالا، کھیتوں کو اُجاڑ دیا اور گھروں میں آگ لگا دی۔ بیشتر جاٹ موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ جو باقی بچے، وہ ایک نامعلوم منزل کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

داؤد خان اور اس کے ساتھی رات بھر جاٹوں کے مکانوں کی تلاشی لیتے رہے اور مال و اسباب جمع کرتے رہے۔ پھر صبح کے وقت افغان جوانوں کا یہ قافلہ فتح کے نشے میں سرشار آگے بڑھا۔ یہاں کچھ مسلمان گھرانے بھی آباد تھے جو داؤد خان کی یورش کا شکار ہو گئے۔ جب یہ لوگ موضع بانکولی کی حدود سے نکلے تو جنگل کا علاقہ شروع ہو گیا۔ یکایک داؤد خان کو ایک معصوم بچے کے رونے کی آواز آئی۔ داؤد خان نے فوراً ہی گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں اور اپنے ساتھیوں کو رک جانے کا حکم دیا۔

''تم بچے کی آوازیں سن رہے ہو؟'' داؤد خان نے اپنے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سردار! ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم ایک بچے کی چیخیں سن کر اپنا سفر روک دیں۔'' ایک ساتھی نے داؤد خان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

داؤد خان آواز پر کان لگا کر اس سمت کا اندازہ کرنے لگا جدھر بچے کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

''جس شخص نے اپنے قدموں میں لوٹتے ہوئے انسانوں کو امان نہیں بخشی، وہ ایک بچے کی آواز سن کر کیوں ٹھہر گیا ہے؟'' دوسرے ساتھی نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔

''کچھ بھی ہو، اس بچے کی طرف میرا دل کھنچ رہا ہے۔'' یہ کہہ کر داؤد خان نے آواز کی سمت اپنا گھوڑا بڑھایا۔ مجبوراً اس کے ساتھی بھی اس کے پیچھے چلنے لگے۔ داؤد خان کو تھوڑے ہی فاصلے پر درخت کے نیچے ایک پانچ چھ سالہ بچہ بیٹھا ہوا نظر آیا۔

وہ بچہ اتنا خوب صورت تھا کہ داؤد خان اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ روتے ہوئے بچے کی نظر داؤد خان اور اس کے ساتھیوں پر پڑی تو وہ خاموش ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک اور حیرت انگیز منظر افغان نوجوانوں کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ان لوگوں نے دیکھا کہ دو کالے سانپ، بچے کی دائیں بائیں طرف پھن اُٹھائے کھڑے تھے۔

''کیا تم بھی وہی دیکھ رہے ہو جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں؟'' داؤد خان نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یقیناً ہماری آنکھیں بھی وہی دیکھ رہی ہیں۔'' کئی افغان نوجوانوں نے اپنے سردار کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''بڑا حیرت انگیز منظر ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ دونوں سانپ بچے کی حفاظت کر رہے ہوں۔''

داؤد خان خاموشی کے ساتھ گھوڑے سے اُترا اور بچے کی طرف بڑھنے لگا۔ سانپوں نے ایک انسان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر پھن زمین پر رکھ دیئے اور تیزی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کالے ناگ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

داؤد خان نے بڑے والہانہ انداز میں آگے بڑھ کر بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ اپنے رومال سے اس کے آنسو خشک کیے اور پیار کرنے لگا۔ پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بلند آواز میں کہنے لگا۔

''دیکھو! یہ میرا بیٹا ہے۔ اور کیسا حسین و جمیل بیٹا ہے۔''

اس کے بعد سردار داؤد خان حاکم بدایوں کے پاس واپس جانے کے بجائے آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ رام پور کے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں داؤد خان نے ایک گیدڑ کو کتوں کا مقابلہ کرتے دیکھا تھا۔

اس وقت رام پور کی آبادی بہت کم نفوس پر مشتمل تھی اور وہ سب کے سب ہندو تھے۔ افغان نوجوان

کو دیکھ کر مقامی ہندوؤں نے گھٹنے بھی ٹیک دیئے اور ماتھے بھی۔ رام پور کے قدیم باشندوں نے کسی پس و پیش کے بغیر داؤد خان کو اپنا حاکم تسلیم کر لیا تھا۔

داؤد خان کو جب بھی موقع ملتا، وہ قرب و جوار کے علاقوں میں لوٹ مار کرتا اور اپنے ٹھکانے پر واپس لوٹ آتا۔ پھر اس کی کامیابیوں کی خبریں بہت تیزی کے ساتھ افغانستان پہنچنے لگیں۔ نتیجتاً پانچ سو افغان نوجوان اپنے اپنے گھروں سے نکل کر رام پور پہنچے اور داؤد خان کے فوجی دستے میں شامل ہو گئے۔ ان لوگوں میں افغانستان کے چند نامور سردار ملک شادی خان، پائندہ خان، دوندے خان، سردار خان اور صدر خان کمال زئی نمایاں تھے۔

موضع بانکولی کی لوٹ مار میں جو خوب صورت بچہ ہاتھ آیا داؤد خان نے اسے متبنٰی (لے پالک) بنا لیا اور اس کا نام علی محمد خان رکھ دیا۔ داؤد خان کو علی محمد خان سے اس قدر محبت تھی کہ داؤد خان اُسے اپنا حقیقی بیٹا سمجھتا تھا۔ داؤد خان نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کی تمام تر توجہات کا مرکز علی محمد خان تھا۔ داؤد خان نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لیے کئی اساتذہ مقرر کیے تھے۔

❁---❁---❁

داؤد خان کی فتوحات میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ خود بھی ایک چھوٹا سا جاگیردار بن گیا تھا..... اور اس کی کامیابیوں کی خبریں شہامت پور پہنچ رہی تھیں۔ مقامی لوگ شاہ عالم خان کی خدمت میں حاضر ہو کر اُنہیں مبارکبادیں دے رہے تھے۔

"آپ کے بہادر بیٹے نے تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ غیر علاقے میں افغانوں کی روایتی شجاعت کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ چھوٹی سی عمر میں یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ایک دن وہ افغانوں کی نئی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

اپنے ہم قوموں کی زبان سے داؤد خان کی تعریفیں سن کر شاہ عالم خان کے چہرے پر خوشی کا عجیب رنگ اُبھر آیا۔ اگرچہ داؤد خان اُن کا لے پالک تھا لیکن آج اُنہیں محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ ان کا حقیقی بیٹا ہو۔

شاہ عالم خان نے اپنی شریکِ حیات سے داؤد خان کی کامیابیوں کا ذکر کیا تو وہ بھی بے قرار ہو گئیں۔

"داؤد کتنا بھی بڑا آدمی بن جائے مگر اسے ابھی تک یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ وہ چند دنوں کے لیے شہامت پور آ کر بے قرار ماں باپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا دے۔"

"اگر یہ سچ ہے کہ داؤد خان ایک جاگیر کا مالک بن گیا ہے تو وہ اپنی جاگیر دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کس طرح یہاں آ سکتا ہے؟" شاہ عالم خان نے بیٹے کی غیر حاضری کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔

"آپ خود چلے جائیں۔" ماں بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہی تھیں۔ "اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ داؤد کس حال میں ہے۔ کم سے کم تسلی تو ہو جائے گی۔"

پھر جب شاہ عالم خان بیٹے سے ملنے کے لیے شہامت پور سے رخصت ہونے لگے تو شریکِ حیات

نے بڑے پُرسوز لہجے میں کہا۔

''داؤد سے کہنا، تُو کہیں بھی رہے، مگر ہر وقت میری دعاؤں کے سائے میں رہے گا۔'' یہ کہتے کہتے مجبور ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

❁---❁---❁

شاہ عالم خان، داؤد خان کی جاگیر میں پہنچے تو وہ اُنہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شاہ عالم خان اس سے ملنے کے لیے اس قدر دشوار گزار اور طویل سفر اختیار کریں گے۔ اسی خیال نے چند لمحوں کے لیے سکتے کی سی کیفیت طاری کر دی تھی۔

''داؤد خان! یہ میں ہوں، تیرا باپ۔ کیا تُو مجھے پہچان نہیں رہا ہے؟'' شاہ عالم خان نے بیٹے کو گم صم دیکھ کر کہا۔

باپ کے الفاظ سن کر داؤد خان کی حالتِ سکوت زائل ہو گئی۔ پھر وہ بڑے والہانہ انداز میں آگے بڑھا اور شاہ عالم خان کے قدموں سے لپٹ گیا۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ میں وطن سے اتنی دُور آپ کا مبارک چہرہ دیکھ رہا ہوں۔''

شاہ عالم خان نے بیٹے کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور نہایت رقت آمیز لہجے میں کہنے لگے۔

''داؤد خان! تُو نہیں جانتا کہ اولاد کی جدائی کا صدمہ کیا ہوتا ہے؟ میں نے تجھے ایک نظر دیکھنے ہی کے لیے اس عمر میں یہ مشکل ترین سفر طے کیا ہے۔''

بعض تاریخی روایتوں کے مطابق اس وقت شاہ عالم خان کی عمر اسّی اور نوّے سال کے درمیان تھی.... مگر بعض مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ جب شاہ عالم خان اپنے لے پالک بیٹے داؤد خان سے ملنے پہنچے تو وہ سو سال کے قریب تھے۔ بہرحال اس اختلاف سے قطع نظر، یہ امر طے شدہ ہے کہ شاہ عالم خان نے بیٹے سے ملنے کے لیے انتہائی دُشوار گزار سفر اختیار کیا تھا۔

شاہ عالم خان چند ماہ تک اپنے بیٹے کے پاس مقیم رہے۔ اس دوران داؤد خان نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جس طرح ایک غلام اپنے آقا کے ساتھ پیش آتا ہے۔ وہ روزانہ باپ کے اعزاز میں پُرتکلف دعوتیں کرتا تھا اور احتراماً قدم قدم پر بچھا جاتا تھا۔ شاہ عالم خان بھی داؤد خان کے طرزِ عمل سے بہت خوش تھے اور دن رات اُسے دعائیں دیتے رہتے تھے۔

''داؤد خان! میں تجھ پر ناز کرتا ہوں کہ تُو نے روہیلہ افغانوں کا نام روشن کر دیا۔''

جواب میں داؤد خان انتہائی نفرت و غرور کے لہجے میں کہتا۔ ''ابھی کیا ہوا ہے بابا؟ ابھی تو میرا منصوبہ تکمیل تک نہیں پہنچا ہے۔ آپ اس وقت مجھ پر اور بھی ناز کریں گے، جب میں روہیلہ افغانوں کی ایک آزاد ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور اپنے ہم قبیلہ لوگوں کے لیے ایسی خوش حالی لاؤں گا جس کے بارے میں انہوں نے سوچا بھی نہیں ہو گا۔''

شاہ عالم خان جوشِ جذبات میں بے قرار ہو کر داؤد خان کی پیشانی چوم لیتے۔ ''بیٹے! بڑا انسان وہی ہے جو اپنے سے زیادہ دوسرے لوگوں کا خیال رکھے۔''

پھر شاہ عالم خان چند ماہ گزار کر اپنے وطن واپس چلے گئے۔ رخصت ہوتے وقت داؤد خان نے دیگر تحائف کے ساتھ باپ کی خدمت میں دو ہزار روپے نقد پیش کیے۔ واضح رہے کہ 1704ء میں دو ہزار روپے موجودہ زمانے کے پچاس لاکھ روپے سے زیادہ قیمت رکھتے تھے۔

''ماں کی خدمت میں میرا سلام پیش کیجیے گا۔'' باپ کو رخصت کرتے وقت داؤد خان نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''انہیں میری مجبوریاں سمجھا دیجیے گا کہ جس جاگیر کو میں نے اپنی جان پر کھیل کر حاصل کیا ہے، اسے فی الوقت خالی نہیں چھوڑ سکتا۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی میں ان کی خدمت میں حاضری دوں گا۔''

اس پیغام کے ساتھ ہی داؤد خان نے ماں کے لیے بھی کچھ تحفے ارسال کیے۔

❀---❀---❀

شاہ عالم خان اپنے لے پالک بیٹے سے مل کر شہامت پور پہنچے تو ایک بہت بڑی خوش خبری اُن کی منتظر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے شاہ عالم خان کو اس ضعیفی کی عمر میں ایک خوبصورت بیٹا عطا کیا تھا۔ یہ قدرتِ الٰہی کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ جب انسان مایوسی کی آخری حدوں تک پہنچ جاتا ہے تو پردۂ غیب سے ایک گھرا بادل اُٹھتا ہے اور برسوں سے پیاسے صحرا پر اس طرح برستا ہے کہ تشنہ زمین سیراب ہو جاتی ہے اور ایک کشتۂ ویراں میں نخلِ آرزو کھِل اُٹھتا ہے۔ شاہ عالم خان بیٹے کا چہرہ دیکھتے ہی فوراً سجدے میں چلے گئے اور بہت دیر تک روتے رہے۔ یہ شکر کے آنسو تھے جنہیں وہ مالکِ حقیقی کی بارگاہِ جلال میں پیش کر رہے تھے۔

پھر شاہ عالم خان نے اپنے نومولود بیٹے کا نام رحمت خان رکھا۔ یہ وہی بچہ ہے جو آگے چل کر حافظ رحمت خان روہیلہ کے نام سے مشہور ہوا...... اور جس نے تاریخِ ہندوستان پر اپنی انسانیت اور شجاعت کے اَن مٹ نقوش چھوڑے۔

❀---❀---❀

کثرتِ ریاضت اور عمر کی زیادتی نے شاہ عالم خان کو تھکا ڈالا تھا۔ داؤد خان کے چلے جانے کے بعد شاہ عالم خان نے اپنی کھیتی باڑی کے انتظامات کسی دوسرے شخص کے سپرد کر دیئے تھے۔ مگر وہ ایک نہایت غیر ذمہ دار اور بے پروا انسان تھا۔ نتیجتاً سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ رحمت خان کی پیدائش کے بعد شاہ عالم خان کی ذمہ داریاں کچھ اور بڑھ گئی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے اور اس کام کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ داؤد خان نے انہیں جو دو ہزار روپے پیش کیے تھے، وہ قرضے ادا کرنے اور دوسرے کاموں میں خرچ ہو گئے۔ شاہ عالم خان تین سال تک کسی نہ کسی طرح گزر اوقات کرتے رہے پھر مجبوراً انہوں نے دوبارہ ہندوستان کا رخ کیا۔

اس بار بھی داؤد خان نے اپنے باپ کی خوب خاطر مدارات کی۔ پھر ایک رات تنہائی میں شاہ عالم

خان نے داؤد خان کے سامنے تمام صورتِ حال بیان کر دی۔
داؤد خان نے انتہائی پُر جوش لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔
"آپ روپے پیسے کی بالکل فکر نہ کریں۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ میں ہر سال باقاعدگی کے ساتھ آپ کی خدمت میں دو ہزار روپے کی رقم ارسال کرتا رہوں گا۔"
داؤد خان کی بات سن کر شاہ عالم خان مطمئن ہو گئے اور واپس جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ داؤد خان چاہتا تھا کہ باپ کچھ دن مزید اس کے پاس قیام کریں مگر شاہ عالم خان نے انکار کر دیا۔
"وہ زمانے اور تھے جب میں تمہارے علاقے میں کئی ماہ تک ٹھہر گیا تھا۔ مجھے ہر حال میں واپس لوٹ جانا ہے۔ اس لیے کہ تمہارے چھوٹے بھائی کو میری نگرانی کی شدید ضرورت ہے۔" رحمت خان کے دنیا میں آ جانے کے باوجود شاہ عالم خان، داؤد خان سے حقیقی بیٹے ہی کی طرح محبت کرتے تھے۔
اس صورتِ حال کے پیشِ نظر داؤد خان نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور شاہ عالم خان اپنے وطن کی طرف روانہ ہو گئے۔

پھر جب یہ سو سالہ درویش اپنے خدمت گاروں کے ہمراہ دہلی کے قریب پہنچا تو اچانک شاہراہ کے دونوں طرف سے مسلح گھڑ سوار برآمد ہوئے اور انہوں نے شاہ عالم خان کو گھیر لیا۔
شاہ عالم خان نے فوراً ہی تلوار کھینچ لی اور اجنبی شہ سواروں کو انتہائی سخت لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ کون ہو؟ اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"
"ہم قزاق یا رہزن ہرگز نہیں ہیں۔" ایک گھڑ سوار نے شاہ عالم خان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔
"پھر میرا راستہ روکنے کا مطلب؟" انتہائی بڑھاپے کے باوجود شاہ عالم خان کی آواز میں افغانوں کے لہجے کی وہی کاٹ تھی، جس کے لیے وہ ساری دنیا میں مشہور ہیں۔
"تمہیں اپنے بیٹے کا قرض ادا کرنا ہے۔" دوسرے گھڑ سوار نے نرم لہجے میں کہا۔ اسے شاہ عالم خان کی بزرگی کا لحاظ تھا۔
"کیسا قرض؟" شاہ عالم خان نے اسی تند و تیز لہجے میں کہا۔ انہیں مسلح گھڑ سواروں کی یہ مداخلت ناگوار گزری تھی۔ "کیا تم نے مجھ سے پوچھ کر داؤد خان کو قرض دیا تھا؟"
"کچھ بھی ہو، بیٹے کا قرض باپ ہی کو ادا کرنا پڑتا ہے۔" تیسرا سوار بولا۔ اس کا لہجہ سخت تھا۔
پھر جب شاہ عالم خان نے اجنبی سواروں سے داؤد خان کے قرض کی تفصیلات پوچھیں تو ایک سوار کہنے لگا۔
"تمہارے لے پالک بیٹے نے ایک سال پہلے ہمارے تاجر مالکوں سے سو گھوڑے خریدے تھے اور ایک ماہ بعد رقم کی ادائیگی کا وعدہ کیا تھا۔ پھر وقتِ مقررہ گزر جانے کے بعد وہ روز نیا وعدہ کرتا اور

دوسرے دن مکر جاتا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ اگر اس سے رقم کی ادائیگی کا تقاضا کرو تو قتل و غارت کی دھمکیاں دینے لگتا ہے۔ اسے اپنی طاقت پر بہت ناز ہے اور ہم تجارت پیشہ لوگ ہیں۔ داؤد خان ہماری اس کمزوری کو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم اس سے جنگ نہیں کر سکتے۔ اب ہمارے پاس ایک ہی صورت تھی کہ ہم داؤد خان کی عزیز ترین شے کو یرغمال بنالیں تاکہ وہ ہماری رقم ادا کر سکے۔''

داؤد خان کے قرض کی تفصیلات سن کر شاہ عالم خان کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ پھر وہ اذیت و کرب کی شدت سے کانپنے لگے۔

''ہمیں تمہاری بزرگی کا خیال ہے۔ اس لیے خاموشی سے ہمارے ساتھ چلے چلو۔ ورنہ ہم سخت روّیہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔'' ایک سوار نے سو سالہ بوڑھے کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

شاہ عالم خان نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''اے خدا! کیا میرے نصیب میں یہ دن بھی لکھے ہوئے تھے؟'' تکلیف کی شدت سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ایک خوددار افغان بھی تھے اور غیرت مند درویش بھی۔

''جلدی کرو۔ ہمارا وقت برباد ہو رہا ہے۔'' ایک سوار نے جھنجلا کر غضب ناک لہجے میں کہا۔

اتنے میں شاہ عالم خان اپنے آپ پر قابو پا چکے تھے۔ ''اطمینان رکھو۔ تمہارا وقت برباد ہوگا اور نہ رقم۔ میں داؤد خان کا قرض ادا کروں گا۔ مجھے اپنے مالکوں کے پاس لے چلو۔''

پھر جب شاہ عالم خان تاجروں کے پاس پہنچے تو ان لوگوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک تمہارا بیٹا داؤد خان مطلوبہ رقم ادا نہیں کرے گا، ہم تمہیں یرغمال بنائے رہیں گے۔

❀---❀---❀

شاہ عالم خان کئی دن تک شدید ذہنی اور قلبی اذیت کا شکار رہے۔ آخر ایک روز گھوڑوں کے تاجروں نے ان سے کہا۔

''تم ایک خط میں داؤد خان کو اپنی گرفتاری کا احوال لکھ ڈالو...... اور اس کے ساتھ یہ بھی تحریر کر دو کہ جب تک تاجروں کی رقم ادا نہیں کی جائے گی، یہ لوگ مجھے آزاد نہیں کریں گے۔''

''میرا یہ خط داؤد خان تک کس طرح پہنچے گا؟'' شدتِ کرب سے شاہ عالم خان کی آواز لرز رہی تھی۔

''تمہیں اس فکر میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ایک تاجر نے انتہائی ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''ہم اپنے ایک معتبر آدمی کے ذریعے تمہارا خط داؤد خان تک پہنچا دیں گے۔ پھر اگر وہ غیرت مند ہوگا تو ہماری رقم ادا کر کے تمہیں قید سے چھڑا لے گا ورنہ ایک دن تم یہیں مر جاؤ گے۔''

جس شخص کے سامنے بڑے بڑے افغان سردار دست بستہ سر جھکائے بیٹھے رہتے تھے، آج وہ عجیب صورتِ حال سے دوچار تھا۔ شاہ عالم خان کا سرخ و سفید چہرہ یکایک دھواں ہو گیا اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میں موت سے نہیں، اپنی رُسوائی سے ڈرتا ہوں۔''

''اگر اپنی رُسوائی سے ڈرتے ہو تو ہماری رقم ادا کر دو۔ ورنہ یہ خبریں دُور دُور تک پہنچیں گی۔'' ایک تاجر نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا۔

شاہ عالم خان کے پاس سفر خرچ کے لیے تھوڑے سے روپے تھے۔ انہوں نے وہ روپے نکال کر تاجروں کے سامنے رکھ دیئے۔

''اگر میرے پاس اتنی رقم ہوتی تو میں تم لوگوں کی دشنام طرازیاں کیوں برداشت کرتا؟''

'پھر تم کیا چاہتے ہو؟ ہمیں تو ہر حال میں اپنی رقم وصول کرنا ہے۔'' دوسرے تاجر نے سوال کیا۔

''میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے تنہا داؤد خان کے پاس جانے دو۔'' شاہ عالم خان نے کہا۔ ''تم اپنے دو آدمی میرے ہمراہ بھیج دو۔ میں تمہاری رقم داؤد خان سے وصول کر کے ان کے حوالے کر دوں گا۔''

شاہ عالم خان کی اس درخواست پر تمام تاجر کچھ دیر کے لیے حیران رہ گئے۔ پھر ایک سوداگر نے مجلس کا سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ ''تم اس بہانے فرار بھی ہو سکتے ہو۔''

''کیا میں تمہیں اپنے چہرے سے جھوٹا نظر آتا ہوں؟'' یکایک شاہ عالم خان کی آواز سے جلالِ روحانی جھلکنے لگا تھا۔ ''اگر میں اپنے وعدے کی تکمیل میں ناکام ہو گیا تو انہی لوگوں کے ہمراہ واپس چلا آؤں گا اور اپنی ساری زندگی تمہاری قید میں گزار دوں گا۔''

شاہ عالم خان کے لہجے میں اس قدر صداقت تھی کہ تمام تاجر اُن سے مزید حجت نہ کر سکے اور آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ ''یہ شخص جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اس پر اعتبار کر لینا چاہیئے۔''

پھر جب داؤد خان نے باپ کو دو اجنبی سواروں کے ساتھ واپس آتے دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر شاہ عالم خان کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور پریشان لہجے میں پوچھنے لگا۔

''بابا! خیریت تو ہے؟ آپ واپس کیوں لوٹ آئے؟''

شاہ عالم خان تیزی کے ساتھ گھوڑے سے اُترے اور تاجروں کے دونوں آدمیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ''آپ حضرات کچھ دیر یہیں ٹھہریں۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر شاہ عالم خان نے داؤد خان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''تم اندر کمرے میں چلو۔ میں تم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' شدتِ غضب کے باعث شاہ عالم خان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے خون ٹپک رہا ہو۔

پھر خلوت میں تمام واقعہ تفصیل سے بتانے کے بعد شاہ عالم خان نے اپنے لے پالک بیٹے سے کہا۔

''داؤد خان! کیا میں نے تجھے اسی دن کے لیے پالا تھا کہ تُو جوان ہو کر میرے چہرے پر سیاہی مل دے گا؟''

داؤد خان باپ کے اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ اس نے شرم و ندامت سے سر جھکا لیا۔

''اب اسی میں عافیت ہے کہ تُو اسی وقت تاجروں کی مطلوبہ رقم ادا کر دے۔'' غصے کی شدت سے شاہ عالم خان کی آواز کانپ رہی تھی۔

آخر بڑی مشکل سے زر پرست داؤد خان نے تاجروں کی رقم ادا کی اور دل ہی دل میں باپ کو برا کہنے لگا۔ آج پہلی بار اس کے اندر چھپے ہوئے ایک بُرے انسان نے نئے انداز سے کروٹ لی تھی۔
پھر شاہ عالم خان نے تاجروں کے نمائندوں کو ایک رات بطور مہمان ٹھہرایا، خوب تواضع کی اور دوسرے دن مطلوبہ رقم دے کر انہیں رخصت کر دیا۔
''اپنے مالکوں کو میرا اسلام کہنا کہ انہیں بہت زحمت اُٹھانی پڑی۔ میں کچھ دن بعد دہلی آ کر اپنا سامان لے جاؤں گا۔ اس دوران میرے دونوں خدمت گاروں کا خیال رکھنا۔ ان کے کھانے پینے پر جو کچھ خرچ ہوگا، وہ میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔''

❁---❁---❁

پھر جب تاجروں کے نمائندے واپس چلے گئے تو شاہ عالم خان نے تنہائی میں داؤد خان سے کہا۔
''اب مجھے معلوم ہوا کہ تیری کامیابیوں کا راز کیا ہے؟.....لوگوں کو فریب دینا اور ان کے مال پر ناجائز قبضہ کرنا۔ یہی ہے تیری جاگیر کا انتظام؟''
''بس اس بات کو یہیں ختم کر دیں بابا!'' داؤد خان آج پہلی بار اُونچی آواز میں باپ سے مخاطب ہوا تھا۔
شاہ عالم خان نے بیٹے کی طرف بہت غور سے دیکھا اور غضب ناک لہجے میں کہنے لگے۔
''اگرچہ میں نے تحقیق نہیں کی ہے لیکن میں تیری اس ایک حرکت سے اندازہ کر سکتا ہوں کہ تُو نے یہاں کیا گُل کھلائے ہوں گے؟ یہاں کے لوگوں سے پوچھوں تو وہ بتائیں گے کہ تُو نے ان پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے ہیں۔ اب میں تجھے اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ تُو مخلوقِ خدا پر مزید ستم توڑے۔ تجھے چند دنوں کی مہلت ہے۔ تُو اپنی تمام دولت سمیٹ لے اور میرے ساتھ شہامت پور واپس چل۔''
باپ کی بات سن کر داؤد خان بدحواس ہو گیا۔ ابھی وہ اس بلائے ناگہانی سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں حاکم بدایوں کے دو اہل کار پہنچے اور داؤد خان سے کہنے لگے۔
''سرکار نے فوری طور پر آپ کو یاد فرمایا ہے۔ کچھ زمینداروں نے دوبارہ سرکشی کی ہے، اس لیے ان کی سرکوبی ضروری ہے۔''
شاہ عالم خان نے چونک کر دونوں اجنبیوں کی طرف دیکھا۔ اب وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کا لے پالک بیٹا کس قسم کے کارنامے انجام دیتا ہے۔
''تم ایک رات یہیں قیام کرو۔ کل میں تمہارے ساتھ بدایوں چلوں گا۔'' داؤد خان نے اہلکاروں سے کہا اور اُٹھ کر چلا گیا۔
پھر اُسی رات داؤد خان نے چار افغان نوجوانوں کو تنہائی میں طلب کیا اور انہیں ایک بڑی رقم کا لالچ دیتے ہوئے کہا۔
''یہ بوڑھا شخص ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دو۔

مگر اس طرح کہ میرے نام پر کوئی حرف نہ آئے۔''

داؤد خان کے منہ کو دولت و اقتدار کا خون لگ چکا تھا۔ اس لیے وہ اس لذت سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ نتیجتاً اس نے چند روزہ عیش و نشاط کی خاطر اس شخص کی زندگی کا سودا کر لیا جس نے اس کے پیروں میں پڑی ہوئی زنجیرِ غلامی کاٹ کر آزادی و سربلندی بخشی تھی۔

دوسرے دن داؤد خان نے باپ سے انتہائی خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''پہلے میں حاکمِ بدایوں سے معذرت کر لوں پھر آپ کے ہمراہ شہامت پور چلوں گا۔''

شاہ عالم خان بیٹے کی بات سن کر مطمئن ہو گئے اور دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگے کہ بہت جلد اس کی مخلوق کو داؤد خان کے ظلم و ستم سے نجات مل جائے گی۔

❁---❁---❁

داؤد خان نے اپنے منصوبے کے مطابق ویران مقام پر رات گزارنے کے لیے پڑاؤ کیا۔ شاہ عالم خان کا خیمہ سب سے الگ لگایا گیا۔ رات کے ابتدائی حصے میں داؤد خان، باپ سے گفتگو کرتا رہا۔ پھر جب شاہ عالم خان کے اوراد و وظائف کا وقت آیا تو انہوں نے بیٹے کو مخاطب کر کے کہا۔

''میری عبادت کا وقت ہو گیا ہے۔ اب تم اپنے خیمے میں جا کر سو جاؤ۔''

داؤد خان نے فرماں برداری اور محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے باپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور خیمے سے نکل کر چلا گیا۔

پھر نصف شب کے قریب چاروں افغان اپنی کمیں گاہ سے نکلے اور شاہ عالم خان کے خیمے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت روہیلہ بزرگ مراقبے کی حالت میں تھے۔ کرائے کے قاتل تیزی سے آگے بڑھے اور تلوار کے ایک ہی وار سے شاہ عالم خان کا سر قلم کر دیا۔ پھر وہ چاروں جنگل کی طرف بھاگ گئے۔

روایت ہے کہ قتل ہونے کے باوجود شاہ عالم خان مصلےٰ سے کھڑے ہو گئے اور پھر یہ سر بُریدہ بزرگ خیمے سے باہر نکل آئے۔ اسی حالت میں چند قدم کا فاصلہ طے کیا۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کی رسیوں میں اُلجھ کر گر گئے اور پھر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

اس وقت تمام لشکر گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا مگر داؤد خان جاگ رہا تھا۔ اسے ایک نئی صبح کا انتظار تھا۔

آخر نئی صبح طلوع ہو گئی مگر وہ شاہ عالم خان جیسے بزرگ کے خون سے سرخ تھی۔ داؤد خان، باپ کی لاش پر بہت دیر تک ماتم کرتا رہا۔

''یہ کیسا ستم ہے کہ سینکڑوں سپاہیوں کی موجودگی میں میرے باپ کو قتل کر دیا گیا۔ میں تم سب لوگوں کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اپنے باپ کے قاتلوں کو ان کے عبرت ناک انجام تک نہ پہنچا دوں۔'' داؤد خان کی آنکھوں سے مصنوعی آنسو بہہ رہے تھے اور اس کی نمائشی چیخیں دور دور تک سنائی دے رہی تھیں۔

پھر نمازِ ظہر کے بعد شاہ عالم خان کو بدایوں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر سید عربؒ کی درگاہ کے قریب دفن کر دیا گیا۔

اس وقت حافظ رحمت خان روہیلہ کی عمر چار سال تھی۔ ایک معصوم بیٹا اپنے باپ کا انتظار کر رہا تھا.... اور باپ دوسرے جوان بیٹے کی ''عنایتوں'' کے سبب اپنے وطن سے ہزاروں میل دُور، دیارِ غیر میں کفن اوڑھے سو رہا تھا۔

❁---❁---❁

چاروں آدمی جو شاہ عالم خان کے قتل میں شریک تھے، خود بھی مکافاتِ عمل سے محفوظ نہ رہ سکے۔ احتساب سے تو ہر ظالم و جابر کو گزرنا پڑتا ہے مگر مالکِ یومِ جزا نے شاہ عالم خان کے قاتلوں کا حساب بہت جلد کر دیا۔ تین آدمیوں کو دوسرے دن ہی اس علاقے کے زمیندار نے قتل کر دیا، چوتھا بچ گیا تو اُسے کوڑھ کے مرض نے آ گھیرا۔ پھر اس خوف ناک بیماری نے اتنی شدت دکھائی کہ ایک مہینے کے اندر اندر اس شخص کے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں گل گل کر گرنے لگیں۔ پھر جب شاہ عالم خان کا چوتھا قاتل اپنی موت کے قریب پہنچ گیا تو اس نے لوگوں سے چیخ چیخ کر کہا۔

''میں نے چند سکّوں کی خاطر روہیلہ بزرگ کو مار ڈالا...... مجھے تو اپنے گناہ کی سزا اسی دنیا میں مل گئی...... مگر داؤد خان کی سزا ابھی باقی ہے۔''

❁---❁---❁

شاہ عالم خان کی موت کے بعد داؤد خان نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ اس کی بوڑھی ماں کیا کر رہی ہے اور ایک یتیم بچہ کس حال میں پرورش پا رہا ہے؟ اُسے تو بس زر اور زمین عزیز تھے...... وہ اُن کے حصول کے لیے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

شاہ عالم خان کی وفات سے پہلے داؤد خان روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا، یہ ساری فتوحات اُس کے زورِ بازو کا نتیجہ ہیں...... مگر جاننے والے جانتے تھے کہ اس کی کامیابیوں میں شاہ عالم جیسے بزرگ کی دعائیں شامل ہیں۔ پھر جب داؤد خان کے سر سے عافیت کا یہ سائبان ہٹ گیا تو وہ مسائل کی تیز دھوپ میں تنہا کھڑا رہ گیا۔ یکایک حالات پلٹ گئے اور داؤد خان کو ایک ہندو راجہ دیبی چند کی ملازمت اختیار کرنا پڑی۔

❁---❁---❁

راجہ دیبی چند کمایوں کا حاکم تھا۔ موجودہ ہندوستان کے نقشے میں جہاں روہیل کھنڈ کی آخری حدیں ختم ہوتی ہیں، وہاں سے کمایوں ڈویژن کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ایک سرسبز و شاداب اور پہاڑی علاقہ ہے۔ راجہ دیبی چند بہت دنوں سے یہ خبریں سن رہا تھا کہ حاکم مراد آباد، عظمت اللہ خان اس کے علاقے کو حریصانہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ عظمت اللہ خان ایک طالع آزما بہادر شخص تھا۔ وہ بہت دنوں

سے اپنی جاگیر میں توسیع کرنے کے لیے منصوبہ بندی کر رہا تھا اور اس کا پہلا ہدف کمایوں کا علاقہ تھا۔

راجہ دیبی چند میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ تنہا عظمت اللہ خان کا مقابلہ کر سکے۔ آخر طویل غور و فکر کے بعد اس نے ایک نئی چال چلی اور اپنا قاصد بھیج کر داؤد خان کو کمایوں بلا لیا۔

راجہ دیبی چند نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''حاکم مراد آباد کی نیت میں بڑا کھوٹ ہے..... میں اپنے علاقے کو اس کے شر سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔''

راجہ دیبی چند کی بات سن کر داؤد خان نے کسی پس و پیش کے بغیر ایک بڑے معاوضے کا مطالبہ کر دیا۔ حاکم کمایوں کے نزدیک یہ رقم بہت زیادہ تھی مگر شدید ضرورت اور انتہائی مجبوری کے سبب راجہ دیبی چند نے سردار داؤد خان کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔

❁---❁---❁

آخر وہ وقت آ گیا، جب عظمت اللہ خان اپنی فوج لے کر مراد آباد کی حدود سے نکلا اور پھر رام پور سے گزرتا ہوا آگے بڑھا۔

راجہ دیبی چند کے جاسوس اُسے عظمت اللہ خان کی پیش قدمی کی خبریں سنا رہے تھے۔ راجہ نے فوری طور پر داؤد خان کو طلب کیا اور اپنی جنگی حکمتِ عملی کے بارے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تم اپنے سپاہی لے کر برق رفتاری سے آگے بڑھو اور ردر پور کے مقام پر پہنچ کر عظمت اللہ خان کی فوج کو روکنے کی کوشش کرو تاکہ اگر خونریز جنگ چھڑ جائے تو کمایوں، دشمن کے فتنہ و شر سے محفوظ رہے۔''

موجودہ ہندوستان کے نقشے میں ردر پور ایک ضلع ہے جو ریاست رام پور سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس وقت تقریباً ایک ہزار افغان سپاہی داؤد خان کے ہمراہ تھے۔ وہ اپنے جانبازوں کو لے کر کمایوں کی حدود سے نکلا۔ اس کے پیچھے ہندو سپاہیوں کا ایک دستہ تھا۔

راجہ دیبی چند نے اپنے سپاہیوں کو خفیہ طور پر حکم دیا کہ وہ افغان سپاہیوں کے تعاقب میں رہیں۔ پھر جب دونوں طرف سے افغان فوجی لڑ کر تباہ ہو جائیں تو پھر عظمت اللہ خان کے بچے کھچے سپاہیوں پر بھرپور حملہ کیا جائے۔ حاکم کمایوں نے یہی منصوبہ بنایا تھا کہ مسلمان کو مسلمان سے لڑا کر اس علاقے میں اُبھرنے والی افغان فوجی قوت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

پھر دونوں لشکر آمنے سامنے خیمہ زن ہو گئے۔ رات آئی تو عظمت اللہ خان نے اپنے ایک قاصد کو خفیہ طور پر داؤد خان کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا۔

''ہم دونوں مسلمان ہیں۔ پھر کیوں ہنود کے لیے آپس میں خون بہائیں؟ اگر تم کسی طرح مجھے آگے جانے کا راستہ دے دو تو میں ایک بڑی رقم تمہاری خدمت میں بطور نذر پیش کروں گا۔''

داؤد خان کو اور کیا چاہئے تھا، دونوں طرف سے بڑی رقموں کی پیشکش ہو رہی تھی۔ نتیجتاً اس نے

صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حاکمِ مراد آباد عظمت اللہ خان سے معاہدہ کر لیا اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔

اور جب نئی صبح طلوع ہوئی تو ایک نہایت بری خبر راجہ دیبی چند کا انتظار کر رہی تھی۔ داؤد خان تھوڑی دیر تک حاکمِ مراد آباد عظمت اللہ خان سے مصنوعی جنگ کرتا رہا۔ پھر اس نے بڑی ہوشیاری سے دشمن کو راستہ دے دیا۔ عظمت اللہ خان کے سپاہی راجہ دیبی چند کے ہندو فوجیوں پر ٹوٹ پڑے۔ وہ پہلے ہی عظمت اللہ خان کے لشکر سے خوف زدہ تھے اور داؤد خان کی کمک پر ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت میدانِ جنگ میں آئے تھے۔ پھر جب داؤد خان نے اپنا دامن بچا لیا تو راجہ دیبی چند کے سپاہی عظمت اللہ خان کے لشکر کا مقابلہ نہ کر سکے اور اپنے چند آدمیوں کی جانوں کی بھینٹ دے کر میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ عظمت اللہ خان نے بہت دُور تک ان کا تعاقب کیا مگر پُر پیچ اور اجنبی راستہ ہونے کی وجہ سے عظمت اللہ خان کے سپاہی، راجہ دیبی چند کے آدمیوں پر قابو نہ پا سکے۔ یہاں تک کہ ان کی جانیں محفوظ رہیں اور وہ پہاڑوں پر بنی ہوئی محفوظ پناہ گاہوں میں داخل ہو گئے۔

عظمت اللہ خان اور اس کے سپاہی کمایوں کے نشیبی علاقے میں لوٹ مار کرتے رہے۔ پھر داؤد خان کو معاہدے کے مطابق اس کی رقم دے کر واپس چلے گئے۔

داؤد خان دُہری سودے بازی کے ذریعے حاصل کی جانے والی رقم سے لطف اندوز ہونے کے لیے دامنِ کوہ میں خیمہ زن ہو گیا۔ اُسے اپنی اس شاطرانہ چال کی کامیابی پر بہت ناز تھا اور وہ راجہ دیبی چند کو محض ایک احمق حاکم سمجھ رہا تھا۔

مگر یہ داؤد خان کی خام خیالی تھی۔ اس نے جس بھونڈے انداز میں عہد شکنی کی تھی، وہ راجہ دیبی چند کے سپاہیوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔ پھر جب یہ سپاہی بھاگ کر حاکمِ کمایوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا۔

"داؤد خان نے غداری کی اور عظمت اللہ خان کے ساتھ ساز باز کر کے ہمیں اس حال تک پہنچایا۔"

راجہ دیبی چند اپنے سپاہیوں کی زبانی یہ خوف ناک انکشاف سن کر غصے سے کانپنے لگا۔ پھر بہت دیر بعد آہستہ آہستہ اُس کی یہ کیفیت زائل ہوئی اور وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ راجہ دیبی چند ایک ہی تجربے کے بعد اس حقیقت کو پا چکا تھا کہ داؤد خان ایک حریص پرندہ ہے، جب بھی اس کے لیے کوئی جال بچھایا جائے گا اور اس کے نیچے مکئی اور گندم کے دانے ڈالے جائیں گے تو وہ انہیں چگنے ضرور آئے گا۔ راجہ دیبی چند نے داؤد خان کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ایک خط تحریر کیا۔

"یہ شکست دراصل میری بدبختی کا نتیجہ تھی۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ بلاشبہ تم ایک مردِ میدان ہو، میں تمہیں کسی بھی حال میں کھونا نہیں چاہتا۔ معاہدے کی نصف رقم میرے ذمے واجب الادا ہے...... کسی دن آ کر مذکورہ رقم لے جاؤ...... میں تم سے ایک نیا معاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس معاہدے کی رُو

سے عنقریب ہم دونوں مل کر عظمت اللہ خان سے اس شکست کا انتقام لیں گے۔"

راجہ دیبی چند کا خط سن کر داؤد خان کا چہرہ مسرت سے کِھل اُٹھا اور اُسے یقین آ گیا کہ حاکمِ کمایوں دنیا کا احمق ترین انسان ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ قاصد کے ساتھ راجہ دیبی چند سے ملنے پہاڑی پر چلا گیا۔ اس کے ہمراہ صرف دو افغان سپاہی تھے۔

❁---❁---❁

حاکمِ کمایوں بڑے والہانہ انداز میں اپنے تخت سے اُٹھا اور نہایت پُر جوش انداز میں استقبال کرتے ہوئے اس نے داؤد خان کو گلے لگا لیا۔ دوپہر سے لے کر رات تک اس نے اپنے مہمان کی خوب خاطر مدارات کی۔ پھر جب رات کا کھانا کھانے کے بعد داؤد خان اور اس کے دونوں ساتھی ایک آرام دہ کمرے میں سو گئے تو آدھی رات کے وقت راجہ دیبی چند کے پچاس ساٹھ مسلح سپاہی وہاں پہنچے اور دروازے پر دستک دی۔

داؤد خان کے ساتھی نے جیسے ہی دروازہ کھولا، اس کے سر پر ایک ساتھ دس پندرہ تلواریں برس پڑیں اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ابھی داؤد خان صورتِ حال کو سمجھنے بھی نہیں پایا تھا کہ راجہ دیبی چند کے سپاہی کمرے کے اندر داخل ہو گئے اور انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے داؤد خان کے دوسرے ساتھی کو بھی قتل کر ڈالا۔ اس دوران داؤد خان نے اپنی تلوار نکالنے کی کوشش کی مگر حاکمِ کمایوں کے سپاہیوں نے اُسے اتنی مہلت نہیں دی اور تھوڑی دیر بعد داؤد خان کو گرفتار کر کے راجہ دیبی چند کے سامنے پہنچا دیا گیا۔

حاکمِ کمایوں نے داؤد خان کو بہت تڑپا تڑپا کر مارا۔ پہلے اُس کی کوچیں کاٹی گئیں اور پھر گردن کی رگیں کھینچی گئیں۔ راجہ دیبی چند اور اس کے سپاہیوں نے بہت دیر تک داؤد خان کی موت کا تماشا دیکھا۔ پھر جب وہ تڑپتے تڑپتے ساکت ہو گیا تو اس کی لاش کو دامنِ کوہ میں لے جا کر دفنا دیا گیا۔

❁---❁---❁

بڑی عجیب بات ہے کہ داؤد خان کی موت پر اس کے ساتھی افسردہ ضرور ہوئے مگر کسی نے اپنے سردار کے قتل کا سوگ نہیں منایا۔ بس داؤد خان کا لے پالک بیٹا، علی محمد خان کئی دن تک باپ کو یاد کر کے گریہ و زاری کرتا رہا۔

"بابا! اگر وقت نے مجھے مہلت دی تو میں راجہ کمایوں سے آپ کے خون کا بدلہ اس طرح لوں گا کہ میرے طرزِ انتقام کو دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔"

داؤد خان کی ناگہانی موت سے روہیلہ افغانوں میں وقتی طور پر شدید انتشار پھیل گیا تھا۔ اس الم ناک سانحے سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ اپنے ملک افغانستان جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ان سنگین لمحات میں ملک شادی خان، دوندے خان، مقدر خان، پائندہ خان، سردار خان اور فتح خان جیسے دلیر سرداروں نے متفقہ طور پر ایک ہی فیصلہ کیا۔

''ہمیں کسی بھی حال میں ہندوستان چھوڑنا نہیں چاہئے کہ اس طرح ہماری برسوں کی محنت رائیگاں جائے گی۔ ہم کٹھیر کے اسی علاقے میں رہیں گے اور افغان اقتدار کو مضبوط تر بنائیں گے۔''

اس فیصلے کے بعد تمام افغانوں نے داؤد خان کے لے پالک بیٹے کو اپنا سردار منتخب کر لیا۔ اس وقت علی محمد خان کی عمر صرف چودہ سال تھی..... مگر وہ کم سنی کے باوجود نیزہ بازی، تیر اندازی اور شہ سواری میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ فنونِ سپہ گری کے علاوہ داؤد خان نے اُسے درسی تعلیم بھی دلوائی تھی نتیجتاً وہ دوسرے افغان سرداروں کے مقابلے میں زیادہ وسیع النظر اور ہوشیار تھا۔

سردار منتخب ہوتے ہی علی محمد خان اپنے سپاہیوں کو لے کر حاکمِ مراد آباد، نواب عظمت اللہ خان کی خدمت میں حاضر ہوا اور پھر ان کی اجازت سے اپنے باپ داؤد خان کی جائیداد پر متصرف ہو گیا۔

❀---❀---❀

چند سال میں علی محمد خان نے کئی فتوحات حاصل کیں۔ پھر علی محمد خان نے آنولہ کے زمیندار سے جنگ کر کے اس کی جاگیر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی علی محمد خان نے نہایت تدبر و ہوشیاری سے کام لیا اور اپنا ایک نمائندہ دہلی بھیج کر وزیر المما لک قمر الدین خان سے رشتۂ اتحاد قائم کر لیا۔ علی محمد خان نے اپنے خط میں واضح طور پر لکھا تھا۔

''میں ہر حال میں آپ کا حلیف رہوں گا اور آزمائش کے وقت اپنی وفاداری کا بھرپور ثبوت فراہم کروں گا۔''

قمر الدین خان، علی محمد خان کی اس بات سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے فوری طور پر شہنشاہِ دہلی کی طرف سے علی محمد خان کو آنولہ کی سند بخش دی۔ آنولہ کی جاگیر سے علی محمد خان کی دولت اور اقتدار میں مزید اضافہ ہوا۔

کچھ دن بعد شاہی فوج نے سادات بارہہ کا زور توڑنے کے لیے جانسٹھ پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں علی محمد خان بھی بادشاہ کے حلیف کی حیثیت سے شامل تھا۔ وہ بڑی جانفشانی سے لڑا۔ یہاں تک کہ ''سادات بارہہ'' قتل ہوئے اور ان کے علاقے پر سلطنتِ دہلی کا قبضہ ہو گیا۔

وزیر المما لک قمر الدین خان، علی محمد خان کی کارگزاری سے بہت خوش ہوا۔ نتیجتاً اُس نے علی محمد خان کی سالانہ مال گزاری (ٹیکس) میں کمی کر دی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ علی محمد خان کو نواب کا خطاب بخش دیا اور نوبت و علم بھی عنایت کیے جو ایک حکمراں کا امتیازِ خصوصی تھا۔

❀---❀---❀

اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے اور فوج میں اضافہ کرنے کے بعد ایک دن نواب علی محمد خان نے تمام روہیلہ سرداروں کو طلب کر کے کہا۔

''آپ حضرات یقیناً اس بات سے باخبر ہوں گے کہ میں نے اپنے باپ داؤد خان کی موت کے

وقت ان کی روح سے ایک وعدہ کیا تھا۔“

ممتاز روہیلہ سرداروں ملک شادی خان، دوندے خان، صدر خان، پائندہ خان، سردار خان اور فتح خان نے نواب علی محمد خان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میں نے عہد کیا تھا کہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا، جب تک راجہ کمایوں چند سے اپنے باپ کی موت کا انتقام نہیں لے لوں گا۔“ علی محمد خان نے یہ عہد اس وقت کیا تھا جب اس کی عمر چودہ سال تھی اور اب وہ بیس بائیس سال کا ایک بھرپور جوان تھا۔

”آپ راجہ دیبی چند کی سرکوبی کے لیے آگے بڑھیں۔ ہماری شمشیریں اس وقت تک نیام میں نہیں جائیں گی جب تک حاکمِ کمایوں اپنے انجام کو نہیں پہنچ جائے گا۔“

اپنے سرداروں کی حمایت و تائید حاصل کرنے کے بعد نواب علی محمد خان ایک طوفانِ برق و باد کی طرح کمایوں کی طرف بڑھا۔ راجہ دیبی چند اپنی مضبوط پہاڑی پناہ گاہوں کی وجہ سے خود کو دشمنوں کے حملے سے محفوظ سمجھتا تھا۔ جب اس نے روہیلوں کے حملے کی خبر سنی تو نہایت متکبرانہ انداز میں ہنسا۔

”کیا علی محمد خان اپنے باپ کی قبر پر پھول چڑھانے آیا ہے؟“ راجہ دیبی چند نے اپنے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

پھر راجہ دیبی چند اور اس کے سپاہیوں کے قہقہے ماتمی شور میں تبدیل ہو گئے اور کمایوں کا پورا دربار ایک مقبرہ بن کر رہ گیا۔ اور دُور تک راجپوت سپاہیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔

نواب علی محمد خان کا حملہ اتنا شدید تھا کہ راجہ دیبی چند کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ روہیلہ سپاہی پہاڑی پر اس طرح چڑھ گئے جیسے کوئی چاق و چوبند شخص درخت پر چڑھتا ہو۔ روہیلوں میں اس قدر جوش تھا کہ انہوں نے پہاڑی راستوں کی ناہمواریوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی اور شام تک حاکمِ کمایوں راجہ دیبی چند کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

کمایوں پر حملہ کرنے سے پہلے نواب علی محمد خان نے انتہائی سختی کے ساتھ اپنے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا تھا۔

”اس جنگ کا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو راجہ دیبی کو چند تمہاری تلواروں سے محفوظ نہیں رہنا چاہیے۔ مجھے ہر حال میں اس کا سر چاہیے۔ اور جو سپاہی میری خدمت میں حاکمِ کمایوں کا مردہ یا زندہ جسم پیش کرے گا، وہ میری طرف سے ایک گراں قدر انعام کا مستحق ٹھہرے گا۔“

نواب علی محمد خان نے راجہ دیبی چند پر قابو پانے کے لیے ایک عجیب نفسیاتی کھیل کھیلا تھا۔ نتیجتاً بہت سے روہیلہ سپاہی، راجہ دیبی چند کے تعاقب میں تھے۔ آخر علی محمد خان کے سپاہیوں نے حاکمِ کمایوں کو اس وقت گھیر لیا جب وہ میدانِ جنگ سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ روہیلوں کی شمشیروں نے راجہ دیبی چند کے جسم پر اتنی گل کاریاں کیں کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا کر گھوڑے سے گر پڑا۔ ایک روہیلہ سپاہی نے

آگے بڑھ کر حاکم کمایوں کا سر کاٹنا چاہا تو دوسرے سپاہی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

''اس کی لاش ہی نواب صاحب کے حضور میں لے چلو۔ وہ چاہیں تو اس کا سر کاٹیں یا اس کے جسم کے ٹکڑے کر ڈالیں۔''

پھر جب راجہ دیبی چند کی لاش نواب علی محمد خان کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے انتہائی پُر جوش انداز میں ''اللہ اکبر'' کہا اور سجدے میں چلے گئے۔ پھر طویل سجدے کے بعد اُٹھے اور اپنی شمشیر راجہ دیبی چند کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''تُو نے میرے والد کو دھوکے سے اس وقت قتل کیا، جب وہ تنہا تھے۔ مگر میرے جانباز سپاہیوں نے تجھے اس وقت موت کا ذائقہ چکھنے پر مجبور کیا، جب تُو اپنے سینکڑوں جاں نثاروں کے درمیان میں گھرا ہوا تھا۔ اگر تُو زندہ ہوتا اور میری آواز سن رہا ہوتا تو میں تجھے بتاتا کہ جنگ اس طرح لڑی جاتی ہے اور انتقام اس طرح لیا جاتا ہے۔''

پھر نواب علی محمد خان نے ان سپاہیوں کو قیمتی انعامات سے نوازا تھا جنہوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر راجہ دیبی چند کو اس کے انجام تک پہنچایا تھا۔

❁---❁---❁

حافظ رحمت خان روہیلہ 1708ء میں پیدا ہوئے تھے۔ شاہ عالم خان کی شہادت کے وقت ان کی عمر چار سال تھی۔ جب پانچ برس کے ہوئے تو رسمِ بسم اللہ ادا ہوئی..... بارہ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر اسی دن سے حافظ کا لفظ رحمت خان روہیلہ کے نام کا لازمی حصہ بن گیا۔ پھر چند سال میں حافظ صاحب نے مروّجہ اسلامی علوم میں مہارت حاصل کر لی اور فقہ کے اسرار و رموز سے بھی واقف ہو گئے۔

پھر جب جوان ہوئے تو گھوڑوں کی خرید و فروخت کے ارادے سے چند تاجروں کے ہمراہ بدخشاں گئے۔ اس وقت گھوڑوں کی تجارت کو شرفاء کا مخصوص پیشہ سمجھا جاتا تھا.... کچھ دن تک حافظ صاحب گھوڑوں کی تجارت کرتے رہے۔

حافظ رحمت خان روہیلہ، شہاب الدین کوٹا باباؒ جیسے قابلِ احترام بزرگ کی اولاد میں سے تھے اس لیے اپنی قوم میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ حافظ صاحب جس محفل میں تشریف لے جاتے، بڑے بڑے افغان سردار اُن کے احترام میں کھڑے ہو جاتے..... حافظ رحمت خان روہیلہ کے روز و شب نہایت پُرسکون عالم میں گزر رہے تھے کہ یکایک ان کی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی۔

جب نواب علی محمد خان نے راجہ دیبی چند کو شکست دے کر اس کے علاقے پر قبضہ کر لیا تو یکایک سیاسی صورتِ حال میں ایک انتشار سا پیدا ہو گیا۔ نواب علی محمد خان نے محسوس کیا کہ بہت سے روہیلہ افغان اُس کی اس قدر عزت و تکریم نہیں کرتے تھے، جو اُس کے شایانِ شان تھی۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ

نواب علی محمد خان، داؤد خان مرحوم کا حقیقی نہیں، لے پالک بیٹا تھا۔

آخر مجبور ہو کر نواب علی محمد خان نے اپنے معتمد افغان سرداروں سے اس سلسلے میں مشورہ کیا۔ طویل غور و فکر کے بعد افغان سرداروں نے اس پیچیدہ مسئلے کا حل تلاش کرتے ہوئے نواب علی محمد خان کو مشورہ دیا۔

''آپ بلا تاخیر شاہ عالم خان کے صاحب زادے، حافظ رحمت خان روہیلہ کو یہاں آنے کی دعوت دیں۔ اُن کی خاندانی عظمت و جلال کے آگے تمام روہیلے کسی پس و پیش کے بغیر سر جھکا دیں گے۔''

نواب علی محمد خان اس مشورے سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے فوری طور پر حافظ رحمت خان کے نام ایک طویل خط تحریر کیا...... سب سے پہلے حافظ رحمت خان کے بزرگوں کی شان میں نہایت عقیدت مندانہ الفاظ استعمال کیے، پھر اُن سے ہندوستان آنے کی درخواست کی۔

آخر نواب علی محمد خان کے مسلسل خطوط لکھنے کے بعد حافظ رحمت خان روہیلہ نے ہندوستان کا قصد کیا۔ ان کے ہمراہ شیخ کبیر، گل شیر خان اور دوسرے مخلص دوست بھی تھے۔ جب حافظ صاحب آنولہ کے قریب پہنچے تو نواب علی محمد خان نے تمام سرداروں کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر ان کا پُرجوش استقبال کیا۔ تمام لوگ حافظ صاحب کی ظاہری شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ان کے چہرے پر نسلی رنگ و نور کے ساتھ ساتھ درویشانہ جلال کا عکس بھی موجود تھا۔

نواب علی محمد خان نے حافظ رحمت خان روہیلہ کے اعزاز میں کئی ہفتے تک خصوصی تقریبات کا انعقاد کیا اور اپنے مہمانِ خاص کی پُرتکلف ضیافتیں کیں۔ اسی دوران ایک دن نواب علی محمد خان کو حافظ صاحب کے والد محترم، شاہ عالم خان کے قتل کا واقعہ یاد آ گیا...... اس خیال کے آتے ہی اسے یہ فکر ستانے لگی کہ کہیں حافظ صاحب اس مقصد کی تکمیل کے بغیر ہی افغانستان واپس نہ چلے جائیں جس کے لیے انہیں ہندوستان بلایا گیا تھا۔ اگرچہ شاہ عالم کے قتل کے وقت نواب علی محمد خان ایک معصوم بچہ تھا اور وہ کسی طرح بھی روہیلہ سردار کے قتل میں ملوث نہیں تھا۔ لیکن داؤد خان سے ایک خاص رشتہ ہونے کے سبب علی محمد خان خود کو بھی مجرم تصور کرتا تھا۔ آخر اس نے اپنے دل کی خلش دور کرنے کے لیے کئی نامور سرداروں کی موجودگی میں رحمت خان روہیلہ سے کہا۔

''عام طور پر مشہور ہے کہ داؤد خان نے آپ کے والد محترم، شاہ عالم خان کو قتل کروایا تھا۔ اگرچہ میں ان کا حقیقی بیٹا نہیں ہوں لیکن چونکہ انہوں نے مجھے بیٹے کی طرح پرورش کیا ہے اور میں ان کی تمام جائیداد کا مالک ہوں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنے باپ کو قیامت کے دن کے حساب اور مواخذے سے بچا لوں۔''

نواب علی محمد خان کی بات سن کر حافظ رحمت خان روہیلہ نے اس کی طرف بہت غور سے دیکھا۔

''نواب صاحب! آپ اپنی بات کی وضاحت کریں۔''

نواب علی محمد خان نے کہا۔ ''میری آپ سے درخواست ہے کہ ان تین طریقوں میں سے کسی ایک کو

اختیار فرمائیے۔ اگر قصاص منظور ہے تو یہ میں ہوں، اور یہ آپ ہیں اور یہ شمشیر موجود ہے..... اگر خون بہا لینا منظور ہے تو پھر یہ چند ہزار روپے کی تھیلیاں حاضر ہیں، انہیں قبول فرمائیے..... یا پھر اپنے والد محترم کا خون معاف فرما دیجئے۔"

حافظ رحمت خان روہیلہ نے جواباً کہا۔

"تمہاری داؤد خان سے کوئی خونی نسبت یا قرابت نہیں ہے.....اس لیے شرعی طور پر قصاص بھی جائز نہیں ہے.....اور خون بہا لینا، صاحبانِ عالی ہمت کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس لیے تم سے خان شہید کے خون کا مواخذہ لینا کسی طرح بھی جائز نہیں.....اگر جائز ہوتا تو میں اس کشادہ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ تم سے ملاقات نہیں کرتا......منافقت یا سیاست میری فطرت نہیں...... جو کچھ میرے دل میں ہے، وہی چہرے پر روشن ہے...... جب میں نے اچھی طرح تحقیق کر لی کہ تم والد محترم کے قتل میں ملوث نہیں ہو تو میں افغانستان سے ہندوستان آیا اور خوش دلی کے ساتھ تمہاری میزبانی قبول کی۔"

حافظ رحمت خان روہیلہ کی طرف سے اس بلند ہمتی کا مظاہرہ دیکھ کر تمام روہیلہ سردار حیرت زدہ رہ گئے۔

"یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی کی روشن دلیل ہے۔" نواب علی محمد خان نے پُرسوز لہجے میں کہا۔ "مگر یہ کانٹا سا جو میرے دل میں کھٹک رہا ہے اور جس کی خلش مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی، اسے تو کسی طرح دُور کیجئے حافظ صاحب!" نواب علی محمد خان کے لہجے سے انتہائی عاجزانہ درخواست گزاری کا رنگ نمایاں تھا۔

چند لمحوں تک حافظ رحمت خان روہیلہ، نواب علی محمد خان کے چہرے کی طرف دیکھتے رہے جس پر ندامت و شرمساری کی تحریر جلی حروف میں لکھی ہوئی تھی۔ پھر روہیلہ سردار نے نہایت پُر اثر لہجے میں کہا۔

"نواب صاحب! اگر آپ کے اطمینان کی یہی ایک صورت ہے تو میں کسی غرض کے بغیر صرف اللہ کے لیے اس خون کو معاف کرتا ہوں۔"

جیسے ہی حافظ صاحب کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، نواب علی محمد خان بے قرار ہو کر ان سے لپٹ گئے۔ پھر جوشِ مسرت و اضطراب میں رحمت خان روہیلہ کے ہاتھ کو بوسہ دینے لگے۔

حافظ صاحب کی اس اعلیٰ ظرفی اور دریا دلی نے نواب علی محمد خان کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ ہر وقت روہیلہ سردار کی عزت و توقیر اور خاطر مدارات میں لگا رہتا تھا۔ روہیلہ سپاہی بھی بڑی گہری نظروں سے حافظ رحمت خان اور نواب علی محمد خان کے تعلقات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ پھر جب ان لوگوں نے دونوں سرداروں میں باہمی رفاقت و محبت کے مناظر دیکھے تو وہ بھی یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"جب روہیلہ سردار، نواب علی محمد خان کا اس قدر احترام کرتا ہے تو پھر ہم سپاہیوں کی کیا حیثیت ہے؟"

نواب علی محمد خان کی تدبیر رنگ لائی اور وہ یہی چاہتا تھا کہ تمام روہیلے دل کی گہرائیوں سے اس کی اطاعت کریں تاکہ وہ سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے علاقوں پر حکومت کر سکے۔ حافظ رحمت خان روہیلہ

نے اپنی خاندانی روایت اور فطری شرافت کے ذریعے نواب علی محمد خان کے اس کارِ دشوار کو آسان بنا دیا تھا۔
تقریباً دو سال تک نواب علی محمد خان کا مہمان رہنے کے بعد حافظ رحمت خان نے اپنے وطن جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ یہ سن کر نواب علی محمد خان اُداس ہو گیا اور انتہائی محبت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔
''حافظ صاحب! میری خاطر کچھ دن اور ٹھہر جائیے کہ آپ کی قربت و محبت میں مجھے عجیب سا سکون ملتا ہے۔''
اس طرح ایک سال اور گزر گیا۔ بالآخر حافظ رحمت خان روہیلہ، نواب علی محمد خان سے جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے اپنے وطن چلے گئے۔

❀---❀---❀

شہامت پور پہنچنے کے بعد حافظ رحمت خان روہیلہ نے شہزاد خان کی بیٹی سے شادی کر لی۔ یہ عفت مآب خاتون، حافظ صاحب کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ شادی کے بعد حافظ صاحب علمی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ کبھی کبھی وقت گزاری کے لیے سیر و تفریح اور شکار کو بھی نکل جاتے۔ اس دوران نواب علی محمد خان کے خطوط مسلسل آتے رہے۔ آخر اپنے وعدے سے مجبور ہو کر حافظ رحمت خان روہیلہ دوبارہ ہندوستان آئے اور آنولہ میں قیام پذیر ہوئے۔
اس بار نواب علی محمد خان نے حافظ صاحب کی پہلے سے بھی زیادہ دل جوئی اور خاطر داری کی۔ پھر ایک دن تمام روہیلہ سرداروں کی موجودگی میں اس نے کہا۔''دوسرے خاندانوں کی طرح آپ بھی اپنے متعلقین کو ہندوستان بلا لیجئے اور مستقل طور پر یہاں قیام کیجئے۔''
جواباً حافظ رحمت خان روہیلہ نے کہا۔''چند پشتوں سے ہم نے کسی کی ملازمت نہیں کی ہے اور نہ اپنی بیٹیاں دوسری قوموں میں بیاہی ہیں..... جس طرح آپ آج کل میرے ساتھ پیش آ رہے ہیں، اگر مستقبل میں یہی سلوک روا رکھا گیا تو میں قیامِ ہندوستان کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔''
نواب علی محمد خان نہایت دُور اندیش اور مردم شناس انسان تھا۔ اس نے حافظ صاحب کی دلداری کرتے ہوئے انتہائی پُرجوش لہجے میں کہا۔''آپ جس طرح بھی چاہیں، ہمارے پاس قیام فرمائیں۔ مگر ایک بات یاد رکھیں کہ ہمیں کسی طرح بھی آپ کی جدائی گوارا نہیں۔''
نواب علی محمد خان کی اس گفتگو کے بعد حافظ رحمت خان روہیلہ نے اپنی بیوی اور دیگر متعلقین کو افغانستان سے بلا لیا اور آنولہ میں مقیم ہو گئے۔ نواب علی محمد خان نے حافظ صاحب کی گزر اوقات کے لیے اپنے مقبوضات میں سے بارہ گاؤں جاگیر کے طور پر روہیلہ سردار کو دے دیئے اور آئندہ کے لیے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ جو نیا پرگنہ یا تعلقہ فتح ہو گا، اس میں سے دو گاؤں حافظ صاحب کے نام کر دیئے جائیں گے۔''
نواب علی محمد خان کی رفاقت میں حافظ رحمت خان کا مستقل قیام روہیلوں کے لیے انتہائی نیک فال

ثابت ہوا۔ حافظ صاحب ایک اولوالعزم، بلند کردار اور نہایت شجاع انسان تھے...... مروّجہ علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ان کے دل و دماغ ہی نہیں، نظر بھی بہت زیادہ روشن ہو گئی تھی۔ وہ دوسرے افغانوں کی طرح صرف مردِ شمشیر ہی نہیں بلکہ صاحبِ تدبیر بھی تھے۔ یہ حافظ صاحب ہی کے مبارک قدم تھے کہ جن کے اثر سے روہیلہ افغانوں کے قدموں میں مزید استقامت آ گئی۔ پھر اس بہادر قوم نے نئے حوصلوں اور ولولوں کے ساتھ شجاعت کی نئی تاریخ لکھنی شروع کر دی۔ حافظ صاحب نے اس علاقے کی جغرافیائی صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے نئے انداز سے روہیلہ فوج کی صف بندی کی۔ نتیجتاً 1735ء تک روہیلوں کی فوجی طاقت میں مزید اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ نواب علی محمد خان نے بریلی اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی جاگیریں روہیلوں کے مقبوضات میں شامل ہو گئیں۔

❀---❀---❀

کٹھیر کے جاگیرداروں نے روہیلوں کی دراز دستیوں کی شکایت وزیرِاعظم قمرالدین خان تک پہنچائی۔ چونکہ قمرالدین خان، نواب علی محمد خان کے ہمدرد تھے، اس لیے انہوں نے چشم پوشی کا مظاہرہ کیا۔ مگر یہ صورتِ حال تادیر قائم نہ رہ سکی۔ آخر 1742ء میں راجہ ہرنندن پچاس ہزار فوج لے کر نواب علی محمد خان کی سرکوبی کے لیے مراد آباد میں داخل ہوا۔ نواب علی محمد خان نے جنگ کو ٹالنے کے لیے راجہ ہرنندن کے پاس صلح کا پیغام بھیجا مگر وہ اس کوشش میں ناکام ہو گئے تو مجبوراً بیس ہزار سپاہی لے کر راجہ سے مقابلے کے لیے آنولہ کی حدود سے باہر نکلے۔ پھر دریائے آرل کے کنارے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں حافظ رحمت خان روہیلہ نے بے پناہ ذہانت اور بہادری کا مظاہرہ کیا اور اپنے چار ہزار سپاہیوں کو لے کر راجہ ہرنندن کے لشکر کے قلب میں گھس گئے، بت سے ہندو سپاہیوں کو تہہ تیغ کیا اور لڑتے لڑتے پچھلی صف تک پہنچ گئے اور راجہ ہرنندن کو گھیر لیا جو ہاتھی پر بیٹھا اپنے سپاہیوں کو لڑا رہا تھا۔ راجہ نے رحمت خان روہیلہ کی یلغار سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر اس کا آخری وقت قریب آ پہنچا تھا۔ ایک افغان سپاہی کی کمان سے تیر نکلا اور آناً فاناً راجہ ہرنندن کے سینے کی ہڈیاں توڑتا اور اس کے دل کا کام تمام کرتا ہوا پشت کی طرف نکل آیا۔

تیر کا یہ زخم اتنا کاری تھا کہ راجہ ہرنندن اسے برداشت نہ کر سکا۔ چند لمحوں تک ہاتھی پر بیٹھا لہراتا رہا، پھر نیچے گرا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ راجہ ہرنندن اور ہندو سپاہیوں کی بدبختی ان کے سروں پر سایہ فگن تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی راجہ ہرنندن کا بیٹا موتی لال بھی افغان سپاہیوں کی شمشیروں کا لقمہ بن گیا۔ موتی لال اتنا وجیہہ نوجوان تھا کہ دور دور تک اس کے حُسن و جمال کی شہرت عام تھی۔ موتی لال کے مرتے ہی راجہ ہرنندن کی تمام فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس جنگ میں بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ لگا جس سے روہیلوں کو نئی

طاقت میسر آئی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے نواب علی محمد خان نے شاہ آباد، مراد آباد، سنبھل اور بریلی کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ پہلے یہ علاقہ کٹھیر کہلاتا تھا، مگر جب روہیلوں نے فیصلہ کُن فتح حاصل کر لی تو اس علاقے کا نام روہیل کھنڈ رکھ دیا گیا جو آج بھی تاریخِ ہندوستان کا ایک اہم حصہ ہے۔

اس جنگ میں حافظ رحمت خان روہیلہ نے ایک یادگار کارنامہ انجام دیا تھا، اس لیے نواب علی محمد خان نے پیلی بھیت کا پورا علاقہ بطور جاگیر حافظ صاحب کے حوالے کر دیا۔

❁---❁---❁

پھر نواب علی محمد خان کا وقتِ آخر آ پہنچا۔ اُس نے فوری طور پر حافظ رحمت خان روہیلہ کو آنولہ طلب کیا اور تمام روہیلہ سرداروں کی موجودگی میں وصیت کرتے ہوئے کہا۔

''دراصل روہیل کھنڈ کی سرداری، حافظ صاحب ہی کا حق تھا مگر یہ ان کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انہوں نے مجھے اپنا سردار تسلیم کیا۔ میں چند گھڑیوں کا مہمان ہوں، اس لیے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں کہ حق دار کو اس کا حق پہنچ گیا..... میرے بعد حافظ رحمت خان ہی روہیل کھنڈ کے سردار ہوں گے...... مجھے حق تعالیٰ کی ذاتِ پاک سے قوی اُمید ہے کہ ان کی قیادت میں روہیلے ترقی اور خوشحالی کی زندگی بسر کریں گے۔''

یہ کہہ کر نواب علی محمد خان نے اپنے خدمت گار کو حکم دیا کہ وہ ان کی دستار حافظ رحمت خان روہیلہ کے سر پر رکھ دے...... اس وقت نواب علی محمد خان کے سب سے چھوٹے بیٹے سعد اللہ خان، باپ کے قریب موجود تھے۔ تمام روہیلہ سردار، نواب علی محمد خان کے اس فیصلے پر حیرت زدہ رہ گئے۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کی موجودگی میں اقتدار کسی غیر شخص کے حوالے کر دے گا۔

نواب علی محمد خان کی دستار حافظ رحمت خان روہیلہ کے سر پر رکھ دی گئی۔ یہ منظر دیکھ کر نواب صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر انتہائی جذباتی لہجے میں کہنے لگے۔

''خدا کا شکر ہے کہ میری موجودگی میں یہ امانت اس کے حقدار تک پہنچ گئی۔''

ابھی نواب علی محمد خان کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ حافظ رحمت خان روہیلہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور دستار اُتار کر سعد اللہ خان کے سر پر رکھ دی۔ پھر رقت آمیز لہجے میں کہنے لگے۔

''نواب صاحب! میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی..... مگر حقیقتاً یہ دستار، سعد اللہ خان کے سر پر ہی زیب دیتی ہے۔ میں روہیلہ سرداروں کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ تمام امور میں سعد اللہ خان کا مددگار و معاون رہوں گا۔''

❁---❁---❁

نواب علی محمد خان کی موت کے بعد ایسے تند و تیز طوفان اُٹھے کہ روہیلوں کی طاقت تنکا تنکا ہو کر بکھرنے لگی۔ حافظ رحمت خان روہیلہ نہایت تدبر اور شجاعت سے ان تنکوں کو سمیٹتے مگر اچانک سیاہ آندھی کا ایک اور جھونکا آتا اور وہ تنکے دوبارہ بکھرنے لگتے۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد اسلامی سلطنت کی مرکزیت تو پہلے ہی تباہ ہو چکی تھی مگر مسلمانوں کی بدبختی یہ تھی کہ وہ زندہ رہنے کی تدبیریں کرنے کے بجائے آپس ہی میں ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے۔ اب نواب قائم خان بنگش، حافظ رحمت خان روہیلہ کے مقابل کھڑا تھا۔ حافظ صاحب نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر نواب قائم خان اپنی ہوسِ اقتدار کی تکمیل کے لیے روہیل کھنڈ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ مجبوراً حافظ صاحب نے نواب قائم خان بنگش سے جنگ کی اور بدایوں پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں نواب قائم خان بنگش مارا گیا مگر حافظ صاحب نے مفتوحین کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا۔

حافظ رحمت خان اور نواب قائم خان بنگش کے درمیان یہ لڑائی صفدر جنگ کی شہادت اور سازش کی وجہ سے ہوئی تھی۔ محمد شاہ کی موت کے بعد صفدر جنگ دہلی کا وزیر بن گیا اور اسے وزارت کے منصب تک پہنچانے میں حافظ رحمت خان روہیلہ کا ہاتھ تھا۔ وزیر بنتے ہی اس نے حافظ صاحب کے سارے احسانات بھلا دیئے اور فتنہ انگیزیوں پر اُتر آیا۔ دراصل وہ روہیلوں کا بدترین دشمن تھا اور ہر حال میں اس جانباز قوم کی تباہی و بربادی چاہتا تھا۔

ابھی نواب قائم خان بنگش کی موت کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ صفدر جنگ نے مرہٹوں کے ساتھ مل کر روہیل کھنڈ پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں آخر حافظ رحمت خان روہیلہ اور صفدر جنگ کے درمیان صلح ہو گئی لیکن اس صورتِ حال سے مرہٹوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس متعصب ہندو قوم کے سپاہیوں نے روہیل کھنڈ کو تاخت و تاراج کر دیا اور جی بھر کے افغانوں کا مال و اسباب لوٹا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ اس لوٹ مار میں مرہٹوں کے ہاتھ دو کروڑ روپے لگے۔

ابھی حافظ رحمت خان اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ روہیل کھنڈ تین حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ یہاں تک کہ حافظ رحمت خان روہیلہ کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر بروقت خبردار ہونے کی وجہ سے وہ بچ گئے۔ پھر ایک بار حافظ صاحب کو قتل کرنے کی بھی سازش کی گئی مگر قاتل اپنے منصوبے میں ناکام رہے۔ آخر مجبور ہو کر حافظ رحمت خان روہیلہ نے آنولہ کی سکونت ترک کر دی اور بریلی کو دارالحکومت بنا لیا۔

❀---❀---❀

حافظ رحمت خان روہیلہ ایک دردمند دل رکھتے تھے جس میں ہر وقت مسلمانوں کے لیے محبت کا جذبہ موجزن رہتا تھا۔ حافظ صاحب نے وقتِ ضرورت ہر مسلمان حاکم کی مدد کی..... مگر جب حافظ صاحب

پر وقت پڑا تو انہی حاکموں نے نہ صرف آنکھیں پھیر لیں بلکہ دشمنوں کا ساتھ بھی دیا۔ مرہٹے ایک بار پہلے بھی روہیل کھنڈ میں لوٹ مار کر چکے تھے۔ پھر اُن کے منہ کو ایسا خون لگا کہ وہ اچانک دوبارہ پلٹے اور ان کی ٹڈی دل فوج نے دیکھتے ہی دیکھتے سنبھل، مراد آباد اور امروہہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر روہیل کھنڈ کے تمام اضلاع میں پھیل کر لوٹ مار کرنے لگے۔ اب کی بار مرہٹوں کی نیت بہت خراب تھی..... اس فتنہ گر قوم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ روہیل کھنڈ پر قبضہ کرنے کے بعد اودھ پر بھی غلبہ حاصل کر لیا جائے گا۔ یہ خبر سنتے ہی نواب شجاع الدولہ بدحواس ہو گیا۔ اس نے فوری طور پر ایک برق رفتار قاصد بھیج کر انگریزوں سے فوجی مدد طلب کی۔ سر رابرٹ بارکر اپنی فوج لے کر اودھ پہنچ گیا۔ انگریزی فوج کے تمام تر اخراجات کی ذمہ داری اودھ کے حکمران نواب شجاع الدولہ نے قبول کر لی تھی۔

اسی دوران نواب ضابطہ خان کو شکست ہوئی اور مرہٹوں نے ان کے بیوی بچوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ صورتِ حال بڑی خطرناک تھی۔ حافظ رحمت خان روہیلہ نے مجبوراً نواب شجاع الدولہ اور انگریز فوج کے سپہ سالار سر رابرٹ بارکر سے گفت وشنید کی تاکہ اس بلائے ناگہانی سے روہیل کھنڈ کو محفوظ رکھا جا سکے۔ نواب شجاع الدولہ اور انگریزوں کو اسی دن کا انتظار تھا۔ ان دونوں نے بڑی عیاری سے ایک منصوبہ بنایا اور پھر نواب اودھ نے حافظ صاحب سے صاف صاف کہہ دیا۔

''اگر آپ تین سال کے اندر چالیس لاکھ روپے ادا کرنے کا وعدہ کریں تو میں ضمانت دیتا ہوں کہ مرہٹے آپ کے علاقے سے واپس چلے جائیں گے۔''

حافظ رحمت خان روہیلہ نے مجبوراً چالیس لاکھ روپے کی ادائیگی کی ایک دستاویز لکھ کر نواب شجاع الدولہ کے حوالے کر دی۔

برسات کا موسم شروع ہوتے ہی مرہٹے خود بخود دریائے گنگا عبور کر کے دہلی کی طرف چلے گئے...... اور نواب شجاع الدولہ نے چال بازی کے ساتھ حافظ رحمت خان کو اپنا مقروض بنا لیا۔

❁---❁---❁

برسات کا موسم ختم ہوتے ہی مرہٹے دوبارہ پلٹے۔ اب کی بار وہ اودھ کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ اودھ تک پہنچنے کے لیے روہیل کھنڈ کا طویل راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔ اس سیاسی ضرورت کے پیشِ نظر مرہٹہ سردار نے حافظ رحمت خان روہیلہ کو یہ پیشکش کی کہ اگر وہ اس جنگ میں ان کی مدد کریں گے تو تمام مقبوضات میں سے نصف حصہ روہیلوں کو دے دیا جائے گا۔ حافظ صاحب کی غیرتِ قومی نے یہ گوارا نہ کیا کہ کافر مرہٹے ایک اسلامی ریاست کو روند ڈالیں۔

جب نواب شجاع الدولہ کو حافظ رحمت خان اور مرہٹہ سردار کے درمیان ہونے والے سیاسی مذاکرات کی خبر ہوئی تو اس نے فوری طور پر ایک برق رفتار قاصد کے ذریعے حافظ صاحب کو یہ پیغام بھیجا۔

''اگر آپ اس جنگ میں میری حمایت کریں گے تو میں شکریہ کے ساتھ چالیس لاکھ کی وہ دستاویز واپس کر دوں گا۔''

حافظ صاحب خود بھی اپنے علاقے کو مرہٹوں کی یورش سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے، اس لیے کسی تاخیر کے بغیر نواب شجاع الدولہ کی حمایت میں اپنی فوج لے کر نکلے۔ پھر مرہٹوں اور روہیلوں کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں روہیلوں کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اسی دوران نواب شجاع الدولہ نے انگریز فوج کے ساتھ مصنوعی نقل و حرکت کی۔ نتیجتاً مرہٹے واپس چلے گئے۔

پھر جب مرہٹوں کا خطرہ مکمل طور پر ٹل گیا تو شجاع الدولہ نے روہیل کھنڈ پر قبضہ کرنے کے لیے منصوبہ سازی شروع کر دی۔

علاقے میں سکون ہوتے ہی حافظ رحمت خان نے شجاع الدولہ سے چالیس لاکھ کی دستاویز واپس کرنے کا مطالبہ کیا۔ شجاع الدولہ اس مطالبے پر برہم ہو گیا اور اس نے نہایت جھوٹ اور مکاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے دستاویز کی واپسی کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا، یہ مجھ پر سراسر بہتان ہے۔''

حافظ رحمت خان اس وعدہ خلافی اور دروغ گوئی پر حیران رہ گئے۔ شجاع الدولہ انگریزوں کے ساتھ مل کر روہیل کھنڈ پر فوج کشی کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا، اس لیے اس نے چالیس لاکھ کی دستاویز واپس کرنے کے بجائے رقم کی فوری ادائیگی کا مطالبہ کر دیا۔

حافظ صاحب نے انتہائی صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے مصالحانہ روش اختیار کی اور کرنل چیمپئن کو ایک طویل خط لکھا جس میں اس معاملے کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ کرنل چیمپئن خود روہیلوں کے خلاف ساز باز کر رہا تھا، اس لیے اس نے شجاع الدولہ کو نئی ترکیب سجھائی۔ پھر اس نے حافظ رحمت خان کے خط کے جواب میں لکھا۔

''گزشتہ تین سال کے عرصے میں روہیلہ قوم کی مدد کرنے کی وجہ سے نواب شجاع الدولہ کے دو کروڑ روپے خرچ ہو گئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ یہ رقم فوراً ادا کر دی جائے۔ اگر آج آپ کا جواب ہاں میں نہیں ملا تو کل میں اپنی فوج لے کر روہیل کھنڈ کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔''

چالیس لاکھ کے بجائے دو کروڑ روپے کے نامعقول مطالبے نے حافظ صاحب کو مایوس کر دیا۔ وہ شجاع الدولہ اور انگریزوں کی بدنیتی کو سمجھ گئے تھے اس لیے انہوں نے مصالحتی کوششیں ترک کر دیں اور جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ کرنل چیمپئن کے اس خط کے ساتھ ہی شجاع الدولہ اور انگریزوں کی فوج نے پیش قدمی شروع کر دی۔

پھر بھی اتمام حجت کے طور پر ایک دن حافظ صاحب نے تمام روہیلہ سرداروں کو جمع کر کے کہا۔

''شجاع الدولہ سامانِ جنگ کی کثرت اور انگریزوں کی امداد کے بھروسے پر ہم سے ہمارا ملک چھین لینا چاہتا ہے..... اس لیے یہی مناسب ہے کہ ہم سب مل کر مطلوبہ رقم ادا کر دیں اور وقتی طور پر اس فتنے کو

ٹال دیں۔"

حافظ صاحب کی تقریر سن کر روہیلہ سردار خاموش بیٹھے رہے اور کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تقریباً تمام روہیلہ سردار، حافظ رحمت خان کی شکست و بربادی کے درپے تھے اور خفیہ طور پر نواب شجاع الدولہ سے ساز باز کر چکے تھے۔ ہر سردار نے تنگ دستی کا عذر پیش کرتے ہوئے اپنے حصے کی رقم دینے سے انکار کر دیا اور سب کے سب مل کر حافظ صاحب کو جنگ کی ترغیب دینے لگے۔

حافظ رحمت خان روہیلہ، سرداروں کے طرزِ عمل سے اس قدر افسردہ ہوئے کہ ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد حافظ صاحب یہ کہتے ہوئے مجلس سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"میری موت کا وقت قریب آ گیا ہے...... تم لوگ بھی غور سے دیکھ لو کہ میں تنہا مقتل کی طرف جا رہا ہوں...... میرے والد محترم کو ان کے لے پالک بیٹے داؤد خان نے قتل کروایا تھا اور تم لوگ جو رشتے میں میرے بھائی ہو، مجھے قتل کرا دینا چاہتے ہو...... یقیناً میں قتل ہو جاؤں گا مگر شجاع الدولہ اور انگریزوں کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکوں گا۔ یہ میرا مزاج نہیں ہے، سرفرازی اور سربلندی میرے بزرگوں کی تاریخ ہے...... انشاء اللہ بہت جلد بزرگوں کی اس تاریخ کو دوبارہ اپنے خون سے تحریر کروں گا۔" یہ کہہ کر حافظ صاحب چلے گئے۔

حاضرینِ مجلس بہت دیر تک گہرے سکوت کے عالم میں بیٹھے رہے۔ ان کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ آبرومندانہ موت کے بجائے ذلت آمیز زندگی خرید چکے ہیں۔

❀---❀---❀

حافظ رحمت خان روحیلہ نے پوری رات عبادت اور ذکرِ الٰہی میں بسر کی، پھر نمازِ فجر ادا کر کے نواب فیض اللہ خان کے خیمے میں آئے اور انہیں ہدایات دینے لگے۔

"برادرِ عزیز! میرا آخری وقت آ گیا ہے..... اس لیے آپ کو لازم ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں، اس وقت تک آپ جنگ سے منہ نہ موڑیں۔ لیکن میرے بعد ہرگز لڑائی کا ارادہ نہ کریں بلکہ اسی وقت میدان سے واپس ہو کر میرے ان بیٹوں کے ساتھ جو آپ کے ہمراہ جانا چاہیں، دامنِ کوہ کی طرف چلے جائیں۔ آپ کے لیے اس سے بہتر کوئی پناہ گاہ نہیں ہو گی۔ اگر آپ نے میرے کہنے کے مطابق عمل کیا تو انشاء اللہ اس کا بہتر نتیجہ پائیں گے ورنہ اس کے برعکس ہو گا۔"

یہ کہہ کر حافظ صاحب، نواب فیض اللہ خان کے خیمے سے باہر نکلے اور گھوڑے پر سوار ہو کر آہستہ آہستہ میدانِ جنگ کی طرف بڑھے۔ حافظ رحمت خان روہیلہ کا پورا لشکر صرف دس ہزار سواروں پر مشتمل تھا۔ اس کے برعکس نواب شجاع الدولہ اور انگریزوں کا لشکر نہ صرف تعداد میں کہیں زیادہ تھا بلکہ انہیں بھاری توپوں اور بندوقوں کی پناہ بھی حاصل تھی۔

ابھی حافظ صاحب میدان میں داخل ہوئے ہی تھے کہ سامنے سے نواب شجاع الدولہ کا ہراول دستہ نمودار ہوا۔ پھر چند لمحے بعد ہی روہیلوں کے لشکر پر توپ کے گولوں کی بارش ہونے لگی۔ اس گولہ باری کے جواب میں محمد مستقیم خان نے دو تین ہزار سواروں کے ساتھ بائیں جانب سے انگریزی فوج پر زبردست حملہ کیا۔ روہیلوں نے پہلے توپوں کی حد عبور کی، پھر بندوق بردار سپاہیوں کی صف کو پار کیا اور انگریزی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ افغان سپاہی اس قدر بے جگری سے لڑے کہ دشمن کی اگلی صفوں کا صفایا کر دیا اور انگریزوں کی کئی توپوں پر قبضہ کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد نواب فیض اللہ خان اپنے پانچ ہزار سواروں کے ساتھ آگے بڑھے اور بائیں جانب سے دشمن پر بھرپور حملہ کیا۔ نتیجتاً شجاع الدولہ کے سپاہیوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

انگریزی فوج نے فوراً ہی زاویہ بدل دیا اور حافظ رحمت خان کے دستۂ خاص کو اپنی توپوں کا نشانہ بنا لیا۔ بارودی گولے برقِ بے اماں کے مانند تھے جن کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنا ممکن نہیں تھا۔ سامانِ جنگ میں عدم توازن کے باوجود روہیلہ سپاہیوں نے پشت نہیں دکھائی۔ وہ اپنی غیرتِ اسلامی اور ہمتِ مردانہ کے سہارے آگے ہی بڑھتے رہے۔

اس وقت جنگ اپنے عروج پر تھی کہ احمد خان نے غداری کی اور شور مچاتا ہوا اپنے سپاہیوں کے ہمراہ میدان سے بھاگ کھڑا ہوا۔ احمد خان کی اس غیر متوقع حرکت سے روہیلہ سپاہیوں میں افراتفری پھیل گئی اور بہت سے لوگ واقعے کی تحقیق کیے بغیر فرار ہونے لگے۔ یہاں تک کہ حافظ صاحب کے گرد صرف پانچ سو سوار رہ گئے۔

انگریزی فوج نے اس صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور توپوں کا رخ رحمت خان کے دستۂ خاص کی طرف کر دیا۔ گولوں کی بارش تیز تر ہو گئی۔ ایک انگریز فوجی افسر نے دُوربین کے ذریعے حافظ صاحب کو پہچانا جو اپنے چند جاں نثاروں کے درمیان میں موجود تھے۔

''بس یہی تمہارا محاذِ جنگ ہے۔'' انگریز فوجی افسر نے چیخ کر کہا۔ ''اپنا تمام بارودی اسلحہ انہی چند سو سپاہیوں پر استعمال کر ڈالو..... تمہاری فتح قریب تر ہے۔''

اپنے افسر کا حکم سنتے ہی توپچیوں نے مخصوص ہدف پر گولے داغنے شروع کر دیے۔ گولے روہیلہ سردار کے قریب سے گزرتے رہے۔ آخر ایک گولے نے حافظ صاحب کے جسم کو چھو لیا۔ جو لوگ اس جنگ میں زندہ بچ گئے تھے، ان کا بیان ہے کہ حافظ صاحب کے جسم پر گولہ لگتے ہی ایسی آواز برآمد ہوئی کہ جیسے گولہ کسی پہاڑ سے ٹکرایا ہو۔ حافظ صاحب گھوڑے سے گر پڑے اور ایک لمحے میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

پھر دیکھنے والوں نے یہ حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ حافظ صاحب کے سینے میں نہ کوئی شگاف پڑا، نہ کوئی ہڈی ٹوٹی اور نہ بارود کی آگ نے ان کے لباس کو جلایا۔ یہ اس قرآن کریم کا معجزہ تھا جو حافظ صاحب کے سینے کے اندر موجود تھا۔

روہیلوں کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا اور نواب شجاع الدولہ نے انگریزوں کے ساتھ مل کر مکر و فریب کی ہزار چالوں کے بعد ایک جانباز قوم کو شکست دے دی تھی۔ جب شہادت کی خبر عام ہوئی تو نواب فیض اللہ خان، حافظ صاحب کی ہدایت کے مطابق ان کے بیٹوں کو ساتھ لے کر اپنی جاگیر رام پور کی طرف چلے گئے۔

❁---❁---❁

جب ہر طرف سناٹا چھا گیا اور میدانِ کارزار قبرستان میں تبدیل ہو گیا تو سلطان خان نامی ایک شخص اُدھر سے گزرا...... دوسرے مقتولین کے ساتھ حافظ رحمت خان روہیلہ کی لاش بھی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ سلطان خان نے فوراً ہی روہیلہ سردار کو پہچان لیا کیونکہ وہ کسی زمانے میں حافظ صاحب کی ملازمت کر چکا تھا اور اب شجاع الدولہ کے خوشامدی مصاحبوں میں شامل تھا۔ سلطان خان نے نواب اودھ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کیا اور آگے بڑھ کر حافظ صاحب کا سر کاٹ لیا۔ پھر وہ دنیا پرست انسان، روہیلہ سردار کا سر ایک طشت میں رکھ کر شجاع الدولہ کے سامنے پہنچا اور لاف زنی کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''سرکار! آپ کے غلام نے دست بہ دست جنگ میں رحمت خان کو شکست دی اور اب ان کا سر حاضرِ خدمت ہے۔''

شجاع الدولہ سب کچھ جانتا تھا مگر اس نے سلطان خان کے دعوے پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ اس نے اپنی جاہ و حشمت کا مظاہرہ کرنے کے لیے سلطان خان کو ایک ہاتھی، دوشالہ اور زرِ نقد انعام دیا۔

پھر شجاع الدولہ نے نواب ضابطہ خان اور نواب مظفر جنگ کو بلایا تاکہ حافظ صاحب کے سر کی شناخت کی جا سکے۔ حالانکہ وہ خود بھی کئی بار روہیلہ سردار سے مل چکا تھا اور اُنہیں خوب پہچانتا تھا مگر یہ مذموم حرکت اس لیے کر رہا تھا کہ حافظ صاحب کی تحقیر ہو اور دوسروں پر اس کا رعب قائم ہو سکے۔''

نواب ضابطہ خان نے دیکھتے ہی کہا۔ ''واقعی، یہ سر حافظ رحمت خان کا ہے۔''

یہ وہی نواب ضابطہ خان تھا جس کے بیوی بچوں کی رہائی کے لیے حافظ صاحب نے مرہٹوں کو چالیس لاکھ روپے کی رقم دینے کا وعدہ کیا تھا اور اسی سلسلے میں ایک دستاویز لکھی تھی...... اور پھر اسی دستاویز کو بنیاد بنا کر شجاع الدولہ نے حافظ رحمت پر جنگ مسلط کی تھی۔

نواب مظفر جنگ نے حافظ صاحب کا سر دیکھ کر انتہائی تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ ''کیا یہ اسی بل بوتے پر جنابِ عالی سے جنگ کرنے آئے تھے؟''

پھر دونوں نوابوں نے شجاع الدولہ کی خوشنودی کے لیے سلطان خان کو پانچ پانچ سو روپے کا انعام دیا۔

آخر میں حافظ صاحب کے سر کی شناخت کے لیے پیرزادہ سیّد مدن کو بلایا گیا۔ یہ اودھ کے مشہور بزرگ تھے اور خاص و عام میں نہایت احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ حافظ صاحب کا سر دیکھتے

ہی پیرزادہ مدن رونے لگے۔ پھر نواب شجاع الدولہ کو مخاطب کرتے ہوئے انتہائی رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''ہاں! یہ اسی مسلمان کا سر ہے۔''

پیرزادہ مدن کی بات سن کر نواب شجاع الدولہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے مگر وہ مصلحتاً خاموش رہا۔

پیرزادہ مدن نے شجاع الدولہ کے چہرے پر ناگواری کا رنگ دیکھ لیا تھا مگر وہ حق گوئی سے باز نہیں آئے۔ سید صاحب نے بے نیازانہ اہلِ دربار پر ایک نظر ڈالی اور پھر باآوازِ بلند یہ شعر پڑھا ؎

سر کشتہ بر نیزہ میزد نفس

کہ معراجِ مرداں ہمیں است و بس

(کٹا ہوا سر نیزے پر بھی سانس لیتا ہے، بس مردوں کی یہی معراج ہے)

شجاع الدولہ اس وقت تو پیرزادہ مدن کی صاف گوئی کو برداشت کر گیا مگر بعد میں اس نے سیّد صاحب کا سارا مال و اسباب ضبط کر لیا اور اُنہیں قید خانے میں ڈال دیا۔ پھر اس قدر مظالم ڈھائے کہ قید خانے ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی واقعے کے حوالے سے اُردو کا یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے ؎

اگرچہ شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

پیرزادہ سید مدن، غوثِ اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔



گمراہ

ہوسِ اقتدار نے ملّتِ اسلامیہ کو شدید نقصانات پہنچائے۔ بھائی کا خنجر بھائی کے گلے پر چلا اور خلافت کی قبا اپنے ہی خون سے رنگین ہوتی رہی۔ بنواُمیّہ نے تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے اور مملکتِ اسلامیہ کی حدود کو وسیع تر کر دیا۔ یکا یک گردشِ ایام نے نئے انداز سے کروٹ لی اور بُوئے حکومت بنوعباس کے دماغوں کو پریشان کرنے لگی۔ پھر حصولِ اقتدار کا جذبہ اس قدر برانگیختہ ہوا کہ اخلاقی قدریں تک فراموش کر دی گئیں۔

بنوعباس کا ایک طالع آزما شخص، ابوالعباس سفاح شمشیرِ بے نیام لے کر اُٹھا اور اس نے بنواُمیّہ کی شہ رگ کاٹ ڈالی۔ اِدھر بھی مسلمان تھے اور اُدھر بھی...... دونوں طرف سے مسلمانوں کا اس قدر خون بہا کہ میدانوں میں خون کی دلدل کھڑی ہوگئی۔ ابوالعباس اتنا سفاک اور منتقم تھا کہ اس نے حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو چھوڑ کر تمام خلفائے بنواُمیّہ کی قبریں کھود ڈالیں اور اُن کی ہڈیاں تک جلا ڈالیں۔ اسی وجہ سے تاریخ میں ابوالعباس کا نام ''سفاح'' مشہور ہوگیا۔ سفاح کا مطلب ہے خونریز.....

سفاح کے بعد اس کے بھائی منصور نے بھی رسمِ ستم جاری رکھی۔ یہاں تک کہ وہ خلافتِ عباسیہ کی بنیادیں مستحکم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر یہ سلسلۂ اقتدار خلیفہ ہادی تک پہنچ گیا۔ ہادی، خلیفہ منصور کا پوتا اور خلیفہ مہدی کا بیٹا تھا۔

خلیفہ مہدی کا دورِ حکومت بھی اندرونی بغاوتوں اور سازشوں سے پاک نہیں تھا۔ قدم قدم پر نئے نئے فتنے سر اُٹھا رہے تھے..... مگر کسی کو خبر بھی نہیں تھی کہ ایک بہت بڑا فتنہ ماں کے پیٹ میں پرورش پا رہا ہے۔

❀---❀---❀

یہ 170ھ کا واقعہ ہے۔ شہر مدائن میں عبداللہ نام کا ایک تیلی رہتا تھا۔ مالی حالات خراب ہوئے تو عبداللہ مدائن چھوڑ کر آذربائیجان چلا گیا۔ اس شہر کی سرحد پر ''بلال آباد'' نام کا ایک گاؤں تھا۔ عبداللہ نے اسی گاؤں میں سکونت اختیار کی۔ پھر وہ اپنی پیٹھ پر بڑا سا برتن رکھ کر گلی گلی تیل بیچنے لگا۔

عبداللہ ایک خوش شکل جوان تھا اور اس کی آواز نہایت دلکش تھی۔ تیل بیچنے کے لیے صدا لگانے کے بجائے وہ کوئی عشقیہ گیت گایا کرتا تھا۔ آواز کے ترنم نے گاؤں کے لوگوں کو عبداللہ کا گرویدہ بنا دیا۔ یہاں تک کہ سارے دیہاتی اس کے خریدار بن گئے۔ یہ حال دیکھ کر دوسرے دکاندار اس سے حسد کرنے لگے۔ عبداللہ ان تمام باتوں سے بے نیاز کُوچہ کُوچہ نغمہ سرائی کرتا رہا۔

گاؤں کی ایک عورت شمارا، عبداللہ کی آواز پر عاشق ہو گئی۔ وہ گھنٹوں اپنے دروازے پر کھڑی عبداللہ کے آنے کا انتظار کرتی رہتی۔ پھر جب عبداللہ ادھر سے گزرتا تو شمارا اُسے آواز دے کر روک لیتی اور بڑے والہانہ انداز میں تیل کا برتن عبداللہ کی طرف بڑھا دیتی۔ یہ اس عورت کا روزانہ کا معمول تھا۔ آخر ایک دن عبداللہ نے شمارا سے پوچھا۔

''تیرے گھر میں روزانہ کتنا تیل استعمال ہوتا ہے؟''

شمارا ہنس کر بڑے شوخ لہجے میں بولی۔ ''یہ تو تجھ سے ملنے کا بہانہ ہے۔'' اتنا کہہ کر شمارا دروازے کی اوٹ سے باہر آ گئی۔

عبداللہ کی آنکھوں کے سامنے ایک برق سی لہرائی۔ شمارا اس قدر حسین عورت تھی کہ عبداللہ کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور وہ پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔

''تجھے کیا معلوم کہ میں تیری آواز سننے کے لیے کتنی دیر کھڑی رہتی ہوں۔'' شمارا کی آواز میں چوڑیوں کی سی کھنک تھی۔

عبداللہ کا سکوت ٹوٹا اور اس نے گھبرا کر شمارا کی طرف دیکھا۔ ''کیا میری آواز اتنی اچھی ہے کہ تجھ جیسی حسین دوشیزہ اسے سننے کے لیے بے چین رہتی ہے؟'' عبداللہ کی آواز جوشِ جذبات سے لڑکھڑا رہی تھی۔

''تیری آواز میں جادو ہے۔'' شمارا بڑے بے باکانہ لہجے میں بول رہی تھی۔ ''اس آواز کو تو میں خوابوں میں بھی سنتی رہتی ہوں۔''

شمارا نے کھلے لفظوں میں اظہارِ عشق کر دیا تھا۔ عبداللہ نظر کی چوٹ کھا کر واپس چلا آیا اور ساری رات جاگتا رہا۔

پھر محبت کی یہ آگ اتنی شدت سے بھڑکی کہ شمارا اور عبداللہ دنوں جل اُٹھے۔ پہلے پہل تیل بیچنے کے بہانے مختصر گفتگو ہوئی، پھر جذبوں کی سرکشی بڑھی تو شمارا گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور جنگل میں ایک چشمے کے کنارے اپنے محبوب سے ملنے لگی۔

ایک دن شمارا کے محلے کی کچھ عورتیں دوسرے گاؤں جا رہی تھیں۔ یکایک راستے میں اُنہیں پیاس لگی۔ وہ پانی کی تلاش میں چشمے کے قریب پہنچیں۔ ناگہاں اُنہیں کسی مرد کے گانے کی آواز آئی۔ عورتوں نے چونک کر دیکھا۔ چشمے کے قریب درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ وہ دلکش آواز اسی طرف سے آ رہی تھی۔ گیت کے بول اس قدر ہیجان انگیز تھے کہ دیہاتی عورتیں، گانے والے کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہو گئیں۔

پھر وہ دبے قدموں درختوں کے کنج کی طرف بڑھیں۔

اب اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔ عبداللہ تیلی کے سامنے شراب کی صراحی رکھی ہوئی تھی اور شمارا جام لبریز کر کے اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ عورتوں نے اپنے محلے کی لڑکی کو اس حال میں دیکھا تو اچانک درختوں کی اوٹ سے نکل کر عبداللہ اور شمارا کے سامنے آ گئیں۔

''بے حیا! تُو نے اپنے گاؤں کی عزت برباد کر دی۔'' ایک عورت نے آگے بڑھ کر شمارا کے بال پکڑ لیے۔

عبداللہ ان عورتوں کو دیکھ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنی محبوبہ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ گیا۔

محلے کی عورتوں نے اپنا سفر ملتوی کر دیا اور شمارا کو کھینچتی ہوئی اس کے باپ کے سامنے لے گئیں۔

باپ نے بیٹی کی شرم ناک حرکتوں کی رُوداد سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ ''اب میں اہلِ محلّہ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟'' بوڑھا باپ زار و قطار رو رہا تھا۔ مگر شمارا کو اپنے اس فعل پر ذرا بھی ندامت نہیں تھی۔

وہ تمام عورتوں کی موجودگی میں با آوازِ بلند کہہ رہی تھی۔ ''محبت کرنا انسان کا پیدائشی حق ہے......اور میں عبداللہ سے محبت کرتی ہوں۔''

''بدنصیب!....وہ تجھ سے محبت نہیں کرتا۔'' باپ نے سرکش بیٹی کے منہ پر زوردار تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔'' شمارا نے اسی بے باکی کے ساتھ کہا۔ ''عبداللہ عورتوں کے خوف سے بھاگ گیا ہے.....ورنہ اُس کی محبت سچی ہے۔''

بات بگڑ گئی تھی اور اہلِ محلّہ، شمارا کے باپ پر زور ڈال رہے تھے۔ ''یا تو دونوں کی شادی کر دو یا پھر اس محلے کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ ہم اپنی بہو بیٹیوں پر اس آوارگی کا سایہ پڑنے نہیں دیں گے۔''

آخر شمارا کے باپ نے محلے کے ایک آدمی کو بھیج کر عبداللہ کو اپنے گھر بلایا۔

عبداللہ نے کھلے لفظوں میں اپنی محبت کا اعتراف کر لیا اور اس کے ساتھ ہی درخواست کی کہ وہ شمارا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

آخر عبداللہ اور شمارا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

شادی کے ایک سال بعد ان کے یہاں ایک خوبصورت لڑکا پیدا ہوا۔ عبداللہ نے اس کا نام بابک رکھا۔

دونوں اپنے بچے کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے کہ وقت نے ایک نئی کروٹ لی۔ عبداللہ اپنی کاروباری ضرورت سے ''کوہ سلان'' گیا اور وہاں کسی شخص نے اسے قتل کر دیا۔

❀---❀---❀

پھر جب یہ خبر شمارا کو پہنچی تو اس کی دنیا ویران ہو گئی۔ اس وقت بابک دو سال کا تھا۔ زندگی کا طویل سفر اور ایک تنہا عورت.....؟

پھر وقت اپنی مقررہ رفتار سے گزرتا رہا اور شوہر کی موت کا صدمہ آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا گیا۔ شمارا نے

اپنا اور بچے کا پیٹ بھرنے کے لیے دایہ کا پیشہ اختیار کر لیا۔ خالی اوقات میں وہ لوگوں کے گھر کا کام کاج کر کے دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا حاصل کر لیتی۔

پھر جب دن بھر کی شدید محنت و مشقت کے بعد شمارا رات کو تنہائی میں بستر پر دراز ہوتی تو اُسے بیتے ہوئے ماہ و سال کی خوشگوار یادیں آ کر گھیر لیتیں۔ اس کے کانوں میں مرحوم شوہر کی سریلی آواز گونجنے لگتی اور وہ گزرے ہوئے لمحوں سے لپٹ کر سسکنے لگتی۔

جب بابک پانچ چھ سال کا ہوا تو مویشی چرانے پر نوکر ہو گیا۔ بیٹے کو چار پیسے ملے تو ماں کا بوجھ بھی کسی قدر کم ہونے لگا۔

بابک دس سال تک جانوروں کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ ایک دن شمارا دوپہر کے وقت بیٹے کے لیے روٹی لے کر گئی۔ اس وقت بابک ایک درخت کے نیچے گہری نیند سویا ہوا تھا۔ شمارا نے کھانا زمین پر رکھ دیا اور بیٹے کو جگانے کے لیے آگے بڑھی۔ بابک تہمد باندھے ہوئے تھا اور اس کے جسم کا اوپری حصہ بے لباس تھا۔ شمارا نے قریب جا کر بیٹے کی طرف دیکھا تو شدتِ خوف سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بابک کے سر کے بالوں کی جڑوں سے خون پھوٹ رہا تھا۔

''بابک!...... میرے بیٹے! تجھے کس نے مارا ہے؟'' شمارا یہی سمجھی تھی کہ کسی شخص نے بابک کے سر پر گہری ضرب لگائی ہے جس کی وجہ سے اس کے بال خون آلود ہو گئے ہیں۔ شمارا نے کئی بار چیخ چیخ کر آوازیں دیں مگر بابک کی گہری نیند میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آخر بے قرار اور وحشت زدہ ماں نے بیٹے کو جھنجوڑ ڈالا۔

بابک کی آنکھ کھل گئی اور وہ بدحواس ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ''کیا بات ہے ماں؟'' بابک نے ماں کی طرف دیکھا، جس کا چہرہ خوف سے زرد تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

شمارا بے اختیار بابک سے لپٹ گئی۔ ''میرے بیٹے! یہ کیسا خون ہے جو تیرے سر سے بہہ رہا ہے؟''

بابک گھبرا گیا اور اپنے سر پر دونوں ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''کہاں ہے خون؟'' بابک نے ہاتھوں کو بغور دیکھتے ہوئے ماں سے پوچھا۔ ''میرے سر پر تو خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔''

شمارا نے گھبرا کر بیٹے کو الگ کر دیا اور دوبارہ اس کے سر کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر پہلے بابک کے بال خون سے بھرے ہوئے تھے اور اب وہاں خون کا ہلکا سا نشان تک نہیں تھا۔ شمارا بار بار اپنی آنکھیں ملتی اور بابک کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتی۔

''بیٹے! یہ کیسے ممکن ہے؟ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔''

''تو پھر وہ خون اتنی جلدی خشک کیسے ہو گیا؟'' بابک زور زور سے ہنسنے لگا۔ ''نہیں ماں! تمہیں دھوکا ہوا ہے۔''

شمارا حیران و پریشان کھڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر وہ اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی گھر

واپس لوٹ آئی۔

❁---❁---❁

بابک اپنے آپ میں مگن گاؤں والوں کے مویشی چراتا رہا......اور شمارا کئی راتیں جاگ کر تنہائی میں سوچتی رہی کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے اپنے بیٹے کے سر کو خون میں تر دیکھا تھا.....اور جب بابک بیدار ہوا تو خون کا ہلکا سا نشان تک نہ تھا۔

آخر اسی ذہنی کشمکش سے نجات پانے کے لیے ایک دن شمارا نے پڑوس کی ایک بوڑھی عورت سے پورا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھ پر ایک انجانا سا خوف طاری ہے جس کی وجہ سے میں رات کو سکون کی نیند بھی نہیں سو سکتی۔''

شمارا کی بات سن کر بوڑھی عورت کے چہرے پر بھی خوف کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ ''یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے...... مجھے تو لگتا ہے کہ بابک پر کوئی نادیدہ بلا مسلط ہو گئی ہے......اگر اس بلا کو فوری طور پر دور نہیں کیا گیا تو بابک کی جان کو خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہے۔''

بوڑھی عورت کے خدشات نے شمارا کو اور بھی پریشان کر دیا۔ وہ بدحواس ہو کر رونے لگی۔ ''میرا ایک ہی بچہ ہے اور یہی میری ناکام و نامراد زندگی کا آخری سہارا ہے۔''

بوڑھی عورت، شمارا کو تسلیاں دینے لگی۔ ''تم گھبراؤ نہیں...... میں اس کا علاج جانتی ہوں۔''

شمارا نے جوشِ جذبات میں بوڑھی عورت کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ ''پھر میرے بیٹے کا علاج کر دو۔'' شمارا کا لہجہ بہت عاجزانہ تھا۔ ''میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے مگر میں ساری زندگی تمہاری خدمت کروں گی۔''

''میں تو خود ایک گناہ گار عورت ہوں۔'' بڑھیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تیرے بیٹے کا علاج میں نہیں، مقدس کافیل کریں گے۔''

''یہ مقدس کافیل کون ہیں؟'' شمارا نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بہت بڑے بزرگ ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے بوڑھی عورت کی آنکھوں میں عقیدت کی ایک خاص چمک نظر آنے لگی۔ ''مقدس کافیل نے ان بیماروں کا بھی علاج کر دیا ہے جو قبر کے کنارے پہنچ چکے تھے...... انہوں نے بڑے خوفناک بھوتوں اور آسیبوں کو اُتارا ہے۔''

''مقدس کافیل کہاں رہتے ہیں؟'' شمارا نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''ہمارے گاؤں سے دس کوس کے فاصلے پر۔'' بوڑھی عورت نے مقدس کافیل کا پتہ بتاتے ہوئے کہا۔

''میں اپنے بیٹے کے لیے سو کوس تک بھی جانے کے لیے تیار ہوں۔'' شمارا نے ایک بار پھر خوشامدانہ انداز میں بوڑھی عورت کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور گڑگڑانے لگی۔ ''مجھے مقدس کافیل کے پاس لے چلو۔''

بوڑھی عورت نے ایک غم زدہ ماں کے اضطراب کو شدت سے محسوس کیا اور پھر تین دن بعد شمارا کو

اپنے ہمراہ لے چلنے کا وعدہ کرلیا۔

اس دوران شمارا مسلسل بابک کا جائزہ لیتی رہی مگر اسے دوبارہ وہ منظر دکھائی نہیں دیا جس نے اُس کی نیندیں اُڑا دی تھیں۔

❀---❀---❀

بوڑھی عورت اپنی ناتوانی کے سبب اتنا طویل فاصلہ پیادہ پا طے نہیں کرسکتی تھی۔ مجبوراً شمارا نے لوگوں سے قرض لے کر ایک بیل گاڑی کا انتظام کیا۔ پھر یہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر مقدس کافیل سے ملنے کے لیے اس کے گاؤں کی طرف روانہ ہوئیں۔

کافیل ایک مجوسی (آتش پرست) تھا۔ اس کی عمر ستّر سال سے تجاوز کر چکی تھی مگر ظاہری طور پر بہت تندرست و توانا نظر آتا تھا۔ کافیل نے سفلی عملیات میں بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ وہ اپنے وقت کا بڑا جادوگر تھا۔ کافر اور آوارہ روحوں کو طلب کر کے لوگوں کے سامنے اپنے فن کے عجیب عجیب مظاہرے کیا کرتا تھا۔ کافیل کا ایک ہنر یہ بھی تھا کہ وہ لوگوں کو ان کے گھروں میں رکھی ہوئی چیزوں کے بارے میں بتا دیا کرتا تھا۔ اس لیے لوگ اس سے بہت ڈرتے تھے۔ کافیل ایک بدکردار شخص تھا۔ ہر وقت شراب کے نشے میں غرق رہتا تھا اور خوب صورت عورتیں اس کی خدمت میں لگی رہتی تھیں۔

کافیل کے بارے میں مشہور تھا کہ شیطان مؤکل اس کے تابع ہیں جو اسے دنیا بھر کی خبریں دیتے رہتے ہیں۔ کافیل ان ہی شیطانوں سے تخریب کاری کے کام لیتا تھا۔ اس نے اپنے جادوئی عملیات کے ذریعے کئی صحت مند انسانوں کو پاگل بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ اور کئی طاقتور لوگ ہلاک کر ڈالے تھے۔ اسی وجہ سے دُور دُور کی بستیوں والے کافیل کے خوف سے سہمے رہتے تھے۔ اس کے مکان میں چوبیس گھنٹے آگ جلتی رہتی تھی۔ کافیل آگ کے گرد پھیرے لگا کر نامانوس زبان میں اپنے منتر پڑھتا رہتا تھا۔

جب شمارا بوڑھی عورت کے ساتھ کافیل کے سامنے پہنچی تو وہ آگ کے قریب آنکھیں بند کیے بڑبڑا رہا تھا۔ شمارا اسے دیکھ کر کانپ گئی۔

کچھ دیر بعد کافیل نے آنکھیں کھولیں اور شمارا کی طرف دیکھا۔ نشے کی زیادتی سے کافیل کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شمارا کے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ کافیل کی آنکھوں میں ہوس کے سائے ناچ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک بہت غور سے شمارا کے دلکش خدوخال کو دیکھتا رہا۔ شمارا نے گھبرا کر اپنی نظریں جھکا لیں۔

یکایک کافیل کی بھاری آواز گونجی۔ ''بدنصیب عورت! تُو میرے پاس کس لیے آئی ہے؟'' کافیل نے شمارا سے سوال کیا۔

شمارا نے سارا واقعہ سنا دیا اور گداگرانہ لہجے میں کہنے لگی۔ ''مقدس کافیل! میں آپ سے اپنے بیٹے کی سلامتی کی بھیک مانگتی ہوں۔''

''بھیک اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔'' کافیل نے گرج دار لہجے میں کہا۔ کافیل کی آواز اتنی بھیانک تھی کہ شمارا لرز اُٹھی۔

''پھر یہ بھیک کس طرح ملے گی؟'' شدتِ خوف سے شمارا کی آواز کانپ رہی تھی۔

''تجھے کچھ دن ہماری خدمت کرنی ہوگی۔'' کافیل نے ایک بار پھر شمارا کے خوب صورت چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پھر جب ہم خوش ہو جائیں گے تو تجھے بتائیں گے کہ تیرے بیٹے پر کیسی خوف ناک بلا مسلط ہے جو دن رات اس کا خون پی رہی ہے۔''

خون کا لفظ سن کر شمارا رونے لگی۔

''رونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' کافیل نے بلند آواز میں کہا۔ ''مقدس کافیل کی خدمت کر کہ اسی میں تیری نجات ہے۔''

''میں تیار ہوں مقدس کافیل!..... میں تیار ہوں۔'' شمارا نے ہوس پرست جادوگر کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

پھر کافیل کے حکم پر اندر سے دو عورتیں برآمد ہوئیں اور شمارا کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئیں۔

کافیل نے بوڑھی عورت کو کچھ پیسے دیئے اور گاڑی کا انتظام کر کے اسے گاؤں واپس بھیج دیا۔

❁---❁---❁

آٹھ دن تک شمارا، کافیل کو شراب پلا کر اُس کی خدمت کرتی رہی۔ پھر جب اُس سیاہ کار جادوگر کا دل بھر گیا تو اس نے شمارا سے کہا۔

''تیرے بیٹے پر ایک خون آشام بلا نازل ہوگئی ہے، اُسے میرے پاس لے آ...... میں اُس کا علاج کر دوں گا۔''

شمارا خوشی خوشی اپنے گاؤں پہنچی۔

بابک نے ماں کو دیکھا تو دوڑ کر لپٹ گیا اور آٹھ دن تک غائب رہنے کی شکایت کرنے لگا۔

شمارا، بیٹے کو پیار کرتی رہی اور مبہم الفاظ میں صورتِ حال کے متعلق سمجھاتی رہی۔ پھر وہ بابک سے کہنے لگی۔ ''تجھے مقدس کافیل نے بلایا ہے۔ وہ تیری بیماری کا علاج کر دیں گے۔''

بابک نے جھنجلا کر کہا۔ ''ماں! مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ تم کس وہم میں پڑ گئی ہو؟''

شمارا کئی دن تک بیٹے کو سمجھاتی رہی مگر بابک، کافیل کے پاس جانے سے انکار کرتا رہا۔ آخر شمارا رونے لگی۔ ''میرے بیٹے! تجھے کیا معلوم کہ تیری ماں تیرے لیے کس عذاب سے گزر رہی ہے؟''

ماں کے آنسو دیکھ کر بابک نرم پڑ گیا او۔ پھر شمارا کے ساتھ کافیل کے آشرم میں چلا گیا۔

❁---❁---❁

بابک اپنی ماں کی طرح خوب صورت تھا۔ کافیل نے ایک نظر اس خوب صورت لڑکے کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر شمارا سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تو اپنے بیٹے کو دو چار مہینے کے لیے میرے آشرم میں چھوڑ جا..... میں علاج کے ساتھ اس کی تربیت بھی کر دوں گا۔''

شمارا بے قرار ہو گئی۔ ''مقدس کافیل! میں ایک دن بھی اپنے بیٹے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''تیرا بیٹا تیرے پاس رہ کر سوکھی روٹیاں کھاتا ہے۔'' کافیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہاں اسے دنیا بھر کی نعمتیں میسر ہوں گی...... اگر تیرا دل چاہے تو دو چار دن میں آکر اپنے بیٹے کو دیکھ لینا۔''

شمارا دل پر پتھر رکھ کر واپس چلی گئی..... اور بابک، کافیل کے آشرم میں رہنے لگا۔ جہاں ہر طرف آسائشیں ہی آسائشیں اور رنگ ہی رنگ تھے۔ شب کے اندھیرے میں کافیل کی خفیہ مجلسیں آراستہ ہوتیں جن میں ہر رات ایک خوب صورت عورت، کافیل کو شراب پلاتی۔ بابک کی عمر اس وقت دس گیارہ سال تھی۔ وہ کافیل کے قریب بیٹھا بے حیائی کے یہ مناظر دیکھتا رہتا۔

جب کافیل شراب کے نشے میں بدمست ہو جاتا تو بابک کو مخاطب کر کے کہنے لگتا۔

''سن اے لڑکے! تُو نے اب تک مویشی چرائے ہیں اور گھاس پھونس کھا کر گزارہ کیا ہے...... اصلی زندگی یہ ہے...... عورت اور شراب...... بھُنے ہوئے مرغ، تیتر اور بکرے......''

نوعمر بابک، کافیل کی باتیں سنتا اور شرما کر سر جھکا لیتا۔

پھر ایک دن رات کے پچھلے پہر کافیل نے بھڑکتی ہوئی آگ کے سامنے اپنا منتر پڑھا۔ کچھ دیر بعد اس منتر کا شیطان مؤکل آمنتی حاضر ہوا۔ یہ ایک دراز قامت اور طاقتور شیطان تھا۔ کافیل اس پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔

''آمنتی! میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ بابک ایک غیر معمولی لڑکا ہے...... مگر میں نہیں جانتا کہ جوان ہو کر یہ کیا کرے گا؟ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ یہ آگ کا پجاری نہیں ہے۔ مجھے بتا آمنتی! یہ کون ہے؟''

آمنتی کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر بولا تو یوں محسوس ہوا جیسے آندھی چل رہی ہے۔ ''مقدس کافیل! میرا علم بتاتا ہے کہ یہ لڑکا کچھ بھی ہو، مگر مسلمان نہیں ہو سکتا۔''

آمنتی کی بات سن کر کافیل نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ ''ابھی میں مطمئن نہیں ہوا آمنتی! کچھ اور بتا اس لڑکے کے بارے میں۔''

ایک بار پھر آشرم میں گہری خاموشی چھا گئی۔ آمنتی خاموش کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ کافیل گہری نظروں سے اپنے شیطان مؤکل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد آمنتی نے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگا۔ ''مقدس کافیل! میرا علم بتاتا ہے کہ یہ لڑکا بابک، مجوسیوں (آتش پرستوں) کے لیے بہت کام کرے گا۔''

''مگر یہ خود تو آتش پرست نہیں ہے۔'' کافیل نے کہا۔ ''اور اپنا مذہب بھی نہیں بتاتا۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ یہ آپ کے بہت کام آئے گا۔'' آمنتی اپنی بات کی وضاحت کر رہا تھا۔ ''ابھی بابک کا ذہن کچا ہے۔ اس پر جو نقش بٹھا دو گے، وہی آگے چل کر پکا ہو جائے گا۔ اگر یہ آگ کا پجاری نہیں ہے تو پھر آپ اسے بنا دیجیے.... اپنے رنگ میں ڈھال دیں..... پھر خود ہی رنگین ہو جائے گا۔''

کافیل کچھ دیر تک خیالات میں غرق رہا۔ پھر آمنتی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اور بابک کی ماں نے جو اس کے سر پر خون اُبلتے دیکھا ہے، اس کے بارے میں تیری کیا معلومات ہیں؟''

''مجھے تو اس وقت بھی اس کے سر پر خون نظر آ رہا ہے۔'' آمنتی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''بابک دس پندرہ روز سے میرے آشرم میں مقیم ہے مگر میں نے ایک دن بھی اس کے سر پر خون نہیں دیکھا۔'' کافیل نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ ''اس کی ماں کا بھی یہی کہنا ہے...... مگر میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر کیوں نہیں آتا؟''

''یہ مقدس کافیل جانیں...... میں تو آپ کا ایک ادنیٰ تابعدار ہوں۔'' آمنتی نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''خون تو مجھے نظر آتا ہے مگر میں یہ نہیں جانتا کہ یہ کیسا خون ہے؟ پھر بھی آپ بابک سے کام لے سکتے ہیں۔ بے شک! یہ ایک غیر معمولی لڑکا ہے۔''

کافیل کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر اس نے اپنے مؤکل شیطان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''اب تُو جا آمنتی! میں اس لڑکے کو دیکھتا ہوں۔''

آمنتی چلا گیا۔

کافیل آگ کے سامنے سے اٹھا اور اس کمرے میں پہنچا جہاں بابک ایک ریشمی بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔

کافیل کچھ دیر تک منتر پڑھتا رہا۔ پھر اس نے بابک کے قریب پہنچ کر پانچ بار پھونکیں ماریں اور سوتے ہوئے لڑکے سے مختلف سوالات شروع کر دیے۔

''لڑکے! مجھے بتا کہ تُو کون ہے؟'' کافیل نے پوچھا۔

کچھ دیر تک کمرے میں سناٹا طاری رہا۔ پھر آہستہ آہستہ بابک کے ہونٹوں کو جنبش ہونے لگی۔ ''میں بابک ہوں۔ میرے باپ عبداللہ کو اس وقت قتل کر دیا گیا، جب میری عمر دو سال تھی۔''

''تیرا مذہب کیا ہے؟ اور تُو کس کی عبادت کرتا ہے؟'' کافیل نے بابک سے دوسرا سوال کیا۔

''میں نہیں جانتا کہ مذہب کسے کہتے ہیں۔'' بابک نے نیند کی حالت میں جواب دیا۔ ''میں تو جنگل میں مویشی چراتا ہوں اور بارش کے گیت گایا کرتا ہوں۔''

''تیری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟'' کافیل نے تیسرا سوال کیا۔

''میں بہت سی دولت چاہتا ہوں۔'' بابک نے جواب دیا۔ ''میری ماں لوگوں کی مزدوری کرتے کرتے

تھک گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی ماں کے لیے ایک محل بنوا دوں، جہاں دوسری عورتیں اس کی خدمت میں دن رات لگی رہیں۔''

کافیل کو یقین آ گیا کہ ابھی بابک کا ذہن بالکل سادہ ہے۔ اور اس پر کوئی بھی نقش آسانی سے بنایا جا سکتا ہے۔

❀---❀---❀

پھر کافیل نے بابک کو آگ کی پوجا پر لگا دیا۔ وہ بھڑکتے ہوئے شعلوں کے سامنے بیٹھ جاتا اور بلند آواز میں یہ کلمات ادا کرتا۔

''اوّل آگ، آخر آگ.....بس آگ ہی آگ......اس کے سوا کچھ نہیں۔''

بابک بھی ان ہی الفاظ کو دہراتا......اور پھر کافیل کی نقل کرتے ہوئے آگ کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے طویل دعا مانگتا۔

''اے مقدس آگ! تجھ سے زیادہ طاقتور اس دنیا میں کوئی شے نہیں ہے......اسی لیے ہم تیری عبادت کرتے ہیں.....تُو اپنے منکرین کو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جلا کر راکھ کر دے.....اور اپنے ماننے والوں کو اس کی تیز لپٹوں سے ہمیشہ کے لیے بچا لے.....تیرے سوا ہمارا کوئی نہیں۔''

بابک بہت دل لگا کر آگ کی پوجا کرتا۔ وہ گھنٹوں آنکھیں بند کیے بیٹھا رہتا۔

کافیل کی طرف سے اسے مرغن اور انتہائی لذیذ غذائیں فراہم کی جاتی تھیں۔ بچپن سے سوکھی روٹی کھانے والے لڑکے نے مہکتے ہوئے کھانوں کی خوشبو سونگھی تو اسے اپنے ماضی سے نفرت ہونے لگی۔ آرام دہ بستر، انواع و اقسام کے مشروبات اور کھانوں نے بابک کے چہرے کا رنگ بدل دیا تھا۔ اس کی رنگت پہلے ہی سرخ و سفید تھی، عیش و آرام ملا تو چہرے پر ایسی چمک پیدا ہو گئی کہ دیکھنے والوں کی نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔

اس دوران اُس کی ماں، شمارا بھی بیٹے سے ملنے آتی رہتی تھی۔ وہ بابک کی صحت و رعنائی دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی......مگر فوراً ہی بیٹے کی جدائی کے خیال سے رونے لگتی تھی۔

بابک اُسے تسلیاں دیتا۔ ''مقدس کافیل کا کہنا ہے کہ چند دنوں میں میری تعلیم مکمل ہو جائے گی...... پھر میں تجھ سے آ ملوں گا اور کبھی جدا نہیں ہوں گا......میں یہ سب کچھ تیری خوشی کے لیے کر رہا ہوں۔''

شمارا اپنی آنکھوں میں اچھے دنوں کے خواب سجائے واپس چلی جاتی۔ اور بابک، کافیل کی ہدایت کے مطابق آگ کی پرستش میں مصروف ہو جاتا۔ کافیل کے آشرم میں خوب صورت عورتوں کی موجودگی کبھی کبھی بابک کو بے چین کر دیتی مگر وہ اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پاتا تھا۔ لیکن اب اُسے صنفِ نازک میں ایک کشش سی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک دن بابک چوری چھپے کافیل کی عشرت گاہ میں داخل ہو گیا اور اس نے صراحی سے تھوڑی سی شراب نکال کر سونے کے پیالے میں بھر لی اور پھر اسے منہ سے لگا لیا۔ ایک

گھونٹ لیتے ہی بابک کو تلخی اور بدبو محسوس ہوئی۔ اُس نے فوراً ہی شراب اُگل دی۔ پھر ایک دن تنہائی میں کافیل سے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے بولا۔

''مقدس دیوتا! یہ آپ کیسا گندا شربت استعمال کرتے ہیں؟''

کافیل نے حیرت سے بابک کی طرف دیکھا۔ ''تجھے کیسے معلوم ہوا کہ یہ گندا شربت ہے؟''

بابک نے تفصیل سے پورا واقعہ سنا دیا۔

کافیل نے ایک خوف ناک قہقہہ لگایا۔ ''بابک! ابھی تُو بچہ ہے۔ جوان ہو کر اسے منہ لگانا، پھر تجھے پتہ چلے گا کہ یہ کیا شے ہے؟''

الغرض اس طرح چھ ماہ گزر گئے۔ بابک کے معصوم ذہن پر آتش پرستی کے نقوش گہرے ہو چکے تھے اور کافیل یہی چاہتا تھا۔ ایک دن شمارا آشرم میں پہنچی اور رو رو کر کہنے لگی۔

''مقدس کافیل! اب مجھ سے بیٹے کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔''

کافیل کام پورا کر چکا تھا۔ اس نے بابک کو جانے کی اجازت دے دی۔

بابک نے کافیل کے آشرم میں انتہائی عیش و عشرت کی زندگی بسر کی تھی۔ گاؤں جا کر اسے دوبارہ لوگوں کے مویشی چرانا پڑیں گے، اس خیال سے وہ بدحواس ہو گیا۔

''مقدس دیوتا! اب میں جانوروں کے ساتھ جنگل جنگل نہیں بھٹکوں گا۔ مجھ سے یہ کام نہیں ہو گا۔''

''اب تُو جانور نہیں چرائے گا میرے بچے!'' کافیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تیرے لیے ترقی کے دروازے کھول دیئے ہیں۔''

شمارا بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ''مقدس کافیل! اب وہ بلا میرے بچے کو پریشان تو نہیں کرے گی؟''

''میں نے اس خون آشام عفریت کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔'' کافیل نے بڑے مکروہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''اب کوئی بلا تیرے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔''

شمارا نے کافیل کے غلیظ اور سیاہ ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنے بیٹے کو لے کر جانے لگی۔

''بابک! جب بھی تجھے کوئی مشکل پیش آئے، بے خوف و خطر میرے پاس چلے آنا۔ تُو میرا بیٹا ہے۔'' کافیل نے بابک کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔

شمارا نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور بیٹے کو لے کر تیزی کے ساتھ اس خبیث کے آشرم سے نکل گئی۔ وہ بابک کو کس طرح بتاتی کہ کافیل مقدس نہیں، غلیظ شیطان ہے...... اور اس شیطان نے ایک مجبور ماں پر کیسا ظلم ڈھایا ہے۔

❁---❁---❁

بابک اپنی ماں کی وجہ سے گاؤں تو لوٹ آیا تھا مگر اسے بروقت کافیل کے آشرم کی یاد ستاتی رہتی تھی جہاں اس نے چھ ماہ کا طویل عرصہ بڑے عیش و عشرت میں گزارا تھا۔ چند روز تو وہ اپنے گاؤں (بلال آباد)

کی گلیوں اور کھیتوں میں آزادانہ گھومتا رہا۔ پھر اُسے فکرِ معاش ستانے لگی۔ گاؤں میں زیادہ تر جولاہے، تیلی اور لوہار بستے تھے۔ آشرم کی لذتوں سے آشنا ہونے کے بعد ان مشکل پیشوں کو اختیار کرنا بابک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اب لے دے کر بابک کے لیے مویشی چرانے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ بابک کئی دن تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ پھر ایک روز اپنی ماں سے انتہائی سخت لہجے میں بولا۔

''مقدس کافیل کے پاس میرے کیسے اچھے دن گزر رہے تھے..... تم نے یہاں بلا کر مجھے کس آفت میں ڈال دیا؟ آشرم میں کیسی کیسی خوشبوئیں سلگتی رہتی تھیں...... اب میں جنگل میں جا کر گندے پانی اور گائے بھینسوں کے گوبر کی بُو سونگھوں؟ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں دوبارہ مقدس کافیل کے پاس چلا جاؤں گا۔''

اس شیطان کا نام سن کر شمارا نے بیٹے کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''بابک! تجھے تیری ماں کی قسم! آئندہ کافیل کے پاس جانے کا نام نہ لینا...... وہ تجھے برباد کر ڈالے گا میرے بیٹے! تُو نہیں جانتا کہ وہ کون ہے؟''

''پھر میں کیا کروں؟'' بابک جھنجلا کر کہتا۔ ''اس گاؤں میں غربت کے سوا کیا رکھا ہے؟'' چند مہینے کے عیش و آرام نے بابک کے دل میں دولت کی نہ مٹنے والی ہوس پیدا کر دی تھی۔

''تو پھر کسی اور شہر چلا جا...... مگر کافیل کے پاس نہ جانا۔'' شمارا مسلسل بیٹے کی خوشامد کر رہی تھی۔ ''اگر کوئی کام نہیں ملتا تو چین سے گھر میں بیٹھ! تیرے بجائے میں خود محنت مزدوری کر لوں گی۔''

اسی رات بابک نے خواب میں دیکھا، کافیل اس سے کہہ رہا تھا۔ ''میرے بیٹے! پریشان مت ہو۔ عنقریب تجھ پر کامیابی کے دروازے کھلنے والے ہیں۔''

صبح ہوتے ہی بابک نے رات کا خواب اپنی ماں کے سامنے بیان کیا۔ کافیل کا نام سنتے ہی ایک بار پھر شمارا کے چہرے پر نفرت کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ شمارا اس شیطان کے ہاتھوں اپنی آبرو گنوا چکی تھی۔ اس کے دل میں کافیل کے لیے نفرت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ موجود ہی نہیں تھا۔ وہ انتہائی برہم لہجے میں بیٹے کو مخاطب کر کے بولی۔

''وہ شیطان تیرے ہوش و حواس پر مسلط ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی ایک نہ سننا۔ وہ جھوٹا ہے....... صرف جھوٹا۔''

ابھی ماں بیٹا باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ بابک اُٹھ کر باہر گیا تو ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔

''لڑکے! کیا تمہارا ہی نام بابک ہے؟'' اجنبی نے پوچھا۔

''ہاں۔ میں ہی بابک ہوں۔ مگر آپ کون ہیں؟'' عبداللہ تیلی کے لڑکے نے اجنبی شخص سے پوچھا۔

اتنے میں شمارا بھی اُٹھ کر دروازے پر آ گئی تھی۔

''میں شہر برستاق سے آیا ہوں۔'' اجنبی شخص نے بابک کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے

رئیس شبل کے لیے کچھ محنتی اور جفاکش نوجوانوں کی ضرورت ہے۔"

یہ سن کر بابک کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"نوجوان! کیا تم میرے ساتھ برستاق چلنا پسند کرو گے؟" اجنبی شخص نے بابک سے پوچھا۔"میرا آقا شبل تمہیں معقول اُجرت دے گا۔ وہاں تم پُرسکون زندگی بسر کرسکو گے۔"

شمارا، بابک کو شیطان کا فیل سے دُور رکھنا چاہتی تھی، اس لیے اس نے فوراً ہی ہامی بھر لی۔

اجنبی شخص نے پیشگی کے طور پر کچھ رقم شمارا کو دی اور بابک کو اپنے ہمراہ لے کر "برستاق" چلا گیا۔

❀---❀---❀

برستاق ایک خوشحال علاقہ تھا جو بابک کے آبائی گاؤں "بلال آباد" سے کافی فاصلے پر واقع تھا۔ یہاں بابک نے دن رات بڑی محنت سے کام کیا اور رئیس شبل کی نظروں میں آ گیا۔ بابک خالی اوقات میں شبل کے غلاموں سے طنبورہ بجانا سیکھتا تھا۔ وہ ایک جوان رعنا تھا، جدھر سے گزر جاتا، برستاق کی دوشیزائیں اسے دیکھتی رہ جاتیں۔ بابک نے یہاں کئی سال گزارے۔ یہاں تک کہ وہ طنبورہ بجانے میں طاق ہو گیا۔ بڑی عجیب بات تھی کہ اس کا باپ عبداللہ تیلی بڑا خوش الحان تھا اور اس کی آواز کو سن کر شمارا اس کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔

بابک کی آواز بھی بہت اچھی تھی..... لیکن طنبورہ بجانے کا ہنر کچھ ایسا تھا کہ جیسے ہی وہ تار کو چھیڑتا، برستاق کی دوشیزاؤں کے دل رقص کرنے لگتے۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ بعض لڑکیاں اپنے گھروں سے نکل کر دریا کے کنارے پہنچ گئیں، جہاں بابک تنہائی میں طنبورہ بجایا کرتا تھا۔ اب وہ سولہ سترہ سال کا ایک ایسا نوجوان تھا جس کے چہرے پر جوانی کی آگ دہک رہی تھی۔ بابک نے گیارہ سال کی عمر میں کا فیل کے آشرم میں خوب صورت عورتوں کا ہجوم دیکھا تھا..... مگر اس وقت وہ وجودِ زن کی اہمیت سے نا آشنا تھا۔ اب اس نے برستاق میں خوب صورت دوشیزاؤں کو دیکھا تو اسے کا فیل کی باتیں اور شراب کی محفلیں یاد آنے لگیں۔

پھر ایک دن ایک سردار کی لڑکی رمیا، بابک کے عشق میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی..... اور اس نے بڑی بے باکی کے ساتھ بابک کے سامنے اظہارِ عشق کر ڈالا۔

بابک، رمیا کی وارفتگی دیکھ کر ڈر گیا۔ "کہاں ایک رئیس زادی اور کہاں یہ غلام؟.... میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"یہاں سے بھاگ چل بابک! دُور، بہت دُور...... میں تیرا ساتھ دوں گی۔" رمیا پاگل ہو رہی تھی۔

بابک ایک دوشیزہ کی وحشتِ عشق دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔

پھر رمیا کی مجنونانہ حرکتیں اس قدر بڑھیں کہ اس کا باپ رئیس شبل کے پاس پہنچا اور انتہائی غضب ناک لہجے میں کہنے لگا۔

''سردار! تیری عزت کا خیال ہے۔ ورنہ میرے قبیلے کے لوگ اب تک بابک کے جسم کے ٹکڑے کر کے انہیں کتوں کے آگے ڈال چکے ہوتے۔''

''اس میں میرے غلام کا کیا قصور ہے؟'' رئیس شبل نے بڑے تحمل کے ساتھ رمیا کے باپ سے پوچھا۔

''قصور اس کے خوب صورت چہرے کا ہے۔'' رمیا کے باپ کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔''یا تو اس کے چہرے کو آگ میں جلا کر بگاڑ دے یا اسے رات کے اندھیرے میں برستاق سے بھگا دے..... اب تیسری کوئی صورت نہیں۔''

رئیس شبل نے برستاق کے لوگوں کو خونریزی سے بچانے کے لیے سیاست و مصلحت سے کام لیا۔ پھر اس نے بابک کو تنہائی میں طلب کرتے ہوئے کہا۔

''میں تیری خدمت گزاری سے بہت خوش ہوں۔ تُو نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ مگر حالات کی اس بے رحمی کا کیا کروں کہ تیرا یہ دلنشین چہرہ ہی تیرے لیے بلائے بے درماں بن گیا ہے...... میں نہیں چاہتا کہ لڑکی کے قبیلے والے تجھے کوئی گزند پہنچائیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تُو رات کے اندھیرے میں برستاق کی حدود چھوڑ کر کوئی نئی پناہ گاہ تلاش کر لے۔''

بابک چپ چاپ رئیس شبل کی گفتگو سنتا رہا۔''میں نے کبھی برستاق کی کسی دوشیزہ کو بری نظر سے نہیں دیکھا..... میں بے قصور ہوں، اس لیے موت سے بھی نہیں ڈرتا۔'' بابک کی آنکھوں میں غصے کی دبی دبی چنگاریاں ناچ رہی تھیں۔

''میں جانتا ہوں کہ سچا آدمی کسی سے نہیں ڈرتا۔'' رئیس شبل نے بابک کو انتہائی نرمی اور شفقت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔''مگر تُو میری خاطر چلا جا......موسم بدل جائے گا تو میں تجھے دوبارہ بلا لوں گا۔''

بابک کی دھواں دیتی ہوئی آنکھیں جھک گئیں۔ اس نے اپنے آقا کے حکم کو دل سے تسلیم کر لیا تھا۔

پھر رئیس شبل نے بابک کو ایک معقول رقم دے کر اپنے مسلح آدمیوں کی نگہبانی میں برستاق کی آخری سرحد تک پہنچا دیا۔ بابک وہاں سے تبریز چلا گیا۔

❀---❀---❀

محمد بن رواد، تبریز کا ایک مشہور رئیس تھا۔ بابک اس کے پاس دو سال تک رہا۔ پھر وہ اپنی ماں سے ملنے کے لیے دوبارہ اپنے گاؤں واپس آیا۔ اس وقت بابک کی عمر اٹھارہ سال تھی۔

ابھی بابک کو اپنے آبائی گاؤں بلال آباد آئے ہوئے چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک اجنبی شخص اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''مقدس کافیل بہت بیمار ہیں۔ شاید یہ ان کا آخری وقت ہے.....اس لیے وہ تجھے یاد کر رہے ہیں۔''

شمارا نے اجنبی شخص کی بات سنی تو بیٹے کو الگ لے جا کر بولی۔''بابک! کچھ بھی ہو جائے، تُو اُس شیطان کے پاس نہیں جائے گا۔''

''ماں! تجھے مقدس کافیل کے بارے میں شدید غلط فہمی ہو گئی ہے۔'' بابک نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بہت بڑا کاہن ہے..... اسی نے کہا تھا کہ عنقریب مجھے ملازمت مل جائے گی۔ پھر تُو نے دیکھا کہ میں سات سال تک بستاق اور تبریز میں رہا اور اپنے ساتھ کتنا پیسہ کما کر لایا..... یقیناً کوئی اہم بات ہو گی، جب ہی تو مقدس کافیل نے مجھے یاد کیا ہے۔''

شمارا ایک جاہل اور توہم پرست عورت تھی۔ بیٹے کی بات سن کر فریب میں آ گئی اور کافیل کے ہاتھوں اپنی بے آبروئی کے اذیت ناک واقعے کو فراموش کر بیٹھی۔

''ٹھیک ہے بیٹا!..... تُو چلا جا۔ مگر وہاں محتاط رہنا اور جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ مجھے آشرم کی رسموں سے بہت ڈر لگتا ہے..... میں جلد از جلد تیری شادی کر دینا چاہتی ہوں۔''

شادی کے نام پر بابک شرماتے ہوئے مسکرایا اور اجنبی شخص کے ساتھ کافیل سے ملنے چلا گیا۔

❀---❀---❀

واقعتاً کافیل بہت بیمار تھا۔ کثرتِ شراب نوشی نے اس کی صحت تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ جگر اور پھیپھڑے برباد ہو چکے تھے۔ وہ مسلسل خون تھوکتا رہتا تھا۔ جب بابک، کافیل کے پاس پہنچا تو اس کے ویران چہرے پر رونق لوٹ آئی۔ جیسے بجھتا ہوا چراغ آخری بار بھڑکا ہو۔

''تُو آ گیا میرے بیٹے!'' کافیل نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا جیسے کوئی خزاں رسیدہ پتا شاخ پر لرز رہا ہو۔ ''تیرے ہی انتظار میں میرا دم اٹکا ہوا تھا..... اب میں سکون سے مر سکوں گا۔''

بابک نے کافیل کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ وہ ہاتھ جو چند سال پہلے بہت زیادہ پُر گوشت تھا..... اب محض ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا، جیسے کسی مُردے کا ہاتھ......

''بابک! میں جا رہا ہوں۔'' کافیل کی آواز شمع کی لو کی طرح تھرتھرا رہی تھی۔ ''دیوتا جنت میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تُو آتش پرستوں کی آنکھ کا تارا ہے، میں تیری کامیابیوں کے لیے دعا کروں گا۔'' یہ کہتے کہتے کافیل کی سانس پھولنے لگی۔ ''مجھے آبِ حیات دو۔''

خدمت گاروں نے فوراً ہی شراب کا جام لبریز کیا اور کافیل کے منہ میں قطرہ قطرہ ٹپکانے لگے۔ یکا یک کافیل کا دم گھٹنے لگا اور آنکھیں اُبل پڑیں۔

''آگ...... مقدس...... ہے..... آگ...... لافانی.....'' یہ کہتے کہتے کافیل کی آواز ڈوب گئی۔

کافیل کی موت کے بعد اس کی جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ آگ کے دوسرے پجاریوں نے کافیل کے آخری الفاظ سن لیے تھے، اس لیے وہ بابک کی جان کے دشمن ہو گئے۔

❀---❀---❀

ایک رات بابک اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا کہ چند آتش پرست تلواریں لیے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ پھر ایک لحیم شحیم آگ کے پجاری نے بابک کے سینے پر برہنہ شمشیر رکھ دی اور ہلکا سا دباؤ بڑھا

دیا۔ یہ شخص کافیل کا نائب ہونے کا مدعی تھا۔

نوکِ شمشیر کی چبھن محسوس ہوتے ہی بابک کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے سر پر آٹھ دس لمبے تڑنگے آتش پرست اس طرح کھڑے تھے کہ جیسے فرشتگانِ اجل، روح قبض کرنے کے لیے آئے ہوں۔ بابک نے اُنہیں غور سے دیکھا۔ آگ کے پجاریوں کا خیال تھا کہ ان کی بے نیام شمشیریں دیکھ کر یہ اٹھارہ سالہ نوجوان گھبرا جائے گا اور اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگے گا۔ مگر بابک کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ اُس نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

''تم لوگ کیا چاہتے ہو؟''

''ہمیں تیرا سر چاہیئے۔'' کافیل کے نائب نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''مقدس آگ بھوکی ہے اور اسے تیرے جسم کی غذا درکار ہے۔''

بابک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''آخر میرا قصور کیا ہے؟'' اس کے لہجے میں وہی اطمینان تھا۔

''تُو مقدس کافیل کی جانشینی کے خواب دیکھ رہا ہے۔'' کافیل کے نائب نے دوبارہ بابک کے سینے پر تلوار رکھ دی۔

''نہ میں آتش پرست ہوں اور نہ مقدس کافیل کی نیابت کا دعوے دار۔'' بابک نے اونچی آواز میں کہا۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس کا ہلکا سا عکس تک نہ تھا۔

''پھر مقدس کافیل نے تجھے آتش پرستوں کی آنکھ کا تارا کیوں کہا؟'' نائب کے لہجے میں وہی قہر و نفرت کی آمیزش تھی۔

''میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' بابک موت کے منہ میں بھی انتہائی جرأت و بے باکی کے ساتھ بول رہا تھا۔ ''میری آنکھوں میں کوئی خواب نہیں۔''

''اگر تُو اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسی وقت یہ علاقہ چھوڑ دے۔'' کافیل کے نائب نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

''میں تو یہاں اس لیے ٹھہرا ہوا تھا کہ دکھ کی سنگین گھڑی میں تمہاری غم گساری کر سکوں..... مقدس کافیل مجھے اپنا بیٹا کہتے تھے...... تم اچھی طرح جانتے ہو کہ خود انہوں نے اپنے خادم کو گاؤں بھیج کر مجھے اپنی خدمت میں طلب کیا تھا۔'' بابک نے بے خوف و خطر کہا۔ ''اگر تم نہیں چاہتے تو میں اسی وقت چلا جاتا ہوں۔ دوبارہ اس طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھوں گا۔''

''اسی میں تیری سلامتی ہے۔'' کافیل کے نائب نے کہا اور اپنی شمشیر نیام میں کر لی۔

پھر تھوڑی دیر بعد رات کے اندھیرے میں آٹھ مسلح آتش پرست، بابک کو سرحد تک چھوڑنے کے لیے جا رہے تھے۔

❁---❁---❁

کافیل کی موت کی خبر سن کر شمارا کو ناقابلِ بیان خوشی کا احساس ہوا تھا۔ مگر اُس نے بیٹے کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا۔

بابک خوشی خوشی اپنی ماں کو بتا رہا تھا۔

''مقدس کافیل نے مرنے سے پہلے مجھے آتش پرستوں کی آنکھ کا تارا کہہ کر پکارا تھا، وہ جنت میں دیوتاؤں کے پاس جا کر میری کامیابیوں کے لیے دعا کریں گے۔''

''گزری باتوں کو بھول جاؤ بیٹا!'' شمارا نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم غریبوں کی تو بس یہی چھوٹی سی دنیا ہے...... اسی میں کولہو کے بیل کی طرح گھومتے رہنا ہے اور پھر ایک دن مر جانا ہے..... مجھے تو تیری شادی کی فکر ستا رہی ہے...... کسی طرح تیرا گھر آباد کر دوں تاکہ میری زندگی کے بقیہ دن سکون سے گزر سکیں۔''

شادی کے نام پر بابک شرما گیا۔

دن آہستہ آہستہ گزرتے گئے اور بابک دریا کے کنارے درختوں کے نیچے بیٹھ کر طنبورہ بجاتا رہا۔ رئیس شبل اور محمد بن رواد کی ملازمت نے بابک کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ اب وہ اپنے گاؤں میں چمار، لوہار یا مویشی چرانے کا پیشہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سات سال کے دوران جس قدر رقم کما کر لایا تھا، اسی کو تھوڑا تھوڑا کر کے خرچ کر رہا تھا...... اور کسی ایسے رئیس کے انتظار میں تھا جو اس کے گھر تک چل کر آئے اور اسے بہتر ملازمت کی پیشکش کرے۔ آخر اسی انتظار میں کئی ماہ گزر گئے۔

پھر ایک دن اس نے عجیب و غریب خواب دیکھا۔ ایک طویل و عریض میدان میں لاکھوں انسان جمع ہیں۔ بابک ایک اونچی مسند پر کھڑا ہے۔ قریب ہی ایک کرسئ زرنگار بچھی ہے۔ یکایک کسی طرف سے لمبی عبا پہنے ہوئے ایک باریش شخص نمودار ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص ہے جو سنہری طشت اُٹھائے ہوئے چل رہا ہے۔ دونوں اجنبی افراد بابک کے قریب آ کر ٹھہر جاتے ہیں۔ بابک غور سے سنہری طشت کو دیکھتا ہے جس پر ہیروں سے مرصع تاج رکھا ہوا ہے۔ باریش شخص تاج اُٹھاتا ہے اور بابک سے جھک جانے کے لیے کہتا ہے۔

اجنبی کی بات سن کر بابک خم ہو جاتا ہے۔

''یہ تاج آپ ہی کے لیے بنایا گیا ہے۔'' باریش شخص نیازمندانہ لہجے میں عرض کرتا ہے۔

بابک اپنی گردن خم کر دیتا ہے اور وہ تاج اس کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے...... پھر وہ باریش شخص انسانی ہجوم کی طرف ایک مخصوص اشارہ کرتا ہے۔ اچانک لاکھوں انسان سجدے میں چلے جاتے ہیں۔

اتنے میں بابک کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ گھبرا کر بستر پر بیٹھ جاتا ہے اور چاروں طرف وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس کی ماں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ بابک دوبارہ اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور اس نے رات کا باقی حصہ جاگ کر گزار دیا۔ بابک صبح کے انتظار میں تھا کہ اُس کی ماں سو کر اُٹھے اور اُسے

اپنا عجیب وغریب خواب سنائے۔

پھر جب شمارا بیدار ہوئی تو بابک نے شدید ہیجانی انداز میں اپنی ماں کو رات کا خواب سنا ڈالا۔

شمارا کچھ دیر تک حیران نظروں سے بیٹے کو دیکھتی رہی اور پھر زور سے کہنے لگی۔ ''سارے غریب ایسے ہی خواب دیکھتے ہیں۔'' شمارا کا لہجہ تلخ تھا۔ ''تجھے کافیل کی صحبتوں نے بگاڑ دیا ہے۔ وہ خود تو دنیا سے چلا گیا اور تجھے خواب دیکھنے کے لیے چھوڑ گیا..... میرے بیٹے! خوابوں کی دنیا سے نکل اور چار پیسے کمانے کی فکر کر۔''

''میں ان دیہاتی گنواروں کی خدمت تو نہیں کروں گا۔'' بابک حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ ''جو لوگ میرے ماں باپ کی تذلیل کرتے ہوں، میں ان کی ملازمت کس طرح کرسکتا ہوں؟..... اب مجھے یہ گاؤں چھوڑنا ہی پڑے گا۔''

''کہیں بھی چلا جا، مگر اس لعنت زدہ بستی سے نکل جا۔'' شمارا کا دلکش چہرہ اذیت وکرب کے دھویں سے بھر گیا تھا۔ ''جب تجھے روزگار مل جائے تو مجھے بھی اپنے پاس بلا لینا۔''

ابھی بابک تلاشِ معاش میں بلال آباد سے باہر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس نے اس کی زندگی کو یکسر بدل ڈالا۔

❀---❀---❀

آذر بائیجان کا پہاڑی سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقے کو دو رئیسوں نے آپس میں تقسیم کرلیا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام ابوعمران تھا اور دوسرے کا جاویدان.....

اسی سلسلۂ کوہسار میں کوہِ بذ کا علاقہ بہت زیادہ سرسبز وشاداب تھا اسی لیے ابوعمران اور جاویدان اس خطے کو اپنے قبضے میں لانا چاہتے تھے مگر ابھی تک دونوں میں سے کسی کو کامیابی حاصل نہیں ہوسکی تھی۔ گرمی کے موسم کا آغاز ہوتے ہی ابوعمران اور جاویدان میں جھڑپیں شروع ہو جاتیں۔ پھر جب موسم سرما کا آغاز ہوتا اور برف باری شروع ہو جاتی تو دونوں اپنی فوجیں لے کر اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جاتے۔ یہ خونریز جنگیں کئی سال سے جاری تھیں مگر ابھی تک کوہِ بذ کی قسمت کا فیصلہ نہیں ہوسکا تھا۔

ایک سال جاویدان دو ہزار بکریوں کا ریوڑ لے کر شہر زنجان کی طرف روانہ ہوا۔ بکریاں فروخت کرنے کے بعد جاویدان واپس لوٹا مگر جب وہ بلال آباد پہنچا تو شدید برف باری شروع ہوگئی۔ مجبوراً اُسے اپنا سفر ملتوی کرنا پڑا..... پھر وہ مقامی لوگوں سے پوچھنے لگا۔

''کوئی ایسا مکان بتاؤ جہاں میں چند روز آرام وسکون سے رہ سکوں۔''

ایک شخص جاویدان کو بابک کی ماں کے پاس لے گیا۔ جاویدان نے وہاں پندرہ روز تک قیام کیا۔ اس دوران بابک اور اس کی ماں نے اپنی خدمت گزاری سے سردار جاویدان کو خوش کردیا۔

پھر جب برف پگھل گئی اور راستے صاف ہو گئے تو جاویدان نے بابک کی ماں سے کہا۔ ''اگر تم اپنا بیٹا

میری ملازمت میں دے دو تو میں اس کے عوض پچاس درہم ماہانہ تنخواہ دوں گا..... اور یہ رقم ہر ماہ پابندی سے تمہارے پاس پہنچ جایا کرے گی۔"

شمارا کو اسی وقت کا انتظار تھا۔ اس نے فوراً ہامی بھر لی...... اور بابک نئی منزل کی تلاش میں جاویدان کے ہمراہ آذر بائیجان چلا گیا۔

❁---❁---❁

سردار جاویدان ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کی بیوی دانیہ جوان بھی تھی اور خوب صورت بھی...... اس نے پہلی بار بابک کو دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ ایک جوانِ رعنا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دلکش خدوخال، دراز قامت، سرخ وسفید رنگ...... دانیہ کی نظر مردانہ حُسن کے مجسمے پر پڑی تو وہ اس کے سحر میں کھو کر رہ گئی۔

پھر دانیہ کو اس وقت ہوش آیا جب اس کا شوہر اسے مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

"دانیہ! یہ ہے ہمارا نیا ملازم بابک۔ بہت محنتی اور بہت فرمانبردار......"

بابک نے اطاعت گزاری کے طور پر جھک کر دانیہ کو سلام کیا۔

دانیہ نے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور بابک کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے کہ یہ ہمارے دوسرے ملازموں پر سبقت لے جائے گا۔"

"یقیناً۔" بیوی کی خوشنودی کے لیے سردار جاویدان بھی مسکرا دیا۔

"میرے دونوں آقا مجھ سے خوش اور مطمئن ہو جائیں گے۔" بابک نے اطاعت گزاری کے اظہار کے لیے سینے پر دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ وہ برستاق کے رئیس شبل اور تبریز کے امیر محمد بن رواد کی صحبتوں میں رہ کر درباری کے انداز سیکھ گیا تھا۔

"اگر تُو ہم سے وفادار رہا تو ہم بھی تجھے نہال کر دیں گے۔" دانیہ نے بڑے عجیب انداز میں کہا اور مسکرا دی۔

کچھ دن بعد سردار جاویدان تجارتی دورے پر دوسرے شہر چلا گیا۔ شوہر کی غیر موجودگی میں دانیہ کی حُسن پرستی نے بڑے گُل کھلائے۔ وہ پہلے دن ہی بابک کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی..... مگر سردار جاویدان کی وجہ سے خاموش اور محتاط تھی۔ پھر بھی وہ بار بار بابک کو طلب کیا کرتی تھی۔ دیر تک اس سے گفتگو کرتی اور پسندیدہ نظروں سے ہنس ہنس کر دیکھتی۔ بابک اپنی مالکہ کے جذبات سے بے خبر دن رات خدمت میں مصروف رہتا۔ پھر جیسے ہی سردار جاویدان محل سے باہر نکلا، دانیہ نے نصف شب کے سناٹے میں بابک کو طلب کیا اور بڑے والہانہ انداز میں اظہارِ عشق کر ڈالا۔ دانیہ کے عشق نے وحشت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ آخر بابک اپنی مالکہ کے قدموں میں جھک گیا۔

❁---❁---❁

حسبِ سابق اس سال بھی ابوعمران اور جاویدان کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی۔ بدقسمتی سے سردار ابوعمران یہ جنگ ہار گیا اور اس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ میدان سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سردار جاویدان اپنے سخت جان حریف کی ساری املاک پر قابض ہو گیا۔ اب وہ آذر بائیجان کے سلسلۂ کوہسار کا رئیسِ اعظم تھا..... مگر سردار جاویدان کو یہ مسرت انگیز فتح راس نہیں آئی۔

ایک رات اس نے اپنی بیوی دانیہ کے ہاتھ سے جی بھر کے شراب پی اور ہیجانی انداز میں چیخنے لگا۔

''میں فاتح ہوں..... میرے پاس سیم و زر اور لعل و جواہر کے انبار ہیں..... اب میرا کوئی مقابل نہیں۔''

سردار جاویدان کچھ دیر تک اسی انداز میں نعرہ زنی کرتا رہا..... پھر یکایک اس کے سینے میں تیز درد اُٹھا۔ سردار جاویدان نے دونوں ہاتھوں سے اپنے دل کو پکڑ لیا اور ریشمی بستر سے اُتر کر قیمتی قالین پر بیٹھ گیا۔

دانیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ حیرت سے شوہر کی اضطراری کیفیت کو دیکھتی رہی۔ سردار جاویدان کے چہرے سے پسینہ پانی کی طرح ٹپک رہا تھا۔

اچانک کوہ بذ کا حکمران قالین پر تڑپنے لگا۔ اب دانیہ کو احساس ہوا کہ معاملہ بہت سنگین ہے۔

''سردار! تم کیا محسوس کر رہے ہو؟'' دانیہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''دانیہ! ایسا لگتا ہے جیسے میرے دل کو کسی آہنی پنجے نے جکڑ لیا ہے۔'' سردار جاویدان کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا سردار!'' دانیہ نے سرسری لہجے میں کہا۔ اسے پہلے ہی شوہر سے محبت نہیں تھی۔ پھر جب سے بابک اس کی دنیا میں داخل ہوا تھا، وہ سردار جاویدان کی طرف سے اور بھی بے پروا ہو گئی تھی۔

''فوراً کسی طبیب کو بلاؤ۔'' سردار جاویدان نے بمشکل کہا۔ ''میں دنیا سے جا رہا ہوں دانیہ! مجھے روک لو۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔''

دانیہ شوہر کو دکھانے کے لیے اپنی جگہ سے اُٹھی..... مگر سردار جاویدان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔

''میری ساری دولت لے لو اور مجھے چند سانسیں دے دو۔'' کوہِ بذ کا حاکم آخری بار پوری طاقت سے چیخا۔ پھر چند لمحوں تک بیش قیمت ایرانی قالین پر تڑپتا رہا یہاں تک کہ سفیرِ اجل نے اس کی روح قبض کر لی۔ سردار جاویدان کی موت اس حالت میں واقع ہوئی تھی کہ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور پورا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔

دانیہ بہت دیر تک شوہر کی لاش کو بغور دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر رنج و الم کے بجائے فکر کے آثار تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا پریشان دماغ خیالات کی مختلف ناہموار پگڈنڈیوں پر بھٹک رہا ہو۔ پھر یکایک اس کے ہونٹوں پر ایک نہایت پُراسرار اور معنی خیز مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اور وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

❁---❁---❁

اب وہ بابک کے سامنے کھڑی تھی......اور بابک انتہائی پریشانی کے عالم میں اس سے کہہ رہا تھا۔

''مالکہ! آدھی رات کے وقت آپ کا میرے کمرے میں آنا کسی طرح بھی مناسب نہیں......سردار محل میں موجود ہیں......اگر انہوں نے آپ کو یہاں دیکھ لیا تو میں اپنی زندگی سے محروم ہو جاؤں گا۔''

''جو خود زندگی سے محروم ہو چکا ہو، وہ کسی دوسرے کی جان کس طرح لے سکتا ہے؟'' یہ کہتے کہتے دانیہ کے ہونٹوں پر بڑی سفاکانہ مسکراہٹ اُبھر آئی۔

''کیا سردار......؟'' حیرت کی زیادتی سے بابک کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

''ہاں! سردار جاویدان اب اس دنیا میں نہیں رہے۔'' دانیہ کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔''اب تم کوہِ بذ کے حاکم ہوں۔''

''میں ......سردار جاویدان کا ادنیٰ خادم.....؟'' فرطِ حیرت سے بابک کی آنکھوں کے حلقے پھیل گئے۔

''مالکہ! آپ ہوش میں تو ہیں؟ میرے خیال میں اس صدمے نے آپ کے ذہن کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔''

''ہاں! میں اپنے پورے ہوش و حواس میں ہوں۔'' شوہر کی لاش کمرے میں پڑی ہوئی تھی اور دانیہ کے ہونٹوں پر ایک عجیب مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''ایک حقیر خدمت گار اور کوہِ بذ کا حاکم.....؟'' بابک کے لیے دانیہ کی گفتگو ناقابلِ فہم تھی۔''مالکہ! میری اس حیثیت کو کون تسلیم کرے گا؟''

''جسے میں تسلیم کروں گی، اسے دنیا تسلیم کرے گی۔'' یکایک دانیہ کا انداز بدل گیا تھا اور اب اس کی شوخ آنکھوں میں نخوت و غرور کی گہری پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔''جو میرے دل پر حکومت کرے گا، وہی اس سلسلۂ کوہسار کا حکمراں ہوگا......اور وہ تم ہو......تمہارے سوا کوئی نہیں...... جاویدان مر چکا ہے۔اب میں دوسری شادی کے لیے آزاد ہوں۔''

''کیا ایک خادم بھی کسی ملکہ کا شوہر بن سکتا ہے؟'' بابک پر ایک بار پھر حیرت کا دورہ سا پڑ گیا تھا۔

''اگر ملکہ چاہے۔'' دانیہ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔''کسی بات سے خوف زدہ مت ہونا۔بس میری ہر بات کی تصدیق کرتے رہنا۔'' یہ کہتے ہوئے دانیہ، بابک کے کمرے سے نکل کر چلی گئی۔

پھر تھوڑی دیر میں محل کا گوشہ گوشہ ماتم سے گونج اٹھا اور تمام خدمت گار، سردار جاویدان کی لاش کی طرف دوڑ پڑے۔

❁---❁---❁

دوسرے دن صبح طویل و عریض میدان میں کوہِ بذ کی تمام رعایا اور فوج جمع تھی۔حاضرین حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کر رہے تھے کہ ملکہ دانیہ نے اُنہیں اچانک اس طرح کیوں طلب کیا ہے؟

یکایک میدان میں ایک گاڑی نمودار ہوئی، جسے سات اعلیٰ نسل کے گھوڑے کھینچ رہے تھے۔لوگوں نے

اپنی ملکہ کی گاڑی کو آگے جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ اس اونچی کرسی کے قریب جا کر رُک گئی جسے قیمتی پتھروں سے تراشا گیا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں بیٹھ کر سردار جاویدان اپنی قوم سے خطاب کیا کرتا تھا۔

دانیہ گاڑی سے نیچے اُتری تو میدان میں جمع تمام لوگ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ملکۂ کوہسار سیاہ ماتمی لباس پہنے ہوئے تھی۔

دانیہ نے ہزاروں کے مجمع پر نظر ڈالی اور بلند آواز میں کہا۔

''مقدس آگ کے پجاریو! آج میں تمہارے پاس بڑی اندوہناک خبر لے کر آئی ہوں۔'' یہ کہہ کر دانیہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔

ہجوم پہلے ہی مضطرب تھا، دانیہ کی بات سن کر سینکڑوں لوگ بے اختیار پکار اُٹھے۔

''سردار جاویدان کی خیر!......ملکۂ کوہسار کا اقبال بلند!......آخر وہ ایسی کون سی خبر ہے؟''

''تمہارے عظیم سردار جاویدان اب اس دنیا میں نہیں رہے۔'' دانیہ نے سوگوار انداز میں کہا۔ یکایک اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ اور وہ مکار عورت زار و قطار رو رہی تھی۔

جاویدان کی موت کی خبر سن کر سرسبز و شاداب میدان پر قبرستان کا سا سناٹا چھا گیا۔ پھر بہت سے لوگ چیخ چیخ کر رونے لگے۔ ماتمی آوازوں کا شور بلند ہوتا ہی جا رہا تھا کہ دانیہ نے سوگوار مجمع کو مخاطب کر کے کہا۔

''آج کے دن مجھ سے زیادہ غم زدہ اس دنیا میں دوسرا کون ہوگا؟ مگر میں اس لیے صبر کر رہی ہوں کہ سردار جاویدان کی روح کو سکون ملے گا۔ مجھ سے شوہر کی جدائی برداشت نہیں ہوتی، جی تو چاہتا ہے کہ ان پہاڑوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اسی وقت مر جاؤں......لیکن میرے کمزور کاندھوں پر سردار جاویدان کی امانت کا بھاری بوجھ ہے۔ بس یہ بارِ گراں اُتر جائے، پھر میں ایک دن بھی زندہ رہنا نہیں چاہتی...... ہائے میرا عظیم شوہر......کیسی بے رحمی کے ساتھ مجھے تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔'' یہ کہتے کہتے دانیہ نے سینہ کوبی شروع کر دی۔

ملکۂ کوہسار کی یہ مجنونانہ حالت دیکھ کر فوج کا سپہ سالار شامی آگے بڑھا اور اس نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا۔

''اگر آپ نے اپنے جذبات پر قابو نہیں پایا تو ریاست کا انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ رعایا کو جلد باخبر کیجئے کہ سردار جاویدان نے رخصت ہونے سے پہلے آپ پر کون سی امانت کا بوجھ ڈالا ہے؟''

سپہ سالار شامی کی بات سن کر دانیہ سنبھل گئی۔ اور پھر اس نے بڑے عیارانہ انداز میں میں ایک عجیب و غریب فرضی داستان سنا ڈالی۔

''کوہِ بذ کے عظیم باشندو! میری بات بہت غور سے سنو۔'' دانیہ بلند آواز میں مجمع سے مخاطب ہوئی۔

''جن لوگوں تک میری آواز پہنچ رہی ہے، وہ اپنے کان کھلے رکھیں۔ جب میں خاموش ہو جاؤں تو میری گفتگو پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں تک منتقل کر دیں۔''

سسکیاں لیتا ہوا مجمع خاموش ہو گیا..... اور کوہِ بذ کے باشندے گوش بر آواز ہو گئے۔

دانیہ نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا۔ بظاہر وہ ہزاروں انسانوں کے ہجوم سے مخاطب تھی لیکن دراصل اُس کا رُوئے سخن سپہ سالار شامی کی طرف تھا۔

''کل نصف شب کے قریب سردار جاویدان نے مجھے اپنی خلوت میں طلب کر کے کہا..... ''میری محبوب ملکہ! میرا دل تو نہیں چاہتا کہ میں اپنے پیارے عوام کو غم زدہ چھوڑ کر جنت میں چلا جاؤں..... مگر دیوتاؤں کا یہی حکم ہے۔''

میں اپنے شوہر کی بات سن کر رونے لگی..... سردار جاویدان نے مجھے سمجھایا..... ''دیوتا اپنے کام میں مداخلت پسند نہیں کرتے۔ جسے طلب کیا جاتا ہے، اسے جانا ہی پڑتا ہے۔''

میں نے بے قرار ہو کر سردار جاویدان کے پاؤں پکڑ لیے اور رو رو کر عرض کرنے لگی۔ ''بے شک! آپ کی جدائی کا یہ صدمہ مجھے ہمیشہ تڑپاتا رہے گا..... مگر میری خاطر اتنا تو کیجئے کہ کوہِ بذ کے عوام کے درمیان اس زمین پر اپنی کوئی نشانی تو چھوڑ جائیے کہ ہم بے قرار لوگ اسے دیکھ کر جیتے رہیں۔''

سردار جاویدان میری التماس سن کر کچھ دیر تک سوچتے رہے..... پھر مجھے تسلی دیتے ہوئے بولے۔ ''میں تمہاری اور اپنی رعایا کی خاطر اس درخواست کو قبول کیے لیتا ہوں اور زمین پر اپنی وہ نشانی چھوڑے جاتا ہوں، جسے دیکھ کر تمہاری بجھی ہوئی آنکھیں روشن ہو جائیں گی... اور بے قرار دل سکون پا جائیں گے۔''

سردار جاویدان کی بات سن کر میرا ڈوبتا ہوا دل ٹھہر گیا۔

پھر انہوں نے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''میری روح میرے جسم سے نکلتے ہی بابک کے بدن میں داخل ہو جائے گی۔''

میں سردار جاویدان کی بات سن کر حیران رہ گئی۔ ''ایک سردار کی روح ایک غلام کے جسم میں.....؟''

''تمہیں آسمانوں کے اسرار سمجھانے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' سردار جاویدان نے کسی قدر ناگوار لہجے میں کہا۔ ''بس یوں سمجھ لو کہ دیوتاؤں کی یہی مرضی ہے..... بابک بظاہر میرا ملازم ہے مگر اس نے میری ایسی خدمت کی ہے کہ دنیا کا کوئی دوسرا شخص یہ فریضہ انجام نہیں دے سکتا..... اس لیے میری روح صرف اسی کے بدن میں قرار پا سکتی ہے۔''

میں اس تنبیہہ کے بعد خاموش ہو گئی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں سردار جاویدان سے حجت کر سکتی۔

''میری روح بابک کے بدن میں داخل ہو کر اس کی روح سے متحد ہو جائے گی۔'' سردار جاویدان آسمانی فیصلے کا انکشاف کر رہے تھے۔ ''میرے بعد بابک ہی میری قوم کا سردار ہو گا..... وہ دشمنوں کو تباہ و برباد کر کے مجوسیوں (آتش پرستوں کو نئی زندگی کے ساتھ نیا عروج بخشے گا.... پھر وہ میری قوم کے ان لوگوں کو عزت و اقتدار کے آسمان پر بٹھائے گا جو گردشِ زمانہ کے سبب غارِ مذلت میں دھکیل دیئے گئے ہیں۔''

سردار جاویدان کی وصیت سن کر کوہ بذ کے عوام تو خاموش ہو گئے۔ مگر سپہ سالار شامی اور دوسرے فوجی سرداروں کے چہروں پر بے چینی کے آثار نظر آنے لگے۔ آخر شامی نے ملکۂ کوہسار سے پوچھا۔

''اتنی اہم وصیت کرتے وقت سردار جاویدان نے ہمیں کیوں طلب نہیں کیا؟''

ملکہ دانیہ کے عیار ذہن نے ایک ہی لمحے میں دوسری دلیل تراش لی۔

''سردار جاویدان کو خوف تھا کہ کہیں فوجی سرداروں کا اختلاف کوئی نیا مسئلہ نہ پیدا کر دے...... اور ہمارے علاقوں کو عربوں کی جارحیت کا سامنا نہ کرنا پڑے...... اس لیے سردار جاویدان نے محتاط روش اختیار کی اور سیاسی تدبر سے کام لیتے ہوئے کہا کہ جب میں دنیا سے چلا جاؤں تو میری قوم کو اس وصیت سے باخبر کر دینا کہ دیوتا اسی وقت خوش ہو سکتے ہیں، جب کوہِ بذ کے عوام بابک کو اپنا پیشوا تسلیم کر لیں۔''

قبل از وقت وصیت نہ کرنے کی توجیہہ سن کر سپہ سالار شامی اور دوسرے فوجی سردار سوچ میں پڑ گئے۔ عیار دانیہ نے فوجی سرداروں کی اس کشمکش سے فائدہ اٹھایا اور ان کے ذہنوں پر نفسیاتی ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

''اب میں دیکھتی ہوں کہ تم اپنے سردار کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اپنے نام فرمانبرداروں کی فہرست میں شامل کرتے ہو یا اس کے حکم سے رُوگردانی کر کے باغیوں کی صف میں شامل ہوتے ہو؟''

سپہ سالار شامی اور دوسرے فوجی سردار، ملکۂ کوہسار کی بات سن کر گھبرا گئے۔ دانیہ نے بڑا خوفناک حربہ استعمال کیا تھا۔

''ملکۂ کوہسار ہماری اطاعت و جاں نثاری کی ادا سے خوب واقف ہیں۔'' سپہ سالار شامی نے دانیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ نے کبھی ہماری آنکھوں میں سرکشی کی کوئی لہر دیکھی ہے؟''

''کبھی نہیں۔'' دانیہ نے ستائشی لہجے میں کہا۔ وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ فوجی سرداروں کے جذبات سے کھیل رہی تھی۔

''تو پھر آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گی کہ ہم اپنے سردار کے آخری حکم پر کس طرح عمل کرتے ہیں۔'' سپہ سالار شامی اور دوسرے فوجی سرداروں نے بیک زبان کہا۔ ان کے لہجوں سے نیا عزم جھلک رہا تھا۔

❀---❀---❀

آذربائیجان کے سلسلۂ کوہسار پر چالیس دن تک رنج والم کے بادل چھائے رہے۔ کوہِ بذ کے سادہ لوح عوام اپنے سردار جاویدان کا سوگ مناتے رہے..... اور ملکہ دانیہ اپنے محبوب بابک کے ساتھ کیف و نشاط کی خفیہ محفلیں آراستہ کرتی رہی۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم مجھے فرش سے اُٹھا کر عرش پر بٹھا دو گی۔'' بابک نے دانیہ کے ہاتھ سے شراب کا لبریز جام لیتے ہوئے کہا۔

دانیہ نے ملازمت کے دوران بابک کو شراب کی لذت سے آشنا کرا دیا تھا۔ سردار جاویدان اور دانیہ دونوں شراب کے عادی تھے۔ پھر جب جاویدان مر گیا تو بابک، دانیہ کے اشارے پر کھل کر شراب پینے لگا۔ اب وہ اسی نشے کی حالت میں مخمور آنکھوں سے دانیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں جسے چاہوں پستیوں میں اُتار دوں اور جسے چاہوں آسمان کی بلندیوں سے ہم کنار کر دوں۔''

دانیہ بھی شراب کے نشے میں بول رہی تھی.....اور بابک واقعتاً آسمانوں پر اُڑ رہا تھا۔ کہاں بلال آباد کا ایک گنوار دیہاتی.....اور کہاں سلسلۂ کوہسار کا حاکم......!

پھر جب سردار جاویدان کا سوگ ختم ہو گیا تو دانیہ نے ایک خاص تقریب کا اہتمام کیا جس میں سپہ سالار شامی اور دوسرے فوجی سالاروں کے ساتھ تمام معززینِ شہر بھی شامل تھے۔

دانیہ نے شرکائے تقریب پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اب میں سردار جاویدان کی وصیت کا آخری حصہ بیان کرتی ہوں۔''

تمام حاضرینِ مجلس اپنی اپنی نشستوں پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ان کی نظریں دانیہ کے چہرے پر مرکوز تھی جو زیادہ شراب پینے کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔

''سردار جاویدان نے دیوتاؤں کے پاس جانے سے پہلے کہا تھا کہ میری روح بابک کی روح میں مکمل طور پر پیوست ہو گئی ہے۔ جو مجھے زندہ حالت میں دیکھنے کا خواہش مند ہو، اُسے چاہئے کہ وہ بابک کا دیدار کرے۔'' یہ کہہ کر دانیہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی اور اس نے حاضرینِ مجلس کا ردِعمل جاننے کے لیے ان کے چہروں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

حاضرینِ مجلس کے چہرے پُرسکون تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انہوں نے اپنے آنجہانی سردار کی نصیحت کو دل سے تسلیم کر لیا ہو۔

فضا کو اپنے حق میں سازگار پا کر دانیہ نے معززینِ شہر کے ذہنوں پر ایک اور ضرب لگائی۔

''یاد رکھو! سردار جاویدان نے یہ بھی کہا تھا کہ جو شخص اس وصیت سے گریز اختیار کرے گا، وہ ہمارے مذہب سے خارج ہو جائے گا۔''

سردار جاویدان اور کوہِ بذ کے عوام بنیادی طور پر آتش پرست تھے اور اس کے ساتھ ہی عقیدۂ تناسخ (آواگون) کے بھی قائل تھے۔

دانیہ کی بات سن کر تقریب کے حاضرین نے باآواز بلند کہا۔ ''ہمیں سردار جاویدان کی وصیت کے ساتھ اپنا مذہب بھی بہت عزیز ہے۔''

کوہِ بذ کے توہم پرست عوام بڑی آسانی سے ایک عورت کے بچھائے ہوئے دام میں آ گئے۔ اپنے پُر پیچ اور مشکل منصوبے کے تکمیل پاتے ہی دانیہ نے تقریب گاہ کے صدر دروازے پر کھڑے ہو کر مسلح محافظ کو اشارہ کیا۔

محافظ فوراً ہی دروازے سے ہٹ کر کسی طرف چلا گیا۔ پھر جب وہ واپس آیا تو بابک اس کے ہمراہ تھا۔ حاضرینِ مجلس، عبداللہ تیلی کے بیٹے کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ وہ اسی انداز کا لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھا جو سردار جاویدان پہنا کرتا تھا۔ بابک آہستہ آہستہ چلتا ہوا دانیہ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ دانیہ نے اپنے ہاتھوں سے سردار جاویدان کا تاج بابک کے سر پر رکھ دیا۔ ایسا کرتے وقت دانیہ کے چہرے سے سرشاری کی عجیب کیفیت نمایاں تھی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک بدکردار عورت پوری قوم کو بے وقوف بنا کر اتنی آسانی کے ساتھ اپنے خوابِ ہوس کی تعبیر حاصل کر لے گی۔

رسمِ تاج پوشی کے بعد دانیہ نے ایک قد آور اور موٹے تازے بیل کو ذبح کر کے اس کی کھال بچھانے کا حکم دیا۔

پھر جب تقریب گاہ کے فرش پر بیل کی کھال بچھ گئی تو اس پر سونے کا بہت بڑا طشت رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد سنہری طشت میں کنارے تک شراب بھر دی گئی۔ پھر روٹیاں منگوا کر ٹکڑے کیے گئے اور انہیں کھال پر رکھ دیا گیا۔ حاضرینِ مجلس بڑی حیرت سے ملکۂ کوہسار کا یہ عمل دیکھ رہے تھے۔

اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق سارے انتظامات مکمل ہوتے ہی دانیہ نے فوجی سرداروں اور دوسرے معززینِ شہر کو حکم دیا۔

''تم میں سے ایک ایک شخص آئے، روٹی کا ٹکڑا اٹھا کر شراب میں ڈبوئے، پھر اسے کھانے کے بعد باآواز بلند کہے...... ''اے بابک کی روح! میں تجھ پر اسی طرح ایمان لاتا ہوں، جس طرح اس سے پہلے جاویدان کی روح پر ایمان لایا تھا۔'' اس کے بعد بابک کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے اور بیعت کرے۔''

دانیہ کے حکم کے مطابق تمام معززینِ شہر نے بابک کے ہاتھوں پر بیعت کی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بلال آباد کا رہنے والا بیس سالہ نوجوان آتش پرستوں کا دیوتا بن گیا۔

پھر دانیہ نے حاضرینِ مجلس کو اس خوشی میں انتہائی پُرتکلف اور لذیذ کھانے کھلائے۔ دعوت کے بعد شراب کا دور چلا۔ دانیہ نے خود بھی شراب پی اور اپنے ہاتھوں سے بابک کو بھی پلائی۔ جب تقریب گاہ کے تمام شرکاء بدمست ہو گئے تو دانیہ محفل سے اُٹھ کر چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں واپس آئی تو دُلہن کے خوبصورت جوڑے میں ملبوس تھی۔ حاضرینِ مجلس ابھی اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ دانیہ نے ان کی حیرت کو دور کرتے ہوئے کہا۔

''جب بابک کے بدن میں جاویدان کی روح موجود ہے تو یہی میرا شوہر ہے۔ میں اس مقدس تقریب میں اپنی شادی کا اعلان کرتی ہوں۔''

یہ کہہ کر دانیہ نے پھولوں کا ایک گلدستہ منگوایا اور آگے بڑھ کر بابک کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بابک نے پھولوں کے گلدستے کو قبول کر لیا۔ آتش پرستوں میں نکاح کا یہی طریقہ ہے۔

شراب کے نشے میں بدمست حاضرینِ مجلس خوشی سے ناچنے لگے اور پوری محفل مبارکبادوں سے گونج اُٹھی۔

❀---❀---❀

کوہِ بذ کا حاکم بن جانے کے بعد بابک نے شمارا کو اپنے پاس بلا لیا۔ غریب ماں بیٹے کا یہ عروج دیکھ کر خوش بھی تھی اور حیران بھی...... اس کے ذہن کے بعید ترین گوشے میں بھی بیٹے کی کامیابی کا یہ تصور موجود نہیں تھا۔ ب شمارا کو کافیل کی روحانی طاقت کا یقین آ گیا تھا۔ اس لیے وہ اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر خود بھی آتش پرست بن گئی۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ اب بابک کی کیفیت اُس درندے کی سی تھی جس کے منہ کو انسانی خون لگ جائے اور پھر وہ آدم خور بن جائے۔ پہلے وہ اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر آتش پرستوں میں شامل ہوا، پھر کوہِ بذ کا حاکم بننے کے بعد اس نے ایک نئے مذہبی فرقے کی بنیاد ڈال دی جسے ''بابکیہ'' کہتے ہیں۔ بابک زندگی میں صرف عیش ونشاط کا قائل تھا، اس لیے لوگ اسے بابک خرمی کہہ کر پکارنے لگے۔

دانیہ، بابک کے لیے بلائے جان بن کر رہ گئی تھی۔ آخر بابک نے اُسے زہر دے کر ایک بوڑھی عورت سے پیچھا چھڑا لیا۔ جب تک دانیہ زندہ تھی، بابک علی الاعلان کہتا تھا کہ اس کے بدن میں جاویدان کی روح سما گئی ہے۔ پھر دانیہ کو قتل کرنے کے بعد اس نے نیا نعرہ لگایا۔

''میرے اندر خدا حلول کر گیا ہے، اس لیے تم پر لازم ہے کہ میرآ گے سر جھکا دو۔''

بابک نے اپنے مذہبی فرقے کی بنیاد مکمل آزادی اور بے راہ روی پر رکھی تھی۔ ہر شخص ہر عورت سے شادی کر سکتا تھا۔ خود بابک کا یہ حال تھا کہ جس خوب صورت عورت کا نام سنتا، اس کے لیے شادی کا پیغام بھیج دیتا۔ اگر لڑکی کے ماں باپ انکار کر دیتے تو وہ اُسے بزورِ شمشیر حاصل کر لیتا۔ اس طرح سینکڑوں حسین عورتیں بابک کے عشرت کدے کی زینت تھیں۔

❀---❀---❀

عیش پرست لوگ بہت تیزی سے اس شیطانی فرقے میں داخل ہو رہے تھے۔ پھر جب بابک کے ماننے والوں کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ گئی تو اُس نے خلافتِ عباسیہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اس وقت خلیفہ مامون رشید برسرِ اقتدار تھا۔

204ھ میں خلیفہ مامون رشید نے آرمینیا اور آذر بائیجان کے حاکم عیسیٰ بن محمد کو حکم دیا کہ وہ بابک کے پیروکاروں کا مکمل خاتمہ کر دے اور اس شیطان کا سر کاٹ کر دربارِ خلافت میں بھیج دے۔ مگر عیسیٰ بن محمد اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس مہم کو سرانجام نہ دے سکا۔ آخر 209ھ میں خلیفہ مامون رشید نے اسے اس کے عہدے سے ہٹا کر علی بن صدقہ کو آرمینیا اور آذر بائیجان کا عامل مقرر کر دیا۔ علی بن صدقہ عام طور پر زریق کے نام سے مشہور تھا۔

زریق نے اپنے ایک تجربہ کار سپہ سالار احمد بن جنید کو اس جنگی مہم پر روانہ کر دیا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ ہر حال میں بابک کو پابہ زنجیر دیکھنا چاہتا ہے۔

سالار احمد بن جنید بڑی مردانگی سے لڑا مگر بدقسمتی اس کے سر پر سایہ فگن تھی۔ نتیجتاً احمد بن جنید نے شکست کھائی اور اُسے حالتِ اسیری میں بابک کے سامنے پیش کیا گیا۔ بابک نے سیاسی حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے اسلامی لشکر پر رعب ڈالنے کے لیے احمد بن جنید کو قتل کرا دیا۔ یہ خبر سن کر خلیفہ مامون رشید سخت برہم ہوا۔ اس نے نا اہلی کی بنیاد پر زریق کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ ابراہیم بن لیث کو آرمینیا اور آذر بائیجان کی عمل داری سونپ دی۔

زریق ایک خود غرض انسان تھا۔ اُس نے باغیانہ روش اختیار کی اور آگے بڑھ کر موصل اور آذر بائیجان کے تمام پہاڑی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ کچھ دن بعد زریق نے شہر موصل پر بھی یلغار کر دی۔ اس معرکہ آرائی میں موصل کا حاکم سید بن انس مارا گیا اور زریق نے اس اہم شہر پر بھی قبضہ کر لیا۔

اب خلیفہ مامون رشید کے دو دشمن تھے۔ ایک شیطان بابک خرمی اور دوسرا مسلمان زریق...... مامون رشید نے ایک نہایت ذہین اور وفادار شخص محمد بن حمید طوسی کو بابک خرمی اور زریق کی سرکوبی پر مامور کیا۔ یہ 212ھ کا واقعہ ہے۔ محمد بن حمید طوسی نے پہلے زریق کو شکست دے کر موصل واپس لیا اور پھر پوری طاقت کے ساتھ بابک خرمی پر حملہ آور ہوا۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ بابک اس کی تاب نہ لا سکا اور میدان سے بھاگ کھڑا ہوا۔ محمد بن حمید طوسی، بابک کا تعاقب کرتے ہوئے دامنِ کوہ تک جا پہنچا۔

بابک نے اس موقع پر جنگی حکمتِ عملی سے کام لیا۔ کچھ دیر تک وہ دامنِ کوہ میں لڑتا رہا، پھر فرار ہونے کے انداز میں اپنے لشکر کے ساتھ پہاڑ پر چڑھ گیا۔ محمد بن حمید طوسی نے پہاڑ کی بلندی پر بھی بابک خرمی کا تعاقب جاری رکھا۔ مسلم سپہ سالار راستے کے پیچ وخم سے ناواقف تھا، اس لیے جوشِ جہاد میں کئی میل تک آگے بڑھتا چلا گیا۔ یکایک پہاڑی کمین گاہوں سے بابک کے محفوظ فوجی دستے باہر نکل آئے اور مسلمانوں کے لشکر کو گھیر لیا۔ بابک خرمی بھی بھاگتے بھاگتے اچانک واپس پلٹا اور محمد بن طوسی کی فوج پر ٹوٹ پڑا۔ اس ناگہانی دہرے حملے سے مسلمان سپاہیوں میں انتشار پھیل گیا اور وہ میدانی علاقے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر محمد بن حمید طوسی کے پائے استقامت میں کوئی لرزش نہیں آئی۔ وہ سینکڑوں دشمنوں کے نرغے میں اکیلا لڑتا رہا، یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔

خلیفہ مامون رشید کو محمد بن حمید طوسی کی موت کا بہت قلق تھا۔ وہ بابک خرمی سے اپنے جانباز سپہ سالار کی شہادت کا انتقام لینا چاہتا تھا مگر اتفاق سے مامون رشید خلافت کے امور میں کچھ ایسا اُلجھا کہ چھ سال تک بابک کے خاتمے کے لیے دوسری جنگی مہم روانہ نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ عباسی خلیفہ 218ھ میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

❀---❀---❀

مامون رشید کے بعد اُس کا بھائی معتصم خلافت کے منصب پر فائز ہوا۔ خلیفہ معتصم نے اپنے ایک نہایت زیرک اور جانباز سپہ سالار افشین حیدر کو اس جنگی مہم پر مامور کیا۔

افشین حیدر مختلف مقامات پر شدید برفانی موسم میں مسلسل پانچ سال تک بابک خرمی سے جنگ کرتا رہا۔ کبھی اس نے اپنے لشکر کو پیچھے ہٹنے کا حکم بھی دیا اور کبھی مقبوضہ علاقے خالی بھی کر دیئے۔ مگر بابک خرمی کو ایک دن کے لیے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ آخر اس طوفانی جنگ نے اس شیطان کی کمر توڑ دی۔ تمام فوجی قوت منتشر ہوگئی اور بابک خرمی کی سب سے محفوظ پناہ گاہ قلعہ بذ پر مسلمانوں نے قبضہ کرلیا۔

بابک خرمی پہلے ہی اپنے اہل و عیال کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کر چکا تھا۔ آخر ایک دن خود بھی رات کے اندھیرے میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ آرمینیا کے پہاڑوں میں جا چھپا۔ اس روپوشی نے یہاں تک طول پکڑا کہ بابک خرمی کا غذائی ذخیرہ ختم ہوگیا۔ بھوک سے مجبور ہو کر ایک دن اس نے اپنے ایک ساتھی کو بازار سے کھانے کا سامان لانے بھیجا۔ افشین حیدر کے جاسوس قدم قدم پر متعین تھے۔ ایک جاسوس کو بابک خرمی کے ساتھی پر کچھ شک ہوا۔ اس نے فوراً ہی فوجی افسر ابنِ ساباط تک یہ اطلاع پہنچا دی۔ ابنِ ساباط بڑی ہوشیاری سے بابک خرمی کی پناہ گاہ تک پہنچا اور اس شیطان کو گرفتار کر لیا جس کی شرانگیزیوں کی وجہ ہزاروں مسلمان شہید ہو چکے تھے اور لاکھوں بندگانِ خدا گمراہی کے بدترین راستے پر چل پڑے تھے۔

پھر جب ابنِ ساباط نے زنجیروں میں جکڑے ہوئے بابک خرمی کو سپہ سالار افشین حیدر کے سامنے پیش کیا تو وہ فرطِ مسرت سے وارفتہ ہوگیا اور اس نے پوری طاقت سے نعرۂ تکبیر بلند کیا پھر جوشِ جذبات میں آگے بڑھ کر ابنِ ساباط کی پیشانی چوم لی۔ بابک خرمی کی گرفتاری پر افشین حیدر اس قدر خوش تھا کہ اس نے ابنِ ساباط کو ایک لاکھ درہم بطور انعام مرحمت کیے۔

پھر جب یہ خبر خلیفہ معتصم باللہ تک پہنچی تو وہ فرطِ مسرت سے مضطرب ہو کر تخت پر کھڑا ہو گیا اور اس نے حاضرینِ دربار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''باطل کتنا بھی فروغ پا جائے، مگر اس کا انجام ذلّت و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

پھر خلیفہ معتصم نے افشین حیدر کے نام حکم بھیجا کہ وہ اپنے قیدی کو لے کر سامرہ پہنچے۔

سالار افشین حیدر، بابک خرمی کو لے کر سامرہ کی طرف روانہ ہوا۔ خلیفہ کے حکم سے ہر منزل پر بڑے والہانہ انداز میں اس کا استقبال کیا جاتا تھا۔ پھر جب افشین سامرہ کے قریب پہنچا تو خلیفہ معتصم کا بیٹا واثق باللہ اس کا استقبال کرنے کے لیے معزز اراکینِ سلطنت کے ساتھ شہر سے باہر آیا اور نہایت عزت و توقیر کے ساتھ اپنے جانباز سالار کو قصرِ مطیرہ میں ٹھہرایا، پھر خلیفہ معتصم کے حکم سے افشین کے سر پر تاج رکھا گیا۔ بیش قیمت خلعت پہنائی گئی اور بیس لاکھ درہم انعام دیئے گئے۔

انہی دنوں جب بابک خرمی، قصرِ مطیرہ میں قید تھا، خلیفہ معتصم وہاں آیا اور کچھ دیر تک زنجیروں میں

جکڑے ہوئے اس شخص کو دیکھتا رہا، جو رُوئے زمین پر سب سے زیادہ لعنت زدہ شخص تھا۔ پھر انتہائی تحقیر آمیز انداز میں مسکرایا اور واپس چلا گیا۔

دوسرے دن خلیفہ کے حکم کے مطابق بابک خرمی کو دربارِ عام میں پیش کرنے کے لیے ہاتھی پر سوار کرایا گیا۔ سامرہ کے ہزاروں شہری شاہراہِ خاص پر جمع تھے اور مختلف انداز میں اپنی نفرتوں کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک شخص نے شدید حالتِ غضب میں بابک خرمی کی طرف منہ کر کے تھوکا اور بلند آواز میں پکار کر کہا۔

''چشمِ فلک نے شاید ہی تجھ جیسا بدکردار انسان دیکھا ہو۔ اب تُو اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جا۔''

بابک خرمی نے مسکراتے ہوئے اس شخص کی طرف دیکھا اور اونچی آواز میں جواب دیا۔ ''عنقریب تم لوگ اپنی آنکھوں سے میرے استقلال اور ہمت کا مشاہدہ کرو گے۔''

پھر جب خلیفہ معتصم باللہ کے حکم پر بابک خرمی کا ہاتھ کاٹا گیا تو اس نے فوراً ہی خون آلود ہاتھ اپنے چہرے پر مل لیا اور اس وقت تک ملتا رہا جب تک پورا چہرہ سرخ نہیں ہو گیا۔

حاضرینِ دربار نے بڑی حیرت سے بابک خرمی کے اس عمل کو دیکھا۔ وہ نہایت اطمینان اور استقامت کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔

ایک درباری نے انتہائی نفرت آمیز لہجے میں بابک خرمی سے پوچھا۔ ''اے مردودِ خلائق! تُو ایسا کیوں کر رہا ہے؟''

بابک خرمی مسکرایا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ خون بہہ جانے سے میرا چہرہ زرد پڑ جائے اور تم لوگ سمجھنے لگو کہ بابک موت سے ڈر گیا ہے۔''

خلیفہ معتصم کے حکم پر بابک خرمی کا دوسرا ہاتھ بھی قطع کر دیا گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نہیں نکلی۔ بابک نے دوسرا ہاتھ بھی اپنے چہرے پر مل لیا۔ پھر اس کے دونوں پاؤں بھی کاٹ دیئے گئے۔ بابک فرش پر گر پڑا اور ایک ہی جملے کی گردان کرتا رہا۔

''تم کچھ بھی کر لو...... مجھے موت سے نہیں ڈرا سکتے۔''

آخر بابک کی گردن بھی جسم سے جدا کر دی گئی۔ مگر اس نے مرتے دم تک نہ گریہ وزاری کی اور نہ رحم کی بھیک مانگی..... واقعی اُس میں شیطان حلول کر گیا تھا۔

❀---❀---❀

خواب اور تلوار

نظامِ قدرت بھی عجیب ہے۔ کبھی گداگروں کو انتہائی پستی سے اُٹھا کر اُن کے سروں پر تاجِ زرنگار سجا دیا جاتا ہے...... اور کبھی شہنشاہوں کے ہاتھوں میں کاسۂ گداگری دے کر اُنہیں دربدر پھرایا جاتا ہے۔

سبکتگین ترکی نژاد غلام تھا۔ اس نے ایک دن شکار کے دوران ہرنی کے ایک بچے کو زندہ پکڑ لیا اور اپنے مکان کی طرف واپس جانے لگا۔ کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سبکتگین نے مڑ کر دیکھا تو بچے کی ماں پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔

سبکتگین اس منظر سے بہت متاثر ہوا اور اس نے بچے کو چھوڑ دیا۔ ہرنی نے شکر گزاری کے طور پر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ سبکتگین کچھ دیر تک گھوڑے کی پشت پر سوار کھڑا رہا۔ ہرنی بار بار اُسے مڑ کر دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بچے کے ساتھ جنگل میں غائب ہو گئی۔

پھر اسی رات سبکتگین نے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرما رہے تھے۔

''سبکتگین! تُو نے ایک جانور پر رحم کیا، اللہ کو تیرا یہ عمل بہت پسند آیا ہے۔ عنقریب مالکِ کائنات تجھ پر رحم فرمائے گا۔''

پھر دستِ قدرت نے سبکتگین کے گلے میں پڑا ہوا طوقِ غلامی کاٹ دیا۔ اب وہ امیر ناصرالدین کے لقب سے غزنی کے تخت پر ایک بادشاہ کی حیثیت سے جلوہ افروز تھا۔

سبکتگین نے کئی سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کی اور اس کی فتوحات کا سلسلہ ہندوستان کے بعض علاقوں تک پہنچ گیا تھا۔ پھر جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو اس کا اُولوالعزم بیٹا، سلطان محمود غزنوی اُفقِ سیاست پر خورشیدِ ضیابار کی طرح جگمگا رہا تھا۔ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے اور ''بت شکن'' کے لقب سے شہرتِ دوام حاصل کی۔ سلطان محمود غزنوی جدھر بھی جاتا، اپنے حریفوں کی صفیں اُلٹ کر رکھ دیتا۔ یہاں تک کہ دنیا کی سیاسی تاریخ نے فاتحِ اعظم کی حیثیت سے سلطان کے نام کو اپنے اوراق میں

محفوظ کر لیا تھا۔ وہ بے شمار دولت کا مالک تھا، اس کے خزانے میں بعض ایسے نوادر موجود تھے، جو سابقہ بادشاہوں میں سے کسی کو میسر نہیں آئے تھے۔

سلطان محمود غزنوی نے 35 سال تک دنیا کے ایک بڑے علاقے کو زیر وزبر رکھا۔ اُس کی ایک جنبش نگاہ تاریخ ہی نہیں، جغرافیہ بھی بدل دیا کرتی تھی۔ وہ خطرات اور طوفانوں سے کھیلنے والا ایک مردِ جانباز تھا......لیکن عروج و زوال کے آفاقی اصول کے مطابق، گردشِ وقت نے اس ناقابلِ تسخیر انسان کو بھی تھکا کر بستر پر گرا دیا۔ ایک دن سلطان کو بہت زور کی کھانسی اُٹھی، جس کے نتیجے میں اسے منہ سے خون آیا۔ محمود نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ یہ مرض ''سل'' کی ابتدا تھی۔ ''سل'' دق کی وہ قسم ہے جس میں انسان خون تھوک تھوک کر مر جاتا ہے۔ محمود غزنوی کو بھی یہ جان لیوا بیماری لاحق ہو گئی تھی۔ سلطان نے شروع میں اس خوفناک مرض کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ یہاں تک کہ درباری طبیبوں سے بھی کوئی مشورہ نہیں کیا۔ سلطان یہ جانتا تھا کہ سل (دق) ایک لاعلاج بیماری ہے۔ اگر اراکینِ سلطنت پر یہ راز فاش ہو جاتا تو وہ سمجھ لیتے کہ ان کا سلطان چند دنوں کا مہمان ہے۔ اس صورتِ حال سے شدید سیاسی انتشار پیدا ہو جاتا۔ محمود غزنوی نے اس عظیم الشان سلطنت کو اسی انتشار سے بچانے کے لیے ایک خوفناک راستہ اختیار کیا......اور یہ راستہ اپنی بیماری کو دوسروں سے چھپانا تھا۔

جس روز سے سلطان کو مرض سل لاحق ہوا تھا، اسی روز سے اس کی عادات و اطوار میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی، پہلے وہ متوازن انداز میں چلتا تھا......مگر اب اس کی رفتار میں شاہانہ جلال آ گیا تھا تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ متاثر ہو سکیں۔ اسی طرح سلطان کے طرزِ گفتگو میں بھی انقلاب آ گیا تھا۔ وہ اونچی آواز میں بولنے لگا تھا اور اس کے لہجے میں سختی آ گئی تھی۔ حاضرینِ دربار اپنے فرماں روا کی ان تبدیلیوں پر حیران تھے مگر کسی کو پتہ نہیں تھا کہ سلطان ایسا کیوں کر رہا ہے؟ دراصل وہ اپنی جان لیوا بیماری کو چھپانا چاہتا تھا تاکہ حکومت کا نظم و نسق برقرار رہ سکے اور طالع آزما لوگ اُس کی اس کمزوری سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

جب بیماری روز بروز بڑھتی چلی گئی تو سلطان نے اپنا نائب مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

محمود غزنوی کے دو بیٹے تھے۔ ایک امیر محمد.....اور دوسرا امیر مسعود..... یہ دونوں جڑواں بچے تھے۔ امیر مسعود اپنے بھائی سے چند لمحے پہلے دنیا میں آیا تھا اس لیے امیر محمد چند لمحوں کے اس فرق کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

امیر محمد کی خاص عادت تھی کہ وہ ہمیشہ باپ کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھتا تھا۔ سلطان محمود غزنوی، بیٹے کو کتنی ہی سخت بات کہہ دیتا لیکن امیر محمد کے ماتھے پر ناگواری کی ایک شکن تک نہ اُبھرتی۔ محمود کو بیٹے کی یہ ادا بہت پسند تھی۔ پھر امیر محمد کی اطاعت گزاری اس حد تک بڑھی کہ اس نے سلطان کی نظروں میں محبوبیت کا درجہ حاصل کر لیا۔

اس کے برعکس امیر مسعود نہایت شجاع اور بے باک نوجوان تھا۔ کیسی بھی صورتِ حال ہو، وہ اپنے دل کی بات برملا اور بے تکلف کہہ دیا کرتا تھا۔ امیر مسعود تلخ گفتار یا بے ادب نہیں تھا..... مگر اُس کا بے باکانہ انداز سلطان کی نظروں میں بہت بڑا عیب بن گیا تھا۔ سلطان نے بیٹے کو کئی بار ٹوکا۔

''مسعود! تم باپ سے کس طرح گفتگو کرتے ہو؟ تم نے بزرگوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں سیکھی۔''

امیر مسعود اسی بے باکی سے جواب دیتا۔

''معاذ اللہ! میں آپ کی جناب میں گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا..... مگر قدرت نے مجھے اختلافِ رائے کا حق بخشا ہے اور میں اپنا وہی حق استعمال کر رہا ہوں۔ اگر میری بات مزاجِ شاہی پر گراں گزرتی ہے تو میں ہزار بار شاہِ والا سے معافی کا خواستگار ہوں مگر ناحق کو حق کہنا، میرے مزاج کے خلاف ہے۔''

سلطان محمود اپنے بیٹے کی یہ گفتگو سنتا اور برہم ہو جاتا۔

ایک بار کسی موقع پر سلطان نے امیر مسعود کو ڈانٹا اور اس پر نافرمانی کا الزام عائد کیا۔ امیر مسعود جوشِ جذبات میں کھڑا ہو گیا اور اس نے سلطان کے سامنے تلوار کھینچ لی۔ محمود غزنوی، بیٹے کی اس حرکت پر گھبرا گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ مسعود اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس نازک صورتِ حال کے پیشِ نظر دربار کے مسلح سپاہیوں نے بھی اپنی شمشیریں بے نیام کر لیں۔ امیر مسعود غضب ناک انداز میں پلٹا اور اس نے قہر آلود نظروں سے محافظ سپاہیوں کی طرف دیکھا۔

''کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں اپنے محبوب و محترم باپ کی جناب میں گستاخی کر رہا ہوں؟'' یہ کہہ کر امیر مسعود گھٹنوں کے بل جھکا اور برہنہ شمشیر سلطان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کرنے لگا۔

''شاہِ والا مجھ سے اپنی اطاعت و فرماں برداری کا ثبوت چاہتے ہیں تو یہ شمشیر حاضر ہے۔ سلطانِ ذی حشم یا تو اپنے دستِ مبارک سے میرا سر قلم کر دیں...... یا پھر مجھے حکم دیں کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی شہ رگ کاٹ ڈالوں اور سارا خون شاہِ والا کے قدموں میں بہا دوں۔''

تمام حاضرینِ دربار کو امیر مسعود کی یہ ادا بہت پسند آئی...... مگر سلطان محمود غزنوی نے بیٹے کی اس شجاعت و بے باکی کو کبھی پذیرائی نہیں بخشی۔

جرأت و بے باکی کے علاوہ امیر مسعود بہت زیادہ سخی نوجوان تھا۔ اُسے حکومت کی طرف سے ہر ماہ ایک معقول معاوضہ ملتا تھا...... مگر امیر مسعود کا ہاتھ ہمیشہ خالی رہتا تھا۔ وہ فضول خرچ یا عیاش نہیں تھا۔ اس کی تمام دولت ضرورت مندوں پر خرچ ہوتی تھی۔ اس نے کبھی کسی سائل کو نہیں جھڑکا...... اور کسی مانگنے والے کو اپنے دروازے سے ناکام و نامراد نہیں لوٹایا۔ نتیجتاً امیر مسعود کا ہاتھ ہمیشہ تنگ رہتا تھا اور وہ سلطان سے اپنے وظیفے کی رقم میں اضافہ کرنے کا سوال کرتا رہتا تھا۔ محمود غزنوی، بیٹے کی اس درخواست پر ناراض ہو جاتا اور انتہائی سخت لہجے میں جواب دیتا۔

''تمہیں پتہ ہے کہ تم جس دولت کو پانی کی طرح بہا رہے ہو، وہ کس جانفشانی سے حاصل کی گئی ہے؟''

امیر مسعود اسی بے باکی کے ساتھ اپنے اس عمل کی وضاحت کرتا۔ ''شاہِ والا! میں رقص و سرود کی محفلیں سجانے کے لیے دولت خرچ نہیں کرتا ہوں، مجھ سے محتاجوں اور مسکینوں کے غم دیکھے نہیں جاتے۔ اس لیے آپ کی دولت کے سمندر میں سے چند قطرے نکال کر ان کے کاسوں میں ڈال دیتا ہوں۔''

محمود غزنوی کو امیر مسعود کی یہ فیاضانہ ادا بھی پسند نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ اکثر مؤرخین نے سلطان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک حریص حکمراں تھا اور دولت خرچ کرنے میں بہت محتاط رہتا تھا۔

فیاضی اور بے باکی کے علاوہ امیر مسعود اپنی شجاعت کے لیے بھی خاصی شہرت رکھتا تھا۔ لوگ اُسے ''رستمِ ثانی'' کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔ امیر مسعود کے تیر میں اتنی تیزی تھی کہ وہ لوہے سے گزر کر ہاتھی کے جسم میں پیوست ہو جاتا تھا، اُس کا گرز اتنا وزنی تھا کہ طاقتور سے طاقتور سپاہی بھی اسے ایک ہاتھ سے نہیں اٹھا سکتا تھا۔ امیر مسعود میں ولی عہدِ سلطنت بننے کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ مگر سلطان نے اپنے لائق بیٹے کی تمام صفات کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا، جب محمود غزنوی نے جانبداری سے کام لیتے ہوئے امیر محمد کو اپنا جانشین مقرر کر دیا اور اس کے ساتھ ہی خلیفۂ بغداد کے نام ایک خط بھی تحریر کیا، جس میں درخواست کی گئی تھی کہ دربارِ خلافت سے جاری ہونے والے احکام اور خطبات میں مسعود سے پہلے امیر محمد کا نام لکھا جائے۔ تمام امرائے دربار نے سلطان کے اس فیصلے کو ناپسند کیا مگر کسی میں اختلاف کی جرأت نہیں تھی۔

جب یہ خط پڑھا جا رہا تھا، اس وقت امیر مسعود بھی دربار میں موجود تھا۔ مکتوبِ سلطانی کے ختم ہوتے ہی امیر مسعود اپنی نشست سے اُٹھا اور باوقار انداز میں چلتا ہوا دربار سے باہر آیا۔ ابونصر جو وزارت کے منصب پر فائز تھا، وہ بھی اپنی جگہ سے اُٹھا اور امیر مسعود کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ پھر راہداری کے ایک پُرسکون گوشے میں امیر مسعود کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''شہزادے محترم! مجھے اور تمام اہلِ دربار کو اس حق تلفی پر بے حد افسوس ہے۔ ولی عہدی کے لیے آپ ہی موزوں ترین اُمیدوار تھے...... مگر ہم لوگ نہایت کمزور اور مجبور ہیں اس لیے سلطانِ ذیشان کے فیصلے کے خلاف احتجاج نہیں کر سکتے۔''

ابونصر کی بات سن کر امیر مسعود بڑے عجیب انداز میں مسکرایا، پھر اپنی شمشیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہیں بزرگوں کا یہ قول یاد نہیں کہ تلوار کی تحریر، قلم کی تحریر سے زیادہ سچی اور مضبوط ہوتی ہے؟''

ابونصر، شہزادہ امیر مسعود کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

پھر سلطان نے ابونصر کو خلوت میں طلب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تُو دربار سے اُٹھ کر مسعود کے پیچھے کیوں گیا تھا؟ اور تم دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی؟''

ابونصر کو سلطان کی نظر کی گہرائی اور مشاہدے پر بڑا تعجب ہوا۔ آخر اُس نے اپنے اور امیر مسعود کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ محمود غزنوی کے سامنے دہرا دیا۔

سلطان چند لمحوں تک خاموش رہا، پھر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ابونصر! میں خوب جانتا ہوں کہ مسعود ہر لحاظ سے امیر محمد سے بہتر ہے اور مجھے اس کا یقین ہے کہ میرے بعد وہی سلطنت کا حق دار ٹھہرے گا۔''

''پھر آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں سلطانِ معظم؟'' ابونصر نے دست بستہ عرض کیا۔

''یہ میری مجبوری ہے ابونصر!'' سلطان نے پُراثر لہجے میں کہا۔ ''امیر محمد نے میری بہت زیادہ عزت کی ہے۔ میری جا اور بے جا باتوں کو خوش دلی کے ساتھ تسلیم کیا ہے اور ہمیشہ اپنے سر کو میرے سامنے خم رکھا ہے، میں اس کی اطاعت کا صلہ دینا چاہتا ہوں۔''

سلطان محمود غزنوی فطرتاً ایک خود پسند انسان تھا۔ بے شمار فتوحات نے اُس کی ''انا پرستی'' میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ امیر محمد کی فرمانبرداری سے اُس کے جذبات کو تسکین ملتی تھی۔ اسی وجہ سے ولی عہدی کے انتخاب کے وقت وہ باپ کی جگہ ایک شہنشاہ بن گیا تھا۔ سلطان کی اسی جذباتی غلطی نے ایک عظیم الشان سلطنت کو شدید نقصان پہنچایا۔

❁---❁---❁

پھر وہ نازک وقت بھی آ گیا، جب موسم کی سختیاں سہتے سہتے عزم و ہمت کی مضبوط چٹان میں بڑی بڑی دراڑیں پڑنے لگیں۔ سل کے مرض کو چھپاتے چھپاتے اور خاموشی کے ساتھ خون تھوکتے تھوکتے سلطان بسترِ علالت پر دراز ہو گیا۔ قصرِ سلطانی میں طوفان سا آ گیا۔ دربار کے سارے طبیبانِ خاص کو جمع کیا گیا اور مقبوضہ علاقوں سے بھی ماہر حکیم طلب کیے گئے مگر ہر شخص کی زبان پر یکساں الفاظ تھے۔

''سلطانِ اعظم! کاش آپ اس مرض کو پوشیدہ نہ رکھتے۔ یقیناً یہ بیماری لاعلاج ہے لیکن اگر شروع ہی سے نگہداشت کی جاتی تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔''

اس مایوس کُن صورتِ حال میں بھی طبیبوں نے علاج جاری رکھا...... لیکن گزرنے والا ہر لمحہ زندگی سے دُور اور موت سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وقتِ معلوم آ پہنچا۔ مرنے سے ایک دن پہلے سلطان نے حکم جاری کیا کہ اس کا سارا خزانہ ایک طویل و عریض کمرے میں جمع کیا جائے۔ سلطان کے حکم کی تعمیل میں تمام نوادر ترتیب اور قرینے سے سجا دیئے گئے۔ محمود غزنوی میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ سہارے کے بغیر بستر پر اُٹھ کر بیٹھ سکے۔ نتیجتاً چار خدمت گار اس کے پلنگ کو اٹھا کر اس کمرے میں لے گئے، جہاں دنیا بھر کی دولت کا ایک بڑا ذخیرہ جمع تھا۔

خدمت گاروں نے سلطان کو سیدھا کیا اور چاروں طرف نرم گاؤ تکیے لگا دیئے۔ حاضرین نے دیکھا کہ ایک سال پہلے جس حکمراں کی یلغار سے زمین لرز جاتی تھی، آج وہ خود ایک زرد پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ محمود نے حسرت زدہ نظروں سے نادر و نایاب لعل و جواہر کی طرف دیکھا۔ ہیروں کی چمک سے پورا کمرہ جگمگا رہا تھا۔ حاضرین نے آج تک ایسی روشنی نہیں دیکھی تھی۔

سلطان محمود غزنوی کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''کیا یہ میرا سارا خزانہ ہے؟'' عظیم فاتح کا لہجہ اس قدر ناتواں تھا کہ قریب کھڑے ہوئے خدمت گار بمشکل اس کی آواز سن سکے۔

''سلطانِ عالی مقام!'' ایک خدمت گار نے دست بستہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے عرض کیا۔ ''آپ کا تمام خزانہ ایک محدود کمرے میں کس طرح سما سکتا ہے؟ یہ تو وہ نوادر ہیں جو حضورِ والا کے ملاحظے کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔''

سلطان نے آہستہ آہستہ اپنی گردن کو موڑا، تمام ضیا بار جواہر پر نظر ڈالی پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہاں تک کہ عظیم فاتح ہچکیوں کے ساتھ رونے لگا۔ عجیب درد انگیز اور حسرت ناک منظر تھا۔ حاضرین کی آنکھیں بھی اشکوں سے لبریز ہو گئیں۔

''انہیں ہٹا لو میرے سامنے سے.....'' سلطان کی آواز اس طرح کانپی جیسے بجھنے والی شمع لرز رہی ہو۔ ''لے جاؤ انہیں......اب یہ چیزیں میرے کسی کام کی نہیں۔''

پھر دوسرے دن 23 ربیع الثانی 421ھ کو عظیم فاتح اپنی زندگی کی جنگ ہار گیا۔ موت کے وقت محمود غزنوی کی عمر 63 سال تھی۔ جس روز سلطان کا انتقال ہوا، اس روز تیز بارش ہو رہی تھی۔ رات کے وقت اسی بارش میں محمود کے جنازے کو غزنی کے قصرِ فیروز میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

❁---❁---❁

سلطان کی وفات کے وقت اس کے دونوں بیٹے غزنی سے بہت دُور تھے۔ یہ بھی بڑی عجیب محرومی تھی کہ آخری لمحات میں باپ اور بیٹے ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے۔ امیر محمد، گورگان میں مقیم تھا اور امیر مسعود، صفاہان میں۔

تین دن بعد جب سوگ کی رسم ختم ہو گئی تو سلطان کے داماد، امیر علی نے امراء کا اجلاس طلب کیا اور محمود غزنوی کی وصیت بیان کرتے ہوئے کہا۔

''تمام معزز اراکینِ سلطنت بخوبی جانتے ہیں کہ سلطان مرحوم و مغفور نے اپنی زندگی میں شہزادہ امیر محمد کو ولی عہدِ سلطنت مقرر فرما دیا تھا۔ سلطنت کی وصیت اپنی جگہ ہے مگر میں اس سلسلے میں آپ کی رائے جاننے کا خواہش مند ہوں۔''

امراء کی اکثریت سلطان کے اس فیصلے سے اختلاف رکھتی تھی مگر مصلحتاً ہر شخص خاموش رہا۔ صرف ایک وزیر ابونصر اپنی نشست پر کھڑا ہوا اور محمود غزنوی کے داماد، امیر علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''اب ہماری رائے جاننے سے کیا حاصل ہو گا؟ وقت بہت آگے جا چکا ہے۔''

ابھی ابونصر کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ احمد حسن مہمندی کھڑا ہوا جو سلطان محمود غزنوی کا دودھ شریک بھائی بھی تھا اور طالب علمی کے دوران اس کا ہم سبق بھی۔ اسی قرابت داری کی وجہ سے سلطان نے احمد حسن مہمندی کو وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز کیا تھا۔ آج حقِ نمک ادا کرنے کا وقت آیا تو احمد حسن

نے علی الاعلان کہا۔

''وصیت آخر وصیت ہوتی ہے، اس پر کسی کی رائے طلب نہیں کی جاتی۔'' احمد حسن مہمندی کی بارعب آواز دربار میں گونج رہی تھی۔ ''سلطان مرحوم نے اپنی زندگی میں جو فیصلہ کر دیا، وہ پتھر کی لکیر ہے، اسے مٹایا نہیں جا سکتا......اور جو شخص مٹانے کی کوشش کرے گا، اس کی وفاداریاں مشکوک سمجھی جائیں گی۔ شہزادہ امیر محمد ہی ہمارے حکمراں ہیں......اس لیے کہ وہ سلطانِ عالی مقام کے محبوب تھے۔''

احمد حسن مہمندی نے شہزادہ امیر مسعود کی مخالفت میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ وہ سلطان کی زندگی میں بڑے زور و شور سے یہ جملہ کہا کرتا تھا۔

''اگر امیر مسعود بادشاہ بن جائے تو مجھے پھانسی پر چڑھا دینا۔''

آخر ایک دن ان الفاظ کی بازگشت امیر مسعود کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ شہزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''احمد حسن مہمندی میرے والد محترم کے دسترخوان کا نمک خوار ہے......دولت و نعمت کی کثرت دیکھ کر وہ بدحواس ہو گیا ہے۔ اسے یہ راز نہیں معلوم کہ دسترخوان بدل بھی جاتے ہیں۔''

شہزادہ امیر مسعود نے بڑی معنی خیز بات کہی تھی......مگر احمد حسن مہمندی نے اپنی روش تبدیل نہیں کی۔ آج جب وفاداری کے مظاہرے کا وقت آیا تو وہ اعتدال کے راستے سے ہٹ کر بہت دُور نکل گیا۔

وصیت بہر حال وصیت تھی۔ آخر امیر علی نے برق رفتار قاصد گورگان کی طرف روانہ کر دیئے۔ پھر کچھ دن بعد شہزادہ امیر محمد کو غزنی کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔

❁---❁---❁

سلطان کے انتقال سے پہلے جب شہزادہ امیر محمد، گورگان میں مقیم تھا، اس وقت اسے ایک خوب صورت رقاصہ شمائلہ سے محبت ہو گئی تھی۔ شمائلہ سمرقند کے ایک امیر کی بیٹی تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ پھر انسانوں کے ایک تاجر ارسلان بیگ نے شمائلہ کی پرورش کی اور اسے رقص کی تعلیم دلائی۔ ارسلان بیگ غلاموں کی تجارت کیا کرتا تھا اور خوب صورت لڑکیوں کو رقص و موسیقی سکھا کر انہیں شہنشاہوں کے درباروں میں پیش کیا کرتا تھا۔

جب شمائلہ پہلی بار امیر محمد کی محفلِ خاص میں رقص کرنے آئی تو شہزادہ اُس کے دلکش خدوخال میں کھو کر رہ گیا۔ پھر جب محفل ختم ہوئی تو امیر محمد نے شمائلہ کو خلوت میں طلب کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ تم جیسی حسین و جمیل لڑکی، ابوالہوس مردوں کے سامنے اس طرح بے حجابانہ رقص پیش کرے۔''

اس پرسشِ حال پر شمائلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے شہزادہ امیر محمد کو اپنی داستانِ الم سنا ڈالی۔

''کیا تم میرے ساتھ رہنا پسند کرو گی؟'' امیر محمد پہلی ہی نظر میں شمائلہ کے حُسن کا اسیر ہو گیا تھا۔

''ایک کنیز اپنی مرضی سے کہاں جا سکتی ہے شہزادے؟'' شمائلہ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں

میں تیزی آ گئی تھی۔ ''میں نے ہزار بار اس حصار سے نکلنے کی کوشش کی ہے......مگر ہر مرتبہ یہ زنجیرِ غلامی مجھے روک لیتی ہے۔''

''کیا تم اس زنجیرِ غلامی کو کاٹنا نہیں چاہتیں؟'' شہزادہ امیر محمد نے سوال کیا۔

''میں بہت مجبور ہوں شہزادے!'' شمائلہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ ''اگر خدا مجھے کسی طاقتور ہاتھ کا سہارا دیدے تو میں اسی وقت ان زنجیروں کو کاٹ کر پھینک سکتی ہوں۔''

پھر اسی دن امیر محمد نے انسانوں کے سوداگر ارسلان بیگ کو طلب کر کے کہا۔ ''یہ لڑکی تمہاری قید میں رہنا نہیں چاہتی، اب اسے آزاد کر دو۔''

''شہزادۂ معظم! انسان کو آزادی کی بہت بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے۔'' ارسلان بیگ کے ہونٹوں پر بڑی حریصانہ مسکراہٹ تھی۔

امیر محمد نے ارسلان بیگ کو منہ مانگی قیمت دے کر شمائلہ کے پیروں میں پڑی ہوئی زنجیر کاٹ دی۔

''اب تم آزاد ہو، جہاں چاہو جا سکتی ہو۔'' امیر محمد کا لہجہ بہت جذباتی تھا۔

شمائلہ نے شکرگزارانہ نظروں سے امیر محمد کی طرف دیکھا۔ شہزادے کی آنکھوں میں رہائی پانے والی کنیز کے لیے محبت کا ایک دریا موجزن تھا۔ شمائلہ نے محسوس کیا کہ جیسے جذبات کی وہ تند و تیز لہریں اس کے دل کو چھو رہی ہیں۔ پھر وہ تیزی سے امیر محمد کے قدموں میں جھک گئی۔

''شہزادے! میں کہاں جا سکتی ہوں؟'' شمائلہ کے لہجے میں اس دوشیزہ کے لہجے کی تپش تھی جس کے سرکش ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔

''ایک زنجیر کٹی تو دوسری خود بخود پیروں میں پڑ گئی۔''

''کیسی زنجیر......؟'' شہزادہ امیر محمد نے کہا۔

''آپ کے احسانات کی زنجیر۔'' شمائلہ کے ہونٹوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''یہ احسان میں نے اپنے آپ پر کیا ہے۔'' شہزادہ امیر محمد نے مبہم الفاظ میں اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔

''میں اسی احسان کی تو بات کر رہی ہوں۔'' شمائلہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ ''وہ بدنصیب لڑکی آپ کی محبت کے قابل کہاں تھی جسے گردشِ تقدیر محفل محفل نچا رہی تھی۔''

پھر شہزادہ امیر محمد اور شمائلہ کے عشق نے شدت اختیار کر لی مگر وحشت کا رنگ نہیں پکڑا...... کیونکہ امیر محمد، سلطان محمود غزنوی سے بہت ڈرتا تھا۔ جب یہ داستانِ عشق شروع ہوئی تھی، اس وقت امیر محمد دو جواں سال بیٹوں کا باپ تھا۔ بڑا بیٹا امیر احمد کسی ذہنی مرض میں مبتلا تھا اور کبھی کبھی پاگلوں جیسی حرکتیں کیا کرتا تھا۔ امیر احمد کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ دوسرا بیٹا اٹھارہ سالہ عبدالرحیم ایک متوازن اور ذہین لڑکا تھا۔ امیر محمد کی بیوی شائستہ خانم ایک مہذب خاتون تھی مگر بیوی اور شوہر میں ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی اسی لیے امیر محمد اپنی جذباتی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرتا تھا۔ آخر شمائلہ جیسی حسین و جمیل دوشیزہ نے اپنی

قربتوں سے اس خلا کو بھر دیا۔

اقتدار سنبھالتے ہی سلطان امیر محمد نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی محبوبہ شائلہ سے شادی کر لی۔ یہ شادی ہنگامہ خیز نہیں تھی، بس ایک سادہ سی تقریب میں چند امرائے سلطنت شریک ہوئے اور امیر محمد نے اپنی محبت کو شریعت کا رنگ دے دیا۔

❋---❋---❋

سلطان امیر محمد نے امورِ سلطنت کو بہتر طور پر انجام دینے کے لیے احمد حسن مہندی کو وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر برقرار رکھا۔ وہ ہر معاملے میں اس جہاں دیدہ شخص سے مشورے کیا کرتا تھا۔ لیکن ایک مسئلے پر اس نے احمد حسن مہندی کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ سلطان امیر محمد جانتا تھا کہ امراء کی اکثریت اُسے دل سے ناپسند کرتی ہے، اسی لیے وہ رعایا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سلطان کے خیال میں عوام کی خوشحالی ہی کسی حکمراں کو محبوبیت کے درجے تک پہنچا سکتی ہے۔ نتیجتاً اس نے رعایا پر شاہی خزانے کے منہ کھول دیئے۔ سلطان محمود غزنوی نے جو دولت بڑی جانفشانی کے بعد جمع کی تھی، اسی دولت کو امیر محمد بے دریغ لٹا رہا تھا۔ اس موقع پر وزیراعظم، احمد حسن مہندی نے سلطان کو کئی بار ٹوکا۔

''رعایا کو خوش رکھنا ہر حکمراں کا فرض ہے لیکن اس پر دولت لٹانا کوئی دانش مندی نہیں۔ آپ امراء کے دل جیتنے کی کوشش کیجئے، باقی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔''

سلطان امیر محمد نے اپنے مشیرِ خاص کے اس مشورے کو قبول نہیں کیا اور دونوں ہاتھوں سے باپ کی جمع کی ہوئی دولت لٹاتا رہا۔ انجام کار ملک کا ہر باشندہ اور فوج کا ہر سپاہی خوشحال زندگی بسر کرنے لگا۔ مگر امرائے سلطنت پر سلطان کے اس اقدام کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا۔ وہ دلی طور پر امیر مسعود ہی کو اپنا حکمراں تسلیم کرتے تھے۔

ادھر امیر محمد اپنے اقتدار کی بنیادیں مضبوط کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اُدھر امیر مسعود برق رفتاری کے ساتھ خراسان پہنچا۔ اس نے عراق اور عجم کے علاقوں میں لائق ترین لوگوں کو اپنا نائب مقرر کرنے کے بعد امیر محمد کے نام ایک طویل خط تحریر کیا۔

''میرے عزیز بھائی! یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ تم مجھ سے چھوٹے ہو۔ اقتدار میرا حق تھا جو مجھ سے چھین لیا گیا لیکن پھر بھی میں اس تلخ ترین واقعے کو فراموش کر دینا چاہتا ہوں۔ میری نظر ان علاقوں پر نہیں ہے جو تمہیں والد محترم نے عطا کیے ہیں۔ میرے لیے خود اپنے مفتوحہ علاقے جبال، طبرستان اور عراق کافی ہیں۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنے ممالک میں یہ ہدایات جاری کر دو کہ ہر خطبے میں تمہارے نام سے پہلے میرا نام پڑھا جائے۔''

امیر مسعود نے بڑی ذہانت سے یہ خط تحریر کیا تھا لیکن امیر محمد اپنے بھائی کی اس پُر پیچ چال کو سمجھ گیا۔ اس نے فوری طور پر انتہائی تحقیر آمیز الفاظ میں خط کا جواب تحریر کیا۔

''مسعود! میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں، تم ایک خودغرض اور سرکش انسان ہو۔ تم نے زندگی بھر والد محترم کو اذیتیں پہنچائی ہیں اور اب ان کی روح کو تکلیف پہنچا رہے ہو۔ میری نظر میں تمہارا یہ گناہ نا قابل معافی ہے۔ یاد رکھو کہ سلطان مرحوم و مغفور نے جو دستار مجھے پہنائی ہے، میں اسے ہرگز نہیں اُتاروں گا۔ تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ چپ چاپ غزنی چلے آؤ۔ یہ فیصلہ بعد میں کیا جائے گا کہ تم کس عہدے کے مستحق ہو۔''

اس خط کے روانہ کرتے ہی امیر محمد نے امیر مسعود سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

جب امرائے سلطنت کو سلطان کے ارادوں کا پتہ چلا تو وہ امیر محمد کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے۔ ''اس جنگ کو روکنے کی کوشش کیجئے۔ اگر ایک بھائی کے مقابل بھائی آ گیا تو دلوں میں شگاف پڑ جائیں گے..... اور پھر نفرتوں کے اس بار کو کسی طرح بھی دھویا نہیں جا سکے گا۔''

امرائے سلطنت چاہتے تھے کہ مذاکرات کے ذریعے سیاسی مسائل حل ہو جائیں لیکن اقتدار کی بھوک نے امیر محمد کی سماعتوں پر قفل لگا دیئے تھے اور دماغ پر گہرے پردے ڈال دیئے تھے۔ اس نے امرائے سلطنت کے مشوروں کو بڑے جارحانہ انداز میں مسترد کر دیا۔

''اگر میں خطبات میں اپنے نام سے پہلے مسعود کا نام پڑھوا دوں تو پھر میری کیا حیثیت باقی رہ جائے گی؟ وہ بہت عیار ہے، میرے ساتھ فریب کارانہ چالیں چل رہا ہے۔''

امرائے سلطنت مایوس ہو کر چلے گئے۔ امیر محمد کی خلوت میں صرف وزیراعظم احمد حسن مہمندی رہ گیا جو ایک زمانہ ساز شخص تھا۔

''سلطانِ ذیشان! تحریروں سے حکومتوں کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ یہ کام شمشیریں ہی انجام دیتی ہیں۔ امیر مسعود کو سنبھلنے کا موقع نہ دیجئے۔'' احمد حسن مہمندی دُہرا کھیل، کھیل رہا تھا۔ اس کے خیال میں اگر امیر محمد غالب آ جاتا تو امیر مسعود کا کانٹا ہمیشہ کے لیے راستے سے نکل جاتا۔ اور اگر امیر مسعود فاتح پاتا تو احمد حسن مہمندی اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے اُس کے حلقۂ مصاحبت میں داخل ہو جاتا۔ وزیراعظم کو اپنی ذہانت پر بڑا ناز تھا اس لیے وہ دونوں بھائیوں کو لڑا کر ہر حال میں کامیاب رہنا چاہتا تھا۔

سلطان امیر محمد، بڑے بھائی پر حملہ کرنے کے لیے فوجیں جمع کر رہا تھا کہ ان ہی دنوں اس کی دوسری بیوی شمائلہ نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔

''سلطان امیر محمد ایک کمرے میں تنہا کھڑا ہے جہاں دو کافوری شمعیں جل رہی ہیں۔ یکایک آندھی کا ایک تیز جھونکا کمرے کی فضا کو درہم برہم کر کے رکھ دیتا ہے، دروازے اور کھڑکیاں پُرشور آوازوں کے ساتھ کھل جاتے ہیں اور روشن شمعیں بجھ جاتی ہیں، چاروں طرف گہری تاریکی چھا جاتی ہے، اندھیرے سے گھبرا کر سلطان امیر محمد چیخنے لگتا ہے۔ شوہر کی چیخیں سن کر شمائلہ کی آنکھ کھل جاتی ہے۔''

''سلطانِ معظم! آپ یہ سفر ملتوی کر دیں اور غزنی میں رہ کر صورتِ حال پر قابو پانے کی کوشش

کریں۔'' شمائلہ نے اپنا خواب بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک انجانا سا خوف محسوس ہو رہا ہے۔''

اگرچہ امیر محمد اپنی دوسری بیوی سے بہت محبت کرتا تھا لیکن خواب سن کر اس نے شمائلہ کو جھڑک دیا۔

''مردوں کے فیصلے بند کمروں میں نہیں، صرف میدانِ جنگ میں ہوتے ہیں۔''

شمائلہ آخر دم تک شوہر کی خوشامد کرتی رہی لیکن سلطان امیر محمد پر جنگ کا جنون طاری تھا۔ وہ ایک لشکرِ جرار لے کر غزنی سے روانہ ہوا پھر یکم رمضان 421ھ کو ''کیاباذ'' کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ اس نے رمضان المبارک کا پورا مہینہ اسی جگہ گزارا اور اپنے بھائی امیر مسعود پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔

پھر عید کے دن امیر محمد نے ایک جشنِ خاص کا اہتمام کیا۔ امرائے سلطنت لذیذ کھانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک تاجِ شاہی سلطان امیر محمد کے سر سے گر گیا۔ تمام امیر و وزیر دم بخود رہ گئے......اور خدمت گار، تاج اُٹھانے کے لیے دوڑ پڑے۔ سلطان امیر محمد نے اس واقعے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ اطمینان سے کھڑا تاجِ شاہی کو دیکھتا رہا جو زمین پر گر کر خاک آلود ہو گیا تھا۔ خادموں نے آگے بڑھ کر تاج اُٹھایا اور گرد صاف کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ امیر محمد نے بے نیازانہ انداز میں تاجِ شاہی کو دوبارہ اپنے سر پر سجا لیا۔

❁---❁---❁

جب سر پر دستار یا ٹوپی پہنی جاتی ہے تو وہ کبھی نہ کبھی سر سے گر بھی جاتی ہے۔ سلطان امیر محمد کے سر سے تاجِ شاہی کا گر جانا بھی ایک عام سا واقعہ تھا۔ مگر اُمرائے سلطنت نے اس واقعے کا عجیب تاثر لیا۔ اُن کے خیال میں تاجِ شاہی کا گر جانا بہت بڑی بدشگونی تھی۔ اگرچہ وہ سب کے سب راسخ العقیدہ مسلمان تھے لیکن اس موقع پر امرائے سلطنت انتہائی توہم پرست ثابت ہوئے۔

رات ہوتے ہی سلطان امیر محمد اپنے خیمے میں جا کر گہری نیند سو گیا مگر اس کے امراء اور سالار رات بھر جاگتے رہے۔ یہ ایک خفیہ اجلاس تھا جس میں تمام با اثر اراکینِ سلطنت جمع تھے۔

''آج فیصلہ ہو گیا کہ وقت کس کے ساتھ ہے۔'' امیر یوسف نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں وقت کے اس فیصلے کو قبل از وقت تسلیم کر لینا چاہئے کہ تاجِ شاہی امیر مسعود کا حق ہے۔'' امیر یوسف، سلطان محمود غزنوی کا چھوٹا بھائی اور امیر محمد کا حقیقی چچا تھا۔

''تاجِ شاہی کا سر سے گر جانا ایک فالِ بد ہے۔'' دوسرے وزیر امیر علی خویشاوند نے بھی امیر یوسف کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں بیٹھنا ہوش مندی نہیں، اس میں ہلاکت کا اندیشہ ہے۔''

احمد حسین مہمندی نے کہا۔ ''بدبخت کی قربت سے بچو، ابھی تمہارے پاس وقت ہے۔''

واقعی یہ سلطان امیر محمد کی بدبختی تھی کہ ایک معمولی واقعے کو بنیاد بنا کر نمک خواروں نے اپنے آقا کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ رات بھر امراء اور سپہ سالاروں کے درمیان مشورے ہوتے رہے، بغاوت کے منصوبے کی تفصیلات طے پا چکی تھیں۔

پھر صبح ہوتے ہی تمام امراء اور سپہ سالار، امیر مسعود کی حمایت میں نعرے لگاتے ہوئے سلطان امیر محمد کے خیمے میں جمع ہو گئے اور کچھ دیر بعد غزنی کے حکمراں کو گرفتار کر کے ''ونج'' کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ (آج کل اس قلعے کا نام ''خلیج'' ہے)

❀---❀---❀

ایک رات میں سب کچھ بدل گیا تھا۔

امیر محمد قیدِ تنہائی میں پڑا اپنی خوں گشتہ حسرتوں کا ماتم کر رہا تھا.....اور باغی امراء، امیر مسعود کا استقبال کرنے کے لیے ہرات کی طرف بڑھ رہے تھے۔

امیر مسعود بہت خوش تھا کہ اس نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اپنی زندگی کی مشکل ترین بازی جیت لی تھی۔ جب باغی امراء ہرات پہنچے تو امیر مسعود نے نہایت پُر جوش انداز میں ان کا استقبال کیا، کئی دن تک پُر تکلف ضیافتیں ہوتی رہیں اور بڑے ہنگامہ خیز انداز میں جشنِ فتح منایا جاتا رہا۔ پھر امیر مسعود، باغی امراء کو اپنے ساتھ لے کر بلخ پہنچا۔

امیر یوسف، امیر علی خویشادند اور امیر حسین عہدہ و منصب اور گراں قدر انعامات کا انتظار کر رہے تھے کہ امیر مسعود نے ان تمام لوگوں کو پابہ زنجیر کر کے اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم جاری کیا۔ جب باغی امراء کو زنجیریں پہنائی جا رہی تھیں تو وہ چیخ چیخ کر سپاہیوں سے پوچھ رہے تھے۔

''ہمیں کس جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے؟''

امیر مسعود نے سب سے پہلے امیر یوسف کی قسمت کا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ ''آپ میرے چچا ہیں، اس لیے موت کی سزا معاف کر رہا ہوں.....مگر زنداں کے اندھیرے آپ کا مقدر ہیں۔ میرے جیتے جی آپ کھلا آسمان نہیں دیکھ سکیں گے؟''

''میرا جرم......؟'' امیر یوسف نے لرزتے ہوئے لہجے میں بھتیجے سے سوال کیا۔

''تم تینوں کا ایک ہی جرم ہے۔'' امیر مسعود نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''دنیا کا بدترین جرم...... اپنے آقا سے نمک حرامی۔''

پھر امیر یوسف کو زنداں کے حوالے کر دیا گیا اور اسی حالتِ اسیری میں اسے موت آ گئی۔

امیر علی خویشادند کو مقتل میں لے جا کر قتل کر دیا گیا۔ پھر جب احمد حسن مہمندی کے قتل کی ساعت آئی تو امیر مسعود نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تُو نے بہت پہلے خود ہی اپنے مقدمے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ کیا تجھے اپنے وہ الفاظ یاد ہیں، جب تُو نے سلطان مرحوم کے سامنے کہا تھا کہ اگر امیر مسعود بادشاہ بن جائے تو مجھے پھانسی چڑھا دینا۔''

احمد حسن مہمندی اپنی خطاؤں کی معافی مانگنے لگا۔ مگر امیر مسعود نے جوشِ جذبات میں اس کے منہ پر تھوک دیا۔ ''میں تو بادشاہ بن چکا، اب تُو بھی قتل ہو جا۔''

دوسرے ہی لمحے احمد حسن مہمندی کا خون آلود جسم زمین پر تڑپنے لگا۔

❀---❀---❀

پھر امیر مسعود کا رُخ زنداں کی طرف تھا۔ وہ اپنے بھائی، امیر محمد سے ملنے جا رہا تھا۔ امراء اور سپاہیوں کے ذہنوں میں ہزاروں وسوسے اُبھر رہے تھے۔ داروغۂ زنداں پریشان تھا کہ اس نے بڑے بڑے انسانوں کو اسی چار دیواری میں قتل ہوتے دیکھا تھا، کئی دن سے ایک بہت بڑا آدمی زنداں کے ایک گوشے میں زنجیریں پہنے سر جھکائے بیٹھا تھا..... اور دوسرا بہت بڑا آدمی غرور سے سر اونچا کیے کھڑا تھا۔ داروغۂ زنداں نے آنے والے کو نہایت پُرجوش انداز میں سلامی دی..... اور دروازہ کھول دیا۔

امیر مسعود اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے وزیر ابونصر تھا۔ معزول سلطان، امیر محمد اُداس بیٹھا ہوا تھا، امیر مسعود کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

بھائی کے اس طرزِ عمل پر امیر مسعود زور سے ہنسا۔ ''آخر وقت نے تیرے غرور پر خاک ڈال ہی دی۔''

''جب انسان ہار جاتا ہے تو اس کے نام سے بے شمار تہمتیں منسوب کر دی جاتی ہیں۔'' امیر محمد پُرجلال لہجے میں بول رہا تھا۔ ''شکست خوردہ انسان کی خوبیاں بھی خامیاں بن جاتی ہیں، سو یہی حال میرا ہے۔''

امیر مسعود بہت دیر تک چھوٹے بھائی پر طعنہ زنی کرتا رہا۔ ''اگر تُو خطبات میں اپنے نام سے پہلے میرا نام شامل کر لیتا تو آج اس انجام کو نہ پہنچتا۔''

امیر محمد نے بھائی کی اس تحقیر آمیز گفتگو کا کوئی جواب نہیں دیا۔

امیر مسعود نے پُرجوش انداز میں تلوار کھینچی۔ وزیر ابونصر، داروغۂ زنداں اور دوسرے محافظ خوف سے سہم گئے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ امیر مسعود اپنے ہی ہاتھ سے بھائی کی گردن اُڑا دے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ امیر مسعود نے بے نیام شمشیر، امیر محمد کے سینے پر رکھ دی اور ایک مغرور فاتح کے لہجے میں بولا۔

''کتابِ اقتدار، نوکِ شمشیر اور انسانی خون کی روشنائی سے لکھی جاتی ہے۔ میں نے اس کتاب سے تیرا نام ہمیشہ کے لیے کھرچ دیا۔''

زنداں میں موجود لوگ اب بھی سمجھ رہے تھے کہ امیر مسعود، بھائی کا کام تمام کر ڈالے گا۔ مگر یہ ساری قیاس آرائیاں تھیں۔ امیر مسعود اسی برہنہ شمشیر کے ساتھ مڑا اور اپنے وزیر ابونصر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''ابونصر! تجھے یاد ہے کہ چند سال پہلے جب میں بے اختیار تھا تو میں نے تجھ سے کیا کہا تھا؟''

ابونصر نے سر جھکایا۔

امیر مسعود نے وہی شمشیر، ابونصر کے سینے پر رکھ دی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کہا تھا کہ قلم کی تحریر سے تلوار کی تحریر زیادہ سچی اور مضبوط ہوتی ہے۔''

ابونصر نے قدرے گردن کو خم کیا اور ایک ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''بے شک! سلطان نے اپنے قول کو سچا کر دکھایا۔''

پھر امیر مسعود نے تلوار نیام میں کر لی اور داروغۂ زنداں سے کہا۔
''امیر محمد میری صورت دیکھنے تک کا روادار نہیں تھا، اس لیے تم اس کی آنکھیں چھین لو تا کہ پھر یہ زندگی بھر اپنی صورت بھی نہ دیکھ سکے۔''
زنداں کی ڈراؤنی فضا کچھ اور بھی پُر ہول ہوگئی۔
وہاں موجود تمام لوگوں کا خیال تھا کہ امیر محمد اس سنگ دلانہ حکم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے رحم کی بھیک مانگے گا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ بس اتنا ہی کہا۔
''مسعود! اگر میں تجھ پر قابو پا جاتا تو اپنے بھائی کے ساتھ اس قدر بے رحمانہ سلوک ہرگز نہ کرتا۔''
امیر مسعود نے بھائی کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا، تیزی سے مڑا اور داروغۂ زنداں کو مخاطب کر کے بولا۔ ''جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو امیر محمد کی آنکھیں بجھا دینا۔ بس میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ اپنے بھائی کی چیخیں نہ سنوں۔''
پھر امیر محمد کی آنکھوں میں جلتی ہوئی سلائیاں پھیر دی گئیں۔ زنداں کا ایک گوشہ انسانی چیخوں سے گونج اٹھا اور امیر محمد کے لیے ساری دنیا تاریک ہوگئی۔
کچھ دن بعد امیر محمد کی دوسری بیوی شمائلہ نے سلطان امیر مسعود سے درخواست کی کہ اسے شوہر کی خدمت کے لیے قید خانے بھیج دیا جائے۔ امیر مسعود نے یہ درخواست قبول کر لی۔ شمائلہ نے ایک دن امیر محمد سے اپنے خواب کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔
''کاش! آپ اُس روز میری بات مان لیتے اور سفر کا ارادہ ملتوی کر دیتے، میں نے خواب میں جن شمعوں کو بجھتے دیکھا تھا، وہ آپ کی دونوں آنکھیں تھیں۔''
یہ کہہ کر شمائلہ نے امیر محمد کے قدموں پر سر رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگی۔
معزول حکمراں کی بے نور آنکھوں میں گزرے زمانے کے کئی خوب صورت مناظر اُبھرنے لگے۔ پھر یادِ ماضی نے امیر محمد کو بھی رُلا دیا۔ ''شمائلہ! تم نے کیسا خواب دیکھا کہ سب کچھ خواب ہوگیا؟''
امیر محمد کے جلتے ہوئے آنسو شمائلہ کے رخساروں کو بھگوتے رہے...... اُس کا پہلا دورِ حکومت صرف پچاس دنوں پر مشتمل تھا۔

❁---❁---❁

سلطان امیر مسعود نے اپنے سب سے بڑے سیاسی حریف، امیر محمد کو اندھا کرنے کے بعد بہت سی یادگار فتوحات حاصل کیں۔ اس نے 422ھ میں کچ اور مکران کو فتح کیا، 424ھ میں ہندوستان پر لشکر کشی کی اور درۂ کشمیر میں داخل ہو کر ''سرتی'' کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ ہانسی کے قلعے کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ وہ دیوتاؤں کی حفاظت میں ہے اس لیے اسے کوئی فتح نہیں کر سکتا۔ مگر سلطان امیر مسعود نے 6 دن کی مختصر ترین مدت میں اس قلعے کو بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد ''سون پت'' کا مضبوط قلعہ بھی اس

کے قبضہ میں آ گیا۔

437ھ میں امیر مسعود نے ایک نیا محل تعمیر کرایا اور اس میں ایک نہایت خوبصورت اور بہت بڑا جڑاؤ تخت بچھوایا۔ تخت کے عین اوپر ایک بے مثال تاج کو سونے کی زنجیروں میں باندھ کر لٹکا دیا گیا۔ اس تاج کا وزن ایک من کے قریب تھا۔ کوئی بھی انسانی سر اتنے بڑے بوجھ کو زیادہ دیر نہیں اٹھا سکتا تھا، اس لیے قصرِ شاہی کے خدمت گار، زنجیروں کو ڈھیلا کر دیا کرتے تھے اور تاج بادشاہ کے سر پر آ کر ٹھہر جاتا تھا۔ اس عمل میں اس ۔ر چابک دستی تھی کہ دیکھنے والوں کو یہی محسوس ہوتا تھا جیسے بادشاہ تاج پہنے ہوئے ہے۔

سلطان امیر مسعود نے اپنی زندگی میں صرف دو بار اس تاج کو پہنا۔ جس طرح امیر محمد کے سر سے تاجِ شاہی کا گرنا بدنصیبی کی علامت بن گیا تھا، اسی طرح امیر مسعود کا تاج بھی اس کے لیے وبالِ جان بن گیا۔

سلطان امیر مسعود کو توسیعِ سلطنت کا بہت شوق تھا۔ وہ پورا سال اپنی فوجوں کو مختلف جنگی مہمات میں اُلجھائے رکھتا تھا۔ نتیجتاً غزنی کے تمام سپاہی اور فوجی افسر آئے دن کی جنگوں سے تنگ آ چکے تھے نیز بیوی بچوں اور وطن کی جدائی بھی اُنہیں ستایا کرتی تھی۔ آخر ایک دن سارے لشکر نے مسعود کے خلاف بغاوت کر دی اور اسے گرفتار کر کے معزول حکمراں امیر محمد کے سامنے پیش کر دیا۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بساطِ سیاست اس طرح اُلٹ جائے گی۔ تمام لوگوں کا خیال تھا کہ امیر محمد اپنے اس بھائی کو کبھی معاف نہیں کرے گا جس نے تاج و تخت کے ساتھ اس کی آنکھوں کی روشنی بھی چھین لی تھی۔ لیکن امیر محمد نے غیر معمولی ظرف کا مظاہرہ کیا۔

"بے شک! آج مجھے تیری موت و زیست پر پورا اختیار ہے مگر میں نہ تجھے قتل کروں گا اور نہ تیری آنکھیں چھینوں گا۔ البتہ تیری نظر بندی میری سیاسی ضرورت ہے۔ تُو اپنی پسند کا قید خانہ منتخب کر لے، وہاں تجھے دنیا کے سارے عیش و آرام میسر ہوں گے۔"

امیر مسعود نے اپنی نظر بندی کے لیے "قلعہ گیری" کا انتخاب کیا۔ جب وہ رباط سے گیری کی طرف روانہ ہوا تو اس کے پاس خرچ کے لیے ایک درہم بھی نہیں تھا۔ امیر مسعود نے ایک آدمی کو امیر محمد کے پاس رقم لانے کے لیے بھیجا۔ امیر محمد نے پانچ سو درہم بھجوا دیئے۔ اس حقیر سی رقم کو دیکھ کر امیر مسعود رو پڑا۔

"سبحان اللہ! کل اسی وقت میرے قبضے میں زر و جواہر سے لدے ہوئے تین ہزار اونٹ تھے.....اور آج میری بدقسمتی کا یہ عالم ہے۔" یہ کہہ کر امیر مسعود نے اپنے ساتھیوں سے ایک ہزار دینار قرض لیے اور پانچ سو درہم اسی شخص کو بطور انعام دے دیئے جو لے کر آیا تھا۔

❁---❁---❁

امیر محمد نے اندھا ہونے کی وجہ سے اپنے بڑے بیٹے امیر احمد کو امورِ سلطنت کا نگراں بنا دیا تھا۔ امیر احمد ایک مخبوط الحواس نوجوان تھا، کبھی کبھی اس کی احمقانہ حرکتوں پر پاگل پن کا گمان ہوتا تھا۔ ایک رات اس پر دورہ پڑا۔ وہ قصرِ شاہی سے نکل کر امیر یوسف اور امیر علی خویشاوند کے بیٹوں کے پاس پہنچا اور

ان سے کہنے لگا۔

''کیا تم اپنے باپ کے قاتل کو فراموش کر چکے ہو؟''

''ہم اُسے کیسے بھول سکتے ہیں؟'' دونوں نے بیک زبان کہا۔

''تو پھر میرے ساتھ آؤ! میں تمہیں ایسا تماشا دکھاتا ہوں جسے دیکھ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔''

پھر امیر احمد ان دونوں کو لے کر قلعہ گیری میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد چند سپاہی امیر مسعود کو لے کر ایک ویران مقام کی طرف جا رہے تھے۔

''تم لوگ مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟'' امیر مسعود نے چیخ کر کہا۔

''عزت مآب! آپ قلعے میں پڑے پڑے اُکتا گئے ہوں گے، اس لیے آپ کو کسی پُر فضا مقام کی ضرورت ہے۔'' ایک سپاہی نے تمسخر آمیز لہجے میں جواب دیا۔

امیر مسعود نے کسی بڑے خطرے کی بُو سونگھ لی تھی، مگر وہ بے دست و پا تھا۔ اس لیے خاموش رہا۔

پھر یہ سفر تمام ہوا۔ مسلح سپاہی، امیر مسعود کو لے کر ایک کنوئیں پر پہنچے۔ امیر احمد اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہلے سے موجود تھا۔

''مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟'' امیر مسعود نے بھتیجے سے پوچھا۔

''آپ کی مشکلات آسان کرنے کے لیے محترم چچا!'' جنگل کی سیاہ رات میں امیر احمد کا ہذیانی قہقہہ گونجا۔

پھر دوسرے ہی لمحے امیر مسعود کو گہرے کنوئیں میں پھینک دیا گیا۔

''اسے مٹی اور پتھروں سے پاٹ دو۔'' امیر احمد نے سپاہیوں کو حکم دیا اور گھوڑے پر بیٹھ کر قصرِ شاہی کی طرف روانہ ہو گیا۔



شیطان

یہ 150ھ کا واقعہ ہے۔

سمرقند کے قریب نشیب کے علاقے میں ہزاروں انسان جمع تھے۔ وہ ایک وسیع و عریض میدان میں کھڑے اس شخص کا انتظار کر رہے تھے، جو فانی انسان ہوتے ہوئے بھی خدائی کا دعویدار تھا۔ شوقِ دیدار کے ساتھ لوگوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

آخر کشمکشِ انتظار ختم ہوئی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کے مترنم شور سے پورا میدان گونج اُٹھا۔ تمام لوگ اس سواری کی طرف متوجہ ہو گئے جو بڑی شان سے میدان میں داخل ہوئی تھی۔

دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ گاڑی کو چار عربی النسل سفید گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ درمیان میں ایک پستہ قد شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے چار مسلح محافظ کھڑے تھے۔ اس مخصوص گاڑی کے دائیں بائیں اور عقب میں مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ تھا۔

انسانی ہجوم کسی کے کہے بغیر خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تا کہ آنے والی گاڑی کسی دشواری کے بغیر اس تخت تک پہنچ جائے جسے ایک بلند ٹیلے پر بچھایا گیا تھا۔

آخر وہ پستہ قامت شخص گاڑی سے نیچے اُترا اور چند سیڑھیوں کا فاصلہ طے کر کے اس تخت تک پہنچا جسے مختلف رنگوں کے خوب صورت ریشمی کپڑوں سے سجایا گیا تھا۔ مسلح سپاہی سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ پستہ قد شخص تخت پر کھڑا ہوا۔ تمام سپاہی عقب سے نکل کر سامنے آئے اور سجدے میں چلے گئے۔

پستہ قامت شخص نے ایک نظر سجدہ ریز سپاہیوں کو دیکھا اور اپنا دایاں ہاتھ اس طرح بلند کر دیا جیسے اُس نے سجدہ گزاروں کی بندگی قبول کر لی ہے۔ پھر وہ تمام سپاہی سیدھے ہوئے اور اس پستہ قامت شخص کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے۔

سپاہیوں کے رسمِ سجدہ ادا کرتے ہی تخت کے نیچے اگلی قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں نے اپنے سر زمین پر رکھ دیئے۔

پستہ قامت شخص نے اسی طرح اپنا ہاتھ بلند کیا اور اونچی آواز میں سجدہ گزاروں کو مخاطب کرتے

ہوئے کہا۔ ''اُٹھو کہ تمہارے سجدے قبول کیے گئے۔''

سجدہ گزار لوگ کھڑے ہو گئے۔ پستہ قامت شخص دوبارہ ان سے مخاطب ہوا۔ ''سلامتی ہے ہر شخص کے لیے جس نے میری بندگی قبول کی۔''

سجدہ گزاروں کی جماعت نے ایک پُر جوش نعرہ بلند کیا جس سے پورا میدان گونج اُٹھا۔

''بے شک! تُو ہمارا خدا ہے اور ہم تیرے راسخ العقیدہ بندے۔''

انسانی ہجوم نے حیرت سے ان لوگوں کی طرف دیکھا جو ایک پستہ قامت شخص کی خدائی کا اقرار کر رہے تھے۔ پھر ہجوم کی نظریں اس شخص کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں جو خدائی کا دعویدار تھا۔ پستہ قامت شخص اپنے چہرے پر سنہری نقاب ڈالے ہوئے تھا جس کے باعث اس کے خدوخال پردے میں تھے۔

''ہم تیری خدائی کو تسلیم نہیں کرتے۔'' انسانی ہجوم نے چیخ کر کہا۔ ''اگر تُو خدا ہے تو کوئی روشن دلیل پیش کر۔''

''صبر کرو۔'' نقاب پوش نے ہجوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ذرا سورج کو غروب ہو جانے دو۔ پھر تم کھلی آنکھوں سے میری خدائی کی روشن دلیل دیکھو گے۔''

کچھ دیر بعد سورج غروب ہو گیا۔ لوگ کھلے آسمان کے نیچے حیران و پریشان کھڑے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نقاب پوش کون سی دلیل پیش کرنا چاہتا ہے؟ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا اور پھر چودھویں کا چاند طلوع ہونے لگا۔

نقاب پوش نے پکار کر کہا۔ ''یہ اس خدا کا پیدا کیا ہوا چاند ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ اسی خدا نے مجھے اپنا نمائندۂ خاص بنا کر زمین پر بھیجا ہے اور بے پناہ قوتیں بخشی ہیں۔''

''پھر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرو۔'' انسانی ہجوم نے چیخ کر کہا۔

''کوہِ سیام کی چوٹی کی طرف دیکھو۔'' نقاب پوش نے بلند آواز میں کہا۔

کوہِ سیام، نقاب پوش کی پشت پر تھا اور انسانی ہجوم کے سامنے۔ نقاب پوش کی ہدایت کے مطابق لوگوں نے کوہِ سیام کی چوٹی کی طرف دیکھا۔ ایک حیرت انگیز منظر، ہجوم کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ کبھی وہ چودھویں کے چاند کی طرف دیکھتے تھے..... اور کبھی دوسرے چاند کی طرف جو آہستہ آہستہ کوہِ سیام کے عقب سے اُبھر رہا تھا۔ دوسرا چاند بھی اپنے حجم میں چودھویں کے برابر تھا اور اس کی روشنی میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔

''غور سے دیکھو۔'' نقاب پوش نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔ ''یہ میرا بنایا ہوا چاند ہے..... اور یہی میرے خدا ہونے کی دلیل ہے۔''

انسانی ہجوم پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ کبھی وہ اپنی آنکھوں کو ملتے اور کبھی نقاب پوش کی طرف دیکھتے جو کافوری شمعوں کی روشنی میں بہت پُراسرار نظر آ رہا تھا۔

''تم اپنی کھلی آنکھوں سے میری خدائی کی روشن دلیل دیکھ چکے۔'' نقاب پوش نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم میری خدائی کو تسلیم کرلو گے تو ہمیشہ میرے کرم کے سائے میں رہو گے...... ورنہ تم پر نئے نئے آفات و مصائب نازل ہوتے رہیں گے۔'' یہ کہہ کر نقاب پوش تخت سے اُترا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔

انسانی ہجوم کچھ دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر بہت سے لوگ پُرجوش انداز میں نعرے لگانے لگے۔

''بے شک! وہ اس زمین پر خدا کا نمائندۂ خاص ہے..... ورنہ نیا چاند کس طرح تخلیق کرسکتا تھا؟''

یہ نیا چاند روزانہ مغرب کے بعد طلوع ہوتا اور ایک خاص مقام پر آ کر ٹھہر جاتا۔ بہت سے لوگ یہ منظر دیکھتے اور نقاب پوش کی روحانی طاقت کے قائل ہو جاتے۔

کچھ لوگوں نے رات بھر اس میدان میں ٹھہر کر اس چاند کا مشاہدہ کیا۔ قدرتی چاند اور نقاب پوش کے پیدا کردہ نئے چاند میں بنیادی فرق یہ تھا کہ وہ کوہِ سیام کی چوٹی سے بلند ہو کر ایک مخصوص بلندی پر قائم ہو جاتا۔ پھر رات کے پچھلے پہر وہ آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف لوٹنے لگتا۔ یہاں تک کہ کوہِ سیام کے عقب میں غائب ہو جاتا۔

لوگ اس سے سوال کرتے۔ ''یہ کیسا چاند ہے جو ایک مخصوص زاویے سے ایک مخصوص جگہ پر قائم ہو جاتا ہے۔ وہ مشرق سے طلوع ہو کر مغرب کی جانب سفر کیوں نہیں کرتا؟ اس کا حجم گھٹتا بڑھتا کیوں نہیں؟ وہ ہلال (پہلی تاریخ کا چاند) کیوں نہیں بنتا؟''

نقاب پوش بڑی ذہانت سے ہر سوال کا ایک ہی جواب دیتا۔

''میں وہ خدا نہیں ہوں جو آسمانوں میں ہے۔ میں تو اس زمین پر اُس کا نائب ہوں۔ مجھے بس اسی قدر قوت بخشی گئی ہے۔ اگر تم میری طاقت پر شک کرتے ہو تو پھر ایسا کوئی دوسرا شخص ڈھونڈ لاؤ۔''

بعض لوگ نقاب پوش کی دلیل سن کر اس پر ایمان لے آتے اور اسے خدائی کا شریک سمجھنے لگتے.... مگر کچھ افراد حجت کرنے لگتے۔ ''یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔''

لوگوں کے اعتراضات سن کر نقاب پوش برہم ہو جاتا اور انتہائی غضب ناک لہجے میں کہنے لگتا۔

''اگر یہ جادو ہے تو پھر ایسا کوئی دوسرا جادوگر تلاش کرلو..... اور تم ہرگز تلاش نہیں کرسکو گے۔''

لوگ مزید حجت کرتے تو نقاب پوش کے مسلح عقیدت مند ان پر ٹوٹ پڑتے۔ ''خدا کے نائب کی تحقیر کرنے والوں کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔'' پھر ان لوگوں کو اس قدر زدوکوب کرتے کہ اُن کی ہڈیاں ٹوٹ جاتیں اور وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جاتے۔ بعض افراد زخموں کی تاب نہ لا کر دنیا سے گزر جاتے۔

آخر وہ لوگ خاموش ہو گئے جو نقاب پوش کی خدائی طاقتوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس کم نظر اور جاہل افراد اس کے حلقۂ اثر میں شامل ہو گئے اور علی الاعلان نقاب پوش کو خدا کا نائب تصور کرنے لگے۔

کچھ لوگوں نے اس راز کو جاننے کی کوشش کی کہ نقاب پوش کا بنایا ہوا چاند کہاں سے طلوع ہوتا ہے اور کہاں غروب ہو جاتا ہے؟ وہ لوگ کوہِ سیام کی چوٹی پر چڑھ کر نشیب میں اُترنا چاہتے تھے تاکہ حقائق سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ مگر اُنہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ کوہِ سیام کی گھاٹی میں نقاب پوش کے سینکڑوں مسلح سپاہی ہر وقت گشت کرتے رہتے تھے۔ اگر اس علاقے میں کوئی مشکوک شخص نظر آ جاتا تو اسے قتل کر کے ایک ویران گوشے میں دفن کر دیا جاتا۔ اس تحقیق و جستجو میں کئی لوگ اپنی جان سے جا چکے تھے۔ انجام کار وہ لوگ خاموش ہو کر اپنے گھروں میں بیٹھ گئے جو نقاب پوش کی حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتے تھے۔

یہ نقاب پوش، حکیم مقنع خراسانی تھا جس نے مصنوعی چاند بنا کر توہم پرست اور کمزور عقائد رکھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں ہلچل مچا دی تھی۔

❀---❀---❀

حکیم مقنع خراسانی، مرو کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ بعض مؤرخین کے مطابق اس کا خاندانی نام ''ہشام'' تھا۔ مگر اکثر تاریخ نویسوں نے اسے ''عطا'' کے نام سے یاد کیا ہے۔

عطا کا خاندانی پس منظر نا قابلِ ذکر تھا۔ پیشے کے اعتبار سے اس کے باپ دادا دھوبی تھے۔ عطا نے اسی گھرانے میں آنکھ کھولی جو عزت و توقیر سے بھی محروم تھا اور بے سروساماں بھی۔ عطا ظاہری طور پر ایک بدہیئت لڑکا تھا۔ اس کی ایک آنکھ بچپن ہی میں ضائع ہو چکی تھی۔ وہ سیاہ فام بھی تھا اور پستہ قد بھی۔

جب عطا سات آٹھ سال کا ہوا تو محلے کے بچے اُس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ وہ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا مگر محلے کے بچے اسے مار کر بھگا دیا کرتے تھے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ جب عطا اپنے ہم جولیوں کے قریب جانے کی کوشش کرتا تو تمام لڑکے یہ کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوتے۔

''کانا آ رہا ہے، اس سے بچو۔ کہیں وہ ہمیں بھی عیب دار نہ بنا دے۔''

عطا اپنے محلے کے لڑکوں کا یہ تحقیر آمیز سلوک دیکھ کر اُداس ہو جاتا۔ گھنٹوں ایک سنسان گوشے میں بیٹھا اپنی حالت پر کڑھتا رہتا۔ پھر یکایک اس کے جسم میں نفرت اور غصے کی ایک تیز لہر اُٹھتی اور وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگتا۔

''وقت آنے دو۔ پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ میں کون ہوں؟ آج تم مجھے ذلیل کر رہے ہو، کل میں تمہیں ذلیل کروں گا۔''

عطا کے معصوم ذہن پر بچپن کے یہ مناظر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ فطرتاً نہایت ذہین لڑکا تھا۔ سات آٹھ سال کی عمر میں اپنے باپ سے عجیب عجیب سوال کیا کرتا تھا۔ جاہل دھوبی اپنے بیٹے کے سوالوں کا کیا جواب دیتا؟ آخر تنگ آ کر عطا کو جھڑک دیتا۔

''تُو پاگل ہو گیا ہے جو ایسی باتیں سوچتا ہے؟ اپنے کام سے کام رکھ۔ پابندی سے گھاٹ پر جایا کر اور

کپڑوں کو صاف صاف دھویا کرتا کہ ہمارے خاندانی پیشے کی مہارت برقرار رہے۔"

عطا، باپ سے صاف صاف کہہ دیتا۔ "دھوبیوں کا پیشہ ایک بُرا پیشہ ہے۔ لوگ اسی وجہ سے ہماری عزت نہیں کرتے۔"

باپ اپنے کم سن بیٹے کی بات سن کر بھڑک اُٹھتا۔ "دھوبی کا بیٹا دھوبی ہی ہوتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

عطا بڑی بے باکی سے جواب دیتا۔ "مگر میں ایک دھوبی کا بیٹا نہیں بنوں گا۔"

"پھر تُو کیا بنے گا؟" باپ غضب ناک ہو جاتا۔

"میں بادشاہ سے بھی بڑا بنوں گا۔" عطا پُر جوش لہجے میں کہتا۔

عطا کی یہ سرکشی دیکھ کر باپ اُسے پیٹنے لگتا۔ "تُو نے اپنی شکل دیکھی ہے؟...... بادشاہوں کی صورت ایسی ہوتی ہے؟"

عطا مار کھاتا رہتا اور اس کی زبان ایک ہی جملے کی گردان کرتی رہتی۔ "میں بادشاہ سے بھی بڑا بنوں گا۔"

باپ اُسے زبردستی گھاٹ پر لے کر جاتا مگر موقع ملتے ہی عطا بھاگ کھڑا ہوتا۔ پھر کسی عالم و فاضل شخص کی درس گاہ میں داخل ہو جاتا اور دست بستہ استاد سے درخواست کرنے لگتا۔

"میرا باپ مجھے دھوبی بنانا چاہتا ہے اور میں علم سیکھنا چاہتا ہوں۔"

اساتذہ ترس کھا کر اسے اپنی درس گاہوں میں بیٹھنے کی اجازت دے دیتے۔ پھر آہستہ آہستہ استادوں پر عطا کی ذہانت کے جوہر کھلنے لگے۔ وہ اپنے ہم عمر طالب علموں سے کہیں زیادہ ذہین تھا۔ اس کی قوتِ حافظہ غضب کی تھی۔ جس بات کو ایک بار سن لیتا، وہ ہمیشہ کے لیے اس کے دماغ میں محفوظ ہو جاتی۔ نتیجتاً اساتذہ بھی اس پر مہربان ہوتے چلے گئے۔

اس دوران کئی مرتبہ اس کا باپ درس گاہوں میں پہنچا اور عطا کے اساتذہ سے شکایتیں کرنے لگا۔

"میرے بیٹے کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے اور وہ اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر آپ لوگوں کو پریشان کر رہا ہے۔"

اساتذہ نے دھوبی کی کوئی بات نہیں سنی اور اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

"تیرا بیٹا پاگل نہیں ہے۔ تُو اُس کی عقل کی سطح کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے خاموش رہ اور اس کے راستے سے ہٹ جا۔ ایک دن آئے گا کہ تیرے بیٹے کا علم تجھے غربت، گمنامی اور بے توقیری کے دُکھوں سے نجات دیدے گا۔"

اساتذہ کی بات سن کر جاہل دھوبی اپنے بیٹے سے مایوس ہو گیا اور عطا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

❀---❀---❀

عطا دن رات اساتذہ کی خدمت میں حاضر رہتا۔ اُن کی جوتیاں اُٹھاتا اور گھریلو کام انجام دیتا۔ یہاں تک کہ وہ تمام استادوں کی نظروں کا مرکز بن گیا۔ عطا کے لیے حصولِ علم کا جذبہ جنون کی کیفیت

اختیار کر گیا تھا۔ وہ رات رات بھر درس گاہوں میں پڑا رہتا اور نادر و نایاب کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا۔ جب کسی مسئلے میں اُلجھ جاتا تو اساتذہ سے اس وقت تک بحث کرتا رہتا، جب تک کہ وہ مسئلہ پوری طرح حل نہ ہو جاتا۔ کوئی استاد نہیں جانتا تھا کہ اس کریہہ المنظر نوجوان کے دل میں کیا ہے؟ وہ تو بس اس کے شوقِ علم کو دیکھتے تھے...... نیتجتاً ہر استاد چاہتا تھا کہ وہ اپنے سینے میں چھپے ہوئے اسرار و رموز شاگرد پر ظاہر کر کے علم کی امانت عطا کو منتقل کر دے۔

بیس پچیس سال کی اَن تھک محنت کے بعد عطا نے حکمت اور فلسفے میں اس قدر کمال حاصل کر لیا کہ ان علوم میں دُور دُور تک اُس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اُس نے عجیب عجیب ایجادات کیں اور بڑے بڑے حکماء کو حیرت زدہ کر دیا۔ عطا نے ایک ایسا نسخہ بھی تلاش کر لیا تھا، جسے استعمال کرنے کے بعد بوڑھے لوگ اپنے اندر جوانوں جیسی طاقت محسوس کرنے لگتے تھے۔ یہ ایک خطرناک نسخہ تھا۔ اس دوا کے اثرِ مقدم سے انسانی جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑ جاتی تھی۔ مگر جب اس کا اثرِ ثانی ظاہر ہوتا تھا تو لوگوں کی موت واقع ہو جاتی تھی۔ الغرض عطا نے اس نسخے سے غیر معمولی شہرت حاصل کی اور اس کے دروازے پر طلب گاروں کا ہجوم رہنے لگا۔

دھوبی باپ، بیٹے کی اس کامیابی سے بہت خوش تھا۔ چند سکّوں کے عوض لوگوں کے کپڑے دھونے والا اب ایک مال دار شخص بن چکا تھا۔ بڑے بڑے اُمراء عطا کے پاس آتے اور ''دوائے شباب'' کے بدلے سینکڑوں ہزاروں دینار دے کر چلے جاتے۔ نیتجتاً چند سالوں کے اندر اندر عطا کے قدموں میں دولت کا ڈھیر لگ گیا۔

❀---❀---❀

خراسان اور اس کے گرد و نواح میں حکیم عطا کی شہرت عام ہو چکی تھی مگر لوگ دلی طور پر اس سے نفرت کرتے تھے۔ اور اس نفرت کی وجہ عطا کا مکروہ چہرہ تھا۔ سیاہ رنگ، پستہ قامتی اور ایک آنکھ سے محرومی..... ان تینوں چیزوں نے مل کر اس کی شخصیت کو انتہائی ناپسندیدہ بنا دیا تھا۔ جب بھی عطا کا ذکر آتا تو لوگ اُسے حکیم کانا کہہ کر پکارتے۔ پھر جب یہ خبریں اس کے کانوں تک پہنچتیں تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ آخر کئی ماہ تک غور و فکر کرنے کے بعد اس نے اپنی بدصورتی کا علاج بھی تلاش کر لیا۔

وہ ایک ہفتے تک اپنے مکان کے ایک کمرے میں روپوش رہا۔ کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب ضرورت مند لوگ حکیم عطا سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کرتے تو اس کے ملازمینِ خاص صاف صاف کہہ دیتے۔

''حکیم صاحب ریاضت میں مصروف ہیں۔ جب ان کا یہ عمل ختم ہو جائے گا تو وہ لوگوں کو دیدارِ عام کرائیں گے۔''

اس خبر نے لوگوں کے اشتیاق میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

پھر آٹھ دن کی روپوشی کے بعد حکیم عطا خلوت سے باہر آیا۔ حیرت کی شدت سے دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اب ان کی نظروں کے سامنے ایک سنہری چہرے والا انسان کھڑا تھا۔ حکیم عطا اپنی پست قامتی کا علاج تو نہ کر سکا مگر اس نے اپنے مکروہ چہرے کو بدل ڈالا تھا۔

اب حکیم کانا، سونے کے ایک خوبصورت چہرے کے ساتھ مجلس میں نمودار ہوا کرتا تھا۔ عطا نے بڑی مہارت سے اس نئے چہرے کے نقش و نگار تراشے تھے، پھر اسے اپنے بدنما چہرے پر چسپاں کر لیا۔ حکیم عطا کا یہ نیا چہرہ مصنوعی تو لگتا تھا مگر پھر بھی اس میں ایک جاذبیت سی تھی......اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نئے چہرے نے پرانے چہرے کی تمام تر بدنمائی پر پردہ ڈال دیا تھا۔

عربی زبان میں ''مقنع'' نقاب پوش کو کہتے ہیں۔ نیا چہرہ سجانے کے بعد حکیم عطا، حکیم مقنع خراسانی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

❁---❁---❁

اپنے چہرے کو نقاب میں چھپانے کے بعد حکیم مقنع کے عیار ذہن نے نئی کروٹ لی۔ وہ بچپن میں اپنے دھوبی باپ سے کہا کرتا تھا۔ ''میں بادشاہ سے بھی بڑا بنوں گا۔'' اپنی اسی خواہش کے مطابق اس نے خوفناک منصوبہ بندی کی۔ حکیم مقنع نے بت پرستوں کے ''عقیدۂ تناسخ'' کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔

تناسخ کا فلسفہ خالص مشرکانہ فلسفہ ہے۔ سائنسی ترقی کے باوجود ہندوستان کے بے شمار لوگ اس فلسفے پر یقین رکھتے ہیں۔ عقیدۂ تناسخ کے مطابق ایک انسان مرنے کے بعد بار بار پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص نے پہلے جنم میں اچھے اعمال کیے ہیں تو وہ دوسرے جنم میں کسی اچھے انسان کی شکل میں دوبارہ پیدا ہو گا۔ اس کے برعکس جو شخص اپنی زندگی میں بدکرداری کا مرتکب رہا ہے تو اسے دوسری زندگی میں کتا بھی بنایا جا سکتا ہے۔ مختصراً یہ کہ ''آواگون'' کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے، جب تک انسانی روح کو مکتی (نجات) حاصل نہ ہو جائے۔

چونکہ حکیم مقنع خراسانی فطرتاً ایک خبیث انسان تھا، اس لیے اس نے عقیدۂ تناسخ کا سہارا لیا اور ایک دن ہزاروں انسانوں کے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''لوگو! میں تمہارے لیے ایک خاص خبر لے کر آیا ہوں۔ میری باتیں غور سے سنو۔ اگر تم نے میرے احکام و ہدایات پر خوش دلی سے عمل کیا تو فلاح و نجات پا جاؤ گے۔''

حکیم مقنع خراسانی کا اعلان سن کر انسانی ہجوم پر سناٹا چھا گیا۔ تاہم کچھ لوگوں نے بلند آواز میں سنہری چہرے والے شخص سے سوال کیا۔

''تم کون ہو؟ اور وہ کون سی خاص خبر ہے جس میں ہماری نجات پوشیدہ ہے؟''

''میں خدا کا نمائندۂ خاص ہوں۔'' حکیم مقنع خراسانی نے پُرجلال لہجے میں کہا۔ اساتذہ کی خدمت میں رہ کر اس نے تقریر کے فن میں اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ سننے والے مسحور ہو کر رہ جاتے تھے۔

''خدا اپنی زمین کو کبھی خالی نہیں چھوڑتا۔ وہ ہر دور میں اپنے نمائندے بھیجتا رہتا ہے تا کہ غم زدہ انسانیت نجات حاصل کر سکے۔''

''تمہارا یہ دعویٰ کوئی دلیل بھی رکھتا ہے؟'' انسانی ہجوم میں سے چند آوازیں اُبھریں۔

حکیم مقنع نے خود کو خدا کا نمائندۂ خاص ثابت کرنے کے لیے بڑا ہولناک جھوٹ بولا۔

''خدا سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اگر خداوند ذوالجلال، حضرت آدم علیہ السلام کی صورت میں نمودار نہ ہوتا تو فرشتے کبھی غیر اللہ کو سجدہ نہ کرتے..... اور نافرمانی کے باعث ابلیس قیامت تک کے لیے مردود قرار نہ پاتا۔''

حکیم مقنع کی دلیل سن کر کم نظر لوگوں کے عقائد کی عمارت لرزنے لگی۔

چند افراد نے اس دلیل کے خلاف احتجاج کیا تو حکیم مقنع کے پرستاروں نے جبراً اُن کی زبانیں بند کر دیں۔

''آدم علیہ السلام کے بعد حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی صورت میں حلول کیا۔ پھر یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ انجام کار خدا، ابو مسلم خراسانی کی شکل میں نمودار ہوا۔ ان کے گزر جانے کے بعد خدا مجھ میں حلول کر گیا ہے۔ اب میں ہی اس زمین پر خدا کا اوتار (نمائندہ) ہوں۔ میرا اقرار تم پر ہدایت وخوش حالی کے راستے کھول دے گا...... اور انکار کرنے والوں کے لیے دونوں جہان میں شدید عذاب و رُسوائی ہے۔''

حکیم مقنع کے اس اعلان نے خراسان اور گرد و نواح کے علاقوں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ جاننے والے جانتے تھے کہ عباسی خلیفہ منصور نے ابو مسلم خراسانی کو نہایت دردناک سزا دینے کے بعد قتل کرا دیا تھا۔ مگر جاہل لوگوں کی اکثریت اس راز سے بے خبر تھی، اس لیے وہ حکیم مقنع کے فریب میں آ گئی۔

پھر یہ مطالبہ زور پکڑ گیا کہ اگر حکیم مقنع خدا کے اوتار ہونے کا مدعی ہے تو پھر وہ لوگوں کے سامنے کوئی روشن دلیل پیش کرے۔

حکیم مقنع خراسانی، حکمت اور فلسفے کے ساتھ ساتھ سحر اور طلسمات کا بھی ماہر تھا۔ اس نے پارے اور دیگر دھاتوں کے مرکب سے ایک چاند بنایا۔ اس چاند کو نخشب کے ایک طویل و عریض کنویں کی تہہ میں رکھا گیا تھا۔ شام ہوتے ہی یہ مصنوعی چاند کنوئیں کی گہرائی سے اُبھرتا اور پھر کوہِ سیام کی چوٹی سے چند گز کے فاصلے پر آ کر ٹھہر جاتا۔ اس کا حجم چودھویں کے چاند کے برابر تھا اور روشنی بھی قدرتی چاند سے ملتی جلتی تھی۔ حکیم مقنع کا بنایا ہوا یہ چاند ایک مخصوص طلسم کے زیر اثر تھا۔ رات بھر چمکنے کے بعد، آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف لوٹنے لگتا اور پھر ''چاہِ نخشب'' کی تہہ میں اُتر جاتا۔

مقنع کی اس حکیمانہ شعبدہ بازی نے جاہل اور کم نظر لوگوں کے عقائد کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ مصنوعی چاند کو دیکھ کر بہت سے لوگ اسے خدا کا اوتار سمجھنے لگے تھے۔ نتیجتاً گمراہی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو

گیا۔ خراسان اور اس کے نواحی علاقے میں اسلام داخل ہو چکا تھا مگر یہاں کے قدیمی باشندے عقائد کے اعتبار سے آتش پرست تھے۔ ابھی وہ اسلامی تعلیمات سے پوری طرح واقف بھی نہیں ہوئے تھے کہ مختلف فتنے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چند سال پہلے اسی علاقے سے ابومسلم خراسانی جیسا فتنہ گر اُٹھا اور اُس نے ہزاروں نومسلموں پر جبر و تشدد کر کے اُنہیں اُن کے آبائی مذہب کی طرف لوٹا دیا تھا۔

حکیم مقنع نے بھی اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا اور ہزاروں مجبور انسانوں کو اپنے آگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنے خطبات میں علی الاعلان کہا کرتا تھا۔

''یہ زمانہ صرف میرا زمانہ ہے۔ حق تعالیٰ اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ میری ذات میں جلوہ گر ہے۔ میں اس صدی کا اوتار ہوں، اس لیے ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ مجھے سجدہ کرے اور میری ہی پرستش کرے تاکہ فلاحِ ابدی کا مستحق قرار پائے۔''

جن لوگوں تک اسلام کی حقیقی روشنی نہیں پہنچی تھی یا جن کے دلوں میں ٹیڑھ تھی یا وہ لوگ جنہوں نے قومی عصبیت کی بنیاد پر اسلامی تعلیمات کو قبول نہیں کیا تھا، وہ آنکھیں بند کر کے حکیم مقنع خراسانی کے سامنے سجدہ ریز ہونے لگے۔ چند سالوں میں اس کے پیروکاروں کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

❀---❀---❀

انسانی فطرت میں گناہ کا جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ اس پر زہد و تقویٰ اور تزکیۂ نفس کے ذریعے ہی قابو پایا جا سکتا ہے۔ حکیم مقنع خراسانی نے بنی نوع آدم کی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ اپنے خطبات میں برملا کہا کرتا تھا۔

''میں تمہیں دونوں جہان میں عیش و عشرت کی خبر سنانے آیا ہوں۔ تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جو چیز تمہیں پسند آئے، وہ کھاؤ..... اور جو مشروب تمہیں کیف و سرور بخشے، اسے بے دریغ پیو۔''

اپنے اسی فلسفے کے تحت حکیم مقنع نے شراب کے ساتھ ساتھ مردار اور سؤر کے گوشت کو بھی حلال قرار دے دیا تھا۔ اس فتنہ گر انسان نے مزید ستم یہ کیا کہ مرد و زن کے رشتوں کو ہر ضابطۂ اخلاق سے آزاد کر دیا۔ اب کسی پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ تمام عورتیں اور مرد آزاد تھے۔ اس بے لگامی کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ کمزور گھرانوں کی خوب صورت عورتیں طاقتور مردوں کی ہوس کا شکار بننے لگیں۔ اگر کوئی ستم رسیدہ یا مجبور عورت حکیم مقنع کے پاس شکایت لے کر جاتی تو وہ خبیث فطرت انسان صاف صاف کہہ دیتا۔

''میں نے دنیا بھر کی لذتیں اپنے ماننے والوں کے لیے حلال کر دی ہیں۔ گناہ یہ نہیں کہ تم نے شراب پی یا جنسی عمل میں ملوث ہو گئے...... دراصل گناہ یہ ہے کہ تم مجھے فراموش کر دو۔ جو شخص میرا تصور کرے گا، اسے نجات حاصل ہو جائے گی۔ چاہے وہ دنیا کی نظروں میں کتنا بھی گناہ گار ہو۔''

حکیم مقنع کے پیروکار دنیا کی ہر برائی میں ملوث تھے لیکن وہ ایک گوشے میں بیٹھ کر مراقبہ کیا کرتے تھے...... اور مراقبے میں حکیم مقنع کا تصور کیا کرتے تھے...... اور یہی تصور ان کی سب سے بڑی عبادت

تھی۔ اور اسی عبادت کو وہ اپنے لیے باعثِ نجات سمجھتے تھے۔

حکیم مقنع خراسانی کا پیش کردہ مذہب دنیا کا سب سے آسان اور لذت کوش مذہب تھا۔ اسی لیے اس کے پرستاروں کی تعداد بہت تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کے ماننے والے شدتِ جذبات میں بے قرار ہو جاتے تھے اور برسرِ مجلس مطالبہ کیا کرتے تھے۔

''اے ہمارے معبود! کبھی اپنے حقیقی رنگ اور خدوخال کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ تاکہ ہماری پیاسی آنکھیں تیری خدائی کے نور سے سیراب ہو سکیں۔''

حکیم مقنع اپنے پرستاروں کا یہ مطالبہ سنتا اور تنبیہہ آمیز لہجے میں کہتا۔ ''نادانی کی باتیں مت کیا کرو۔ تمہیں جو کچھ بتایا گیا ہے، اسی پر یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ عمل کرتے رہو۔''

پھر جب پرستاروں کی طرف سے رونمائی کا مطالبہ زور پکڑنے لگتا تو حکیم مقنع غضب ناک ہو جاتا۔ ''یاد رکھو کہ بندہ ہر حال میں بندہ ہوتا ہے اور خدا ہر رنگ میں خدا۔ تم میں کس کی آنکھ ہے جو میرے دیدار کی تاب لا سکے؟''

حکیم مقنع کے عقیدت مندانِ خاص چیخنے لگتے۔ ''کوئی نہیں...... کوئی نہیں۔''

حکیم مقنع کا لہجہ کچھ اور قہر آلود ہو جاتا۔ ''میں نے تمہاری اور اس دنیا کی بھلائی کے لیے اپنے چہرے پر نقاب ڈالا ہے۔ اگر میں بے نقاب ہو جاؤں تو قیامت سے پہلے قیامت نازل ہو جائے گی...... اور میرا نور زمین و آسمان کو جلا کر خاکستر کر دے گا۔''

حکیم مقنع کا یہ غضب ناک رنگ دیکھ کر اس کے پرستار سہم جاتے۔ پھر آہستہ آہستہ رونمائی کا مطالبہ بھی ختم ہوتا چلا گیا اور لوگ اس بات پر ایمان لے آئے کہ وہ واقعی خدا کا اوتار ہے۔ اس کے ہزاروں مسلح سپاہی سادہ لباسوں میں گلی گلی گھومتے رہتے تھے۔ اگر کسی گھر میں بغاوت کے آثار نظر آتے تو وہ جابر وہ سفاک لوگ اہلِ خانہ کو بند کر کے گھر میں آگ لگا دیتے۔

حکیم مقنع کے پیروکاروں نے اہلِ دنیا کو دھوکا دینے کے لیے جگہ جگہ مسجدیں تعمیر کرائی تھیں..... مگر ان میں کوئی نماز نہیں پڑھتا تھا۔ کیونکہ حکیم مقنع نے یہ احکام جاری کر دیئے تھے کہ اس کے ماننے والے نماز اور روزے کی قید سے آزاد ہیں۔ ان مسجدوں کے تعمیر کرانے کی ایک خاص وجہ تھی۔ مقنع کے پیروکار، مسلمانوں پر نظر رکھنا چاہتے تھے۔ اگر کوئی پردیسی مسلمان بھولے بھٹکے ادھر آ نکلتا تو خبیثوں کا یہ گروہ اہلِ ایمان کو نماز کی حالت میں قتل کر دیتا...... اور پھر اُس کی لاش جنگل کے کسی ویران گوشے میں سپردِ خاک کر دی جاتی۔

حکیم مقنع کی بدکرداری کا یہ عالم تھا کہ وہ سؤر کا گوشت کھاتا اور کھلے عام شراب پیتا۔ وہ ان دونوں چیزوں کو دنیا کی سب سے بڑی نعمتیں تصور کرتا۔ اس کے مذہب میں نکاح کی کوئی حیثیت نہیں تھی، وہ خراسان کی تمام عورتوں پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس کے خصوصی کارندے، خوب صورت لڑکیوں کی تلاش میں

قریہ قریہ گھومتے رہتے تھے۔ پھر جہاں بھی انہیں کوئی خوبصورت دوشیزہ نظر آتی، اُسے پیغام دیتے کہ وہ ہنسی خوشی حکیم مقنع کے حرم میں داخل ہو جائے۔ اگر لڑکی انکار کرتی تو خبیثوں کی یہ جماعت اسے زبردستی اُٹھا کر لے جاتی۔ اس طرح حکیم مقنع خراسانی کے حرم میں سینکڑوں خوب صورت عورتیں داخل تھیں۔ اس کے بہت سے بچے تھے، جن کے وہ نام تک نہیں جانتا تھا۔

حکیم مقنع کی بیویوں میں ایک مسلمان لڑکی سلیمہ بھی شامل تھی۔ سلیمہ ایک حسین و جمیل دوشیزہ تھی..... اور اس کا یہی حُسن اس کے لیے سب سے بڑا عذاب بن گیا تھا۔ سلیمہ نے بڑی مزاحمت کی مگر وہ ایک کمزور لڑکی تھی۔ جبراً حکیم مقنع کے حرم میں داخل کر دی گئی۔ سلیمہ نے بہت قریب سے اس شیطان کی دنیا کو دیکھا جو غلاظتوں سے بھری ہوئی تھی۔ جب سب لوگ سو جاتے تو رات کے پچھلے پہر سلیمہ اپنے ربّ کے حضور گریہ وزاری کرنے لگتی۔

''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتی ہوں کہ تیرے سوا کوئی پناہ دینے والا نہیں۔ تُو دلوں کا حال خوب جانتا ہے کہ ان شیاطین نے کس طرح مجھے گناہ گارانہ زندگی پر مجبور کیا ہے۔ میں ان ظالموں کے لیے تجھ سے تیرے قہر و غضب کا سوال کرتی ہوں۔ تیرے قبضۂ قدرت میں جس قدر بھی عذاب ہیں، وہ سب ان پر نازل فرما دے......اور اپنے نام لیواؤں کی حفاظت فرما کہ تیرے سوا ان کا کوئی مشکل کشا نہیں۔''

❁---❁---❁

جب حکیم مقنع کے پرستاروں کا حلقہ وسیع ہو گیا تو اس نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی۔ سب سے پہلے اُس نے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا جس کا نام ''دیثق'' تھا۔ یہ حکیم مقنع کی پہلی پناہ گاہ تھی۔ پھر کچھ دن بعد اسے خیال آیا کہ دیثق کا قلعہ ناکافی ہے۔ اگرچہ حکیم مقنع اپنے شیطانی عزائم میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا تھا لیکن ایک نامعلوم خوف ہمیشہ اس کے ذہن پر مسلط رہتا تھا۔ وہ اپنے پیش رو، ابو مسلم خراسانی کا حشر دیکھ چکا تھا، اس لیے دن رات اپنی حفاظت کی تدبیریں کرتا رہتا تھا۔ آخر اسی خوف کے زیر اثر مقنع نے سیام کی پہاڑیوں میں دوسرا قلعہ تیار کرایا۔ اس قلعے کی مضبوطی کا یہ حال تھا کہ دیوار کی چوڑائی میں سو سے زیادہ بڑی اینٹیں لگائی گئی تھیں۔ مزید یہ کہ قلعے کے چاروں طرف ایک وسیع و عریض خندق کھودی گئی تھی جس کو عبور کرنا انتہائی مشکل کام تھا۔ قلعے میں خوراک اور اسلحے کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کیا گیا تھا کہ اگر تین سال جنگ جاری رہتی تو حکیم مقنع قلعہ بند ہو کر اپنے حریف کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ قلعہ سیام کی تعمیر کے بعد وہ اپنے پرستاروں سے کہا کرتا تھا۔

''اب میری خدائی پر ایمان لانے والوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے اپنے اور منکرین کے درمیان ایک ایسی آہنی دیوار کھینچ دی ہے جسے توڑنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔''

محفوظ پناہ گاہیں تعمیر کرنے کے بعد حکیم مقنع نے خراسان اور اس کے نواحی علاقوں میں آباد مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اس کے مسلح سپاہی، مسلمان محلوں پر شب خون مارا کرتے تھے اور اہلِ ایمان کو

قتل کر کے فرار ہو جاتے تھے۔ اگر حکیم مقنع اپنے چند ہزار پرستاروں کے سجدوں پر قناعت کر لیتا تو ایک طویل عرصے تک اس کی فتنہ انگیزیوں پر پردہ پڑا رہتا...... لیکن ہوسِ ملک گیری نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ وہ جلد از جلد اسلامی اقتدار سے نجات حاصل کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کرنا چاہتا تھا۔

اسی دوران بخارا کے کئی ہزار سرکشوں نے خلافتِ عباسیہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ باغیوں کی یہ جماعت "مبیضہ" کہلاتی تھی۔ ان لوگوں نے حکیم مقنع کی خدائی کو تو تسلیم نہیں کیا لیکن اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنیاد پر وہ اس شیطان کی ہم نوا ہو گئی۔

"مبیضہ" کے علاوہ ترکوں کا بھی ایک گروہ حکیم مقنع سے آ ملا۔ یہ وہ ترک تھے جو ابھی تک حلقۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے اور قومی عصبیت کی بنیاد پر اسلامی حکومت کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے تھے۔ حکیم مقنع نے باغی ترکوں کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ خلافتِ عباسیہ کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی افرادی قوت میں اضافہ چاہتا تھا۔ جب اس نئے اتحاد پر اس کے مشیرانِ خاص نے اعتراض کیا تو وہ خبیث نہایت مکروہ انداز میں ہنسا۔

"یہ ایک سیاسی معاہدہ ہے۔ جب ہم اسلامی سلطنت کا طوقِ غلامی اپنی گردنوں سے اُتار پھینکیں گے تو اپنے ان حلیفوں کو بھی تہہ تیغ کرا دیں گے۔ بڑے دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لیے چھوٹے دشمنوں کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔

پھر اس سیاسی اتحاد نے مسلم علاقوں میں تباہی مچا دی۔ یہاں تک کہ بے گناہ مسلمانوں کی چیخوں سے دارالحکومت بغداد گونجنے لگا۔

❁---❁---❁

اس وقت منصور کا بیٹا خلیفہ مہدی سریر آرائے سلطنت تھا۔ خراسان کے علاقے سے تعلق رکھنے والے کئی تباہ حال لوگ جو کسی نہ کسی طرح جان بچا کر دربارِ خلافت تک پہنچ گئے تھے، مہدی کے سامنے کھڑے گریہ وزاری کر رہے تھے۔

"امیر المومنین! اہلِ ایمان کی خبر لیجیے کہ خدائی کے دعویدار حکیم مقنع نے کلمہ گویوں پر وہ ستم ڈھائے ہیں جنہیں بیان کرنے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔"

پہلی بار خلیفہ مہدی پر یہ انکشاف ہوا کہ حکیم مقنع کی تحریک سیاسی نہیں بلکہ وہ ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس اطلاع نے عباسی خلیفہ کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ آخر اس فتنے کو کچلنے کے لیے بغداد کی فوجیں حرکت میں آ گئیں۔

خلیفہ مہدی نے ابونعمان جنید اور لیث بن نصر کو ایک لشکرِ جرار دے کر حکیم مقنع اور اس کے سیاسی حلیفوں کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ دشوار گزار راستوں کی وجہ سے اسلامی لشکر کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس معرکہ آرائی میں لیث بن نصر کا بھائی محمد بن نصر اور اس کا بھتیجا شہید ہو گئے۔

خلیفہ مہدی نے بڑی اذیت کے ساتھ یہ خبر سنی۔ پھر اس نے اپنے ایک جانباز سپہ سالار جبریل بن یحییٰ کو طلب کرتے ہوئے کہا۔

''کل تک تم کفر کے اندھیروں میں غرق تھے۔ اسلام نے تمہیں دیارِ ظلمت سے نکال کر قصرِ نور تک پہنچایا...... اور آج اسی قصرِ نور پر اندھیروں کے پجاری شب خون مار رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں غیرتِ اسلامی اس وقت تک چین سے سونے نہیں دے گی، جب تک وہ خدائی کا دعویدار اپنے شیطانی ارادوں کے ساتھ خاک میں نہیں مل جاتا۔'

جبریل بن یحییٰ نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر اللہ تعالیٰ کی کبریائی بیان کی اور دشمنانِ خدا کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ پھر بخارا کے قلعے پر چار مہینے تک خونریز جنگ ہوتی رہی۔ آخر لشکرِ اسلام کو غلبہ حاصل ہوا۔ اس معرکے میں حکیم مقنع کے ایک ہزار جاں نثار مارے گئے۔ باقی لوگ فرار ہو کر سیام کے قلعے میں پہنچے جہاں حکیم مقنع موجود تھا۔ اس نے اپنے اتحادیوں کی شکست کی خبر سنی تو کچھ دیر کے لیے بدحواس ہو گیا مگر اس نے فوراً ہی اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔

''قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہو۔ مسلمان یہاں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

جبریل بن یحییٰ، مفسدین کا تعاقب کرتا ہوا کوہِ سیام تک پہنچ گیا تھا...... مگر قلعے کی مضبوطی اور دشوار گزار راستوں نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

خلیفہ مہدی نے دوسرے سپہ سالار ابوعون کو روانہ کیا مگر اس کی جنگی تدابیر بھی کارگر ثابت نہ ہوسکیں۔

❀---❀---❀

آخر طویل غور وخوض اور مشوروں کے بعد عباسی خلیفہ نے معاذ بن مسلم کو ستر ہزار فوج دے کر فیصلہ کُن جنگ کے لیے روانہ کیا۔ جب معاذ بن مسلم بغداد سے رخصت ہو رہا تھا تو خلیفہ مہدی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تھا۔

''ابومسلم خراسانی کو میرے والد مرحوم نے قتل کرایا تھا۔ میں حکیم مقنع خراسانی کے ناپاک وجود سے اللہ کی زمین کو پاک کروں گا۔ مجھے ایک ایک لمحے کی خبر دیتے رہنا۔ اگرچہ کوہِ سیام اور بغداد کے درمیان طویل فاصلہ ہے مگر تم مجھے ہر وقت اپنے قریب ہی پاؤ گے۔''

معاذ بن مسلم طوفانِ برق و باد کی طرح حکیم مقنع خراسانی کے ٹھکانوں کی طرف بڑھا۔ اس جنگی مہم میں سعید بن عمرو، معاذ بن مسلم کا نائب تھا۔ ابھی لشکرِ اسلام راستے ہی میں تھا کہ عباسی خلیفہ مہدی نے دوسرے سپہ سالار عقبہ بن مسلم کو بھی ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ کرتے ہوئے ہدایت کی۔

''میں نہیں چاہتا کہ معاذ کو کسی قسم کی کمی کا احساس ہو۔ دشمنانِ خدا پر اتنا شدید حملہ کرو کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔''

عقبہ بن مسلم اپنے لشکر کو لے کر اتنی تیز رفتاری سے آگے بڑھا کہ معاذ بن مسلم کی فوج سے جا ملا۔ پھر

دونوں سالاروں نے باہمی مشورے کے ساتھ ''طواویس'' کی طرف پیش قدمی کی۔ یہ مقنع خراسانی کا ایک مضبوط فوجی ٹھکانہ تھا۔ معاذ بن مسلم نے پوری طاقت سے حملہ کیا۔ عام خیال تھا کہ اس محاذ پر ایک خونریز جنگ ہوگی مگر مقنع خراسانی کے پیروکار نہایت بزدل نکلے۔ طلوعِ آفتاب کے بعد جنگ کا آغاز ہوا اور دوپہر سے پہلے باطل پرستوں کا لشکر فرار ہوگیا۔ اس مختصر سے معرکے میں مقنع کے ہزاروں پرستار مارے گئے......اور جو شمشیرِ اجل سے بچ گئے، وہ سیام کے قلعے میں روپوش ہوگئے۔

❊---❊---❊

دوسری شکست کے بعد مقنع خراسانی نے ہوشیاری سے کام لیا اور اپنے تمام سپاہیوں کو سیام کے قلعے میں طلب کرلیا۔ وہ جانتا تھا کہ کھلے میدانوں میں لشکرِ اسلام کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مختلف محاذوں پر جنگ ہوتی رہتی تو اس کا ایک سپاہی بھی زندہ نہیں بچتا۔ یہی سوچ کر مقنع نے اپنی باقی ماندہ فوجی طاقت کو اس قلعے میں محفوظ کرلیا جسے شیطانوں کی یہ جماعت ناقابلِ تسخیر سمجھتی تھی۔

معاذ بن مسلم نے آگے بڑھ کر کوہِ سیام کا محاصرہ کرلیا۔ ابھی محاصرے کو چند روز ہی گزرے تھے کہ بدقسمتی سے معاذ بن مسلم اور سعید بن عمرو میں کسی بات پر اختلاف ہوگیا اور پھر یہ اختلاف سخت کشیدگی میں بدل گیا۔ یہاں تک کہ سعید بن عمرو نے خلیفہ مہدی کو ایک طویل خط تحریر کیا اور یہ درخواست کی کہ اگر اسے تنہا مقنع خراسانی کے مقابلے پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اس شیطان کا قلع قمع کرسکتا ہے۔

عباسی خلیفہ مہدی نے سعید بن عمرو کی درخواست قبول کرلی اور معاذ بن مسلم کو بغداد واپس بلالیا۔ یہ معاذ بن مسلم کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ انہوں نے رخصت ہوتے وقت اپنے بیٹے کو سعید بن عمرو کی مدد کے لیے وہیں چھوڑ دیا۔

سعید بن عمرو نے خندق کو عبور کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ لشکرِ اسلام کو شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ مسلمان سپاہی ایک کھلے میدان میں پڑے ہوئے، موسم کی سختیاں برداشت کررہے تھے۔ مقنع خراسانی کے سپاہی موقع بہ موقع تیر چلاتے اور سنگ باری کرتے رہتے تھے جس سے لشکرِ اسلام کو شدید جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ اگر مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کی آگ روشن نہ ہوتی تو وہ محاصرہ اٹھا کر کبھی کے بغداد واپس جاچکے ہوتے اور خلیفۂ وقت کے سامنے اپنی ناکامی کا اعتراف کرلیتے۔ مگر یہ اسلامی حمیت ہی تھی جو اُنہیں آفات و مصائب کے ہجوم میں بھی ثابت قدم رکھے ہوئے تھی۔

سعید بن عمرو نے بے مثال استقامت کا مظاہرہ کیا۔ آخر اس نے طویل غور و فکر کے بعد لوہے اور لکڑی کی بہت لمبی لمبی سیڑھیاں بنوائیں تاکہ انہیں خندق کے دونوں سروں پر رکھ کر پار اُترا جاسکے۔ مگر یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہوسکی۔ کیونکہ خندق کی چوڑائی مسلمان انجینئروں کے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ بعض مؤرخین کے مطابق اس محاصرے کو کئی سال گزر چکے تھے۔ انجامِ کار سعید بن عمرو نے خلیفہ مہدی کو اپنی مجبوریاں بیان کرتے ہوئے لکھا۔

''امیر المومنین! ہمارے اور دشمن کے درمیان میں ایک طویل وعریض خندق حائل ہے۔ اس خندق کو پاٹے بغیر قلعے تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ براہِ کرم کوئی ایسی تدبیر کیجئے کہ اس خندق کو عبور کیا جا سکے۔ میں ناکامی و نامرادی کی حالت میں واپس آنا نہیں چاہتا کہ اس طرح دشمنانِ خدا کے حوصلے اور بڑھ جائیں گے اور جاں نثارانِ اسلام کی ساری قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔''

❁---❁---❁

اُن دنوں ہندوستان میں صوبہ سندھ اور پنجاب کا جنوبی علاقہ خلافتِ بغداد کے زیرِ نگیں تھا۔ خلیفہ مہدی نے فوری طور پر عاملِ سندھ کو تحریر کیا کہ گایوں، بیلوں اور بھینسوں کی جس قدر کھالیں ممکن ہوں، جلد از جلد بغداد بھجوا دی جائیں۔ عاملِ سندھ نے بڑی تیزی سے فرمانِ خلافت پر عمل کیا اور مختصر سے عرصے میں دس ہزار کھالیں دارالخلافہ بھجوا دیں۔

پھر جب یہ کھالیں سیام کے علاقے میں پہنچیں تو سعید بن عمرو نے ریت اور پتھر بھروا کر اُنہیں خندق میں ڈلوانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ خندق پٹ گئی اور لشکرِ اسلام پار اُتر گیا۔

اب مقنع خراسانی کی محفوظ ترین پناہ گاہ منجنیقوں اور دوسرے قلعہ شکن آلات کی زد میں تھی۔ باطل پرست اپنی موت کو اتنے نزدیک پا کر بدحواس ہو گئے۔ انہوں نے خفیہ طور پر سعید بن عمرو سے رابطہ کیا اور امان طلب کی۔ سالارِ اسلام نے اسلامی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقنع خراسانی کے پرستاروں کو امان بخش دی۔ کیونکہ وہ اپنے باطل عقائد سے تائب ہو چکے تھے۔ نتیجتاً تیس ہزار سپاہی خدائی کے دعویدار کو شدید بے کسی کے عالم میں چھوڑ کر چلے گئے۔ مقنع خراسانی چیخ چیخ کر اُنہیں بلاتا رہا مگر جانے والوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ بعض سپاہیوں نے انتہائی تحقیر آمیز انداز میں اپنے سابقہ معبود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تُو خدا ہوتا تو اس طرح ایک گوشے میں چھپ کر نہ بیٹھتا اور آسمان سے مسلمانوں پر نئے نئے عذاب لے آتا۔ مگر تیرے قبضۂ قدرت میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تُو محض ایک جھوٹا انسان ہے، ہم سے بھی زیادہ کمزور اور ناکارہ۔''

اب قلعے میں صرف دو ہزار سپاہی موجود تھے۔ ان بدنصیبوں کو اس شکستگی کے عالم میں بھی یقین تھا کہ مقنع خراسانی، خدا کا اوتار ہے اور وہ عنقریب کوئی نیا کرشمہ دکھا کر مسلمانوں پر فتح حاصل کر لے گا۔

مقنع خراسانی جانتا تھا کہ اگر وہ لشکرِ اسلام کے ہاتھ آ گیا تو اس کا حشر بھی ابو مسلم خراسانی سے زیادہ مختلف نہیں ہوگا۔ خلیفہ مہدی اس کے بھی دست و پا کاٹ دے گا اور تڑپا تڑپا کر موت کا ذائقہ چکھنے پر مجبور کر دے گا۔ اسی خیال نے اس پر شدید وحشت طاری کر دی تھی۔ وہ اپنے اعصاب کو پُرسکون رکھنے کے لیے مسلسل شراب پی رہا تھا۔ آخر اس کے فتنہ ساز ذہن نے اپنی نجات کا راستہ تلاش کر ہی لیا۔

مقنع خراسانی نے باقی ماندہ سپاہیوں کو قلعے کے وسیع وعریض میدان میں جمع کیا اور نہایت پُرجوش لہجے میں تقریر شروع کی۔

"اب تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو مسلمانوں کے غلام بن کر نامرادانہ زندگی بسر کرو..... یا پھر میرے ساتھ آسمان پر چلو۔ جہاں جنت اپنی تمام تر رعنائی اور دلکشی کے ساتھ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

تمام پیروکاروں نے بیک زبان چیخ کر کہا۔ "ہمیں آپ کی رفاقت کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔"

اس کے بعد مقنع نے میدان کے بہت بڑے حصے میں آگ جلانے کا حکم دیا۔ جب شعلوں کی سیاہ زبانیں لپکنے لگیں تو قلعے میں جمع شدہ سارا مال و اسباب آگ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس میں دودھ دینے والے اور سواری کے جانور بھی شامل تھے۔ بھڑکتی ہوئی آگ نے ذرا سی دیر میں ہر شے کو پھونک ڈالا۔ مقنع خراسانی کچھ دیر تک یہ ہولناک منظر دیکھتا رہا، پھر قلعے کے صدر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے پوری طاقت سے چیخا۔ "میں جا رہا ہوں۔ تم لوگ میری خاک کو بھی نہیں پا سکتے۔"

یہ کہہ کر مقنع آگ میں کُود پڑا۔ اپنے "معبود" کی تقلید میں بیویوں، بچوں اور دیگر پرستاروں نے بھی خود کو بھڑکتے ہوئے شعلوں کے سپرد کر دیا۔

پھر جب لشکرِ اسلام قلعے میں داخل ہوا تو وہاں راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔

دوسری روایت کے مطابق جب مقنع محاصرے سے تنگ آ گیا تو اس نے آگ جلانے کا حکم دیا۔ پھر اپنی بیویوں، بچوں اور پیروکاروں کو خوب شراب پلائی۔ جب تمام لوگ بے ہوش ہو گئے تو مقنع نے انہیں ایک ایک کر کے قتل کر ڈالا۔ پھر ان کی لاشوں کو آگ میں پھینک دیا۔ آخر میں اس نے ایک بڑی دیگ کو تیزاب سے بھرا اور خود اس کے اندر اُتر گیا۔ تیزاب نے چند لمحوں میں اس کی ہڈیاں تک جلا ڈالیں اور وہ بے نام و نشان ہو گیا۔

جب مقنع اپنے پیروکاروں کو شراب پلا رہا تھا تو اس کی ایک بیوی کسی تاریک گوشے میں چھپ گئی تھی۔ پھر جب موت کا کھیل ختم ہو گیا تو وہ عورت باہر نکلی اور اس نے قلعے کی فصیل پر چڑھ کر مسلمان سپاہیوں کو آواز دی۔

"تم لوگ اندر آ جاؤ۔ قلعے میں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔" یہ وہی مسلمان عورت سلیمہ تھی جسے مقنع نے جبراً اپنے حرم میں داخل کیا تھا اور جو راتوں کی تنہائی میں اپنے اللہ کو پکارا کرتی تھی۔

مقنع خراسانی کے فتنے کی آگ چودہ سال تک بھڑکتی رہی۔ پھر 163ھ میں وہ خود ہی اس آگ کی خوراک بن کر ہمیشہ کے لیے مقہور و مردود بن گیا۔



بے وفا

آج سے آٹھ سو سال پہلے یعنی 522ھ میں ملتان سے تقریباً سو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی ہندو ریاست ''اوچ'' آباد تھی۔ (موجودہ پاکستان کے نقشے میں اوچ ضلع بہاولپور کی ایک تحصیل ہے۔ یہاں مشہور صوفی بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمتہ اللہ علیہ آسودۂ خواب ہیں)

عسکری قوت کے اعتبار سے اوچ کوئی قابلِ ذکر ریاست نہیں تھی مگر اس کا قلعہ بے حد مضبوط تھا۔ اس زمانے میں راجہ کرن، اوچ کا حکمران تھا۔ وہ ایک طویل قامت اور توانا جسم کا مالک تھا..... مگر راجہ کرن کی ایک محرومی یہ تھی کہ چیچک کے مرض نے اس کے چہرے کو انتہائی حد تک بدصورت بنا دیا تھا۔ اس نے کئی شادیاں کیں مگر اتفاق سے ہر رانی کچھ دن بعد کسی نہ کسی خوف ناک بیماری میں مبتلا ہو کر مر جاتی تھی۔ راجہ کرن کی دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔

ایک دن شاہی تقریب میں راجہ کرن نے ایک بیس بائیس سالہ لڑکی کو دیکھا۔ یہ لڑکی بے پناہ حُسن کی مالک تھی۔ ساٹھ سالہ راجہ کرن لڑکی کو دیکھتے ہی اُس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ پھر دوسرے دن ہی اس نے اپنی رازدار کنیزوں کو اس کام پر لگا دیا کہ وہ لڑکی کے بارے میں تمام ضروری معلومات فراہم کریں۔

راجہ کرن کی لونڈیاں شاہی جاسوس بن کر گلی گلی اور محلے محلے گھومتی رہیں۔ آخر وہ اس لڑکی کے گھر تک پہنچ گئیں جس کے عشق میں راجہ کرن کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ لڑکی کا نام شکنتلا تھا اور وہ ریاست کے ایک بڑے جاگیردار دینا ناتھ کی بیٹی تھی۔

لڑکی کے بارے میں ساری معلومات مکمل کرنے کے بعد راجہ کرن نے فوراً ہی دینا ناتھ کو خلوت میں طلب کر لیا۔ راجہ کرن کے مکروہ چہرے پر مختلف رنگ اُبھرا اُبھر کر ڈوب رہے تھے۔ وہ خود ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ آخر دینا ناتھ نے اس طویل وقفۂ سکوت کو توڑا۔

''مہاراج! آپ کچھ پریشان ہیں؟''

''پریشان تو نہیں ہیں دینا ناتھ!.... مگر یہ سوچ رہے ہیں کہ ہمیں تجھ سے وہ بات کہنی چاہیے یا نہیں؟''

راجہ کرن اب بھی کچھ اُلجھا اُلجھا سا نظر آ رہا تھا۔
''مہاراج! بات کو ہر حال میں زبان پر آ جانا چاہیے۔'' دینا ناتھ نے انتہائی خوشامدانہ لہجے میں کہا۔
''اگر بات سینے کی گہرائیوں میں دبی رہ جائے تو بہت طوفان اٹھاتی ہے۔ آخر آپ کا یہ داس کس لیے ہے؟ کہہ دیجئے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''
''دینا ناتھ! تجھے ہمارے احسانات یاد ہیں؟'' یکایک راجہ کرن کا لہجہ بدل گیا تھا۔ اب اس کے چہرے سے دولت و اقتدار کی رعونت جھلکنے لگی تھی۔
''میں غلام، میرا باپ غلام، میرا دادا غلام۔'' دینا ناتھ نے دنوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''یہ سب کچھ مہاراج کی کرپا (مہربانی) ہے کہ مجھے اور میرے پُرکھوں (بزرگوں) کو اپنی غلامی کا طوق پہنایا۔
''تو پھر اس غلامی کا سودا کر۔'' راجہ کرن نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔
''میرا سارا دھن دولت آپ ہی کا تو دان ہے مہاراج!'' دینا ناتھ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا مگر اس نے راجہ کرن کو دکھانے کے لیے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ ''حکم دیجئے، میں تمام سونا چاندی مہاراج کے چرنوں میں ڈھیر کر دوں گا۔''
''ہمیں تیرا سونا چاندی نہیں چاہیے دینا ناتھ!'' راجہ کرن نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
''پھر......؟'' دینا ناتھ نے سکون کی سانس لی۔ اس نے جس دولت کی سانپ بن کر حفاظت کی تھی، وہ راجہ کی بری نظروں سے محفوظ ہو گئی تھی لیکن خطرہ ابھی تک ٹلا نہیں تھا۔ ''تو کیا مہاراج کو میری جان کی ضرورت ہے؟'' دینا ناتھ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔
''نہیں دینا ناتھ! ہمیں تیری سب سے قیمتی چیز چاہیے۔'' راجہ کرن کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔
''مہاراج! کسی انسان کے لیے اس کی جان سے زیادہ کوئی چیز قیمتی نہیں ہوتی۔'' دینا ناتھ، ریاست اوچ کے حاکم کی بات سمجھنے سے قاصر تھا۔
''تُو بہت نادان ہے دینا ناتھ!'' راجہ کرن نے اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ ''جب تک انسان شادی نہیں کرتا، اس وقت تک اُس کی جان سب سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے......مگر جس روز وہ ایک لڑکی کا باپ بن جاتا ہے تو پھر......'' راجہ کرن نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی......اور وہ دینا ناتھ کے چہرے پر اپنے الفاظ کا ردِعمل تلاش کر رہا تھا۔
راجہ کرن کی بات سن کر دینا ناتھ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ایک طاقتور حاکم نے ایک کمزور باپ سے اس کی بیٹی مانگ لی تھی۔
''کیا ہماری بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟'' یکایک راجہ نے اپنا انداز بدل دیا تھا۔ اب اس کے لہجے سے جارحیت نمایاں تھی۔
''سمجھ گیا مہاراج!......سمجھ گیا۔'' دینا ناتھ نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''پھر تیرا کیا جواب ہے؟'' راجہ کرن نے تحقیر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا مہاراج!'' دینا ناتھ کسی بھکاری کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔
''مگر وقت پر بھی تو ہماری ہی حکومت ہے۔'' غرورِ اقتدار اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ''پھر بھی ہم تجھے تھوڑی سی مہلت دیتے ہیں...... اگر تیری طرف سے انکار ہوا تو اپنے ہاتھوں سے اپنی چتا تیار کر لینا...... ہم آ کر اس میں آگ لگا دیں گے۔''

دینا ناتھ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے واپس چلا گیا۔

❀---❀---❀

جب دینا ناتھ نے اپنی بیوی للیتا سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ خوشی سے چیخ اُٹھی۔
''پنڈت گیان چند جی نے تو شکنتلا کی پیدائش کے وقت ہی کہہ دیا تھا کہ میری بیٹی ایک دن مہارانی بنے گی۔''
''مگر ریاست کے لوگ میرے بارے میں کیا کہیں گے؟'' دینا ناتھ کے چہرے سے شدید کرب نمایاں تھا۔
''کیا کہیں گے لوگ......؟'' للیتا نے تیز لہجے میں کہا۔
''تم نہیں جانتیں کہ لوگ کیسی کیسی باتیں بنائیں گے؟'' دینا ناتھ نے غضب ناک نظروں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ساٹھ سالہ مکروہ صورت بوڑھا...... اور میری پھول جیسی بیٹی۔ دونوں میں کوئی جوڑ نہیں۔ اگر یہ رشتہ طے پا گیا تو دنیا مجھ پر اُنگلیاں اُٹھائے گی کہ وہ جا رہا ہے بے غیرت دینا ناتھ جس نے اپنی بیٹی کو فروخت کر ڈالا۔''
''دنیا تم پر اُنگلیاں نہیں، سلام کے لیے ہاتھ اٹھائے گی۔'' للیتا نے شوہر کے خدشات کو دُور کرتے ہوئے کہا۔ ''مہاراج کی عمر کوئی نہیں پوچھے گا، سب اُن کے اقتدار کو دیکھیں گے۔ ریاست میں ایک سے ایک حسین لڑکی موجود ہے۔ مہاراج جدھر بھی نظر اُٹھا کر دیکھیں گے، لڑکیوں کے ماں باپ اُنہیں سجدے کریں گے۔ یہ تو شکنتلا کی خوش نصیبی ہے کہ مہاراج نے خود اس کے رشتے کے لیے سوال کیا ہے۔ آپ کچھ بھی کہیں، میں اپنی بیٹی کے سر پر تاج دیکھنا چاہتی ہوں۔'' للیتا بہت زیادہ پُر جوش نظر آ رہی تھی۔
''تمہیں معلوم ہے کہ مہاراج کی تین بیویاں مر چکی ہیں۔'' دینا ناتھ بدستور پریشان نظر آ رہا تھا۔
''میری بیٹی نہیں مرے گی۔'' للیتا نے تیز آواز میں کہا۔ ''اب کے مہاراج کی باری ہے۔''
آخر اس کشمکش سے نجات پانے کے لیے دینا ناتھ نے اوچ کے مشہور نجومی، پنڈت گیان چند کو بلا کر تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔
گیان چند نے ایک بار پھر شکنتلا کا زائچہ کھینچا اور ستاروں کی رفتار دیکھنے لگا۔ پھر بہت دیر تک مختلف زاویوں پر غور کرنے کے بعد پنڈت جی نے دینا ناتھ کو نئی خوشخبری سنائی۔

''شکنتلا بیٹی کا مستقبل بہت روشن ہے، وہ بیوہ ضرور ہو جائیں گی.....مگر ایک طویل عرصے تک ریاست اوچ پر راج کریں گی۔''

بالآخر یہ رشتہ طے پا گیا۔ پھر راجہ کرن اور شکنتلا کی شادی اس قدر دھوم دھام سے ہوئی کہ ریاست کے بڑے بوڑھے پکار اُٹھے۔

''ہم نے ایسا ہنگامہ خیز جشن نہ آنکھوں سے دیکھا، نہ کانوں سے سنا۔''

❀---❀---❀

بوڑھے شوہر کا بدنما چہرہ دیکھ کر شکنتلا کا رونے کو دل چاہا......مگر اب شورِ ماتم سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ مجبوراً اُسے اس تصور سے بہلنا پڑا کہ اب وہ ریاست کی مہارانی ہے......اور اُس کی ایک جنبشِ نگاہ سے ہزاروں انسانوں کی تقدیر بدل سکتی ہے۔

راجہ کرن دن رات رانی شکنتلا کی ناز برداری میں لگا رہتا تھا.......مگر شکنتلا کے دل پر غموں کی ایسی گھٹا چھائی ہوئی تھی، جس کے کھل کر برسنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ ایک حسین ترین لڑکی تھی۔ اس نے دوشیزگی کے زمانے میں کسی خوب صورت راج کمار کے خواب دیکھے تھے۔ اسے خوابوں کی تعبیر ملی مگر بہت دُھندلی اور ادھوری......اُس کا شریکِ سفر بوڑھا بھی تھا اور بدصورت بھی۔

شکنتلا کا حُسن اُس کے لیے قیامت بن گیا تھا۔ راج گھرانے کی معزز خواتین شکنتلا کے آتے ہی آتشِ حسد میں جلنے لگی تھیں۔ ریاست کی عام عورتوں میں دن رات اسی کے تذکرے رہتے تھے۔ راجہ کرن، شکنتلا سے وابستگی کے بعد اپنی خوش قسمتی پر ناز بھی کیا کرتا تھا اور ایک انجانے خوف سے سہا ہوا بھی رہتا تھا۔ آخر ان ہی اندیشوں اور وسوسوں سے مجبور ہو کر اس نے اپنی فتنہ ساماں بیوی پر پہرے بٹھا دیئے تھے۔

رانی شکنتلا کو ان تقریبات میں جانے کی اجازت نہیں تھی، جہاں مرد و زن کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ عام طور پر رانیاں اپنے حکمراں شوہروں کے ساتھ درباروں میں جلوہ افروز بھی ہوا کرتی تھیں مگر شکنتلا کو اس اعزاز سے بھی محروم رکھا گیا تھا۔ ہر ہندو ریاست میں رانی کو ''راج ماتا'' کا درجہ حاصل ہوتا تھا۔ اس لیے امراء، وزراء، فوجی سردار اور عام رعایا، راج ماتا کی خدمت میں حاضر ہو کر سلامی پیش کرتے تھے......لیکن رانی شکنتلا کے معاملے میں اس رسم کو بھی ختم کر دیا گیا تھا۔ یہ ساری پابندیاں اور احتیاطیں اس لیے تھیں کہ شکنتلا غیر معمولی حُسن کی مالک تھی.....اور راجہ کرن شدید احساسِ کمتری کا شکار۔

شکنتلا کو ایک آمرانہ نظام کے تحت شادی پر مجبور کیا گیا تھا۔ پھر راجہ کرن کی طرف سے عائد شدہ پابندیوں نے شکنتلا کو شوہر کی طرف سے اور بھی متنفر کر دیا تھا۔ فاصلے جو پہلے دن سے قائم تھے، روز بروز بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے......اور حُسن کی دیوی لعل و جواہر سے مرصع اس پنجرے میں شدید گھٹن محسوس کر رہی تھی۔

راجہ کرن کے پہرے بہت مضبوط تھے...مگر پھر بھی ایک جواں سال مرد، رانی شکنتلا کی بارگاہِ ناز تک

پہنچ ہی گیا۔

یہ تیس سالہ جوان راج کنور امر سنگھ تھا۔ دراز قامت، سرخ رنگ، دلکش خدوخال..... امر سنگھ، راجہ کرن کا سوتیلا بھائی تھا۔ فطرتاً بہادر تھا..... اور عادتاً شراب و شباب کا رسیا..... اکثر راج کماروں، ولی عہدوں اور وزیر زادوں کو اس کے سوا دوسرا کام ہوتا بھی نہیں۔ راج کنور امر سنگھ نے جب پہلی بار اپنی بھابی کو دُلہن کے روپ میں دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اکثر سلام کرنے کے بہانے رانی شکنتلا کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور تمام وقت اس کی نظریں اپنی بھاوج کے توبہ شکن حُسن پر مرکوز رہتی تھیں۔

راج کنور کا انہماک دیکھ کر کبھی کبھی رانی شکنتلا اپنے دیور سے سوال کر بیٹھتی۔

''کیا دیکھ رہے ہو، راج کنور؟''

امر سنگھ بڑے والہانہ انداز میں جواب دیتا۔ ''اپنے بھائی کی قسمت پر رشک کر رہا ہوں...... اور تمہاری بدنصیبی کا ماتم۔''

رانی شکنتلا اپنے دیور کی باتیں سن کر غیر محسوس طور پر اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔

اسی دوران رانی شکنتلا نے ایک خوب صورت بچی کو جنم دیا۔ راجہ کرن نے یہ خبر سنی تو اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔ وہ ولی عہدِ سلطنت کا شدت سے انتظار کر رہا تھا..... مگر بیٹی کی پیدائش نے اُس کی ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔

لڑکی کا نام نرملا رکھا گیا۔ وہ خدوخال اور رنگ و روپ میں اپنی ماں رانی شکنتلا پر گئی تھی..... مگر درباری نجومیوں نے نرملا کی پیدائش کو راج گھرانے کے لیے منحوس قرار دیا۔ پھر جب راجہ کرن نے رانی شکنتلا سے اپنی اس محرومی کا ذکر کیا تو وہ برہم ہوگئی۔

''دنیا کی کوئی عورت اس بات پر قادر نہیں ہوتی کہ وہ اپنی مرضی سے اولاد پیدا کرے۔ اگر آپ کو شکایت کرنی ہے تو بھگوان سے کریں۔ مجھے نرملا اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔''

بیٹی کی پیدائش کے بعد راجہ کرن کی مسلسل طعنہ زنی نے شکنتلا کے دل میں مزید غبار بھر دیا تھا۔ نتیجتاً وہ اپنے دیور راج کنور امر سنگھ کے قریب ہوتی چلی گئی۔ امر سنگھ سوتیلا اور چھوٹا بھائی ہونے کی وجہ سے راجہ کرن سنگھ سے شدید نفرت کرتا تھا۔

''بھگوان نے مجھے چھوٹا بنا کر سنگین ظلم کیا ہے..... مگر میں تقدیر کے اس لکھے کو نہیں مانتا...... میں اپنی قسمت آپ لکھوں گا۔''

امر سنگھ دن رات بڑے بھائی کے خلاف سازش کے منصوبے بنایا کرتا تھا۔ مگر اسے فوجی سرداروں کی حمایت حاصل نہیں تھی، اس لیے کفِ افسوس مل کر رہ جاتا تھا۔ پھر اس نے شکنتلا کی جذباتی محرومیوں سے فائدہ اُٹھایا..... اور راجہ کرن سے انتقام لینے کے لیے ایک انتہائی گھناؤنا کھیل کھیلنے لگا۔

❁---❁---❁

رانی شکنتلا کی خلوتوں میں امر سنگھ کی آمدورفت بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ راج محل کی داسیوں کو ان ملاقاتوں پر شک ہو گیا۔ پھر ایک دن راجہ کرن کی کنیزِ خاص مالتی نے ریاست اوچ کے حاکم سے صاف صاف کہہ دیا۔

''مہاراج! رانی شکنتلا اور راج کنور کی خفیہ ملاقاتیں کسی وقت بھی خوفناک رنگ اختیار کر سکتی ہیں...... اور اس گھر کے چراغ سے بھی آگ لگ سکتی ہے۔''

مالتی کی ان اطلاعات کے بعد راجہ کرن نے چھوٹے بھائی کو تنہائی میں طلب کیا اور نہایت سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے مہارانی کے ساتھ یہ بے تکلفانہ حرکتیں پسند نہیں۔''

امر سنگھ نے اپنے آپ کو پارسا ثابت کرنے کے لیے ناخوشگوار لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ بڑی بھاوج ہیں اور میرے لیے ماں کا درجہ رکھتی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے میرے بارے میں اس قدر پست ذہنیت کا مظاہرہ کیا۔''

''کچھ بھی ہو، میں ان ملاقاتوں کو پسند نہیں کرتا۔'' راجہ کرن کے چہرے سے شدید غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''وہ تمہاری ماں سہی، مگر آج کے بعد تم اپنی ماں سے بھی نہیں ملو گے۔''

امر سنگھ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا، بھائی کے سامنے سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اُس کی زبان خاموش تھی مگر سینے میں آتشِ انتقام نئے انداز سے بھڑک رہی تھی۔

اس تنبیہہ کے بعد راجہ کرن نے اپنی خاص کنیزوں کو ہر وقت مستعد رہنے کا حکم دے دیا۔ ''راج کنور اور مہارانی کی ایک ایک حرکت پر گہری نظر رکھو۔''

ہر طرف سخت پہرے تھے مگر پھر بھی امر سنگھ نے کسی نہ کسی طرح رانی شکنتلا تک یہ پیغام پہنچا دیا۔

''مہاراج کو ہم دونوں کی ملاقاتوں پر شک ہو گیا ہے، اس لئے تم بھی کچھ دنوں کے لیے محتاط روش اختیار کرو اور اپنی خوب صورت باتوں سے بوڑھے شوہر کا دل بہلاؤ۔ یہ جدائی بہت عارضی ہے...... عنقریب میں اس اونچی دیوار کو گرا دوں گا۔ پھر ہم دونوں کو روکنے والا اس دنیا میں کوئی نہیں ہو گا۔''

❀---❀---❀

پھر کچھ دن بعد ہی یہ مضبوط ترین اور بلند دیوار گر گئی۔

ایک روز راجہ کرن اپنے وزیروں اور مصاحبوں کے ساتھ شکار کھیلنے گیا۔ کچھ دیر بعد ہی اسے ایک نہایت خوب صورت ہرن نظر آیا۔ وہ معصوم جانور، راجہ کرن کے تیروں کی زد میں تھا مگر ریاست اوچ کے حاکم نے کمان نہیں کھینچی۔ وہ اپنی شہسواری کا ہنر دکھا کر ہرن کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ راجہ کرن نے اپنے گھوڑے کو اِیڑ دی...... اور گھوڑا برق رفتاری سے دوڑنے لگا۔ راجہ کرن، ہرن کے نزدیک پہنچ چکا تھا کہ یکایک گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، توازن بگڑا اور گھوڑا اوندھے منہ جا پڑا۔ راجہ کرن اس حادثے کے لیے تیار نہیں تھا، لگامیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں اور وہ دور جا کر گرا اور اس کا سر ایک بھاری پتھر سے ٹکرایا۔

ضرب اتنی شدید تھی کہ راجہ کرن کے دماغ کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ اوچ کا حاکم کچھ دیر تڑپا اور پھر قیامت تک کے لیے ساکت ہو گیا۔

راجہ کرن کی ناگہانی اور حادثاتی موت پر ریاست میں ایک کہرام برپا تھا...... تمام وزراء، امراء اور فوجی سردار اپنے فرمانروا کی ہلاکت پر غم زدہ تھے مگر کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ اس حادثے کے پیچھے امر سنگھ کا عیار ذہن کام کر رہا تھا۔ راجہ کرن کے شکار پر جانے سے پہلے امر سنگھ، داروغۂ اصطبل تلارام سے ملا۔ چند سال پہلے راجہ کرن نے تلارام کے باپ کو معمولی بات پر قتل کرا دیا تھا۔ امر سنگھ نے اس صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ایک دن وہ تلارام سے تنہائی میں ملا اور بڑے عیارانہ انداز میں کہنے لگا۔

''اگر تُو چاہے تو اپنے باپ کی موت کا انتقام لے سکتا ہے۔''

''وہ کس طرح راج کنور؟'' داروغۂ اصطبل تلارام نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

امر سنگھ نے تلارام کو ایک عجیب ترکیب بتائی اور راج بھون واپس چلا آیا۔

پھر داروغۂ اصطبل نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ راجہ کرن کے گھوڑے کے نال ڈھیلے کر دیے۔ پھر جب گھوڑے نے اپنی پوری رفتار پکڑی تو چاروں نال اپنی جگہ سے ہٹ گئے...... اور عربی النسل گھوڑا ان میں اُلجھ کر ٹھوکر کھا گیا۔

ریاست اوچ کی رعایا نے چالیس دن تک اپنے حکمراں کا سوگ منایا۔ پھر راجہ کرن کے سوتیلے اور چھوٹے بھائی امر سنگھ کے سر پر تاج سجا دیا۔

❁---❁---❁

امر سنگھ نے ریاست کا انتظام سنبھالتے ہی سب سے پہلے داروغۂ اصطبل تلارام کو قتل کرا دیا۔ کیونکہ وہ ایک خوفناک راز کا امین تھا۔ اگر تلارام کی زبان کھل جاتی تو راجہ امر سنگھ کے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

شکنتلا کے بیوہ ہوتے ہی ریاست کے معزز حلقوں نے مہارانی کے ''ستی'' ہو جانے کا مطالبہ کیا تھا.... مگر امر سنگھ نے مداخلت کر کے اپنی محبوبہ کو بچا لیا تھا۔ پھر راجہ کرن کے چالیسویں کی رسم ادا ہوتے ہی امر سنگھ نے رانی شکنتلا سے شادی کر لی۔

اس موقع پر درباری جوتشیوں نے راجہ امر سنگھ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''مہاراج کے لیے ایک بیوہ سے شادی کرنا اچھا شگون نہیں ہے جبکہ ریاست میں سینکڑوں حسین دوشیزائیں موجود ہیں۔''

ہوشربا اور توبہ شکن حُسن رکھنے والی نوجوان عورت، راجہ امر سنگھ کے اعصاب پر بری طرح مسلط تھی۔ اس نے درباری نجومیوں کے مشوروں کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ ریاست میں بسنے والی لڑکیوں کی بات کر رہے ہو؟ شکنتلا جیسی اپسرا تو پورے سنسار میں نہیں ہے۔''

پھر راجہ امر سنگھ، رانی شکنتلا کی جلوہ سامانیوں میں گم ہو گیا۔ وہ پہلے ہی بادۂ گلفام کا عادی تھا، شکنتلا کی قربتوں نے اُسے بلانوش بنا دیا تھا۔

مہارانی شکنتلا بھی اپنی ڈھائی تین سالہ ازدواجی زندگی میں راج بھون کی سیاست سے بخوبی آشنا ہو گئی تھی۔ راجہ امر سنگھ سے دوسری شادی کرتے ہی اُس کی سلب شدہ آزادی بحال ہو گئی۔ اب وہ ریاست کی تمام تقریبات میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے موجود ہوتی..... اور ہزاروں خواتین کو اپنے قدموں میں جھکا ہوا پاتی۔ مہارانی شکنتلا نے دولت کے ساتھ اقتدار کا مزہ بھی چکھ لیا تھا، اس لیے اس کے قدم زمین پر تھے مگر دماغ آسمان سے ملتا تھا۔

راجہ امر سنگھ تقریباً روزانہ ہی کوئی نہ کوئی قیمتی تحفہ اپنی محبوب رانی کی خدمت میں پیش کرتا یہاں تک کہ مہارانی شکنتلا کے ذاتی خزانے میں لعل و جواہر اور اشرفیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ وہ فطرتاً ایک مادہ پرست اور حریص عورت تھی۔ دلکش لباسوں اور خوبصورت نگینوں پر جان دیتی تھی۔ اگر راجہ امر سنگھ کی طرف سے نیا تحفہ ملنے میں دیر ہو جاتی تو رانی شکنتلا خود مطالبہ کرتی...... اور حُسن پرست حاکم اپنی محبوبۂ دلنواز کی خاطر شاہی خزانے کا بوجھ کم کر دیتا۔ ابھی اس کی دوسری شادی کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ریاست اوچ کے تمام نادرات، مہارانی شکنتلا کے قبضے میں چلے گئے۔

دوسری طرف اس نے اپنے باپ دینا ناتھ کو بھرپور انداز میں نوازا۔ ریاست اوچ کے سینکڑوں دیہات دینا ناتھ کی جاگیر میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ دولت کے ڈھیر سمیٹتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا کرتا تھا۔

''شکنتلا بیٹی ہمارے لیے بڑی بھاگوان ثابت ہوئی۔''

❀---❀---❀

راجہ امر سنگھ کا دورِ کیف و مستی دو تین سال تک جاری رہا۔ پھر ایک دن آیا کہ اوچ کا حاکم، رانی شکنتلا سے اُکتا گیا۔ اپسرا (حور) اب اُس کی نظروں میں ایک عام سی عورت بن کر رہ گئی تھی۔ خود رانی شکنتلا کو بھی دولت جمع کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں تھا۔ آخر ہوس ناک اور خودغرضانہ محبت کا سیلاب اُتر گیا۔

راجہ امر سنگھ فطرتاً حُسن پرست تھا۔ آخر اُس کی یہی کمزوری اُسے سردار پرتاب سنگھ کی جواں سال بیٹی نمرتا کی طرف لے گئی۔ نمرتا، رانی شکنتلا کی طرح حسین تو نہیں تھی مگر پھر بھی وہ ایک بیس سالہ خوبصورت دوشیزہ تھی۔ سردار پرتاب سنگھ بھی ایک دنیادار انسان تھا۔ اس نے ریاست کی تاریخ میں کئی چھوٹے چھوٹے باپوں کو اپنی خوب صورت بیٹیوں کے ذریعے بڑا آدمی بنتے دیکھا تھا، اس لیے وہ اپنی بیٹی نمرتا کو شاہی تقریبات میں لے جایا کرتا تھا۔ نمرتا شوخ بھڑکیلے لباس اور قیمتی زیورات سے آراستہ ہوتی اور تقریبات کے دوران کوشش کرتی کہ وہ مختلف زاویوں سے راجہ امر سنگھ کی نظروں کے سامنے رہے۔ حاضرینِ محفل کے علاوہ رانی شکنتلا نے بھی نمرتا کی خودنمائی کے انداز دیکھے تھے مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ اس خوبصورت دوشیزہ کا نشانہ کون ہے۔

آخر ایک دن راجہ امر سنگھ، نمرتا کی ناوک اندازی کا شکار ہو گیا..... اور اس نے سردار پرتاپ سنگھ کی بیٹی کے لیے شادی کا پیغام دے دیا۔

اس خبر سے راج بھون کے لوگوں کو تو زیادہ حیرت نہیں ہوئی مگر رانی شکنتلا پر آفتِ ناگہانی ٹوٹ پڑی۔

''مہاراج! میں یہ کیا سن رہی ہوں؟'' رانی شکنتلا کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔

''مہارانی نے جو کچھ سنا ہے، وہی درست ہے۔'' راجہ امر سنگھ نے بے نیازانہ کہا۔ وہ اس وقت شغلِ جام کر رہا تھا۔

مسلسل تجربات و مشاہدات نے شکنتلا کو سیاست کے گُر سکھا دیئے تھے۔ مجبوراً اُس نے فوراً ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ ''آپ مجھے مہارانی کے منصب سے تو محروم نہیں کریں گے؟'' رانی شکنتلا نے امر سنگھ کے سامنے دستِ سوال دراز کر دیا تھا۔

''اگر تم میرے راستے کی دیوار نہیں بنیں تو پھر زندگی بھر اپنے عہدہ و منصب پر بحال رہو گی۔'' راجہ امر سنگھ نے ایک ذہین تاجر کی طرح شکنتلا کی زبان بندی کی قیمت لگا دی تھی۔

مہارانی شکنتلا بھی سوداگر بن گئی..... اور اس نے اپنے شوہر کی دوسری شادی کے بدلے میں مہارانی کا منصب خرید لیا۔

❁---❁---❁

راجہ امر سنگھ دو تین سال تک رانی نمرتا کے جلوؤں میں گم رہا۔ اسے خوب صورت عورتوں کی قربت اور مسلسل شراب نوشی کے سوا کوئی تیسرا کام نہیں تھا۔ حکمراں کی بے راہ روی نے ریاست کے انتظامات پر بھی برے اثرات ڈالے تھے۔ ہر با اثر شخص اپنی دولت اور جاگیروں میں اضافہ کر رہا تھا یہاں تک کہ ریاستی فوج بھی بد دلی کا شکار نظر آنے لگی۔

پھر اس وقت اوچ کی رعایا حیران رہ گئی جب راجہ امر سنگھ نے ایک اور خوب صورت لڑکی پورنیما سے شادی کر لی۔ مہارانی شکنتلا تو اپنی حسرتوں کا ماتم کر کے خاموش ہو چکی تھی..... مگر رانی نمرتا نے بڑا شور مچایا۔

''مہاراج! آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میرے بعد کوئی دوسری عورت آپ کی زندگی میں داخل نہیں ہو گی۔''

راجہ امر سنگھ کچھ دیر تک رانی نمرتا کے وحشت و اضطراب پر مسکراتا رہا، پھر نہایت پُرسکون لہجے میں بولا۔ ''شاید رانی نے راجپوت حکمرانوں کی تاریخ نہیں پڑھی، بعض راجاؤں کی تو ایک وقت میں نو نو سو بیویاں ہوتی تھیں..... تم نے میری تیسری شادی پر قیامت اُٹھا رکھی ہے۔''

''اور آپ کا وعدہ؟'' رانی نمرتا ابھی نوجوان تھی، اس لیے شوہر کی اس حرکت پر کسی زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔

''وعدہ اپنی جگہ برقرار ہے۔'' راجہ امر سنگھ اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ ''ہم تمہیں رانی کے منصب سے معزول نہیں کریں گے۔''
رانی نمرتا مجبور تھی، آخر وہ بھی رو پیٹ کر خاموش ہو گئی۔

راجہ امر سنگھ کو رانی پورنیما سے شادی راس نہیں آئی۔ ریاست اوچ کے حاکم کو مسلسل کھانسی رہنے لگی تھی۔ ویدوں نے مختلف دوائیں تجویز کیں مگر امر سنگھ کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر ایک دن یہ کھانسی رنگ لائی اور امر سنگھ نے خون تھوکنا شروع کر دیا۔ وہ تپ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔
ویدوں نے امر سنگھ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ مسلسل آرام کریں، شراب چھوڑ دیں اور کسی پُر فضا مقام پر چلے جائیں تو اس جان لیوا بیماری پر قابو پایا جا سکتا ہے۔'' سارے وید اور حکیم، راجہ امر سنگھ کو جھوٹی تسلیاں دے رہے تھے۔ اُس وقت تپ دق ایک لاعلاج مرض تھا۔ احتیاط اور پرہیز سے مریض کی زندگی میں چند سالوں کا اضافہ کیا جا سکتا تھا، مگر بیماری سے نجات ممکن نہیں تھی۔
راجہ امر سنگھ نے ویدوں کا مشورہ سنا اور پہلی بار اس کے چہرے پر رنج والم کے گہرے سائے لرزنے لگے۔ قافلۂ حیات شدید گرد و غبار کی لپیٹ میں تھا اور والئ اوچ کو کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ دوسرے حکمرانوں سے اجازت لے کر کشمیر کی جانفزا ہواؤں میں سانس لے سکتا تھا۔ مگر طویل غیر حاضری اس کے اقتدار کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔
دوسرا سنگین مرحلہ ترکِ شراب نوشی کا تھا، جو امر سنگھ کے بس کی بات نہیں تھی۔ نوعمری کے زمانے سے یہ ہلاکت خیز زہر اس کے رگ و پے میں اُتر رہا تھا۔ اور اب تو یہ حالت تھی کہ امر سنگھ کی رگوں میں خون کی جگہ شراب دوڑ رہی تھی۔
عجیب عبرت ناک منظر تھا۔ راجہ امر سنگھ، خون تھوک رہا تھا اور اس کی تینوں محبوب رانیوں نے شوہر کے قریب آنا چھوڑ دیا تھا۔ ویدوں نے انہیں بتا دیا تھا کہ دق چھوت کی بیماری ہے اور اس کے جراثیم بیمار کے قریب رہنے والے انسانوں کو بھی مبتلائے مرض کر دیتے ہیں۔
راجہ امر سنگھ، بدترین تنہائی کا شکار تھا۔ پھر ایک دن اس کا جگر بھی جواب دے گیا......اور چند روز میں ایک تندرست و توانا راجپوت سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔
امر سنگھ کی ناقابلِ علاج بیماری نے مہارانی شکنتلا کو نوشتۂ دیوار پڑھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب اُس کی بیٹی نرملا ایک سترہ اٹھارہ سال کی خوب صورت دوشیزہ تھی۔
راجہ امر سنگھ کا مرض لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وزراء اور امراء کی عیش پرستیوں نے ریاست اوچ کے مستقبل کو مخدوش بنا دیا تھا۔ سپہ سالار ہری سنگھ بہت خاموشی سے اس صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔

اتفاق سے راج گھرانے میں ایسا کوئی لڑکا موجود نہیں تھا جسے تخت کا وارث قرار دیا جائے۔ قانونی طور پر راج کماری نرملا ہی ریاست اوچ کی حقیقی وارث تھی۔ آخر ایک دن سپہ سالار ہری سنگھ، مہارانی شکنتلا سے تنہائی میں ملا اور ریاستی استحکام کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔

''مہاراج کی ناقابلِ علاج بیماری ریاست کے لیے ایک خطرہ بن گئی ہے۔'' سپہ سالار ہری سنگھ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کسی وزیر یا امیر کو ریاست کے مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے مہاراج کی علالت کو پردۂ راز میں رکھا ہے۔ اگر یہ خبر اوچ کی حدود سے نکل گئی تو بڑی تباہی پھیل جائے گی۔''

''وہ کس طرح.....؟'' مہارانی شکنتلا نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''آس پاس کے حکمراں برسوں سے ریاست پر قبضہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔'' ہری سنگھ نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تک یہ طوفان اس لیے ظاہر نہیں ہوا کہ میں نے چاروں طرف مضبوط بند باندھ دیئے تھے۔''

''پھر تم کیا چاہتے ہو؟'' شکنتلا نے گہری نظروں سے ہری سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ میری ریاست محفوظ رہے۔'' سپہ سالار ہری سنگھ کا لہجہ پُرجوش تھا اور اس کی آنکھوں میں عجیب سے رنگ اُبھر رہے تھے۔ دراصل راجہ امر سنگھ کی بیماری اور تخت کے مرد وارث کی غیر موجودگی نے ہری سنگھ کو بھی کچھ خواب دکھائے تھے۔

مہارانی شکنتلا، اپنی سوکنوں رانی نمرتا اور رانی پورنیما سے پہلے ہی خائف تھی، پھر جب اس نے ہری سنگھ کی آنکھوں میں حکمرانی کے خواب دیکھے تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ آخر اس نے ایک عجیب چال چلی۔

''ہری سنگھ! میں اور میری بیٹی بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہی ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا؟''

''میں اسی لیے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔'' ہری سنگھ نے رک رک کر کہا۔ ''آپ مہارانی ہیں اور آپ کی صاحبزادی راج کماری نرملا، تخت کی وارث...... میں ہر حال میں آپ دونوں کی حفاظت کروں گا۔''

''تو پھر میری طرف سے اجازت ہے۔'' مہارانی شکنتلا نے صاف صاف کہا۔ ''تم فوری طور پر مہاراج کے خوشامدی وزیروں اور ناکارہ امیروں کو برطرف کر کے ریاست کے انتظامی امور سنبھال لو۔''

ہری سنگھ یہی چاہتا تھا۔ اس نے ایک ہی رات میں تمام وزیروں اور امیروں کو برطرف کر کے اپنے معتمد فوجی سرداروں کو اہم ترین عہدوں پر متعین کر دیا۔

بسترِ علالت پر دراز راجہ امر سنگھ نے اپنے سپہ سالار سے انتظامی تبدیلیوں کا سبب پوچھا تو اس نے بہانہ سازی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمام امراء ریاست کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، میرے نزدیک آپ کے اقتدار کو بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔''

راجہ امر سنگھ سب کچھ سمجھتا تھا..... مگر خون تھوکنے والا حکمراں خون کے گھونٹ پی کر ہی رہ گیا۔ اب اس کے کھوکھلے جسم میں اتنی بھی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ چند قدم کا فاصلہ کسی سہارے کے بغیر طے کر سکے۔

❀---❀---❀

ان ہی دنوں وقت نے ایک اور کروٹ لی۔ 572ھ میں شہاب الدین غوریؒ نے اپنے بڑے سلطان غیاث الدین غوری کے حکم سے ملتان پر حملہ کر دیا۔ ان دنوں ملتان قرامطہ کا مرکز تھا۔ قرامطہ اپنے ناموں کے اعتبار سے مسلمان تھے مگر درپردہ وہ اسلام کے بہت بڑے دشمن تھے اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دین کے خلاف مسلسل سازشیں کرتے رہتے تھے۔ سلطان محمود غزنوی نے بڑی حد تک قرامطہ کا قلع قمع کر دیا تھا..... مگر پھر بھی فتنہ گروں کی یہ جماعت سمٹتے سمٹتے ملتان میں مرکوز ہو گئی تھی۔ شہاب الدین غوری نے آندھی طوفان کی طرح یلغار کی اور ایک خونریز جنگ کے بعد ملتان کو قرامطہ سے خالی کرا لیا۔

اس کے بعد شہاب الدین غوری، اوچ کی طرف بڑھا۔ سپہ سالار ہری سنگھ جو مہارانی شکنتلا کی مدد سے حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا، شہاب الدین غوری کی پیش قدمی کی خبر سن کر گھبرا گیا۔ ریاست اوچ کی فوج میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ کھلے میدان میں اسلامی لشکر کا مقابلہ کر سکے۔ نتیجتاً ہری سنگھ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اوچ کے سپہ سالار نے یہ فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ قلعے کی فصیلیں بہت اونچی اور مضبوط تھیں۔ ہری سنگھ کا خیال تھا کہ شہاب الدین غوری چند ماہ کے محاصرے کے بعد اس صورتِ حال سے تنگ آ کر واپس چلا جائے گا۔

ریاست پر ایک دشمن کی یلغار کے خوف نے راجہ امر سنگھ کی بیماری کو شدید تر بنا دیا تھا۔ ایک دن اُس نے سپہ سالار ہری سنگھ سے کہا کہ وہ قلعے کی فصیل سے شہاب الدین غوری کے لشکر کو دیکھنا چاہتا ہے۔ ویدوں نے راجہ کو سمجھایا کہ سیڑھیاں چڑھنے سے اس کے پھیپھڑے بہت زیادہ متاثر ہوں گے۔ امر سنگھ نے حکیموں کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ آخر وہ ایک پالکی میں بیٹھ کر قلعے کی فصیل پر پہنچا اور جب اس نے مسلمان سپاہیوں کو چاروں طرف خیمہ زن دیکھا تو بدحواس ہو گیا۔ راجہ امر سنگھ کو شکست کے ساتھ اپنی موت بھی نظر آ رہی تھی۔ اسی خوف نے اُسے دوبارہ شراب نوشی پر مجبور کر دیا حالانکہ شراب کا ایک قطرہ بھی اس کے جسم میں فساد برپا کر سکتا تھا۔ راجہ امر سنگھ کا جگر مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ ویدوں کی سخت تنبیہہ کے بعد کئی ماہ سے اس نے شراب پینا بند کر دی تھی..... مگر جب اس پر شدید مایوسی کا حملہ ہوا تو اس نے دوبارہ ساغر و صراحی کی آغوش میں پناہ ڈھونڈی۔

شہاب الدین غوری کے محاصرے کی وجہ سے ریاست کی صورتِ حال روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ اس دوران سپہ سالار ہری سنگھ اور مہارانی شکنتلا بہت زیادہ قریب آ گئے تھے۔ شکنتلا نے اپنا اقتدار بچانے کے لیے ایک اور چال چلی۔

"ہری سنگھ! اگر تم یہ جنگ جیت گئے تو میں تمہیں ایک قیمتی تحفہ پیش کروں گی۔" شکنتلا نے اپنے سپہ

سالار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ہری سنگھ استفہامیہ نظروں سے مہارانی کی طرف دیکھنے لگا۔

''مہاراج چند دنوں کے مہمان ہیں۔'' مہارانی شکنتلا کے ہونٹوں پر ایک عیارانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ ''غوری کے شکست کھاتے ہی میں، راج کماری نرملا کا بیاہ تمہارے ساتھ کر دوں گی۔ پھر تم دونوں مل کر ریاست اوچ پر حکومت کرو گے۔''

سپہ سالار ہری سنگھ کی آنکھوں میں بیک وقت کئی رنگین خواب لہرا رہے تھے۔ راج کماری نرملا اپنی ماں کی طرح خوب صورت ترین دوشیزہ تھی۔ اس سے شادی کے تصور نے ہری سنگھ جیسے سخت مزاج انسان پر بھی ایک نشہ سا طاری کر دیا تھا۔

❁---❁---❁

اوچ کی رعایا نے شہاب الدین غوری کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ راندۂ درگاہ اچھوت اور دوسری نیچ قوموں کے افراد شہاب الدین غوری کے پاس آ آ کر فریادیں کرتے تھے۔

''سردار! ہمیں ان ظالموں سے نجات دلا دو جن کے پاس صدیوں سے ہمارے جان و مال اور عزت و آبرو رہن رکھے ہوئے ہیں۔''

شہاب الدین غوری اُنہیں تسلیاں دیتا۔ ''اسلام ہی تمہارا مسیحا ہے۔ عنقریب وہ تمہیں سارے دُکھوں سے نجات دیدے گا۔''

محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا اور صورتِ حال لحظہ بہ لحظہ سنگین ہوتی جا رہی تھی۔ سپہ سالار ہری سنگھ کے جاسوس اُسے خبریں دے رہے تھے۔ ''شہاب الدین غوری کے عزائم خوفناک ہیں، وہ واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہے، اس کے پاس سامانِ رسد کی فراوانی ہے، مسلمان سپاہیوں کو غذا کی پروا نہیں کہ ان میں سے اکثر روزہ رکھتے ہیں۔''

ہری سنگھ نے مہارانی شکنتلا کے سامنے تمام صورتِ حال بیان کر دی اور اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔

''مہارانی! میں زیادہ دنوں تک ریاست کا دفاع نہیں کر سکتا...... ہمارے حکمرانوں کے بے پناہ ظلم و تشدد کی وجہ سے اوچ کی رعایا شہاب الدین غوری کے ساتھ ہے۔ ہم اخلاقی طور پر یہ جنگ ہار چکے ہیں۔ اگر میں شہاب الدین غوری کے مقابلے کے لیے کھلے میدان میں نکلا تو ہزاروں انسان خاک و خون میں نہا جائیں گے...... پھر بھی ذلت و شکست کے سوا ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔''

''ہری سنگھ! میں تمہیں اس طرح ہتھیار ڈالنے نہیں دوں گی۔'' مہارانی شکنتلا کی آنکھوں میں خوفناک چمک تھی۔ ''میں یہ جنگ خود لڑوں گی۔''

سپہ سالار ہری سنگھ خاموشی سے واپس چلا گیا۔

❁---❁---❁

دوسرے دن مہارانی شکنتلا نے بڑی رازداری کے ساتھ اپنے ایک جاسوس کو خط دے کر شہاب الدین غوری کے پاس بھیجا۔

''اگر میں قلعے کی فتح میں تمہاری مدد کروں تو تم مجھے کیا انعام دو گے؟''

جواب میں شہاب الدین غوری نے تحریر کیا۔

''پہلے میں تمہیں اسلام کی دعوت دوں گا، پھر تمہیں اپنی شریکِ حیات بنالوں گا۔''

مہارانی شکنتلا نے دوسرا خط لکھا۔

''اب میری عمر تو شادی کے قابل نہیں رہی، لیکن راج کماری نرملا خوب صورت بھی ہے اور تمہارے شایانِ شان بھی...... اگر تم میری بیٹی سے شادی کا وعدہ کرو اور میرے مال و اسباب کو ہاتھ نہ لگاؤ تو میں تمہارے لیے قلعے کا خفیہ دروازہ کھول سکتی ہوں۔''

شہاب الدین غوری نے مہارانی اوچ کی یہ شرائط منظور کر لیں۔

شکنتلا نے دوسرے دن اپنے مُردہ زدہ شوہر، راجہ امر سنگھ کو زہریلی شراب پلا کر مار ڈالا۔ اسی رات دونوں رانیوں کو بھی کھانے میں زہر دے دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ہی رانی نمرتا اور رانی پورنیما کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور وہ خون تھوک تھوک کر مر گئیں۔

تیسرے دن قلعے کے ایک سنسان گوشے میں بیک وقت تین چتائیں جلائی گئیں۔ اوچ کا قلعہ محفوظ پناہ گاہ کے بجائے راج گھرانے کا مدفن بن گیا۔

چوتھے دن مہارانی شکنتلا کے حکم پر قلعے کا خفیہ دروازہ کھول دیا گیا جس کے ذریعے شہاب الدین غوری کے منتخب جانبازوں کا ایک دستہ اوچ کے قلعے میں داخل ہو گیا۔

سپہ سالار ہری سنگھ ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ غوری کے سپاہیوں نے صدر دروازے پر متعین مسلح پہرے داروں کو قتل کر کے دروازہ کھول دیا۔ راستہ ملتے ہی شہاب الدین غوری کا آدھا لشکر قلعے میں داخل ہو گیا اور نصف فوج بدستور محاصرہ کیے رہی۔

پھر ایک معمولی سی جنگ کے بعد شہاب الدین غوری نے اوچ کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ سپہ سالار ہری سنگھ گرفتار ہو گیا اور پھر اسی دن رات کے اندھیرے میں مہارانی شکنتلا کے اشارے پر اسے قتل کر دیا گیا۔

❀---❀---❀

ہنگامۂ دار و گیر کے ختم ہوتے ہی شہاب الدین غوری نے رانی شکنتلا اور اس کی بیٹی راج کماری نرملا کو حلقۂ اسلام میں داخل کیا اور حسبِ وعدہ نرملا سے شادی کر لی۔

مہارانی شکنتلا بہت خوش تھی کہ اس نے بڑی ذہانت سے نہ صرف جان بچا لی تھی بلکہ اپنے قیمتی خزانے کو بھی محفوظ کر لیا تھا۔ مگر اس کی یہ خوشی بہت عارضی تھی۔ ریاست کے انتظامات مکمل کرتے ہی شہاب الدین غوری نے اپنی بیوی راج کماری نرملا اور مہارانی شکنتلا کو غزنی بھیجنے کا حکم جاری کر دیا۔

''میں اپنے وطن سے دُور کیسے رہ سکتی ہوں؟'' شہاب الدین غوری کا حکم سن کر شکنتلا بدحواس ہوگئی۔

''ایک نومسلم عورت کی حیثیت سے تمہیں اسلامی تعلیم و تربیت کی شدید ضرورت ہے۔'' شہاب الدین غوری نے اپنے حکم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تعلیم تو یہاں رہ کر بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔'' مہارانی شکنتلا نے دلیل پیش کی۔ وہ کسی قیمت پر بھی اپنی ریاست چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک نیا منصوبہ تھا۔ اس نے گردشِ وقت کو ٹالنے کے لیے اسلام قبول کیا تھا مگر وہ اندر سے ہندو تھی اور دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کر رہی تھی۔

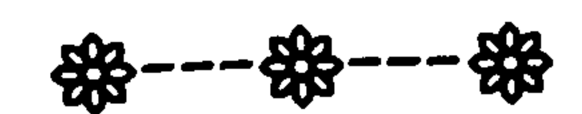
''میں اپنے وعدے سے منحرف نہیں ہوا ہوں۔'' شہاب الدین غوری نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''معاہدے کے مطابق تم ساری دولت اپنے ساتھ لے جا سکتی ہو۔ میں سیم و زر کے اس ذخیرے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا...... مگر ریاست اوچ میں تمہارا قیام ممکن نہیں۔''

''آخر مجھے اپنے آبائی وطن، ماں باپ اور رشتے داروں سے دُور کیوں بھیجا جا رہا ہے؟'' مہارانی شکنتلا کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

''اس لیے کہ تم ایک بے وفا عورت ہو۔'' مجبوراً شہاب الدین غوری نے وہ بات کہہ ڈالی جو بہت نازک بھی تھی اور خطرناک بھی...... ''جو عورت اپنے شوہر کو قتل کر سکتی ہے، اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ سیاست کے اصولوں کے مطابق تمہارا قتل بھی واجب تھا مگر میں اپنے عہد سے مجبور ہوں۔''

مہارانی شکنتلا دولت کے ایک بڑے ذخیرے کے ساتھ غزنی چلی گئی۔ اسلامی دارالحکومت میں اس کی حیثیت ایک قیدی کی سی تھی۔ شہاب الدین غوری نے احکام جاری کر دیئے تھے کہ شکنتلا کی حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھی جائے۔

اوچ کی مہارانی اس اسیرانہ زندگی کو زیادہ دنوں برداشت نہ کر سکی اور ایک سال کے اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر مر گئی۔ جنازہ اُٹھا تو اس کی لاش پر ماتم کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ راج کماری نرملا کو بھی اپنی ماں سے شدید نفرت تھی۔



دیول دیوی

سلطان علاء الدین خلجی کی زندگی میں ارضِ گجرات کی ایک خاص اہمیت ہے۔
اس علاقے کو علاء الدین کے جانباز سپہ سالار نصرت خان نے فتح کیا تھا۔ اس وقت گجرات کا حکمراں راجہ رائے کرن تھا۔ جونسلاً راجپوت تھا...... مگر جب معرکۂ کارزار گرم ہوا تو راجپوتوں کی تلواریں خلجیوں کی شمشیروں کے مقابلے میں یا تو ٹوٹ گئیں یا پھر کند پڑ گئیں۔ نتیجتاً راجہ رائے کرن کو شکستِ فاش سے دوچار ہونا پڑا اور وہ گجرات سے فرار ہو کر دیوگڑھ (دکن) پہنچ گیا۔
شدید افراتفری کا عالم تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ آخر اس ہنگامۂ دار و گیر میں راجہ رائے کرن اپنی بیوی کنولا دیوی سے بچھڑ گیا...... مگر اس کے ساتھ ہی وہ دونوں بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت بڑی بیٹی کی عمر بارہ تیرہ سال تھی اور چھوٹی بیٹی دیول دیوی صرف چار برس کی تھی۔ رانی کنولا دیوی نے بھی فاتح لشکر کی دراز دستی سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور وہ جنگی قیدی بنا لی گئی۔ رانی کنولا دیوی نہایت حسین و جمیل عورت تھی...... اور سلطان علاء الدین خلجی انتہائی جمال پرست حکمراں تھا۔ اسی لیے سالار نصرت خان نے کنولا دیوی کو تحفۂ خاص کے طور پر بارگاہِ سلطانی میں پیش کر دیا تھا۔

❀---❀---❀

علاء الدین کو کنولا دیوی بہت پسند تھی مگر رانی نے ابھی تک سلطان کے عشق کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ اور وہ بدستور کنیزوں کی طرح زندگی بسر کر رہی تھی۔ آخر ایک دن تنہائی میں علاء الدین نے اپنے جلال و جبروت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
''تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ ہماری غلامی قبول کر لو۔''
رانی کنولا دیوی نے بہت منت سماجت کی کہ اسے واپس جانے دیا جائے...... مگر علاء الدین نے گجرات کی سابق ملکہ کی درخواست مسترد کر دی۔

''جو ہمارے مزاج آشنا ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ سکندر ثانی اپنے فیصلے تبدیل نہیں کرتا'' علاء الدین خلجی اپنی کثرتِ فتوحات کے سبب خود کو ''سکندر ثانی'' سمجھتا تھا۔ آخر سلطان نے رانی کنولا دیوی کو بھی فتح کر لیا...... اور وہ مسلمان ہو کر علاء الدین خلجی کے حرمِ خاص میں داخل ہو گئی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ رانی کنولا دیوی کا یہ اقدام جبرِ سلطانی کا نتیجہ تھا۔

پھر تقریباً بارہ سال گزر گئے۔ اگرچہ رانی کنولا دیوی کو ''ملکۂ ہند'' کا اعزاز حاصل تھا..... اور علاء الدین خلجی اُس کی ناز برداری بھی کیا کرتا تھا لیکن وہ ہمیشہ اپنی بیٹیوں کی جدائی میں سوگوار رہا کرتی تھی۔ جب بھی سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتی، اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجا لیتی مگر جیسے ہی اُسے تنہائی میسر آتی، وہ اپنی دونوں بچیوں کو یاد کر کے آنسو بہانے لگتی۔

پھر ایک دن رانی کنولا دیوی کو خبر ملی کہ اس کی بڑی بیٹی طویل علالت کے بعد انتقال کر گئی۔ ملکۂ ہند کے دل پر ایک نشتر سا لگا۔ اُس کے مرجھائے ہوئے زخم دوبارہ خون دینے لگے۔ یہ غم اتنا شدید تھا کہ رانی کنولا دیوی چالیس دن تک سلطان کی خلوت میں بھی حاضر نہ ہو سکی۔ علاء الدین مزاج پُرسی کے لیے آیا تو اُس نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ تراش لیا مگر اپنے کرب کا اظہار نہیں کیا۔

❀---❀---❀

پھر ایک دن رانی کنولا دیوی کو خبر ملی کہ سلطان علاء الدین ایک فوجی مہم، دیوگڑھ (دکن) بھیج رہا ہے۔ واقعہ یوں تھا کہ دیوگڑھ کے راجہ رام دیو نے تین سال سے خراج ادا نہیں کیا تھا۔ علاء الدین نے رام دیو کی اس حرکت کو بغاوت پر محمول کیا...... اور اس کی سرکوبی کے لیے ایک لشکرِ جرار بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس لشکر کی قیادت کافور کر رہا تھا جو ترقی کرتے کرتے ''ملک نائب'' کے اہم ترین عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ تمام امرائے سلطنت اس ''خواجہ سرا'' سے دلی طور پر نفرت کرتے تھے مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ ملک کافور کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کر سکے۔

لشکر کی روانگی سے پہلے سلطان علاء الدین نے اپنے محبوب کو ''چتر'' عطا کیا جو صرف بادشاہوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اس کے بعد سلطان نے اپنے امراء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہر امیر پر لازم ہے کہ وہ روزانہ ملک نائب کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوں۔ اس کے احکام پر پورا پورا عمل کریں اور ہر معاملے میں اسی کی مرضی کو پیشِ نظر رکھیں۔''

اسی رات رانی کنولا دیوی، سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس وقت اُس کی خوب صورت آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔ علاء الدین، رانی کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔

''ملکۂ ہند کی طبیعت خراب ہے یا کسی نے آپ کی دل آزاری کی ہے؟'' علاء الدین کے لہجے سے انتہائی فکر و تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں بارہ سال سے ایک ایسی آگ میں جل رہی ہوں جو میری روح تک کو پگھلائے دے رہی ہے۔'' رانی کنولا دیوی زار و قطار رو رہی تھی۔ پھر اس نے ہچکیوں کے دوران اپنی بیٹیوں سے جدائی کا تمام واقعہ سناتے ہوئے کہا۔

''ملکۂ ہند نے اتنے دنوں تک اس راز کو کیوں چھپائے رکھا؟'' علاء الدین بھی رانی کنولا دیوی کی حالت زار سے بہت زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا۔ ''آپ صرف ایک بار اپنے ہونٹوں کو جنبش دیتیں، ہم آپ کے سکون کی خاطر ارضِ دکن کو نیست و نابود کر ڈالتے۔''

''میں کس کے سامنے اپنا دُکھ بیان کرتی...... اور کون سنتا میری رُودادِ الم؟'' رانی کنولا دیوی سر تا پا ایک تصویرِ درد نظر آ رہی تھی۔

''ہم سنتے۔'' یکایک علاء الدین کا روایتی جاہ و جلال لوٹ آیا۔ ''ملکۂ ہند پر واضح ہو جانا چاہیے کہ ہم اپنے نام لیواؤں کو تنہا نہیں چھوڑ دیتے۔''

پھر سلطان نے اسی وقت کافور اور الغ خان کو طلب کیا اور انتہائی غضب کے عالم میں حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''میں ملکۂ ہند کی بیٹی دیول دیوی کو ہر حال میں اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

ملک کافور اور الغ خان نے اپنے سر جھکا دیئے۔

''اگر راجہ رائے کرن خوشی سے دیول دیوی کو تمہارے حوالے کر دے تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کر دو۔'' علاء الدین خلجی کے لہجے سے قہر کی آگ برس رہی تھی۔ ''اور اگر وہ حکمِ سلطانی سے گریز اختیار کرے تو اس کی سانسیں غصب کر لو۔ وہ جہاں جائے، اس کا تعاقب کرو۔ یہاں تک کہ اس زمین پر اس کے لیے کوئی پناہ گاہ باقی نہ رہے۔'' سلطان کے غصے میں دم بہ دم اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ''اگر اس علاقے کا کوئی حاکم، رائے کرن کی حمایت کرے تو اس پر بھی زندگی کے دروازے بند کر دو۔''

ملک کافور گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ ''آقائے نعمت کا اقبال بلند ہو۔ یہ غلام اس وقت تک واپس نہیں آئے گا جب تک اپنے آقا کے ایک ایک حکم کو ارضِ دکن پر نافذ نہیں کر دے گا۔''

ملک کافور کے اس اندازِ وفاداری پر علاء الدین خلجی کا چہرہ کِھل اُٹھا۔ پھر فرمانروائے ہند نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ملک! خدا تجھے سربلند رکھے کہ تُو اپنے سلطان ہی کا سایہ ہے۔''

ملک کافور اور الغ خان اُلٹے قدموں چلتے ہوئے، جھکے سروں کے ساتھ خلوتِ سلطان سے باہر نکل گئے۔

رانی کنولا دیوی نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ اپنے شوہر کی طرف دیکھا جسے قہر و غضب کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ آج ملکۂ ہند کو سلطان کے چہرے پر محبت کا عجیب رنگ نظر آیا۔ کنولا دیوی نے مضطرب ہو کر علاء الدین خلجی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

''ایک بے قرار ماں کی دعا ہے کہ خدا، سلطان کے منصب و اقتدار میں اضافہ کرے۔''

علاء الدین نے کنولا دیوی کو گلے سے لگا لیا۔ ''ملکۂ ہند کو یقین کر لینا چاہیے کہ ہم پر اس وقت تک

دنیا کی ہر لذت حرام ہے، جب تک ایک بیٹی اپنی ماں کی آغوشِ محبت میں سما نہیں جاتی۔ آپ کے رشتے سے اب دیول دیوی ہماری بھی بیٹی ہے۔"

❀---❀---❀

کئی سال پہلے جب نصرت خان نے گجرات کے راجہ رائے کرن کو شکست دی تو وہ فرار ہو کر دیوگڑھ پہنچا اور یہاں کے حاکم رام دیو سے مذہب کے نام پر پناہ مانگی۔ اگرچہ رام دیو، سلطان علاء الدین خلجی کا خراج گزار تھا لیکن دل سے وہ ایک مسلمان کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے رام دیو نے نہ صرف راجہ رائے کرن کو سیاسی پناہ دے دی بلکہ اپنی حدودِ سلطنت میں سے "بگلانہ" کا علاقہ بھی اس کے سپرد کر دیا۔ رائے کرن نے "نندر بار" کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور سکون سے حکومت کرنے لگا۔

اسی دوران ایک مرتبہ رام دیو کا بیٹا سنگل دیو، نندر بار پہنچا۔ راجہ رائے کرن، رام دیو کو اپنا محسن سمجھتا تھا، اس لیے اس نے سنگل دیو کا نہایت پُر جوش استقبال کیا۔ رقص و سرود کی محفلیں سجائیں اور دسترخوان کو پُر تکلف کھانوں سے بھر دیا۔ اتفاق سے ایک دن سنگل دیو کی نظر دیول دیوی پر پڑ گئی اور وہ اس پری پیکر کے جلووں میں کھو کر رہ گیا۔ سنگل دیو فطرتاً ایک اوباش نوجوان تھا۔ دیول دیوی کے بے پناہ حُسن نے اُس کے ہوش و حواس چھین لیے تھے۔

پھر جب سنگل دیو واپس دیوگڑھ پہنچا تو اس نے اپنے باپ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ دیول دیوی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی محبت کو جلد از جلد قانونی رشتے میں تبدیل کر دیا جائے۔

"یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا کہ تم سمجھ رہے ہو۔" رام دیو نے اپنے جذباتی بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "کیا پتہ کہ رائے کرن نے اپنی بیٹی کا رشتہ کہیں اور طے کر رکھا ہو؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے پتا جی؟" سنگل دیو نے کسی تکلف کے بغیر کہا۔ "یہ رشتہ ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"کیا فضول باتیں کر رہے ہو؟" رام دیو کے لہجے سے تلخی جھلکنے لگی تھی۔ "وہ رائے کرن کی بیٹی ہے، میری جاگیر نہیں۔ میں اس سے درخواست ہی کر سکتا ہوں۔"

"صرف دیول دیوی ہی نہیں، اس کا باپ بھی آپ کی جاگیر ہے۔" سنگل دیو نے اونچی آواز میں کہا۔ "اب رائے کرن گجرات کا راجہ نہیں، ہمارا پناہ گزیں ہے...... اور پناہ گزیں کی حیثیت رعایا سے زیادہ نہیں ہوتی۔ آپ درخواست نہ کریں، اُسے حکم دیں۔ ایک غلام میں انکار کی جرأت نہیں ہوتی۔ وہ آقا کی مرضی کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتا۔"

آخر رام دیو، بیٹے کی ضدوں کے آگے مجبور ہو گیا۔ پھر وہ دیوگڑھ سے بگلانہ پہنچا اور اس نے سنگل دیو کے لیے دیول دیوی کا ہاتھ مانگا۔ راجہ رائے کرن اس پیغام پر حیران رہ گیا...... مگر اس نے فوراً ہی اپنی حیرت پر قابو پا لیا اور مسکرانے لگا۔

''دیول دیوی ابھی چھوٹی ہے۔''

''راجہ صاحب! پندرہ سولہ سال کی عمر کم تو نہیں ہوتی۔'' رام دیو نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔''ہمارے یہاں تو اس سے بھی کم عمر لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مہاراج! مگر میں مزید دو تین سال دیول دیوی کی تعلیم و تربیت کرنا چاہتا ہوں۔'' راجہ رائے کرن کے ہونٹوں پر ایک شگفتہ مسکراہٹ تھی۔''مجھے یہ رشتہ دل سے پسند ہے لیکن اس کے ساتھ ایک درخواست بھی ہے کہ کچھ دن انتظار کر لیں۔''

رام دیو مطمئن ہو کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی راجہ رائے کرن بند کمرے میں چیخنے لگا۔

''میں جلاوطن اور پناہ گزیں سہی مگر میں نے دیوگڑھ والوں کے ہاتھ اپنی غیرت فروخت نہیں کی ہے۔ ایک مرہٹہ میرا داماد کی طرح بن سکتا ہے؟ میں اوّل و آخر ایک راجپوت ہوں۔ دنیا کی اعلیٰ ترین نسل۔ میں اپنی قوم میں پیوند کاری کی ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔''

ہندوستان کے راجپوت، برہمنوں کے علاوہ ہر قبیلے اور ذات کے لوگوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ راجہ رائے کرن احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا، اس لیے وہ رام دیو کے سامنے انکار نہ کر سکا مگر دل ہی دل میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ''سرخ پری'' کو ''کالے دیو'' کے حوالے نہیں کرے گا۔ (عام طور پر راجپوتوں کا رنگ سرخ اور مرہٹوں کا سیاہی مائل ہوتا ہے)

❀---❀---❀

الغ خان اپنا لشکر لے کر گجرات چلا گیا......اور ملک کافور نے دکن کا رُخ کیا۔ پھر علاء الدین کے دونوں سالار کچھ دن تک منصوبہ بندی کرتے رہے۔

الغ خان اور ملک کافور کو اس نازک صورتِ حال کا پورا پورا احساس تھا کہ اگر وہ اپنے مقاصد میں ناکام ہوئے تو سلطان کی نظروں سے گر جائیں گے۔ خصوصاً ملک کافور بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ علاء الدین خلجی نے اپنے کئی معتمد اور تجربہ کار سالاروں کو نظر انداز کر کے اسے فوجی مہم کی قیادت بخشی تھی۔ اس لیے وہ اس سنہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

آخر ملک کافور نے طویل غور و خوض اور مشاورت کے بعد جنگی حکمتِ عملی تیار کی۔ اس وقت وہ مالوہ میں مقیم تھا۔ گجرات سے الغ خان اور عین الملک ملتانی بھی مالوہ آ پہنچے۔ دونوں سالاروں کی موجودگی میں ملک کافور نے راجہ رائے کرن کو فرمانروائے ہندوستان کا پیغام بھیجا۔

''سلطانِ معظم کی شدید خواہش ہے کہ ملکۂ ہند کنولا دیوی کی صاحبزادی دیول دیوی کو پورے عزت و احترام کے ساتھ دہلی بھیج دیا جائے۔ اگر بگلانہ کے حاکم نے سلطانِ ذی وقار کی خواہش کو حکم کا درجہ دیا تو اس کی تمام سابقہ کوتاہیاں اور خطائیں بھی معاف کر دی جائیں گی۔ انکار کی صورت میں کوئی نہیں جانتا کہ قتل و غارت کا کیسا طوفان اُٹھے گا؟ موجِ خوں انسانی سروں سے گزرے گی یا محلات کے بلند ترین

میناروں سے؟''

راجہ رائے کرن نے ملک کافور کا خط پڑھا اور شدید غصے کی حالت میں خط کے ٹکڑے کر دیئے۔ پھر انتہائی غضب ناک لہجے میں قاصد سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اس خواجہ سرا سے کہہ دینا کہ اس کے خط کا یہی جواب ہے۔''

قاصد نے اس گالی کا حوالہ تو نہیں دیا جو رائے کرن نے ملک کافور کو دی تھی..... مگر پورا واقعہ بے کم و کاست بیان کر دیا۔

ملک کافور ''ملک نائب'' کے عہدے پر فائز تھا۔ اسی منصب کے باعث وہ اپنے آپ کو سلطان علاء الدین خلجی کے بعد ہندوستان کا سب سے طاقتور انسان سمجھتا تھا۔ راجہ رائے کرن کا جواب سن کر ملک کافور غصے سے کانپنے لگا۔

''الغ خان! تم نے سنا رائے کرن کا جواب؟'' شدتِ غضب سے ملک کافور کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

''جواب بھی سن لیا اور اس کے ایک ایک لفظ کا مفہوم بھی سمجھ لیا۔'' الغ خان کے چہرے پر بھی شدید غصے کی کیفیت اُبھر آئی تھی۔

''مجھے سلطانِ عالی مقام نے یہ اعزاز بخشا ہے۔'' ملک کافور ایک بادشاہ کے لہجے میں بول رہا تھا۔ ''وہ میرا فرمان نہیں، سلطانِ ذی وقار کا فرمانِ مقدس تھا۔ میں اپنے آقائے نعمت کی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔''

''اس گستاخی کا جواب شدید انتقام کے سوا کچھ نہیں۔'' سالار عین الملک ملتانی نے انتہائی سخت لہجے میں کہا۔ ''سلطانِ معظم پہلے ہی حکم دے چکے ہیں کہ انکار کی صورت میں قہرِ شاہی ان لوگوں کا مقدر بن جائے گا۔ اب ہمیں کسی تاخیر کے بغیر ارضِ دکن کی قسمت کا فیصلہ کر دینا چاہئے۔''

باہم مشورے کے بعد ملک کافور نے الغ خان سے کہا کہ وہ ''بگلانہ'' کے پہاڑی راستوں میں پیش قدمی کر کے رائے کرن تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ پھر جب الغ خان کا لشکر کُوچ کر گیا تو ملک کافور، دیوگڑھ کی طرف بڑھا۔

❁---❁---❁

الغ خان اور راجہ رائے کرن کے درمیان دو ماہ تک جنگ ہوتی رہی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ پُر پیچ اور دُشوار گزار پہاڑی راستے کی وجہ سے رائے کرن کا دفاع بہت مضبوط تھا۔ اس لیے الغ خان سر توڑ کوششوں کے باوجود اس پر قابو نہ پا سکا۔

رائے کرن کو آفات و مصائب کے ہجوم میں گھرا دیکھ کر دیوگڑھ کے ولی عہدِ سلطنت سنگل دیو نے ایک اور چال چلی۔ وہ رات کے اندھیرے میں نندربار پہنچا اور رائے کرن سے کہنے لگا۔

''مسلمانوں اور ہندوؤں کی یہ دشمنی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ پہلے ان لوگوں نے ہمارے علاقے غصب

کیے اور ہمیں اپنا خراج گزار بنایا۔'' سنگل دیو کی زبان مسلمانوں کے خلاف نفرت کا زہر اُگل رہی تھی۔
''اور اب وہ ہم سے ہماری عزتوں کا خراج مانگ رہے ہیں۔''
''میرے جیتے جی یہ کیسے ممکن ہے؟'' راجہ رائے کرن انتہائی غضب ناک نظر آ رہا تھا۔''سنگل دیو! کیا تجھے راجپوتوں کی تاریخ نہیں معلوم؟''
''میں خوب جانتا ہوں مہاراج!'' سنگل دیو خوشامد اور چاپلوسی سے کام لے رہا تھا۔''جب تک یہ دھرتی اور آکاش قائم ہیں، راجپوتوں کی غیرت وشجاعت کی داستانیں گھر گھر دہرائی جاتی رہیں گی۔''
''تو پھر مجھے کیا غم ہے سنگل دیو.....!'' راجہ رائے کرن کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ اُبھر آئی۔
''راجپوتوں کی یہ روایت رہی ہے کہ فیصلہ کُن جنگ سے پہلے ان کی عورتیں اپنے آپ کو بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالے کر دیتی ہیں۔ اگر ایسا وقت آیا تو دیول دیوی بھی خود کو بھڑکتے ہوئے شعلوں کے سپرد کر دے گی۔ اور اگر وہ لڑکی ہونے کی وجہ سے موت سے ڈر گئی تو میری تلوار اس کا کام تمام کر ڈالے گی۔''
راجہ رائے کرن کے یہ عزائم دیکھ کر سنگل دیو مایوسی کا شکار نظر آنے لگا۔ پھر بھی اس نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سنگل دیو کے عیار ذہن نے آخری چال چلتے ہوئے کہا۔
''مہاراجہ! سارا جھگڑا ابھی تو اسی بات پر ہے کہ دیول دیوی غیر شادی شدہ ہے۔''
رائے کرن نے چونک کر سنگل دیو کی طرف دیکھا۔
''اگر دیول دیوی کا بیاہ میرے ساتھ ہو جاتا ہے تو سارا جھگڑا ختم۔'' سنگل دیو بڑی ہوشیاری کے ساتھ رائے کرن کے گرد جال بچھا رہا تھا۔
''وہ کس طرح؟'' رائے کرن ابھی تک بات کی گہرائی کو نہیں سمجھ سکا تھا۔
''یہ شادی ہوتے ہی مسلمان مایوس ہو جائیں گے......اور پھر بگلانہ کا محاصرہ ختم کر کے دہلی کی طرف واپس لوٹ جائیں گے۔'' سنگل دیو بڑے عیارانہ انداز میں اپنی بات کی وضاحت کر رہا تھا۔
آخر رائے کرن کی سمجھ میں بات آ گئی۔ وہ دل ہی دل میں سنگل دیو کی اس حیلہ سازی پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔
رائے کرن کو خاموش پا کر، سنگل دیو نے اپنے جال کا آخری پھندا بھی کس دیا۔''اس شادی کا سب سے بڑا فائدہ آپ ہی کو پہنچے گا مہاراج!'' سنگل دیو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''دیول دیوی بھی آگ کی خوراک بننے سے بچ جائے گی.....اور آپ کو پتا جی کا آشیرواد بھی حاصل رہے گا۔''
سنگل دیو کا آخری جملہ بڑا خطرناک تھا۔ راجہ رائے کرن نے الفاظ کی نشتریت کو پوری طرح محسوس کر لیا۔ سنگل دیو، رائے کرن کو اس کی مجبوریوں کی مکمل تصویر دکھانا چاہتا تھا۔ پھر جب رائے کرن نے گردشِ ایام کے آئینے میں اپنی مجبوریوں کو دیکھا تو ڈر گیا۔ رائے کرن جس خطے پر حکومت کر رہا تھا، وہ رام دیو ہی کا بخشا ہوا زمین کا ایک ٹکڑا تھا۔ اگر رام دیو اس کے سر سے اپنا ہاتھ اٹھا لیتا تو زمین کا یہ ٹکڑا بھی

اس کے پیروں کے نیچے سے نکل جاتا۔

حالات کا دوسرا سنگین پہلو یہ تھا کہ "بگلانہ" کا مضبوط دفاع بھی رام دیو کی فوجی امداد کا رہینِ منت تھا۔ اگر رام دیو ہاتھ کھینچ لیتا تو اب تک الغ خان کے سپاہی، بگلانہ کو پامال کر چکے ہوتے۔ اور رائے کرن یا تو زنجیریں پہن چکا ہوتا یا پھر الغ خان کے گھوڑے اس کے سر کو روند رہے ہوتے۔ سنگل دیو نے مبہم اشارے میں رائے کرن کو یہی بات سمجھانی چاہی تھی۔

آخر زندہ رہنے کی خواہش اور اقتدار کی حرص قومی غیرت کے جذبات پر غالب آ گئی۔ اور رائے کرن نے یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیا۔

"دیول دیوی کسی شہزادے کے حرم میں داخل ہو جائے یا کوئی مسلمان اس پر تصرف حاصل کر لے....اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ایک مرہٹے کی بیوی بن جائے۔ آخر سنگل دیو ہندو تو ہے۔ کم ذات ہوا تو کیا ہوا؟"

پھر ایک راجپوت نے ایک مرہٹے کو اپنی دامادی میں قبول کر لیا۔

سنگل دیو کی خوشی نا قابلِ بیان تھی۔ اس نے جوشِ جذبات میں راجہ رائے کرن کا ہاتھ چوم لیا۔

"مہاراج! میں دیوگڑھ پہنچ کر اپنے چھوٹے بھائی، بھیم دیو کو بھیجتا ہوں۔ آپ اس کی نگرانی میں دیول دیوی کو روانہ کر دیجیے۔ شادی کی رسم دیوگڑھ میں ادا ہو گی۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس تقریب میں شرکت کر لیں۔"

"میں ایک لمحے کے لیے بھی بگلانہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔" راجہ رائے کرن نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں، میری غیر موجودگی میں کیا صورتِ حال پیش آ جائے۔"

سنگل دیو نے رخصت کی اجازت چاہی۔ رائے کرن نے بڑے جبر و کراہ کے ساتھ اپنے ہونے والے داماد کو گلے سے لگایا۔

"اور آخری بات یہ کہ آپ صبح ہوتے ہی بگلانہ کے گلی کوچوں میں تشہیر کرا دیجیے کہ دیول دیوی کی شادی میرے ساتھ ہو چکی ہے۔" سنگل دیو نے تجویز پیش کی تا کہ مسلمان لشکر میں بددلی پھیل جائے۔ اور الغ خان یہ سوچ کر واپس لوٹ جائے کہ جس چیز کے لیے جنگ کی جا رہی تھی، جب وہی نہیں رہی تو پھر انسانی خون بہانے سے کیا فائدہ؟

❀---❀---❀

سنگل دیو، رات کے اندھیرے میں خفیہ اور محفوظ راستے سے دیوگڑھ کی طرف لوٹ گیا۔ وہ گھوڑے کی پشت پر اس طرح بیٹھا تھا جیسے رقص کر رہا ہو۔ اور یہ رقص اس خوشی میں تھا کہ کالے دیو نے سرخ پری کو جیت لیا تھا۔

پھر جب دیول دیوی کو اس کی سکھیوں اور داسیوں نے یہ خبر سنائی تو وہ اُداس ہو گئی۔ اس نے سنگل

دیو کے بارے میں پہلے بھی سنا تھا کہ وہ ایک بدصورت نوجوان ہے..... اور قومی حیثیت میں بھی اس سے کمتر ہے...... مگر جب رائے کرن نے بیٹی کو اپنی مجبوریاں سمجھائیں تو دیول دیوی نے سر جھکا کر قسمت کے فیصلے کو بادلِ ناخواستہ قبول کر لیا۔ رائے کرن نے اسے یہ بات نہیں بتائی تھی کہ کنولا دیوی اس کی جدائی میں تڑپ رہی ہے۔ دیول دیوی کو تو اپنی ماں کی شکل وصورت بھی یاد نہیں تھی۔ اگر کبھی اُسے کنولا دیوی کی یاد آتی بھی تو رائے کرن یہ کہہ کر ان یادوں کو غبار آلود کر دیتا کہ کنولا دیوی ایک بے وفا عورت تھی، جو ہندو دھرم چھوڑ کر اپنی خوشی سے علاء الدین خلجی کے حرم میں چلی گئی۔ ممتا سے محرومی اور ماں کے نام سے وابستہ شرمناک افسانوں نے دیول دیوی کو بچپن ہی سے شکستہ دل بنا دیا تھا۔ وہ اکثر اُداس اور خاموش رہتی۔ اسے راج محل کی رنگا رنگ تقریبات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سنگل دیو سے رشتہ طے ہو جانے کے بعد اس کی اُداسیوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

❋---❋---❋

دوسرے دن الغ خان کے خیمے میں گیروا لباس پہنے ہوئے ایک ہندو جوگی داخل ہوا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ الغ خان کے خیمے میں ایک خدمت گار موجود تھا۔

''تم باہر جاؤ۔'' الغ خان نے اپنے خدمت گار کو حکم دیتے ہوئے کہا اور ہندو جوگی کو غور سے دیکھنے لگا۔ خدمت گار فوراً ہی خیمے سے نکل گیا۔

جوگی آگے بڑھا اور الغ خان سے سرگوشی میں کہنے لگا۔ ''سردار! بڑی عجیب خبر ہے۔ رائے کرن نے اپنی بیٹی دیول دیوی کی شادی رام دیو کے بیٹے سنگل دیو سے کر دی۔''

یہ خبر سن کر الغ خان پر وحشت طاری ہو گئی۔ ''تجھے کیسے پتہ چلا؟''

''بگلانہ کی گلی گلی میں یہی شور ہے۔'' جوگی بھی سراسیمہ نظر آ رہا تھا۔

''تو نے بگلانہ میں کوئی خاص تقریب دیکھی؟'' الغ خان کی وحشت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

''نہیں سردار!'' جوگی بھی پریشان نظر آ رہا تھا۔ ''پھر بھی لوگوں میں ایک جوش وخروش پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اسی شادی کا ردِعمل ہو۔''

''تو واپس جا اور حالات پر گہری نظر رکھ!'' الغ خان کھڑا ہو گیا۔

ہندو جوگی تیزی کے ساتھ خیمے سے نکل گیا۔ دراصل وہ الغ خان کا جاسوس تھا جو مقامی ہندوؤں کے لباس میں ''بگلانہ'' کی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ اس کی حرکات وسکنات دیکھ کر اور گفتگو سننے کے بعد بڑے سے بڑا پنڈت بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص مسلمان ہے اور سلطانی لشکر کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔

جوگی کے جاتے ہی الغ خان نے اپنے فوجی ماہرین کو خیمے میں جمع کیا اور ان سے مشورے کرنے لگا۔

جب کوئی مشیر کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تو اس نے اپنے معتمد ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں مزاجِ سلطانی کا اندازہ ہے۔'' علاء الدین خلجی کے خوف سے الغ خان کا جسم اور زبان دونوں کانپ رہے تھے۔ ''میں اپنے شہنشاہ کے مزاج سے واقف ہوں۔ سلطانِ ذی وقار کو شکست و ناکامی سے شدید نفرت ہے۔ اگر ہم لوگ خالی ہاتھ دہلی کی طرف لوٹے تو ہمیشہ کے لیے بارگاہِ سلطانی میں حاضری کے اعزاز سے محروم کر دیئے جائیں گے۔''

الغ خان کی بات سن کر دوسرے فوجی ماہرین کے چہروں پر بھی ایک خوف و ہراس کا رنگ اُبھر آیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ دیول دیوی ابھی بگلانہ میں موجود ہے۔'' الغ خان نے اس سنگین صورتِ حال پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے راجہ رائے کرن نے اپنی بیٹی کی شادی کی افواہ اُڑائی ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' تمام فوجی مشیروں نے الغ خان کی اس قیاس آرائی پر مثبت ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''اب ایک ہی صورت ہے کہ ہم اپنی تمام تر فوجی طاقت رائے کرن کے خلاف استعمال کر ڈالیں۔'' الغ خان نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ''ہمیں زبردستی دیول دیوی کو چھین لینا چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو بگلانہ اور نندر بار کی زمین کو اپنے ہی خون سے لالہ زار بنا ڈالیں۔ جب ہم لوگ اس دنیا میں نہیں رہیں گے تو پھر سلطان کو اپنا منہ بھی نہیں دکھا سکیں گے۔ ناکامی کی رُسوائی سے تو بہتر ہے کہ ہم اسی کوہستان میں پیوندِ خاک ہو جائیں۔''

ہر شخص، سلطان علاء الدین کے خوف سے سہا ہوا تھا۔ اس لیے تمام امیروں اور فوجی مشیروں نے الغ خان کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''اب اس کے سوا ہماری نجات کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔''

الغرض رات بھر اس قسم کے مشورے ہوتے رہے۔

فجر کی اذان ہوتے ہی الغ خان اور دوسرے سپاہیوں نے نماز ادا کی۔ پھر وہ اللہ کے بھروسے پر اپنے خیموں سے نکلے اور مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر بگلانہ کے پورے کوہستان میں پھیل گئے۔

مسلمانوں پر ایک جنون سا طاری تھا۔ وہ رائے کرن کے سپاہیوں سے دیوانہ وار لڑ رہے تھے۔ پھر یہی دیوانگی رنگ لا کر رہی۔ راجہ رائے کرن، الغ خان کے حملوں کی تاب نہ لا سکا اور میدانِ جنگ سے دیوگڑھ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

❁---❁---❁

اسی دوران سنگل دیو نے اپنے چھوٹے بھائی، بھیم دیو کو بگلانہ بھیج دیا تھا۔ رائے کرن نے دیول دیوی کو بھیم دیو کے حوالے کیا اور اس کی حفاظت کے لیے دو ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ متعین کر دیا۔

بگلانہ کے کوہستان میں خونریز جنگ جاری تھی...... اور بھیم دیو اپنی ہونے والی بھاوج کو لے کر ایک خفیہ راستے سے دیوگڑھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پھر جب راجہ رائے کرن، میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا تو الغ خان نے اس کے تمام مال و اسباب اور ہاتھیوں پر قبضہ کر لیا۔ مالِ غنیمت یا علاقے کی فتح الغ خان کا مقصد نہیں تھا۔ اس کی مضطرب نگاہیں رائے کرن کو تلاش کر رہی تھیں...... اور رائے کرن کا دُور دُور بھی پتہ نہیں تھا۔ الغ خان نے مختصر سی فوج بگلانہ کے قلعے کی حفاظت کے لیے چھوڑی اور اپنا پورا لشکر لے کر دیوگڑھ کی طرف روانہ ہوا۔

سلطانی لشکر نے رائے کرن کو بہت تلاش کیا مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ مغرور راجہ کا ہلکا سا نشان تک نہیں ملا۔ آخر الغ خان مایوس ہو کر دریا کے کنارے خیمہ زن ہو گیا۔ دو دن تک وہ کھلے آسمان کے نیچے پڑا رہا اور دعائیں کرتا رہا۔

''خداوند ذوالجلال! مجھے سلطان علاء الدین کے جلال سے محفوظ رکھ۔''

پھر آسمانوں پر الغ خان کی دعا سن لی گئی۔ اچانک اسلامی لشکر میں ایک شور سا برپا ہو گیا۔ تمام فوجی، دیول دیوی کے حصول کو سلطان علاء الدین کی کرامت کا نتیجہ سمجھنے لگے۔

اور حقیقتاً دیول دیوی کا اس طرح مل جانا کسی بزرگ کی کرامت سے کم نہیں تھا۔

واقعہ یوں ہوا کہ جب الغ خان کا لشکر دریا کے کنارے خیمہ زن تھا تو کچھ فوجیوں کے دل میں آئی کہ وہ ''ایلورا'' کی سیر کریں۔ (اجنتا اور ایلورا کے غار قدیم ہندو تہذیب کی یادگار نشانیاں ہیں)

الغ خان نے اپنے فوجیوں کو اجازت دے دی۔ نتیجتاً چار ہزار کے قریب سپاہی ''ایلورا'' کی سیر کے لیے روانہ ہوئے۔ ابھی مسلمان فوجیوں نے چند میل کا فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ اُنہیں دکنی فوج کا ایک دستہ دُور سے گزرتا ہوا نظر آیا۔ الغ خان کے سپاہی سمجھے کہ دشمن کی فوج ان پر حملہ کرنے کے لیے آ رہی ہے۔ اس خیال کے پیشِ نظر مسلمان سپاہی یکجا ہو گئے۔

''اس سے پہلے کہ رائے کرن کا فوجی دستہ ہم پر حملہ آور ہو، ہم خود ہی آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیں۔'' ایک فوجی مشیر نے اپنے سپاہیوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

الغ خان کے سپاہیوں نے فوجی مشیر کی رائے سے اتفاق کیا۔ پھر وہ سب کے سب یک جان ہو کر بھوکے عقاب کی طرح راجہ رائے کرن کے فوجی دستے پر جھپٹ پڑے۔

دراصل یہ وہی فوجی دستہ تھا جو بھیم دیو کی نگرانی میں دیول دیوی کو لے کر دیوگڑھ جا رہا تھا۔

مسلمان فوجی سیر و تفریح اور شکار کے لیے جا رہے تھے، اس لیے ہر سپاہی کے پاس تیر کمان موجود تھا۔ بھیم دیو نے کچھ دیر تک تو مسلمان فوجی دستے کا مقابلہ کیا۔ پھر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ مسلمانوں کے زہریلے تیروں نے ہندوؤں کے سینے چھلنی کر دیئے تھے۔ انجام کار بھیم دیو میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے فرار ہوتے ہی رائے کرن کا فوجی دستہ بھی منتشر ہو گیا۔ ہر شخص کو اپنی جان

کی فکر تھی۔ جس کو جدھر راستہ ملا، وہ اس طرف چل پڑا۔

اسی خونریز ہنگامے کے دوران ایک تیر اُس گھوڑے کی ٹانگ میں بھی لگا، جس پر دیول دیوی سوار تھی۔ زخمی گھوڑا زمین پر گر پڑا اور دیول دیوی فرار ہونے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ دیول دیوی کے ساتھ اس کی ملازمہ بھی اسی گھوڑے پر سوار تھی۔ اب وہ دونوں عورتیں بے یار و مددگار کھڑی تھیں اور چیخ چیخ کر اپنے سپاہیوں کو مدد کے لیے پکار رہی تھیں۔

اسی دوران کچھ مسلمان سپاہی ادھر سے گزرے تو ان دونوں عورتوں کو دیکھ کر رُک گئے۔

''کون ہو تم؟'' ایک سپاہی نے انتہائی سخت لہجے میں دیول دیوی سے پوچھا۔

''اس کے ساتھ ادب سے پیش آؤ۔'' ملازمہ نے مسلمان سپاہی کو جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہماری رانی دیول دیوی ہے۔ اسے اپنے سردار کے پاس لے چلو۔''

''دیول دیوی؟'' حیرت وخوشی سے مسلمان سپاہیوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔

پھر جب دیول دیوی کو الغ خان کے سامنے پیش کیا گیا تو کچھ دیر کے لیے مسلمان سردار پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ تم ہی دیول دیوی ہو۔'' الغ خان کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

''کیا اس میں کوئی شک ہے؟'' دیول دیوی نے شہزادیوں کے سے انداز میں کہا۔ دشمن کی حراست میں ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر خوف و ہراس کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا۔

''میں تمہارے دعوے کی تصدیق چاہتا ہوں۔'' الغ خان پر بے یقینی کی سی کیفیت طاری تھی۔

''مجھ سے بہتر اپنا تعارف کون کروا سکتا ہے؟'' دیول دیوی کے لہجے سے شائستگی اور قومی وقار جھلک رہا تھا۔ ''اگر پھر بھی یقین نہ ہو تو اس عورت سے پوچھ لیجئے۔'' دیول دیوی نے اپنی ملازمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

الغ خان نے ہندو عورت کی طرف دیکھا جو بہت زیادہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

''ہاں! یہی ہماری رانی دیول دیوی ہیں۔'' شدتِ خوف سے ملازمہ کی آواز لرز رہی تھی۔

''آپ بگلانہ کے فاتح ہیں۔'' دیول دیوی، الغ خان سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ ہماری حدودِ سلطنت میں بسنے والے ایک ایک فرد سے پوچھ سکتے ہیں کہ میں کون ہوں؟''

''نہیں! مجھے یقین آ گیا۔'' الغ خان کی نظریں دیول دیوی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ''آپ یقیناً رانی دیول دیوی ہیں۔''

یہ کہہ کر سب لوگوں کے سامنے الغ خان سجدے میں چلا گیا۔ پھر اس نے ایک طویل سجدۂ شکر ادا کیا۔ اب وہ سلطان علاء الدین کے قہر وغضب سے محفوظ ہو گیا تھا۔

پھر اسی روز الغ خان، دیول دیوی کو لے کر گجرات چلا گیا۔

کچھ دن بعد الغ خان نے دیول دیوی کو ایک پالکی میں بٹھا کر دہلی کی طرف روانہ کر دیا۔ اس طویل سفر میں انتہائی معتبر اور جانباز سپاہیوں کا ایک دستہ راجپوت شہزادی کی حفاظت کر رہا تھا۔

❀---❀---❀

706ھ میں دیول دیوی دہلی پہنچی۔

راج کماری کی آمد کے موقع پر سلطان علاء الدین نے ایک جشنِ خاص کا اہتمام کیا۔ اپنی بیوی رانی کنولا دیوی کی دلداری کی خاطر سلطان نے ''قصرِ ہزار ستون'' کو سجانے اور چراغاں کرنے کا حکم دیا تھا۔ محل میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ قلعے کا ہر مکین مہمانِ خصوصی کا منتظر تھا۔

پھر جب دیول دیوی کی پالکی، قصرِ ہزار ستون میں آ کر رُکی تو رانی کنولا دیوی جوشِ جذبات میں دُور تک دوڑتی چلی گئی۔ پھر اس نے لرزتے ہاتھوں سے پالکی کا پردہ ہٹایا۔ ماں کے سامنے اس بیٹی کا چہرہ تھا، جو بارہ تیرہ سال تک آغوشِ مادر سے جدا رہی تھی۔ کنولا دیوی، راج کماری کو پہچان نہیں سکی۔ کہاں چار سالہ چھوٹی سی بچی......اور کہاں سولہ سترہ سالہ حسین دوشیزہ؟......اگرچہ اپنے وطن اور باپ کے سائے سے محرومی نے دیول دیوی کو غم زدہ بنا دیا تھا لیکن پھر بھی اس کا دلکش چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔

''بیٹی! پالکی سے اُتر آؤ۔'' رانی کنولا دیوی کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے لبریز تھیں اور آواز کانپ رہی تھی۔ ''یہ میں ہوں، تمہاری بدنصیب ماں۔''

دیول دیوی نے اُداس نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور جھجکتے ہوئے پالکی سے اُتر آئی۔ رانی کنولا دیوی کچھ دیر تک بیٹی کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے درمیان لیے دیکھتی رہی، پھر دیول دیوی کو گلے لگا کر اتنا روئی کہ علاء الدین خلجی اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ راجہ رائے کرن نے ماں کی طرف سے دیول دیوی کے دل میں نفرتوں کا غبار بھر دیا تھا لیکن کنولا دیوی کے جذبات کا سیلاب دیکھ کر دیول دیوی خود بھی رو پڑی۔

پھر جب سلگتی ہوئی آرزوئیں سکون پا گئیں تو رانی کنولا دیوی نے سلطان علاء الدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سلطان! یہ بے قرار ماں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہے گی۔''

''بیٹی کا چہرہ دیکھ کر ملکۂ ہند کی مہجور آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں، یہی ہماری فتح ہے۔'' علاء الدین نے دیول دیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

راج کماری نے اندازے سے تاجدارِ ہندوستان کو پہچان لیا۔ پھر وہ ہندوانہ رسم کے مطابق علاء الدین کے قدموں میں جھک گئی سلطان نے دیول دیوی کو اٹھا کر گلے سے لگایا، سر پر ہاتھ رکھا اور بڑے جذباتی

لہجے میں بولا۔ ''بیٹی! اپنی ماں کی دلجوئی کرنا۔ یہ تمہارے فراق میں بہت تڑپی ہے۔''

راج کماری نے ماں کی طرف دیکھا۔ کنولا دیوی کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا، مگر بارہ تیرہ سالہ جدائی کا سارا گرد و غبار ڈھل گیا تھا۔

❁---❁---❁

دیول دیوی کے آنے کی خوشی میں تین دن تک جشن جاری رہا۔ کنولا دیوی نے کئی بار بیٹی کی نذریں اُتاریں۔ صدقہ و خیرات کیے اور ہزاروں بھوکوں کو کھانا کھلایا۔

اسی ہنگامہ خیز جشن کے دوران شہزادوں نے بھی دیول دیوی کو دیکھا۔ علاء الدین کا بڑا بیٹا خضر خان پہلی ہی نظر میں راجپوت دوشیزہ کے حُسنِ فتنہ ساماں کا شکار ہو گیا۔ سلطان نے بھی خضر خان کے زاویۂ نظر کو محسوس کر لیا تھا۔

علاء الدین کا دوسرا بیٹا شادی خان بھی دیول دیوی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر اس کا انداز اپنے بڑے بھائی خضر خان کی طرح زیادہ جذباتی نہیں تھا۔

علاء الدین کی پہلی بیوی ملکۂ جہاں بھی اپنے دونوں بیٹوں کی نظروں کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس کی جہاں دیدہ آنکھیں ایک ایسے طوفان کو دیکھ رہی تھیں جو گہرے پردوں میں چھپا ہوا تھا۔

❁---❁---❁

خضر خان کئی راتوں سے جاگ رہا تھا...... اور کھلی آنکھوں سے دیول دیوی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ خضر خان کو اپنے چھوٹے بھائی کی آنکھوں میں بھی دیول دیوی کے لیے پسندیدگی کا عکس نظر آیا تھا اس لیے وہ شادی خان کو اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا۔ خضر خان کئی دن تک ذہنی کشمکش کا شکار رہا۔ اسے اپنے چھوٹے بھائی سے بہت محبت تھی...... مگر اس برادرانہ محبت پر دیول دیوی کی محبت غالب آ گئی۔ یہاں تک کہ خضر خان، شادی خان سے کھل کر بات کرنے پر مجبور ہو گیا۔

''میرے بھائی! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دیول دیوی میری پسند ہے۔''

شادی خان نے حیرت سے بڑے بھائی کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔ ''برادرِ معظم! میں نے آپ کی پسند پر کب اعتراض کیا ہے؟''

خضر خان کے چہرے پر مسرت و شادمانی کا گہرا رنگ اُبھر آیا...... مگر پھر بھی وہ اپنی غلط فہمی کو مکمل طور پر دُور کر لینا چاہتا تھا۔ ''کیا تم دیول دیوی کے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتے؟''

''دیول دیوی ایک خوب صورت دوشیزہ ہے۔ اسے دیکھ کر تو ایک برہمچاری (تارک الدنیا جوگی) بھی اپنی تپسیا توڑ سکتا ہے۔'' شادی خان نے بڑے بھائی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ وہ خضر خان کی بے قراری سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

چھوٹے بھائی کی بات سن کر خضر خان کے چہرے کا رنگ اُتر گیا۔

شادی خان نے فوراً ہی خضر خان کی بگڑتی ہوئی کیفیت کو محسوس کر لیا۔ ''میں آپ کی پسند پر اپنے جذبات کو قربان کر سکتا ہوں۔'' شادی خان سنجیدہ ہو گیا۔ ''دیول دیوی مجھے اچھی لگی تھی مگر اب میرا زاویۂ نظر بدل گیا ہے۔ مطمئن رہیے! میں آپ کی خوشیوں کے راستے میں کبھی حائل نہیں ہوں گا۔''

بات واضح ہو گئی تھی۔ خضر خان اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس نے بڑے والہانہ انداز میں چھوٹے بھائی کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

''شادی خان! آج تم نے میرے دل و دماغ سے بڑا بوجھ اتار دیا۔ میں کئی راتوں سے سویا نہیں ہوں۔ شکریہ میرے بھائی!''

جواب میں شادی خان نے بڑے بھائی کے ہاتھ چوم لیے۔ ''راج کماری آپ کو مبارک ہو۔ مگر قطب الدین سے ہوشیار رہیے گا۔ کہیں وہ بابا محترم سے دیول دیوی کو نہ مانگ بیٹھے۔''

قطب الدین، علاء الدین کا تیسرا بیٹا تھا...... مگر خضر خان اور قطب الدین کی مائیں الگ الگ تھیں۔ اس لیے دونوں دُور دُور رہتے تھے۔

''مجھے بس تمہاری فکر تھی۔'' خضر خان نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ''میں ولی عہدِ سلطنت ہوں۔ بابا محترم میری سنیں گے یا قطب الدین کی؟''

❀---❀---❀

اب خضر خان کا زیادہ وقت رانی کنولا دیوی کی خدمت میں گزرتا تھا۔ وہ اس بہانے دیول دیوی کے قریب ہونا چاہتا تھا۔ کنولا دیوی ایک زمانہ شناس عورت تھی اور اسے اپنی بیٹی کے لیے ایک مضبوط سائبان درکار تھا۔ اس لیے وہ بھی خضر خان اور دیول دیوی کو قربت کے مواقع فراہم کرتی رہتی تھی۔ آخر یہ نزدیکیاں رنگ لائیں ......اور دیول دیوی بھی خضر خان کو پسند کرنے لگی۔

پھر بات یہاں تک پہنچی کہ خضر خان اور دیول دیوی چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ کچھ دن تک ان خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا...... مگر ایک رات ملکۂ جہاں کی کنیزِ خاص، دلربا نے ہندوستان کے ولی عہدِ سلطنت اور گجرات کی راج کماری کو سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔

''ملکۂ عالم! ذرا شہزادے خضر خان کی خبر تو لیجئے کہ وہ کس حال میں ہیں؟'' دلربا نے حقِ نمک ادا کرتے ہوئے کہا۔ دراصل وہ ملکۂ جہاں کی جاسوسہ تھی اور قصرِ ہزار ستون کے مکینوں کی خلوتوں میں جھانکتی پھرتی تھی۔

''کس حال میں ہے ہمارا بیٹا خضر خان؟'' ملکۂ جہاں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''کیا شہزادے کی شراب نوشی میں اضافہ ہو گیا ہے؟''

خضر خان کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ علماء کی محبتوں سے محروم رہا۔ علاء الدین کو اپنی فتوحات کے شمار سے فرصت نہیں تھی۔ نتیجتاً وہ اپنے بیٹوں کی تربیت پر توجہ نہ دے سکا اور عام شہزادے، معمولی تعلیم

سے زیادہ کچھ حاصل نہ کر سکے۔ خضر خان لڑکپن ہی سے ایک حُسن پرست نوجوان تھا۔ باپ کی بے توجہی نے اُسے مزید گمراہ کر دیا۔ شراب پینے اور رقص و سرود کی محفلیں سجانے کے سوا ولی عہدِ سلطنت کو کوئی دوسرا کام نہیں تھا۔ اگرچہ علاء الدین کے دورِ حکومت میں شراب نوشی پر سخت پابندی عائد تھی لیکن خضر خان کے پاس پرانی سے پرانی شراب کے بہت بڑے ذخیرے تھے اور اسے کوئی ٹوکنے والا نہیں تھا۔ دلربا کی بات سن کر ملکۂ جہاں یہی سمجھی تھی کہ خضر خان اعتدال کی حدوں سے گزر کر بلانوش بن گیا ہے۔

''ملکۂ عالم! بادہ نوشی تو شہزادے کے لیے معمول کی بات ہے۔'' دلربا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ولی عہدِ سلطنت آج کل ایک خطرناک زہر پی رہے ہیں۔ کنولا دیوی کی بیٹی نے ان پر جادو کر دیا ہے۔''

ملکۂ جہاں، کنولا دیوی سے پہلے ہی جلتی تھی کہ گجرات کی رانی نے اس کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا تھا اور وہ سلطان کے حرم میں داخل ہو گئی تھی۔ اب دلربا نے ایک اور ہولناک خبر دی تھی کہ اسی کنولا دیوی کی بیٹی نے اس کے بیٹے خضر خان کو اپنی زلفوں کا اسیر بنا لیا تھا۔ ملکۂ جہاں کی آنکھوں کے سامنے آتش فشاں سے پھٹنے لگے اور ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ خضر خان اور دیول دیوی کی قربت کا ایک ہی مفہوم تھا کہ آئندہ کنولا دیوی پورے ہندوستان پر حکومت کرے گی۔

ملکۂ جہاں کو اپنا منصوبہ خاک میں ملتا نظر آنے لگا۔ وہ خضر خان کی شادی اپنے بھائی الغ خان کی بیٹی سے کرنا چاہتی تھی تاکہ اقتدار پر اس کی گرفت مضبوط رہے۔

''یہ خضر خان اور دیول دیوی کی آخری ملاقات ہے۔'' ملکۂ جہاں نے غضب ناک لہجے میں کہا اور اپنی خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔

❀---❀---❀

ملکۂ جہاں کا خاندانی نام ''ماہِ رُو'' تھا...... اور وہ سلطان علاء الدین کے عہدِ جوانی کی محبوبہ تھی۔ سلطان علاء الدین کی پہلی بیوی سلطان جلال الدین خلجی کی بیٹی تھی۔ پھر جب علاء الدین اپنے حقیقی چچا اور خسر جلال الدین کو قتل کرا کے برسرِ اقتدار آیا تو اسے اپنی محبوبہ بھی یاد آ گئی۔ اب علاء الدین کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ نتیجتاً اس نے ماہِ رُو سے شادی کر لی۔ اور اپنی نئی ملکہ کو ''ملکۂ جہاں'' کے خطاب سے سرفراز کر دیا۔ ملکۂ جہاں ایک خود پسند عورت تھی۔ شادی کے بعد چند سال تک تو وہ سلطان کی ناز برداری کرتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اپنی ذات کی دلچسپیوں میں گم ہوتی چلی گئی۔ اب ملکۂ جہاں عورتوں کا الگ دربار آراستہ کرتی اور اپنی ہم جنسوں کے سامنے طاقت و اقتدار کا مظاہرہ کرتی۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ قصرِ ہزار ستون میں خواتین کی تقریب منعقد نہ ہوتی...... اور ملکۂ جہاں اس تقریب کی سرپرستی نہ کرتی۔ آخر ایک دن وہ آیا کہ سلطان علاء الدین اپنی محبوبہ سے دُور ہو کر دوسری خوب صورت خواتین کے نظاروں میں گم ہو گیا۔ کبھی اُس نے رانی پدمنی کے حصول کے لیے چتوڑ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور کبھی رانی کنولا دیوی کو اپنے

حرم میں داخل کرنے کے لیے گجرات کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ ملکۂ جہاں کو سلطان کے ان مشاغل پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ مکمل طور پر اپنی ذات کی اسیر ہو چکی تھی اور اس نے شوہر کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔

جب ملکۂ جہاں کے دونوں بیٹے خضر خان اور شادی خان جوان ہو گئے تو اس نے نئی ہنگامہ آرائیوں کے لیے ان کی شادیوں کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اس منصوبہ بندی کے پیچھے اقتدار پر گرفت مضبوط رکھنے کی خواہش بھی کارفرما تھی۔ الغ خان، علاء الدین کی حکومت کا طاقتور ترین مہرہ تھا۔ اس لیے ملکۂ جہاں نے اپنے دونوں بیٹوں کے لیے الغ خان کی دونوں بیٹیوں کا انتخاب کیا تھا۔ مگر جب اس کی کنیزِ خاص دلربا نے خضر خان اور دیول دیوی کی خفیہ ملاقاتوں کا ذکر کیا تو ملکۂ جہاں بدحواس ہو گئی۔

پھر اس شاطر عورت نے نئی چال چلی اور بڑی بے رحمی کے ساتھ دو محبت کرنے والوں کو جدا کر دیا۔

دیول دیوی اپنی ماں رانی کنولا دیوی کے ساتھ قصرِ ہزار ستون میں رہتی تھی۔ اسی محل کے سبزہ زار میں خضر خان اور دیول دیوی چوری چھپے ملتے تھے۔ ملکۂ جہاں نے فوری طور پر حکم جاری کر دیا کہ دیول دیوی کو ''قصرِ لعل'' میں منتقل کر دیا جائے۔ قصرِ لعل، قصرِ ہزار ستون سے کافی فاصلے پر واقع تھا۔ ملکۂ جہاں کا خیال تھا کہ اس طرح خضر خان اور دیول دیوی کی ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ پھر جسمانی فاصلوں کے ساتھ ساتھ دلوں کی قربتوں میں بھی فرق آ جائے گا اور آخر ایک دن یہ نازک جذبات سینوں کی گہرائی میں دم توڑ دیں گے۔

پھر جب دیول دیوی کو قصرِ ہزار ستون سے قصرِ لعل منتقل کیا جانے لگا تو وہ ماں کے گلے لگ کر رونے لگی۔

''میرے لیے کہیں کوئی پناہ گاہ نہیں۔'' دیول دیوی نے دبے لفظوں میں سب کچھ کہہ دیا تھا۔

''صبر کرو بیٹی!'' رانی کنولا دیوی نے بیٹی کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ ''اگر شہزادہ سچا ہے تو وہ آسمان تک اٹھائی جانے والی دیوار بھی گرا دے گا اور تم تک پہنچ جائے گا۔''

خضر خان کا نام سن کر دیول دیوی کے چہرے پر حیا کا رنگ آیا......اور پھر وہ سسکیوں کے درمیان قصرِ ہزار ستون سے رخصت ہو گئی۔

❁---❁---❁

اگرچہ خضر خان ایک رنگین مزاج شہزادہ تھا لیکن ماں باپ کے سامنے بات کرنے سے شرماتا تھا۔ جب اُسے دیول دیوی کے جانے کی خبر ملی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ خضر خان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ماں کے سامنے اپنی پسند کا اظہار بھی کر سکتا۔ اس نے بڑی خاموشی سے اپنی محبوبہ کو جاتے ہوئے دیکھا۔

دیول دیوی کے جانے کے بعد ملکۂ جہاں نے ولی عہدِ سلطنت کو خلوت میں طلب کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے تمہاری شادی الغ خان کی بیٹی سے طے کر دی ہے۔ ایک طرف وہ ہماری پسند ہے......اور دوسری طرف تمہاری ماموں زاد بہن۔ ہمیں یقین ہے کہ تم ان دونوں رشتوں کا لحاظ رکھو گے۔''

خضر خان کے چہرے پر اذیت کا رنگ اُبھر آیا مگر وہ ماں کے فیصلے کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ کر سکا۔ ولی عہدِ سلطنت نے شدید حیرت کے عالم میں سر جھکا لیا۔

''خضر خان! پورے ہوش و حواس کے ساتھ میری بات سن لو۔'' ملکۂ جہاں نے تند و تیز لہجے میں کہا۔

ولی عہدِ سلطنت نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا۔

''اگر کسی دوسری لڑکی نے میری بھانجی کو آزار پہنچایا تو اس پر بھی زندگی کی ساری آسائشیں حرام کر دی جائیں گی۔'' ملکۂ جہاں کا اشارہ دیول دیوی کی طرف تھا۔

خضر خان خاموشی کے ساتھ کمرے سے اُٹھ کر چلا آیا۔

ملکۂ جہاں نے دوسرے دن ہی تیز رفتار قاصدوں کو گجرات روانہ کر دیا اور اپنے بھائی الغ خان کو پیغام بھیجا کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر دہلی پہنچے تاکہ خضر خان اور اس کی بیٹی کو جلد از جلد رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی قصرِ ہزار ستون میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

❀---❀---❀

خضر خان، دیول دیوی کے جدا ہونے پر پاگل سا ہو گیا تھا۔ وہ کئی دن تک اپنے کمرے میں پڑا آنسو بہاتا اور شراب پیتا رہا۔ اس دوران اس نے اپنی کنیزِ خاص نشاط کو طلب کیا اور دل کا درد بیان کرتے ہوئے کہا۔

''نشاط! تُو کسی نہ کسی طرح دیول دیوی تک میرا پیغام پہنچا دے کہ میں اُسے بھولا نہیں ہوں۔''

ولی عہدِ سلطنت کا حکم سنتے ہی نشاط لرز اُٹھی۔ ''شہزادۂ معظم خوب جانتے ہیں کہ ملکۂ عالم کی مرضی کے بغیر قصرِ لعل میں کوئی چڑیا بھی پَر نہیں مار سکتی۔''

''کچھ بھی ہو نشاط!...... کچھ بھی ہو۔'' خضر خان ایک کنیز کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔

آخر نشاط ولی عہدِ سلطنت کی سفارت پر مجبور ہو گئی۔ پھر جب وہ قصرِ لعل پہنچی تو دیول دیوی کے کمرے میں کچھ فاصلے پر دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ سپاہیوں نے ایک کنیز کو ادھر آتے دیکھا تو سنبھل گئے۔

''کون ہو تم؟'' سپاہیوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''ملکۂ عالم کی کنیزِ خاص۔'' نشاط نے بڑی ہوشیاری سے جھوٹ بولا۔

سپاہی ملکۂ جہاں کی کنیزِ خاص سے ناواقف تھے، اس لیے وہ نشاط کو پہچاننے سے قاصر رہے۔ نشاط کی آواز میں بڑا اعتماد تھا۔ سپاہی گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ اور نشاط تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

پھر نشاط کو اس وقت عجیب مشکل پیش آئی جب اس نے دیول دیوی کے کمرے سے باہر کئی کنیزوں کو پہرہ دیتے ہوئے دیکھا۔

''تم یہاں کیسے؟'' ایک کنیز نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ وہ نشاط کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ ''ملکۂ عالم کا حکم ہے کہ شہزادے کی کوئی کنیز دیول دیوی سے نہیں مل سکتی۔''

''یہ ماں اور بیٹے کا معاملہ ہے۔'' نشاط نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی دنیا کیوں خراب کرتی ہو؟ کل شہزادے خضر خان کو ہندوستان کا بادشاہ بننا ہے۔ پھر تم قہرِ شاہی سے کس طرح محفوظ رہو گی؟ اس لیے تم اپنی آنکھیں بند کرلو۔ جیسے کہ تم نے مجھے یہاں آتے ہوئے دیکھا ہی نہیں۔''

نشاط کی گفتگو سن کر کنیزیں کانپنے لگیں۔ پھر وہ دروازے کی طرف سے ہٹ گئیں اور نشاط تیزی سے اندر چلی گئی۔

دیول دیوی تصویرِ درد بنی بیٹھی تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ پھر جب نشاط نے سرگوشی کرتے ہوئے اسے شہزادے خضر خان کا پیغام دیا تو دیول دیوی کے سوگوار اور ویران چہرے پر مسرتوں کے پھول کِھل اُٹھے۔ راج کماری بہت دیر تک اپنے محبوب کا حال پوچھتی رہی۔

پھر جب نشاط رخصت ہونے لگی تو دیول دیوی نے نہایت شکستہ لہجے میں کہا۔ ''شہزادے سے کہنا کہ ابھی شامِ فراق ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شام، دائمی جدائی کی سیاہ رات میں ڈھل جائے......اور یہ آراستہ کمرہ میری قبر بن جائے۔''

نشاط کی زبانی اپنی محبوبہ کا پیغام سن کر خضر خان کے دل میں درد کی ایک تیز لہر اُٹھی......اور پھر اسی تڑپ میں شہزادے نے تمام پہرے توڑ ڈالے۔

❁---❁---❁

خضر خان تمام احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ کر قصرِ لعل کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں قدم قدم پر ملکۂ جہاں کے جاسوس موجود تھے۔ مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ولی عہدِ سلطنت سے آنکھ ملا کر بھی بات کر سکے۔ خضر خان رات کے اندھیرے میں تیز رفتاری کے ساتھ قصرِ لعل کی طرف جا رہا تھا جو اب محل کی جگہ کوچۂ جاناں میں تبدیل ہو چکا تھا۔

جب خضر خان دروازے پر پہنچا تو مسلح محافظوں نے سر جھکا کر کہا۔ ''شہزادۂ معظم! ملکۂ جہاں کا حکم ہے......'' قلعے کے محافظ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اور میں کون ہوں؟'' خضر خان نے انتہائی پُر جلال لہجے میں کہا۔

محافظوں کے سر جھک گئے اور زبانیں بند ہو گئیں۔ خضر خان شاہانہ رفتار سے قصرِ لعل میں داخل ہو گیا۔ پھر جب وہ دیول دیوی کے کمرے کے قریب پہنچا تو راج کماری کی محافظ کنیزیں خوف سے کانپنے لگیں۔ خضر خان نے مسکراتے ہوئے کنیزوں کی طرف دیکھا۔

''انعام کی لالچ میں اپنی حدود سے آگے نہ بڑھنا۔ پھر تمہارے لیے امان ہی امان ہے۔'' یہ کہہ کر شہزادہ خضر خان، دیول دیوی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس وقت دیول دیوی دریچے میں کھڑی چودھویں رات کے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ خضر خان دبے پاؤں

آگے بڑھا اور دیول دیوی کے قریب پہنچ کر آہستہ سے بولا۔

''راج کماری، چاند کا نظارہ کر رہی ہیں؟''

ایک مرد کی آواز سن کر دیول دیوی اُچھل پڑی۔

''کون ہو تم؟'' راج کماری نے انتہائی تند و تیز لہجے میں پوچھا۔

''یہ میں ہوں، آپ کا خادم۔'' خضر خان نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

خضر خان کو دیکھ کر کچھ دیر کے لیے دیول دیوی کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر اس نے چیخنے کے سے انداز میں کہا۔ ''شہزادے! یہ آپ ہیں؟''

''میرے سوا کون آ سکتا ہے راج کماری کی خلوت میں؟'' خضر خان کے لہجے میں عجیب سی سرشاری تھی۔

دیول دیوی حسرت زدہ نظروں سے اپنے محبوب کو دیکھتی رہی۔ پھر خضر خان کے گلے سے لگ کر سسکنے لگی۔ ''شہزادے! تمہیں میرے دُکھوں کا اندازہ ہے؟''

''میں جانتا ہوں شہزادی!'' دیول دیوی کی حالت دیکھ کر خضر خان بھی اُداس ہو گیا تھا۔

''آپ کچھ نہیں جانتے شہزادے!...... کچھ نہیں جانتے۔'' دیول دیوی زار و قطار رو رہی تھی۔ ''کوئی نہیں جانتا کہ میں کس کس طرح جلی ہوں۔ چار سال کی عمر میں ماں سے بچھڑ گئی۔ پھر باپ کی مجبوریوں نے میرا سودا سنگل دیو کے ہاتھ کر دیا۔ پھر میری خاطر سلطان نے ہزاروں انسانوں کو خاک و خون میں ملا دیا۔ اب مجھے ماں کی آغوش سے جدا کر کے کسی قیدی کی طرح ایک کمرے میں ڈال دیا گیا۔ شہزادے! میری خانماں بربادی کا یہ دور کب ختم ہو گا؟ میں راج کماری دیول دیوی ہوں یا کوئی کٹھ پتلی؟ آخر مجھے کب تک نچایا جاتا رہے گا؟'' دیول دیوی کا شکوہ بڑا درد انگیز تھا۔

''راج کماری! میں تمہارے سارے دکھوں کی تلافی کر دوں گا۔ ذرا حالات پر قابو پا لوں۔ یہ خضر خان کا وعدہ ہے کہ اس کے شبستانِ دل میں تمہارے سوا کوئی داخل نہیں ہو گا۔''

شہزادے کی پُرجوش گفتگو نے دیول دیوی کے بہتے ہوئے آنسو خشک کر دیئے اور اس کی گم شدہ مسکراہٹ لوٹ آئی۔ تقریباً نصف شب تک ہندوستان کا ولی عہدِ سلطنت اور گجرات کی راج کماری دنیا و مافیہا سے بے خبر رنگین خوابوں میں کھوئے رہے۔

اس دوران محافظ کنیزیں اختلاجِ قلب کا شکار ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کے چہروں سے شدید ترین خوف کا اظہار ہو رہا تھا اور دل کی دھڑکنیں اس قدر بے ترتیب تھیں کہ کسی وقت بھی حرکتِ قلب بند ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اگر اس وقت ملکۂ جہاں قصرِ لعل میں چلی آتی تو تمام محافظ مردوں اور نگہبان کنیزوں پر قیامت نازل ہو جاتی۔

آدھی رات کے بعد خضر خان نے راج کماری سے رخصت طلب کی۔ جدائی کا تصور کرتے ہی دیول دیوی کی خوب صورت آنکھوں کے آبشار دوبارہ بہہ نکلے۔

''شہزادے! میں پھر اس مقبرے میں تنہا رہ جاؤں گی۔''

''تم تنہا کہاں ہو گی؟'' خضر خان کے ایک ایک لفظ سے شدید محبت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''میری یادیں قدم بہ قدم تمہارے ساتھ ہوں گی۔''

''شہزادے! آپ کے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔'' جوشِ جذبات میں دیول دیوی نے خضر خان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ہندوانہ رسموں کے مطابق ایک عورت کی نظر میں اس کا شوہر دیوتا کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی رسم کے زیرِ اثر دیول دیوی نے بھی خضر خان کو دیوتا کا درجہ دے دیا تھا۔ ولی عہدِ سلطنت، دیول دیوی کے جوشِ عقیدت سے بہت متاثر ہوا۔

''تمہارے سوا میرا بھی کوئی نہیں ہے دیول!'' خضر خان بھی راج کماری کے لہجے میں گفتگو کر رہا تھ۔

''آپ سمراٹ ہیں۔ ہندوستان کے مالک ہیں۔'' دیول دیوی نے روتے ہوئے کہا۔ ''ہزاروں خوب صورت دوشیزائیں آپ کے راستے میں آنکھیں بچھائے کھڑی ہوں گی...... مگر میرے دل میں تو آپ کے بعد کوئی اور نہیں آئے گا۔ میں راجپوت زادی ہوں۔ جسے ایک بار چاہا، اُسے جیون بھر چاہا...... میرا وچن میری جان کے ساتھ۔''

''میں ابھی سے کیا کہوں دیول؟'' خضر خان کے چہرے پر عجیب سا رنگ اُبھر آیا تھا۔ ''آنے والا وقت تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔''

❀---❀---❀

ملکۂ جہاں کو اُس کی کنیزوں نے بتا دیا تھا کہ خضر خان اور دیول دیوی کی ملاقاتیں اب بھی جاری ہیں۔ ملکۂ جہاں ایک شاطر عورت تھی۔ اس نے دیول دیوی پر مزید پابندیاں لگانے کے بجائے تیزی کے ساتھ شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے راجاؤں اور حاکموں کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے اور سب کو تاکید کر دی گئی تھی کہ اس شادی میں ان کی شرکت ضروری ہے۔

پھر 23 رمضان 711ھ کو خضر خان کی شادی الغ خان کی بڑی بیٹی سے کر دی گئی۔ یہ ایک تاریخی شادی تھی، جس میں بڑے بڑے امراء سے لے کر چھوٹے چھوٹے حاکم تک شریک ہوئے تھے۔ اس قدر تحائف پیش کیے گئے کہ ہر طرف انبار لگ گئے۔

خضر خان کی شادی کی خبر سن کر دیول دیوی کا برا حال تھا۔ ایک خلجی شہزادے کی محبت کے دعوے جھوٹے ثابت ہوئے تھے۔ وہ کمرے کے ایک گوشے میں منہ چھپائے اپنی بدنصیبی کا ماتم کرتی رہی۔ اگر ملکۂ جہاں چاہتی تو دیول دیوی کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی..... مگر وہ دوسروں کو اذیت دے کر خوش ہونے والی عورت تھی۔ ملکۂ جہاں نے خاص طور پر حکم دیا کہ دیول دیوی، خضر خان کی شادی میں شریک ہو....... اور اپنی آنکھوں سے اپنی محبت کا دردناک انجام دیکھے۔

دیول دیوی اس شادی میں شریک ہونا نہیں چاہتی تھی..... مگر جب ملکۂ جہاں کی طرف سے بار بار حکم

دیا گیا تو راج کماری کے ہونٹوں پر ایک مغرور مسکراہٹ اُبھر آئی۔ پھر اس نے نہایت شوخ اور قیمتی لباس زیب تن کیا اور شاہانہ رفتار سے چلتی ہوئی تقریب گاہ میں داخل ہوئی۔ دیول دیوی کے حُسنِ شرر بار نے خواتین کے حلقے میں ہلچل سی مچا دی۔ آج قصرِ ہزار ستون میں حسین ترین عورتوں کا اجتماع تھا۔ ان عورتوں میں شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی خواتین بھی شامل تھیں اور حسین و جمیل کنیزیں بھی...... مگر دیول دیوی کے رُخِ تاب ناک کے آگے سب کی سب بجھ کر رہ گئی تھیں۔ طویل و عریض تقریب گاہ میں وہ جدھر سے بھی گزرتی، مرکزِ نگاہ بن جاتی۔ بہت سی عورتیں حسد کا شکار نظر آنے لگیں۔ مگر دیول دیوی ان تمام باتوں سے بے نیاز آگے بڑھتی رہی۔

ملکۂ جہاں نے پہلی بار دیول دیوی کو اس عالم میں دیکھا تھا۔ اب اسے اندازہ ہوا کہ خضر خان، دیول دیوی کی زُلفِ گرہ گیر کا اسیر کیوں تھا؟ ملکۂ جہاں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

'میں نے بروقت خضر خان کی شادی کر دی...... ورنہ وہ خوب صورت بلا مجھ سے میرے بیٹے کو چھین کر لے جاتی۔'

ابھی ملکۂ جہاں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ دیول دیوی، شہزادے خضر خان کے قریب پہنچ گئی جو دولہا بنا ہوا مسندِ زرنگار پر بیٹھا تھا۔ دیول دیوی کے ہاتھ میں صندل کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی صندوقچی تھی جس کے اندر ہیروں کا ایک خوب صورت ہار موجود تھا...... اور یہ ہار، دیول دیوی کی ذاتی ملکیت تھا۔

راج کماری نے بے مثال حوصلے کا مظاہرہ کیا اور مسکراتے ہوئے خضر خان کی طرف دیکھا۔ ولی عہدِ سلطنت کو محسوس ہوا جیسے دیول دیوی کی مسکراہٹ اس سے پوچھ رہی ہو۔

''شہزادے! محبت نبھانے کی وہ قسمیں کیا ہوئیں؟...... اور جاں نثاری کے عہد و پیمان کیا ہوئے؟''

خضر خان، دیول دیوی کی سوالیہ نظروں کی تاب نہ لا سکا اور اس نے سر جھکا لیا۔

دیول دیوی چند قدم اور آگے بڑھی۔ پھر اس نے نہایت شگفتہ لہجے میں ولی عہدِ سلطنت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''شہزادے! آپ کو یہ شادی بہت بہت مبارک ہو۔''

خضر خان نے نظر اُٹھا کر اپنی محبوبہ کو دیکھا۔ شدتِ کرب سے شہزادے کا سرخ و سفید چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔

دیول دیوی نے صندل کی خوب صورت صندوقچی، خضر خان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میری طرف سے یہ حقیر سا تحفہ اپنی دُلہن کو پیش کر دیجیے گا۔ میں ایک غریب الوطن راج کماری ہوں۔ اگر اپنے وطن میں ہوتی تو بہت سے قیمتی تحائف نذر کرتی۔''

دیول دیوی کے الفاظ، خضر خان کے دل میں نشتر کی طرح اُتر گئے۔

پھر دیول دیوی اسی شاہانہ وقار کے ساتھ تقریب گاہ سے نکل کر چلی گئی۔ وہ چند لمحوں کے لیے اس ہنگامہ خیز جشن میں آئی تھی...... مگر بہت سے وزیر زادوں کے دل میں اس نے مستقل حشر اُٹھا دیا تھا۔ ہر

امیرزادے کی خواہش تھی کہ دیول دیوی اُس کی شریکِ سفر بن جائے...... مگر کسی کو یہ راز معلوم نہیں تھا کہ دیول دیوی تو کسی اور ہی منزل کی مسافر ہے۔

سلطان علاء الدین نے بھی خضر خان اور دیول دیوی کے چہروں پر لکھی ہوئی داستان کو پڑھ لیا تھا..... مگر اس نے تقریب کے شرکاء کو یہی تاثر دیا کہ وہ دلوں کی زبان سے ناواقف ہے۔

❀---❀---❀

خضر خان نے ماں کے کہنے سے الغ خان کی لڑکی کے ساتھ شادی ضرور کر لی تھی لیکن اس نے دل میں اپنی ماموں زاد بہن کو بیوی تسلیم نہیں کیا تھا۔ ولی عہدِ سلطنت نے شبِ عروسی اس طرح گزاری کہ وہ علیحدہ کمرے میں رات بھر شراب پیتا رہا۔

پھر اسی طرح روزانہ صبح کا سورج طلوع ہوتا اور ناکام حسرتوں کا جنازہ اٹھاتے ہوئے غروب ہو جاتا۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی خضر خان اپنے خلوت کدے کو ساغر و صراحی سے روشن کر لیتا۔ جام پر جام لبریز کرتا اور اس آتشیں سیال کو اپنے حلق سے اُتار لیتا۔ پھر جب تک اس کے ہوش باقی رہتے، وہ دیول دیوی کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہتا۔

دوسری طرف دیول دیوی کا بھی یہی حال تھا۔ اس نے شادی کی تقریب میں دنیا والوں کو دکھانے کے لیے اپنی طبیعت پر جبر کر کے حوصلہ مندی کا مظاہرہ ضرور کیا تھا....... مگر حقیقتاً وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ دیول دیوی کی زندگی کا انحصار ہی خضر خان پر تھا۔ پھر جب شہزادے کو کسی دوسری عورت کے دامن سے وابستہ کر دیا گیا تو راج کماری کے جینے کی آخری اُمید بھی مایوسیوں کے گرداب میں ڈوب گئی۔ اس دوران اس کی ماں کنولا دیوی بھی بیٹی سے ملنے کے لیے قصرِ لعل پہنچی اور دیول دیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ملکہ جہاں تمہارے ساتھ اتنا خوف ناک کھیل کھیلے گی۔ یقیناً شہزادے کو مجبور کر دیا گیا ہوگا۔''

''اگر شہزادہ اتنا ہی مجبور تھا تو وہ میرے قریب کیوں آیا تھا؟'' آج پہلی بار دیول دیوی نے ماں کے سامنے انتہائی تلخ لہجہ اختیار کیا۔ ''میں نے کب اس سے رحم کی بھیک مانگی تھی؟ قصرِ شاہی کے مکین کیا سوچیں گے میرے بارے میں؟ ...... کیا میں کوئی کنیز تھی کہ شہزادے نے مجھ سے کچھ دن تک دل بہلایا اور پھر اپنے شبستان سے باہر نکال دیا۔'' یہ کہتے کہتے دیول دیوی رو پڑی۔

''صبر کرو بیٹی!'' کنولا دیوی، بیٹی کو تسلیاں دے رہی تھی۔ ''جہاں تک میرا اندازہ ہے، خضر خان بے اعتبار شہزادہ نہیں ہے۔''

''یہ سب جھوٹے ہیں ماتا جی!'' دیول دیوی کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا تھا۔ ''وہ سنگل دیو ہو یا خضر خان.... سب کی طلب کا ایک ہی انداز ہے۔ ہم عورتیں تو متاعِ کوچہ و بازار ہیں۔ بس خریدار بدلتے رہتے ہیں۔''

دیول دیوی کی عمر بھر کی محرومیوں نے اُسے ایک آتش فشاں بنا دیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ آج اس کے ہونٹوں سے الفاظ لاوے کی طرح بہہ رہے تھے۔

❁---❁---❁

ملکۂ جہاں اپنی حقیقی بھانجی کے درد سے آشنا تھی۔ وہ سہاگن ہوتے ہوئے بھی ایک بیوہ کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے کئی بار خضر خان سے اس بے رخی کی شکایت کرتے ہوئے انتہائی غضب ناک لہجے میں کہا تھا۔

''کیا آپ نے مجھ سے اس لیے شادی کی تھی کہ میں شمع کی طرح چپ چاپ جلتی رہوں اور آپ میرے پگھلنے کا تماشا دیکھتے رہیں؟''

''میں نے مادرِ گرامی کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔'' خضر خان، بیوی کے سوال کے جواب میں ہر بار یہی جواب دیتا۔

''کیا میری حیثیت ایک کنیز کے برابر بھی نہیں؟'' الغ خان کی بیٹی، شوہر کا جواب سن کر برس پڑتی۔

''یہ دل کا معاملہ ہے...... اور میرا دل تمہارے ساتھ نہیں ہے۔'' خضر خان، بیوی کو فیصلہ کُن جواب دے کر شغلِ جام کرنے لگتا۔

❁---❁---❁

شادی کے کچھ دن بعد خضر خان اپنی پرانی روش پر لوٹ گیا۔ اس کی بیوی انتظار کی سیج پر جلتی رہتی اور ولی عہدِ سلطنت دیول دیوی کی جلوہ آرائیوں میں گم رہتا۔

شروع میں دیول دیوی اس کے ساتھ سختی سے پیش آئی۔

''شہزادے! میں کوئی کھلونا نہیں ہوں۔ وعدہ کسی اور سے...... رشتہ کسی اور سے۔''

خضر خان، دیول دیوی کی طنز آمیز گفتگو سنتا رہتا۔ پھر جب وہ غارت گر خاموش ہو جاتی تو ولی عہدِ سلطنت انتہائی پُرسوز لہجے میں اپنے دل کا درد بیان کرتا۔''

''میرے جسم پر ملکۂ جہاں کا حکم نافذ ہو گیا...... مگر میرے دل پر تمہاری ہی حکمرانی ہے۔ میں نے آج تک اپنی بیوی کو نظر بھر کے بھی نہیں دیکھا کہ اس کے خدوخال کیسے ہیں۔ میں تمہارے سوا کسی کو نہیں پہچانتا۔ تم یقین کر لو دیول! کہ میری آنکھوں پر تمام حسینانِ عالم کے جلوے حرام ہیں۔ مجھے تمہارے بعد کچھ نظر ہی نہیں آتا۔''

آخر دیول دیوی کو یقین آ گیا کہ خضر خان کوئی عام شہزادہ نہیں ہے۔ پھر گجرات کی راج کماری اپنے محبوب کے ساتھ ان دنوں کا خواب دیکھنے لگی، جب وہ قانونی طور پر ولی عہدِ سلطنت کے حرم میں داخل ہو جائے گی۔

پھر جب ملکۂ جہاں کو معلوم ہوا کہ جس آگ کو بھاری پتھروں کے نیچے دبا دیا گیا تھا، وہ دوبارہ بھڑک

اُٹھی ہے تو اس کی پریشانیاں حد سے زیادہ بڑھ گئیں۔ ملکۂ جہاں کو اپنی بھانجی کی فکر ستا رہی تھی۔ الغ خان بھی کئی بار خضر خان کی بے رخی کی شکایت کر چکا تھا۔ آخر ملکۂ جہاں نے ایک دن بیٹے سے صاف صاف کہہ دیا۔

''شہزادے! اگر تم نے دیول دیوی سے ملنا نہیں چھوڑا تو میں اس فتنے کو ایسی جگہ گم کر دوں گی کہ تمہیں اس کا نشان بھی نہیں ملے گا۔''

''مادرِ گرامی! میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔ مگر مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں ہے۔'' زندگی میں پہلی بار خضر خان نے ماں کے سامنے لب کشائی کی تھی اور کسی قدر باغیانہ لہجہ اختیار کیا تھا۔ ''بے شک! آپ اس پر قادر ہیں کہ دیول دیوی کو زندہ دفن کرا دیں...... مگر اس کے ساتھ ہی میرے لیے بھی ایک قبر تعمیر کرا دیجیے گا۔'' یہ کہہ کر خضر خان چلا گیا اور ملکۂ جہاں کے چہرے پر فکر و پریشانی کے سائے پھیلتے چلے گئے۔

❁---❁---❁

خضر خان کی شادی کی تقریب میں اس کے سوتیلے چھوٹے بھائی قطب الدین نے دیول دیوی کو دیکھا تو اپنے حواس کھو بیٹھا۔ قطب الدین انتہائی اوباش شہزادہ تھا۔ اس نے دل ہی میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ گجرات کی راج کماری کو حاصل کر کے رہے گا۔ پھر اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے قطب الدین ملکۂ جہاں کی خدمت میں درخواست لے کر حاضر ہوا۔

قطب الدین کی بات سن کر ملکۂ جہاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ وہ اسی دن کے انتظار میں تھی.... مگر جب ملکۂ جہاں نے رانی کنولا دیوی سے اس رشتے کا ذکر کیا تو گجرات کی سابق ملکہ برہم ہو گئی۔

''مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔''

کنولا دیوی سے مایوس ہو کر ملکۂ جہاں نے قطب الدین کو ایک اور راستہ دکھایا۔ ''بیٹے! تم اس معاملے میں براہِ راست سلطانِ معظم سے بات کرو..... اور کسی جھجک کے بغیر دیول دیوی کو مانگ لو۔ وہ مالِ مفتوحہ ہے اور اس کے جسم و جاں پر تمہارا حق ہے۔''

قطب الدین پر ایسی وحشت طاری تھی کہ وہ بے حجابانہ بارگاہِ سلطانی میں داخل ہو گیا اور بڑے بے تکلفانہ انداز میں دیول دیوی کا سوال کرنے لگا جیسے دیول دیوی کوئی ادنیٰ کنیز ہو۔

سلطان علاء الدین اپنے نوعمر بیٹے کے مطالبے پر حیران رہ گیا۔ پھر اس نے بڑے تحمل سے قطب الدین کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اگر تم اس رشتے کے خواہش مند ہو تو اپنی والدہ کو رانی کنولا دیوی کے پاس بھیجو۔ ملکۂ ہند ہی اپنی بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ کر سکتی ہیں۔''

سلطان کا جواب سننے کے بعد قطب الدین مایوس ہو گیا کیونکہ رانی کنولا دیوی پہلے ہی انکار کر چکی تھی۔

اسی دوران یہ خبر اُڑتے اُڑتے خضر خان تک بھی پہنچ گئی۔ ولی عہدِ سلطنت کو اپنے چھوٹے بھائی کی نادانی پر شدید حیرت ہوئی۔ پھر وہ قطب الدین سے ملا۔

''میرے عزیز بھائی! تم دیول دیوی کا خیال چھوڑ دو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے اور میرے درمیان کیا رشتہ ہے؟''

دیول دیوی اُس کے اعصاب پر بری طرح مسلّط تھی۔ قطب الدین بڑے بھائی سے بھی بے ہودگی کرنے لگا۔ ''بڑے ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام مالِ غنیمت پر آپ کا قبضہ ہو جائے۔''

''دیول دیوی مالِ مفتوحہ نہیں ہے۔'' خضر خان چھوٹے بھائی کی گستاخی پر برہم ہو گیا۔ ''اگر تم نے اس سلسلے میں کوئی ناشائستہ حرکت کی تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔''

قطب الدین چپ چاپ چلا گیا مگر بڑے بھائی کی طرف سے اس کے دل میں گرہ پڑ گئی۔ خضر خان کی سخت تنبیہہ کے باوجود اوباش شہزادہ دیول دیوی کے خیال سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔

❀---❀---❀

دیول دیوی کی جدائی اور کثرتِ شراب نوشی نے خضر خان کی صحت تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ چند ماہ کے مختصر سے عرصے میں وہ بسترِ علالت پر دراز ہو گیا۔ ملک کے نامور طبیبوں نے بیک زبان اپنی رائے پیش کر دی کہ اگر شہزادے کو ذہنی صدمات سے آزاد نہیں کیا گیا تو وہ دق کے مہلک مرض میں مبتلا ہو جائے گا۔ ملکۂ جہاں جانتی تھی کہ اس کے بیٹے کو کیا بیماری لاحق ہے۔ آخر وہ اپنے دل پر پتھر رکھ کر خضر خان اور دیول دیوی کی شادی کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ملکۂ جہاں نے اسی روز اپنے چھوٹے بیٹے، شادی خان کی شادی الغ خان کی دوسری لڑکی سے کر دی۔

وہ دن خضر خان کی زندگی کا سب سے خوب صورت دن تھا، جب دیول دیوی لباسِ عروسی میں اس کے سامنے جلوہ گر ہوئی۔

''دیول! میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔'' جوشِ جذبات میں خضر خان کی آواز لرز رہی تھی۔

دیول دیوی، خضر خان کے قدموں سے لپٹی رو رہی تھی۔ ''میرا تو اعتبار ہی اُٹھ گیا تھا انسانوں پر سے۔ آپ نے مجھے میرا اعتبار لوٹایا۔ آج سے میں آپ کی داسی ہوں..... اور آپ میرے دیوتا۔'' دیول دیوی پر ہندو مذہب کے اثرات باقی تھے، اس لیے وہ اکثر ایسے ہی الفاظ ادا کرتی تھی۔

''تم داسی نہیں، میرے دل کی حکمراں ہو۔'' آج خضر خان پر سرشاری کی عجیب کیفیت طاری تھی...... مگر لذت وخمار کا یہ طلسم جلد ہی ٹوٹ گیا۔

❀---❀---❀

گردشِ دوراں، خضر خان کے تعاقب میں تھی۔ وہ شب و روز دیول دیوی کی زلفوں کے سائے میں پڑا رہتا تھا۔ اس لیے سازشوں کی تیز دھوپ میں آتے ہی جل کر راکھ ہو گیا۔ سلطان علاء الدین بسترِ علالت پر دراز تھا اور نمک حرام کافور حکومت کے خواب دیکھنے لگا۔ اس نے خضر خان کے خلاف سلطان کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ علاء الدین شدید بیماری کے سبب فہم و تدبر کی صلاحیتوں سے محروم ہو گیا۔ اس

لیے وہ اپنے محبوب خواجہ سرا کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ گیا۔ اسی دوران الغ خان کو قتل کر دیا گیا۔ اب ملک کافور، خلجی سلطنت کا سب سے طاقتور مہرہ تھا۔

آخر وہ گراں وقت بھی آ گیا جب علاء الدین نے خضر خان کے سارے حقوق سلب کر لیے اور اس کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے۔ ملک کافور نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر خضر خان کو زنجیریں پہنا دیں اور اسے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔

کچھ دن بعد ملک کافور نے علاء الدین کو بھی زہر دے دیا۔ کیسا عبرت ناک منظر تھا کہ چوراسی جنگوں میں عظیم الشان فتوحات حاصل کرنے والا حکمراں انتہائی بے کسی کے عالم میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ علاء الدین کے مرتے ہی کئی علاقوں میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں اور ملک کا سیاسی نظام شدید انتشار کی لپیٹ میں آ گیا۔

❋---❋---❋

خضر خان کی عاشقانہ فطرت کا بھی عجیب رنگ تھا۔ وہ اسیری کی حالت میں بھی دیول دیوی کو فراموش نہیں کر سکا تھا۔ خضر خان، زنداں کے نگہبانوں کی خوشامد کرتا اور دیول دیوی کے نام خطوط بھیجتا۔ وہ خطوط کیا تھے، ایک عاشق مہجور و ناصبور کے لکھے ہوئے مرثیے تھے۔

''دیول! مجھے اس بات کا کوئی غم نہیں کہ میں اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ دراصل میری محرومی یہ ہے کہ میں تم سے دُور ہو گیا ہوں۔ اگر صاحبانِ اختیار تمہیں میرے پاس بھیج دیں تو میں خوشی کے ساتھ تختِ ہندوستان سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہوں۔''

دیول دیوی یہ خطوط پڑھتی تو اُس کے سینۂ فگار سے دھواں سا اُٹھنے لگتا...... اور پھر یہی دھواں آنسو بن کر آنکھوں سے برستا رہتا۔ رانی کنولا دیوی بھی اپنی بیوگی کا غم بھول کر بیٹی کے دُکھ میں شریک ہو گئی تھی...... مگر حالات کے طوفان میں دونوں عورتیں بے دست و پا تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ انقلاب کی سرکش لہریں ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔ کنولا دیوی اپنی بیٹی کو دن رات تسلیاں دیتی...... مگر دیول دیوی کے ہونٹوں پر بس یہی الفاظ تھے۔

''میں دنیا کی سب سے بدنصیب عورت ہوں۔ پتہ نہیں یہ چند روزہ خوشی مجھے کیوں مل گئی؟ میں جانتی ہوں کہ یہ غم کی سیاہ رات کبھی ختم نہیں ہو گی۔''

دوسری قیامت یہ تھی کہ خضر خان کے قید ہوتے ہی اس کے سوتیلے بھائی قطب الدین نے دیول دیوی کے پاس آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اوباش و عیار شہزادہ اپنی بھاوج سے ہمدردی کا اظہار کرتا تھا مگر درپردہ اُس کے دل میں ہوس کے جذبات موجزن تھے۔ قطب الدین کو خضر خان کی موت کا انتظار تھا کہ بڑے بھائی کی آنکھیں بند ہوں اور وہ دیول دیوی پر غلبہ حاصل کر لے۔ دیول دیوی، شہزادے کی خباثتِ نفسی

سے بے خبر اپنے محبوب کی یادوں میں اشکبار تھی۔ چند ماہ کے اندر اس کا رنگ خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد ہو گیا اور تو بہ شکن آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے۔ خضر خان کی جدائی نے دیول دیوی کو برسوں کا بیمار بنا دیا تھا۔

آخر خضر خان نے ملک کافور سے درخواست کی کہ وہ دیول دیوی کو گوالیار بھیج دے۔ نمک حرام خواجہ سرا، شہزادے کی التجا سن کر بہت دیر تک ہنستا رہا۔ پھر اس نے ازراہِ کرم دیول دیوی کو خضر خان کے پاس بھیج دیا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ ولی عہدِ سلطنت شراب و شباب میں مست رہے اور اسے ہندوستان کے تخت پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے تھوڑی سی مہلت مل جائے۔

❀---❀---❀

ملک کافور نے علاء الدین کے انتقال کے دوسرے دن ہی سلطان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے شہاب الدین عمر کو تخت پر بٹھا دیا تھا۔ علاء الدین نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ وہ اپنے بیٹے خضر خان کو ولی عہد سے معزول کرتا ہے..... اور اس کی جگہ چھوٹے بیٹے شہاب الدین عمر کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہے۔ اس وقت شہزادے شہاب الدین کی عمر سات سال تھی۔ کوئی بھی ذی ہوش انسان سمجھ سکتا ہے کہ سلطان کی یہ وصیت کس قدر احمقانہ تھی۔ مگر جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ اس وصیت کے پیچھے اسی بدذات ملک کافور کا ہاتھ تھا۔

قصرِ ہزار ستون پر ایک نئی قیامت نازل ہو رہی تھی۔ ملک کافور نے شہزادہ شہاب الدین عمر کو تختِ شاہی پر بٹھا کر اس کی ماں سے نکاح کر لیا تھا۔ پھر اس نے بڑی ظالمانہ چال چلی۔ شادی خان اور ملکۂ جہاں کو بھی گوالیار کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

کچھ دن بعد ملک کافور کے حکم پر خضر خان اور شادی خان کی آنکھوں میں لوہے کی جلتی ہوئی سلائیاں پھیر کر انہیں اندھا بنا دیا گیا۔ اب دونوں شہزادے زندہ درگور اور دوسروں کے محتاج تھے۔ خضر خان کو اپنی محبوبہ کی قربت میسر تھی مگر آنکھیں اس کے دیدار سے محروم تھیں۔ بڑا عبرت خیز اور دردناک منظر تھا۔ ملکۂ جہاں جو قصرِ ہزار ستون کی مالک تھی، آج وہ قید خانے کے ایک تاریک اور بدبودار کمرے میں منہ چھپائے پڑی تھی اور اس کے ساتھ ادنیٰ کنیزوں کی طرح سلوک کیا جا رہا تھا۔

خضر خان اور شادی خان کو زندگی بھر کے لیے مجہول بنانے کے بعد ملک کافور، علاء الدین کے تیسرے بیٹے قطب الدین شاہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اب یہی اس کے راستے کا آخری کانٹا تھا۔ ملک کافور نے دو خواجہ سراؤں بشیر اور مبشر کو قیمتی انعامات کا لالچ دے کر قطب الدین کے قتل پر آمادہ کر لیا۔ یہ دونوں خواجہ سرا بڑی ہوشیاری سے قطب الدین کی خلوت میں داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ بشیر اور مبشر کے تیز دھار خنجر، شہزادے کی شہ رگ کاٹ دیتے، قطب الدین نے انہیں اپنے باپ کے احسانات یاد دلائے۔ یکایک

خواجہ سراؤں کی ذہنی رو پلٹ گئی اور انہوں نے قطب الدین کے بجائے ملک کافور کو کسی جانور کی طرح ذبح کر ڈالا.....اور قصرِ ہزار ستون ایک بڑی لعنت سے پاک ہو گیا۔ اس ہندو زادے نے شہاب الدین عمر کی آڑ میں پینتیس دن تک ہندوستان پر حکومت کی۔

❀---❀---❀

ملک کافور کے قتل کے بعد قطب الدین مبارک شاہ نے دو مہینے تک شہزادے شہاب الدین کی نیابت کی۔ پھر دوسرے امراء کے ساتھ ساز باز کر کے اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی گوالیار کے قید خانے میں ڈال دیا اور خود تختِ شاہی پر قابض ہو گیا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ قطب الدین مبارک شاہ اپنے بھائیوں اور ماں کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کرے گا......مگر دولت و اقتدار کی فطرت ہی سب سے جداگانہ ہے۔ یہ دونوں کسی کی شرکت برداشت نہیں کرتے۔ قطب الدین نے بھی اسی شرمناک خودغرضی کا مظاہرہ کیا۔

اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہی اس نے اپنے بڑے بھائی خضر خان کے نام ایک طویل خط تحریر کیا۔ ''برادرِ معظم! آج آپ جس حال سے گزر رہے ہیں، میں ہرگز اس کا ذمے دار نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ اس کمینہ فطرت انسان، ملک کافور کا کیا دھرا ہے، جواب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ جو ہوا، سو ہوا۔ اپنے عذاب ناک ماضی کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جائیں۔ میں آپ کو خوشگوار مستقبل کی نوید سناتا ہوں۔ عنقریب درِ زنداں کھل جائے گا اور آپ کسی صوبے کے حاکم بنا دیئے جائیں گے۔''

قطب الدین مبارک شاہ خلجی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ انتہائی اذیت ناک مذاق کر رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ خضر خان بینائی سے محروم ہو چکا ہے.....اور ایک اندھا حاکم کس طرح انتظامی امور انجام دے سکتا ہے۔

قطب الدین مبارک شاہ کے خط کی ہمدردانہ تمہید محض ایک فریب تھی۔ آگے چل کر اس نے صاف صاف لکھ دیا تھا۔

''چھوٹے بھائی کی حیثیت سے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ کو نادان اور نکمّے عاشقوں کی طرح دیول دیوی کے عشق میں جلنا نہیں چاہیئے۔ وہ اوّل و آخر ایک لونڈی ہے۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ آپ ہر وقت اس کے قدموں پر سر رکھے پڑے رہتے ہیں۔ اگر دیول دیوی، چاند کی طرح بھی خوب صورت ہو، تب بھی وہ آپ کی محبت کے لائق نہیں ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اسے آپ سے الگ کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ سلطان مرحوم و مغفور نے مالِ غنیمت کے طور پر آپ کو دیول دیوی عطا کی تھی۔ اب چونکہ میں ہندوستان کا بادشاہ ہوں، لہٰذا اس کنیز کو دوبارہ دہلی بھیج دیا جائے۔ جب آپ کا پاگل پن دُور ہو جائے گا تو دیول دیوی بھی لوٹا دی جائے گی تاکہ وہ ایک حقیقی لونڈی کی طرح آپ کی خدمت انجام دے سکے۔''

جب قطب الدین کا خط پڑھا جا رہا تھا، اس وقت دیول دیوی خضر خان کے قریب موجود تھی۔ جیسے ہی مکتوبِ سلطانی تمام ہوا، دیول دیوی شدتِ کرب سے چیخ اُٹھی۔

''سمراٹ! یہ قطب الدین کی چال ہے۔ وہ مجھ پر بُری نظر رکھتا ہے۔''

خضر خان بھی غصے سے کانپ رہا تھا مگر اس نے دیول دیوی کو بچانے کے لیے مصلحت سے کام لیا.... اور قطب الدین کے خط کا جواب تحریر کرانے لگا۔

''میرے عزیز بھائی! تم خوب جانتے ہو کہ میں عہدہ و منصب کے ساتھ ساتھ اپنی بینائی بھی کھو چکا ہوں۔ اب یہ غم گسار بیوی ہی میری ناکارہ زندگی کا آخری سہارا ہے۔ خواہ مجھے تمام عمر زنداں کے اندھیروں میں پڑا رہنے دو مگر دیول سے جدا نہ کرو۔ یہ میری انتہائی عاجزانہ درخواست ہے۔ اس کے بعد میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا۔''

خضر خان کا جواب پڑھ کر قطب الدین مسکرایا۔ وہ تو بڑے بھائی کے قتل کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی نیا فرمان جاری کر دیا۔

حکمِ سلطانی کی بجا آوری سے انکار، کھلی بغاوت ہے۔ اور ایک باغی کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔''

پھر جب یہ فرمان خضر خان کو پڑھ کر سنایا گیا تو دیول دیوی شدتِ غم سے بے ہوش ہو گئی۔ زنداں کے نگہبان اُسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ قطب الدین مبارک شاہ خلجی نے بیک وقت تینوں بھائیوں خضر خان، شادی خان اور شہاب الدین عمر کے قتل کے احکام جاری کیے تھے۔ نتیجتاً شادی خان کو بھی اسی کمرے میں لے جایا گیا، جہاں خضر خان قید تھا۔

تھوڑی دیر بعد مضبوط توانا بازو رکھنے والا ایک طویل قامت جلاّد برہنہ شمشیر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ خضر خان اندھا ہونے کی وجہ سے جلاّد کو دیکھ نہیں سکتا تھا مگر اس نے موت کے قدموں کی آہٹ سن لی تھی۔ آخری وقت میں ولی عہدِ سلطنت کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے روتے ہوئے سردار شادی کہنہ سے درخواست کی۔

''میں اپنی بیوی کو الوداع کہنا چاہتا ہوں۔ میری اس خواہش کا احترام کیا جائے۔''

سردار شادی کہنہ کو تینوں بھائیوں کے قتل کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ وہ ایک جابر و سفاک انسان تھا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے خضر خان کی درخواست مسترد کر دی۔

''باغیوں کی آخری خواہش کا احترام نہیں کیا جاتا۔'' پھر جلاّد کی شمشیر ہوا میں لہرائی اور دوسرے ہی لمحے خضر خان کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ کچھ دیر تک ایک نامراد عاشق کا جسم تڑپتا رہا، پھر ہمیشہ کے لیے پُرسکون ہو گیا۔

شادی خان نے بڑے بھائی کی دردناک چیخ سنی تو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ ''ظالمو! تم جس خون کو اتنی بے دردی سے بہا رہے ہو، یہ تمہارے آقائے نعمت کا خون ہے۔''

ابھی شادی خان کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ جلاّد نے اس کی قوتِ گویائی بھی چھین لی۔ شمشیرِ ستم نے علاء الدین کے دوسرے بیٹے کا بھی قصہ پاک کر دیا تھا۔

سات سالہ شہاب الدین عمر کو الگ کمرے میں قتل کیا گیا۔ اب قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے علاوہ تختِ شاہی کا کوئی دعوے دار باقی نہیں رہا تھا۔ پھر ان تینوں لاشوں کو اس برج میں دفن کر دیا گیا جو ''وجے مندر'' کے نام سے مشہور ہے۔ نہ کوئی تعزیت کے لیے آیا...... نہ کسی نے مرثیہ پڑھا...... اور نہ کسی گھر سے ماتم کی صدا بلند ہوئی۔ خضر خان، شادی خان اور شہاب الدین عمر اس طرح خاک میں مل گئے جیسے وہ شہزادے نہیں، دنیا کے سب سے زیادہ لاوارث انسان تھے۔

❁---❁---❁

دیول دیوی کو ہوش آیا تو اس نے قید خانے کے محافظوں سے کسی گداگر کی طرح التجا کی۔ ''مجھے میرے شہنشاہ کے پاس پہنچا دو۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہوں گے؟''

''شہزادے اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔'' زنداں کے نگہبانوں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے لیے حکم ہے کہ آپ کو سلطانِ معظم کے پاس دہلی بھیج دیا جائے۔''

شوہر کے قتل کی خبر سن کر دیول دیوی دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔ پھر اسے اسی حالت میں دہلی پہنچا دیا گیا۔

اس کے بعد کوئی نہیں جانتا کہ دیول دیوی پر کیا گزری؟ تمام داستانیں مہر بہ لب ہیں..... اور تمام تاریخیں خاموش۔

پھر بھی کہنے والے کہتے ہیں کہ قطب الدین مبارک شاہ خلجی نے جبراً دیول دیوی سے شادی کر لی تھی..... مگر یہ شادی اسی وقت ممکن تھی جب دیول دیوی پر بے پناہ تشدد کیا گیا ہو...... اور وہ راجپوت زادی اپنے لالہ وگل جیسے بدن پر ہزاروں زخم سجا کر مبارک شاہ خلجی کے شبستان میں داخل ہوگئی ہو گی۔

کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ دیول دیوی نے دُلہن کا جوڑا پہنا تھا..... اور پھول کی سیج پر بیٹھ کر قطب الدین کا انتظار بھی کیا تھا...... مگر جب سلطان قطب الدین مبارک شاہ حجلۂ عروسی میں داخل ہوا...... اور اپنی دُلہن کی طرف بڑھا تو اطلس و کم خواب کا نرم و گداز بستر سرخ ہو رہا تھا۔ یہ سرخی دیول دیوی کے خون کی سرخی تھی جس نے اپنی شہ رگ کاٹ دی تھی..... اور خضر خان سے کیا ہوا وعدہ وفا کر دیا تھا۔ مبارک شاہ خلجی بس اُس کے مُردہ جسم ہی کو چھو سکا۔

جتنے منہ اتنی ہی روایتیں..... مگر اس روایت میں کوئی شک نہیں کہ دیول دیوی، دنیا کی حسین ترین عورت تھی..... اور اُس کا حُسن ہی اُس کے لیے عذاب بن گیا تھا۔

❁---❁---❁

جفا کار

کئی دن سے شام ہوتے ہی دہلی کے اُفقِ غرب پر گہری سرخی اُبھر آتی تھی۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آسمان سے خون برس رہا ہے۔ عوام میں صدیوں سے یہی روایت چلی آ رہی تھی کہ جب بھی آسمان سرخ ہوتا ہے، اہلِ زمین پر کوئی نہ کوئی آفتِ ناگہانی ضرور نازل ہوتی ہے۔ بظاہر کسی جنگ کے آثار نہیں تھے مگر قصرِ شاہی ایک طویل عرصے سے خوف ناک سازشوں کی لپیٹ میں تھا۔ روزانہ نئی بساطِ سیاست بچھائی جاتی تھی۔ پرانے مہروں کو ہٹا دیا جاتا تھا...... اور نئے مہرے آگے بڑھا دیئے جاتے تھے۔ اگرچہ جلال الدین خلجی بادشاہ نہیں تھا لیکن گردشِ وقت نے اُسے بادشاہ گر ضرور بنا دیا تھا۔ تختِ دہلی پر بیٹھنے والا ہر حکمراں ایک کٹھ پتلی تھا اور اس کی ڈوریاں جلال الدین خلجی کے ہاتھوں میں تھیں۔
سلطان غیاث الدین بلبن کی ترتیب دی ہوئی داستانِ اقتدار ورق ورق ہو کر بکھر رہی تھی۔ بلبن کے خاندان کے تمام باصلاحیت افراد یا تو قتل کیے جا چکے تھے یا پھر زنداں کے کسی تاریک گوشے میں اپنی ناکام وفادار زندگی کے باقی دن گزار رہے تھے۔ اس وقت بلبن کا اٹھارہ سالہ پوتا معز الدین کیقباد فرمانروائے ہندوستان تھا۔ مگر اس کی حیثیت ایک گداگر سے بھی بدتر تھی۔ کثرتِ شراب نوشی اور عیاشانہ زندگی نے کیقباد کو اُس تناور درخت کی مثال بنا دیا تھا، جسے اندر سے دیمک چاٹ چکی ہو۔ وہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے فالج کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر بستر پر دراز تھا۔ کیقباد کا پورا جسم مفلوج ہو چکا تھا۔ بس اُس کی زبان حرکت کر سکتی تھی۔ وہ اپنے آراستہ کمرے میں پڑا یا تو آنسو بہاتا رہتا یا پھر اپنے ماضی کو یاد کر کے چیختا رہتا تھا۔

جلال الدین خلجی نے دنیاداری کی خاطر کیقباد کے تین سالہ بیٹے کیومرث کو تختِ شاہی پر بٹھا دیا تھا.... وہ اکثر کیقباد کی خلوت میں حاضری دیتا اور بڑے فرمانبردارانہ انداز میں سرگوشیاں کرتا۔

''سلطانِ معظم! اپنے دل و دماغ کو تمام فکروں سے آزاد رکھیں۔ شاہی طبیبوں کا خیال ہے کہ آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔''

یہ ایک جھوٹا دلاسا تھا۔ شاہی طبیب، معز الدین کیقباد کو لاعلاج قرار دے چکے تھے۔

کیقباد، جلال الدین خلجی کی تسلیوں سے مطمئن نہ ہوتا۔ ''میں جانتا ہوں کہ میرا مرض کس منزل میں ہے۔''

''اگر مشیتِ خداوندی یہی ہے تو پھر آپ یہ سوچ کر مطمئن ہو جائیں کہ میں آپ کے خاندان کا وفادار ہوں۔'' جلال الدین خلجی سلطان معزالدین کیقباد کو فریب دیتے ہوئے کہتا۔ ''آپ نہ سہی، آپ کا بیٹا سہی۔ تختِ شاہی تو آپ کے قدموں کے نیچے ہے۔''

معزالدین کیقباد بہل جاتا......اور جلال الدین خلجی سوچتا رہتا کہ کب ایک اپاہج حکمراں کی آنکھیں بند ہوں....اور کب وہ اپنے اس خواب میں رنگ بھرے، جسے دیکھتے دیکھتے خلجی سردار ستر سال کا ہو چکا تھا۔

❀---❀---❀

جلال الدین کو اپنے حقیقی بھتیجے علاء الدین خلجی سے شدید محبت تھی۔ علاء الدین کا خاندانی نام، علی تھا۔ اس کے باپ شہاب الدین کا انتقال اس وقت ہوا، جب وہ بمشکل تین چار سال کا تھا۔ جلال الدین نے مرحوم بھائی کی نشانی کو اس طرح دل سے لگا کر رکھا کہ علاء الدین اکثر رات کو چچا کے سینے پر لیٹے لیٹے سو جاتا تھا۔ پھر جب علاء الدین جوان ہوا تو جلال الدین نے اس رشتے کو مضبوط تر کرنے کے لیے اپنی بڑی بیٹی شائستہ بیگم کو اس سے منسوب کر دیا۔

علاء الدین خلجی فطرتاً ایک حُسن پرست نوجوان تھا۔ شائستہ بیگم سے منسوب ہونے سے پہلے وہ ایک فوجی سردار الغ خان کی چھوٹی بہن، ماہِ رُو کی زلفوں کا اسیر ہو چکا تھا۔ ماہِ رُو اپنے نام ہی کی طرح حسین تھی۔ کہنے کو جلال الدین کی بیٹی شائستہ بیگم بھی حُسن و جمال میں بے مثال تھی......مگر فطرتاً وہ ایک نہایت مغرور دوشیزہ تھی۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی۔ لوگوں کو بات بات پر کم حیثیتی کے طعنے دیتی۔ اس لیے علاء الدین اس رشتے سے خوش نہیں تھا۔

جب ماہِ رُو کو اس رشتے کی خبر ملی تو وہ بدحواس ہو گئی۔ اُسے اپنا مستقبل تاریک ہوتا نظر آ رہا تھا۔

علاء الدین خلجی نے ماہِ رُو کو تسلیاں دیتے ہوئے کہا۔ ''میں اس رشتے سے انکار نہیں کر سکتا کہ چچا کے مجھ پر بے شمار احسانات ہیں۔''

''آپ کے اقرار میں میری تباہی پوشیدہ ہے۔'' ماہِ رُو زار و قطار رو رہی تھی۔

''ماہِ رُو! میرے دل پر تمہاری ہی حکمرانی ہے۔'' علاء الدین کا لہجہ پُر جوش تھا۔ ''میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں اپنے فیصلے تبدیل کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے مناسب وقت کا انتظار ہے۔ میں تمہارے حقوق اس طرح ادا کروں گا کہ ساری دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھے گی۔''

ماہِ رُو، علاء الدین کے قول وقسم سے مطمئن نہیں تھی۔ وہ امیرزادوں اور فوجی سرداروں کے مزاج سے خوب آشنا تھی۔ اقتدار پرستوں کے دل خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے تھے۔ سردار سے وزیر..... اور وزیر سے بادشاہ بننے کے خواب دیکھنا ان لوگوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ اسی طرح موسم کے ساتھ ساتھ ان کی محبوبائیں بھی بدلتی رہتی تھیں۔ ماہِ رُو کو بھی علاء الدین کی نیت پر شک ہو گیا تھا.....مگر اس کے لیے تمام

راستے بند ہو چکے تھے۔ وہ نہ آگے بڑھ سکتی تھی اور نہ پیچھے کی طرف لوٹ سکتی تھی۔ مجبوراً علاء الدین کا ساتھ نبھاتی رہی۔ قصرِ شاہی کے سنسان گوشوں میں دونوں کی ملاقاتیں جاری رہیں۔ علاء الدین، ماہِ رُو کی مہکی ہوئی زلفوں کے سائے میں خود بھی حسین خواب دیکھتا رہا اور اپنی محبوبہ کو بھی رنگین خواب دکھاتا رہا۔

شائستہ بیگم کی آنکھوں میں کوئی خواب نہیں تھا۔ اس لیے وہ علاء الدین کو اپنی ملکیت سمجھتی تھی۔ شائستہ بیگم کو معلوم تھا کہ اس کے باپ نے اپنے یتیم بھتیجے کی پرورش کی ہے...... اور ایک پروردہ انسان اپنی آقا زادی کے سامنے سر اُٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اسی اندازِ فکر نے شائستہ بیگم کو بہت مغرور بنا دیا تھا۔ نسبت طے ہو جانے کے بعد اگر اتفاق سے دونوں کی ملاقات ہو جاتی تو شائستہ بیگم کے چہرے پر فاتحانہ رنگ اُبھر آتا۔ وہ اپنے ہونے والے شوہر کی دلداری کرنے کے بجائے، بے رُخی سے پیش آتی...... اور علاء الدین دِل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔

❀---❀---❀

قصرِ شاہی میں ہر شخص خواب دیکھ رہا تھا۔ اچانک وقت نے نئی کروٹ لی اور سب سے پہلے جلال الدین کو اس کے خواب کی تعبیر مل گئی۔ معزالدین کیقباد کو معذور دیکھ کر تمام طالع آزما اپنے اپنے خول سے باہر نکل آئے تھے۔ ایک دن جلال الدین کے جاسوسوں نے اُسے خبر دیتے ہوئے کہا۔

''سلطان غیاث الدین بلبن کے ترکی نژاد امیرزادوں نے خلجی سرداروں کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے اور اس میں سرفہرست آپ کا نام ہے۔''

اس انکشاف کے بعد جلال الدین خلجی نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ اس نے اس رات ان ترک زادوں کو خلوت میں جمع کیا جن کے باپ معزالدین کیقباد کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

''اگر تم اپنے منتقم جذبوں کی پیاس بجھانا چاہتے ہو تو آگے بڑھو ورنہ وقت تمہاری گرفت سے نکل جائے گا۔''

جلال الدین کی بات سن کر ترک امیرزادوں کی ایک شمشیر بکف جماعت ''کیلوکھڑی'' کے محل کی طرف بڑھی جہاں سلطان معزالدین کیقباد اپنی ناکارہ زندگی گزار رہا تھا۔

تباہی کے نمائندے اور موت کے یہ نقیب اندھیری رات میں پچھلے پہر قصرِ شاہی میں داخل ہوئے اور اپنے راستے کے پتھروں کو ہٹاتے چلے گئے۔ طویل راہداری میں جتنے محافظ موجود تھے، یا تو قتل کر دیئے گئے یا پھر ان لوگوں نے ترک زادوں کے قدموں پر گر کر اپنی جانوں کے لیے امان مانگ لی۔

پھر یہ ترک زادے اپنے سینوں میں انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ لیے، سلطان معزالدین کیقباد کی خلوت میں داخل ہو گئے۔ مفلوج حکمراں اس وقت گہری نیند سویا ہوا تھا۔ ایک ترک زادے نے آگے بڑھ کر معزالدین کیقباد کے گلے پر شمشیر رکھ دی۔ فرمانروائے ہند کی آنکھ کھل گئی۔ فرشتۂ اجل کو اپنے سرہانے کھڑا دیکھا تو شدتِ خوف سے فرمانروائے ہند کی پتلیاں کانپنے لگیں۔

''تم لوگ کون ہو؟ اور قاتلوں کے لباس میں میرے پاس کیوں آئے ہو؟'' معزالدین کیقباد کی آواز لرز رہی تھی۔

ترک زادوں نے مختصر الفاظ میں اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

''میرا عدم و وجود دونوں برابر ہیں۔'' معزالدین کیقباد ترک زادوں سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ ''میں کسی کے راستے کی رکاوٹ نہیں بلکہ اس دنیا کا سب سے زیادہ کمزور اور محتاج انسان ہوں۔ نہ کوئی فرمان جاری کر سکتا ہوں اور نہ کوئی میری بات سنتا ہے۔ بس چند دنوں کی بات ہے۔ میں تو ایک خزاں رسیدہ پتا ہوں۔ زندگی کے شجر سے ٹوٹ کر گرنے ہی والا ہوں۔ پھر کیوں میرے خون سے ہاتھوں کو رنگین کر کے اپنی آخرت برباد کرنا چاہتے ہو؟''

جیسے ہی معزالدین کیقباد کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، ایک ترک زادے نے والئ ہندوستان کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ ''ہزاروں انسانوں کا قاتل ہمیں آخرت کا درس دے رہا ہے؟''

جب کیقباد نے محسوس کر لیا کہ یہ فرشتگانِ اجل کسی طرح بھی ٹلنے والے نہیں تو اس نے آخری چال چلی۔ ''میرا سارا اثاثہ لے لو۔ لعل و جواہر سے اپنے گھر بھر لو...... اور دولت کے اس انبار کو اپنے باپوں کے خون کا قصاص سمجھ لو۔''

''جان کے بدلے جان۔ اسے بھی قصاص کہتے ہیں۔'' ترک زادے نے پوری طاقت سے کیقباد کے منہ پر گھونسا مارا جس سے اس کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ بند کمرے میں ایک جگر شگاف چیخ گونجی اور پھر معزالدین کیقباد کا منہ خون سے بھر گیا۔

ایک ترک زادے نے جوشِ انتقام میں اپنی شمشیر لہرائی...... مگر دوسرے ساتھیوں نے اسے روک دیا۔ ''بس اتنا خون کافی ہے۔''

اس کے بعد ترک زادوں نے معزالدین کیقباد کو ریشمی چادروں میں لپیٹا اور اپنے انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے دو چار شدید ضربیں لگائیں۔ اسی دوران میں کیقباد کا دم نکل گیا۔

چند ترک زادوں نے فرمانروائے ہند کی لاش کو اٹھایا اور دریائے جمنا کے حوالے کر دیا۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے پوتے کا عجیب لرزہ خیز اور عبرت ناک انجام تھا۔ نہ جنازہ اُٹھا...... نہ کسی نے نمازِ جنازہ پڑھی..... اور نہ مرنے والے کو قبر میسر آئی۔ دریائے جمنا کی بھوکی مچھلیوں اور دوسرے آبی جانوروں نے والئ ہندوستان کی لاش کو نوچ نوچ کر کھا لیا۔

❀---❀---❀

سلطان معزالدین کیقباد کا قصہ پاک ہوتے ہی جلال الدین خلجی نے اس کے تین سالہ بیٹے کیومرث کو تختِ شاہی پر بٹھایا اور خود اُس کا مدار المہام بن گیا۔ پھر کچھ دن بعد جلال الدین نے اپنی گردن سے غلامی کا یہ طوق بھی اُتار پھینکا۔ کیومرث کو بڑی رازداری کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا...... مگر سب جانتے تھے

کہ کیقباد کے کم سن بیٹے کا قاتل کون ہے؟ ہر شخص مصلحت کا شکار تھا۔ اس لیے تمام رازداروں نے اپنی اپنی زبانوں پر قفل لگا لیے تھے۔ پھر شاہی قبرستان میں ایک چھوٹی سی قبر بنا دی گئی...... اور اس قبر میں دنیا کا سب سے کم عمر شہنشاہ، سلطان شمس الدین کیومرث اُس غنچے کی مثال بنا سو رہا تھا جو کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا تھا..... اور جس پر کسی کے دستِ ستم نے کبھی نہ ختم ہونے والی خزاں مسلط کر دی تھی۔

کیومرث کو خاک میں ملاتے ہی جلال الدین خلجی نے تاجِ شاہی اپنے سر پر سجا لیا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ جلال الدین ایک بلند کردار اور نیک سیرت حکمراں تھا..... مگر وہ یہ بات ہمیشہ بھول جاتے ہیں کہ اس کی گردن پر اپنے دو آقا زادوں کا خون تھا۔

جلال الدین نے تخت نشیں ہوتے ہی اپنی بڑی بیٹی شائستہ بیگم کی شادی علاء الدین خلجی سے کر دی۔

شادی کا یہ ہنگامہ خیز جشن کئی دن تک جاری رہا۔ دُلہن کی بارگاہ میں بڑے بڑے قیمتی تحائف پیش کیے گئے۔ آخر وہ تاجدارِ ہندوستان کی بیٹی تھی۔ امراء کی بیویاں، وزیر زادیاں اور قصرِ شاہی کی کنیزیں شائستہ بیگم کے قدموں میں جھکی جا رہی تھیں۔

علاء الدین اس پُرمسرت ہنگامے میں خود کو تنہا تنہا محسوس کر رہا تھا۔ تمام نظریں شائستہ بیگم کے رُخِ تاب ناک پر مرکوز تھیں۔ اس دوران ماہ رُو نے کئی بار علاء الدین کے قریب آنے کی کوشش کی...... مگر وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ چشم پوشی کرتا رہا۔ آخر ماہِ رُو نے مجبور ہو کر علاء الدین کے نام ایک طویل خط تحریر کیا جس میں ہجر و فراق کی جاں گداز داستان رقم کی گئی تھی جسے پڑھ کر علاء الدین کی آنکھوں کے گوشے بھی نم ہو گئے۔

''میرے لیے اس سے بڑی قیامت اور کیا ہو گی کہ میں اپنے دل کے تاجدار کو کسی دوسری عورت کے ساتھ اس طرح ہنستا مسکراتا دیکھوں۔ اب مجھے اس دنیا میں کوئی دلکشی محسوس نہیں ہوتی۔ جدھر دیکھتی ہوں، اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ خدا آپ کے شبستانِ وصال کے چراغوں کو ہمیشہ روشن رکھے۔ کبھی کبھی یہ خواہش میرے دل و دماغ پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے کہ میں اپنی ناکام و نامراد زندگی کا خاتمہ کر ڈالوں۔''

خط کی آخری سطریں پڑھ کر علاء الدین بے قرار ہو گیا۔ اس نے فوری طور پر ماہِ رُو کے خط کا جواب لکھا اور اپنی کنیز خاص رباب کے حوالے کر دیا۔ رباب، علاء الدین خلجی اور ماہِ رُو کی رازدار تھی اور وہی دونوں کی ملاقاتوں کا اہتمام کرتی تھی۔

علاء الدین نے اپنے خط میں ماہِ رُو کو انتہائی صبر و ضبط کی تلقین کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''میں تمہارے دلی اضطراب سے پوری طرح باخبر ہوں...... مگر تم اتنی بے قراری کا مظاہرہ نہ کرو کہ ہمارا راز خاص و عام کی زبانوں تک چلا جائے۔ تمہیں یقین کر لینا چاہئے کہ میں اس جشنِ کیف و نشاط میں اپنی خوشی سے شریک نہیں ہوں۔ میری بے چین نظریں ہر وقت تمہی کو ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ میں عنقریب تم سے آملوں گا۔ مجھے اپنا ایک ایک وعدہ یاد ہے...... اور میں ایفائے عہد کی قیمت کو خوب پہچانتا ہوں۔''

علاء الدین نے خط دینے کے بعد کنیز رباب کو کچھ باتیں زبانی بھی سمجھا دیں۔
اپنے محبوب کا خط پڑھ کر ماہِ رُو کچھ دیر کے لیے کیف و مسرت سے سرشار نظر آنے لگی..... مگر وہ اربابِ اقتدار کی سیاست سے ہمیشہ خائف رہتی تھی۔ تاج و تخت کے اکثر شیدائی دل کی دھڑکنیں بہت کم سنا کرتے تھے۔ شوقِ حکمرانی اور سلطنت کی ہنگامہ آرائی میں ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ نازک جذبوں کی پذیرائی کر سکیں۔ اسی قسم کے اندیشوں نے ماہِ رُو کو بھی مختلف اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا..... اور اس کا مضطرب ذہن اپنا حق حاصل کرنے کے لیے نئے انداز سے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

❀---❀---❀

شائستہ بیگم اس وقت بھی نہایت مغرور لڑکی تھی، جب اس کا باپ محض ایک سردار تھا۔ پھر جیسے ہی جلال الدین خلجی، تختِ شاہی پر جلوہ گر ہوا، شائستہ بیگم کا تکبر اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ زمین پر رہتے ہوئے بھی اس کا دماغ آسمان سے ملتا تھا۔
شادی کی ہنگامہ خیزیوں میں علاء الدین کی حیثیت ایک خاموش تماشائی کی سی تھی۔ شائستہ بیگم نے ایک جاں نثار بیوی کی طرح اپنے شوہر کا استقبال نہیں کیا۔ جب بھی علاء الدین اس کے سامنے آتا، وہ خود کو ملکۂ عالیہ تصور کرتی۔ شائستہ بیگم خدمت گزاری کے جذبات سے یکسر عاری تھی۔ وہ علاء الدین کو شوہر کے بجائے اپنے باپ کا پروردہ خادم سمجھتی تھی۔
شائستہ بیگم کے اس جارحانہ طرزِ عمل نے علاء الدین خلجی کو اپنی شریکِ حیات سے اور بھی دُور کر دیا۔ حالانکہ وہ دنیا کی حسین و جمیل عورت تھی..... مگر علاء الدین جیسے سرکش اور ضدی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی مغرور عورت کے سامنے سرخم کر دے۔ بلاشبہ علاء الدین ایک حُسن پرست نوجوان تھا لیکن اوّل و آخر اُس کے مزاج میں خود پسندی شامل تھی۔ وہ حُسن کو بھی اپنے قدموں پر جھکا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ جب دونوں طرف اپنی ذات کی پرستش کے شدید جذبات موجود ہوں، وہاں دلوں میں قربتیں نہیں، فاصلے پیدا ہوتے ہیں۔
ان فاصلوں کو بڑھانے میں شائستہ بیگم کی ماں کے مشوروں کو بھی بہت زیادہ دخل تھا۔ شادی سے پہلے شائستہ بیگم کی ماں نے بیٹی سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔
''تم ایک شہنشاہ کی بیٹی ہو اور تمہیں ہر قدم پر اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ علاء الدین تمہارا شوہر سہی...... مگر اس کے ساتھ ہی وہ تمہارے باپ کا احسان مند بھی ہے۔ تمہیں جب بھی موقع ملے، اپنے باپ کے احسانات گناتی رہو۔ اس طرح وہ نفسیاتی طور پر تمہارے حلقۂ اثر سے باہر نہیں نکل سکے گا اور تمہیں ازدواجی زندگی میں ہمیشہ برتری حاصل رہے گی۔''
شائستہ بیگم کی ماں تاجدار بیگم، بیٹی کو یہ غیر مناسب مشورے اس لیے دے رہی تھی کہ وہ خود بھی اپنے دورِ جوانی میں ایک خوب صورت عورت تھی اور اپنے شوہر جلال الدین خلجی کے ساتھ اسی طرح پیش آتی

تھی۔ جلال الدین فطرتاً ایک منکسر المزاج اور صلح جُو انسان تھا۔ وہ بیوی کے تحکم آمیز سلوک کو اس لیے برداشت کرتا رہا کہ اسے دنیا میں بہت سے ضروری کام تھے۔ وہ عورتوں کے ناز و ادا کی بے جا نمائش میں اُلجھ کر اپنی زندگی خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تاجدار بیگم نے شوہر کی خاموشی کو فرماں برداری سے تعبیر کیا اور زندگی بھر اس فریب میں مبتلا رہی کہ جلال الدین کے دماغ پر اس کی حکمرانی ہے۔

پھر جب اس کی بیٹی کی ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا تو اس نے شائستہ بیگم کے سامنے اپنے تجربات بیان کیے اور اس لڑکی کو تباہی کے راستے پر ڈال دیا جو پہلے ہی انتہائی خود پسند اور متکبر تھی۔

اگر چہ علاء الدین دلی طور پر شائستہ بیگم کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن پھر بھی اس نے اپنے آپ کو ذہنی انتشار سے بچانے کے لیے کئی بار بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں حفظ مراتب کا قائل ہوں اور تمہیں ہر حال میں ایک اطاعت گزار بیوی دیکھنا چاہتا ہوں۔''

شوہر کی اس خواہش کو شائستہ بیگم نے ایک طنزیہ اور متکبرانہ تبسم میں غرق کر دیا۔ ''آپ کا زاویۂ نظر کچھ بھی ہو...... مگر میں تمام نگاہوں کو اپنی ذات پر مرکوز دیکھنا چاہتی ہوں۔''

شائستہ بیگم نے چند الفاظ میں اپنے خود پرستانہ جذبات کی ترجمانی کر دی تھی۔ علاء الدین کا سرخ سفید چہرہ بجھ کر رہ گیا۔ اس جیسے انا پسند انسان نے پہلی بار ایک ایسی عورت سے شکست کھائی تھی جو بد قسمتی سے اس کی شریکِ حیات بھی تھی۔ مختصراً یہ کہ علاء الدین شائستہ بیگم کی مرضی کا تابع تھا۔ وہ خودسر عورت جب چاہتی، شوہر کو اپنے حریمِ ناز میں طلب کرتی...... اور جب چاہتی رخصت کر دیتی۔ بیوی کے اس خودغرضانہ اور بے رحمانہ طرزِ عمل نے علاء الدین کو شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔

شادی کے چند روز بعد ہی علاء الدین، شائستہ بیگم سے نہ صرف مایوس ہو گیا بلکہ متنفر بھی ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس نے تمام احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ دیا اور اپنی کنیزِ خاص، رباب کو طلب کر کے کہا۔

''آج ہم ماہِ رُو سے ملنا چاہتے ہیں۔''

رباب نے سر جھکا دیا۔ وہ علاء الدین کے مزاج سے خوب واقف تھی۔ اگر وہ چمکتے ہوئے سورج کی موجودگی میں کہہ دیتا کہ یہ سیاہ رات ہے تو پھر حاضرین کو بھی یہی کہنا پڑتا کہ اس قدر کالی رات ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ اگر غلطی سے کسی زبان پر حرفِ انکار اُبھر آتا تو وہ زبان دہن میں محفوظ نہیں رہتی تھی۔ یہی سوچ کر رباب نے بھی سر جھکا دیا۔ حالانکہ آج کل ان ملاقاتوں کے لیے فضا انتہائی ناسازگار تھی۔

''اور یہ ملاقات عام ملاقاتوں کی طرح نہیں ہو گی۔'' علاء الدین کی آنکھوں میں جذبات کا گہرا خمار تھا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ ماہِ رُو ایک دُلہن کی طرح آراستہ ہو کر ہمارے سامنے جلوہ آرا ہو۔''

کنیزِ خاص رباب لرزتی کانپتی واپس چلی گئی۔ اگر شادی سے پہلے علاء الدین اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو اُس کی آوارگیوں پر یہ کہہ کر پردہ ڈال دیا جاتا کہ وہ ایک رئیس زادہ

ہے......اور رئیس زادے عام طور پر ایسی تفریحات کے عادی ہوتے ہیں مگر سلطان جلال الدین کی بیٹی سے شادی کے بعد علاء الدین کا کسی نامحرم عورت سے ملنا ایک سنگین گناہ تھا۔ خود رباب بھی اس کارِ گناہ میں شریک و معاون تھی اس لیے اُسے بھی اپنی زندگی پر موت کے سائے لرزتے نظر آ رہے تھے.......لیکن وہ کیا کرتی کہ کنیزوں کی تو زندگی ہی ایسی سزاؤں کے لیے وقف ہوتی ہے۔

❁---❁---❁

پھر قصرِ شاہی کے ایک سبزہ زار میں ایک رات علاء الدین بڑی بے قراری کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ وہ چودھویں کی رات تھی۔ ماہِ تمام کی کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر سبزہ زار کو چھو رہی تھیں۔ مخملیں گھاس شبنم کے قطروں سے بھیگ چلی تھی اور فضا میں ایک لذت انگیز خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ کشمکشِ انتظار نے زیادہ طول نہیں پکڑا۔ ماہِ رُو سامنے سے نظر آئی۔ کنیزِ خاص، رباب اُس کے پیچھے پیچھے تھی۔ پھر جب ماہِ رُو قریب آئی تو علاء الدین اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ زمینی چاند کے مقابلے میں آسمانی چاند کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ ماہِ رُو کا دہکتا ہوا چہرہ ایک انگارے کے مانند تھا، جس نے بھیگی ہوئی فضا میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔

''ماہِ رُو! اتنی دیر؟ ..... تمہیں ہماری بے چینی کا اندازہ ہے۔'' علاء الدین خلجی نے اس عاشقِ جاں سوختہ کے لہجے میں کہا جو بہت دیر سے انتظار کے شعلوں میں جل رہا تھا۔

''شہنشاہ کو میری اذیتوں کا احساس ہے کہ میں آتشِ فراق میں کس کس طرح جلی ہوں۔'' ماہِ رُو نے ایک خاص ادائے محبوبانہ کے ساتھ کہا۔ وہ ہمیشہ علاء الدین کو شہنشاہ کہہ کر پکارتی تھی......اور اس کی زبان سے ادا ہونے والا یہ لفظ علاء الدین پر ایک ناقابلِ بیان سرشاری کی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔

''ہم تمہارے احساسِ محرومی سے بے خبر نہیں ہیں ماہِ رُو!'' علاء الدین نے رُک رُک کر کہا۔

''اور یہ دیر بھی تو شہنشاہ کے حکم کی تعمیل کے سبب ہوئی ہے۔'' ماہِ رُو کے ہونٹوں پر تو بہ شکن تبسم اُبھر آیا اور اس کی آنکھوں میں شوخیاں کروٹیں لینے لگیں۔

''ہماری وجہ سے؟'' علاء الدین نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''شہنشاہ کا حکم تھا کہ یہ کنیز لباسِ عروسی میں حاضر ہو۔'' یکا یک ماہِ رُو کی آواز سے شکستگی جھلکنے لگی تھی۔

''ہم تمہیں اسی لباس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔'' شائستہ بیگم کے سنگدلانہ سلوک سے پہنچنے والے کرب کو علاء الدین، ماہِ رُو کی قربتوں سے زائل کر دینا چاہتا تھا۔ ''اور سچ تو یہ ہے کہ تم ہی اس پیرہنِ خاص کی مستحق ہو۔''

''میں نے صرف حکمِ شاہی کی تعمیل کی ہے۔'' یہ کہتے کہتے ماہِ رُو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''اگر آپ کی خواہش کا احترام پیشِ نظر نہ ہوتا تو میں کبھی ان زرنگار کپڑوں کو زیب تن نہ کرتی۔ یہ لباس عروسی نہیں، میرا کفن ہے شہنشاہ!'' اب فضا میں ماہِ رُو کی ہلکی ہلکی ہچکیاں بھی اُبھرنے لگی تھیں۔

''ہم پہلے ہی بہت اُداس ہیں ماہِ رُو! تم اس رات کو اور سوگوار نہ بناؤ۔'' علاء الدین اپنے دل کا درد بیان کر رہا تھا۔

''اب بارگاہِ شاہی میں حاضری دینا تو کجا، میں آپ کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔'' ماہِ رُو زار و قطار رو رہی تھی۔ ''ملکۂ عالیہ نے میری قسمت پر ہی نہیں، دل و دماغ پر بھی پہرے لگا دیئے ہیں۔ ڈرتی ہی رہتی ہوں کہ کہیں قصرِ شاہی کی سنگی دیواریں میرے خیالات کو نہ پڑھ لیں، میرے جذبات کی گرفت نہ کر لیں...... اور پھر مجھے مجرم بنا کر ملکۂ عالیہ کے حضور میں پیش نہ کر دیں۔''

''جب تک میں زندہ ہوں، تمہارے عشق پر آنچ بھی نہیں آ سکتی۔'' علاء الدین بڑے والہانہ انداز میں اپنی محبوبۂ دلنواز کو تسلیاں دے رہا تھا۔ ''میں تمہارے حقوق کی حفاظت کا ضامن ہوں...... اور جب علاء الدین کسی بات کی ضمانت دے دیتا ہے تو پھر......'' علاء الدین نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ ''اپنے ذہن سے ہر خوف اور اندیشے کو جھٹک دو۔ تم ہر حال میں میری ہو۔ اور یہ ہندوستان تمہاری ملکیت ہے۔''

ماہِ رُو نے علاء الدین کے اس دعوے کو ایک عاشقِ بے قرار کی لاف زنی سے تعبیر کیا۔ ''مجھے ہندوستان کی حکومت نہیں، آپ کے قدموں میں بیٹھنے کی جگہ چاہئے۔''

''تم ہمارے دل کی گہرائیوں میں ہو ماہِ رُو!..... قدموں کی بات کیوں کرتی ہو؟'' علاء الدین کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ ''گلے شکووں کے لیے ایک عمر پڑی ہے۔ اس حسین رات کو کیوں برباد کرتی ہو جو بڑی مشکل سے میسر آئی ہے۔''

ماہِ رُو نے بڑی ہوشیاری سے شکایتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا اور اپنے ہاتھ سے جام لبریز کرنے لگی۔ پھر اس نے چھلکتا ہوا ساغر علاء الدین کی طرف بڑھایا۔

علاء الدین اپنے عہدِ جوانی ہی سے شراب نوشی کا عادی تھا۔ پھر جب اُس کی شادی ہوئی تو اُس نے شائستہ بیگم سے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنے دستِ حنائی سے ایک جامِ سرخ اُس کی خدمت میں پیش کرے۔ شائستہ بیگم اس راز سے واقف تھی کہ اکثر شہزادے، اُمراء اور وزراء شراب نوشی کی لعنت میں مبتلا ہیں۔ جلال الدین خلجی جسے تمام مؤرخ ایک باکردار اور نیک سیرت حکمراں قرار دیتے ہیں، وہ خود بھی اس قبیح فعل کا شکار تھا...... اور اکثر محفلوں میں معزز اراکینِ سلطنت کے ساتھ شراب پیا کرتا تھا۔ قصرِ شاہی کی رنگین فضاؤں میں پرورش پانے کی وجہ سے شائستہ بیگم بادہ نوشی کو مقتدر مردوں کا محبوب مشغلہ سمجھتی تھی...... مگر جب اُس کے شوہر نے اُس سے ایک جامِ لبریز طلب کیا تو وہ برہم ہو گئی۔

''تمہارے اس شوق کی تکمیل کے لیے محل میں ہزاروں کنیزیں اور غلام زادے ہیں۔ آئندہ میرے سامنے اپنی اس بے ہودہ خواہش کا اظہار مت کرنا۔ میں تمہاری لائقِ احترام بیوی ہوں، کوئی زنِ بازاری نہیں کہ ساقی گری کے فرائض انجام دیتی رہوں۔''

ماہِ رُو ہر ملاقات میں بصدِ ناز و ادا ساقی گری کا فریضہ انجام دیتی تھی..... مگر آج جب اُس نے ساغرِ ناب پیش کیا تو علاء الدین کو اپنی بیوی شائستہ بیگم کا ذلت آمیز انکار یاد آ گیا۔ پھر وہ مسلسل پیتا رہا۔ اپنی ازدواجی تلخیوں کو فراموش کرنے کے لیے پیتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ مست و بے خود ہو گیا۔

❀---❀---❀

علاء الدین کی شادی کے کچھ دنوں بعد سلطان جلال الدین خلجی نے اپنی دوسری بیٹی علاء الدین کے چھوٹے بھائی الماس بیگ کو بیاہ دی۔ تاجدار بیگم نے اس شادی کی بھی مخالفت کی تھی مگر جلال الدین نے یہ کہہ کر تاجدار بیگم کی بات مسترد کر دی تھی۔

''علاء الدین کی طرح وہ بھی میرا حقیقی بھتیجا ہے۔ اگر شادی کے معاملات میں ذات و نسب کوئی حیثیت رکھتے ہیں تو پھر الماس بیگ اور میرا نسب نامہ ایک ہے۔ اس کے بدن میں بھی وہی خون ہے جو میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ وہ میرے چھوٹے بھائی کی نشانی ہے..... اور مجھے اپنے بیٹوں کی طرح عزیز ہے۔''

تاجدار بیگم اپنا سا منہ لے کر رہ گئی...... اور یہ شادی اس قدر دھوم دھام سے ہوئی کہ یادگار بن کر رہ گئی۔ اس شادی کے موقع پر جلال الدین خلجی نے اپنے دونوں دامادوں کو نئے منصب عطا کیے۔ علاء الدین کو ''امیر توزک'' مقرر کیا اور الماس بیگ کو ''امیر تاشور۔''

''امیر توزک'' ایک معزز عہدہ تھا۔ جب وہ اس منصب سے سرفراز کیا گیا تو امرائے سلطنت نے پُر جوش مبارکبادوں کے ساتھ اس کی خدمت میں قیمتی تحائف پیش کیے۔ علاء الدین کا خیال تھا کہ اس موقع پر شائستہ بیگم بھی اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی خوشی کا اظہار کرے گی مگر اُس مغرور عورت نے اس طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی جیسے یہ کوئی معمولی بات ہو۔

پھر جب علاء الدین نے اپنی بیوی سے اس عدم التفات کا شکوہ کیا تو شائستہ بیگم نے نہایت بے رخی کے ساتھ کہا۔

''مبارک باد تو ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو اپنی صلاحیتوں اور کوششوں سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ تمہارا یہ منصب تو میری ہی ذات کا صدقہ ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ بابا محترم تمہیں جو کچھ عطا کر رہے ہیں، وہ میرے جہیز میں شامل ہے۔''

''اپنی آواز نیچی رکھو۔'' شائستہ بیگم نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ ''اونچی آواز میں بولنے کا حق صرف ان لوگوں کو حاصل ہے جو اپنے زورِ بازو سے عہدہ و منصب حاصل کرتے ہیں۔ تمہاری پہچان صرف تمہارا دورِ یتیمی ہے۔ ان دنوں کو یاد کرو جب تم اس بے رحم دنیا میں تنہا رہ گئے تھے۔ اگر تمہیں میرے محترم باپ کی آغوشِ محبت میسر نہ ہوتی تو انسانوں کے ہجوم میں گم ہو کر اپنی پہچان بھی کھو چکے ہوتے...... یا زیادہ سے زیادہ شاہی فوج میں ایک معمولی سپاہی ہوتے اور کسی اصطبل میں اپنے گھوڑے کی مالش کر رہے ہوتے۔'' اپنے شوہر کے ساتھ شائستہ بیگم کا ذلت آمیز برتاؤ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ وہ اقتدار کے نشے میں اس

حقیقت کو بھی فراموش کر بیٹھی تھی کہ کسی زمانے میں اس کا باپ، جلال الدین خلجی بھی ایک عام سپاہی تھا۔ پھر ترقی کرتے کرتے سرداری کے منصب تک پہنچا..... اور آخر میں سیاسی انتشار سے فائدہ اُٹھا کر تختِ شاہی پر قابض ہو گیا۔ شائستہ بیگم کو اپنے باپ کا دورِ گمنامی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ تو بس یہی سمجھتی تھی کہ جیسے سات پشتوں سے حکومت اُس کے گھر کی لونڈی رہی ہو۔

علاء الدین کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ آج پہلی بار وہ اپنے اصلی لہجے میں بیوی سے مخاطب ہوا۔ ''شائستہ بیگم! میرے بار بار تنبیہہ کرنے کے باوجود تم نے اپنی روش تبدیل نہیں کی۔''

''میرا روّیہ اس وقت تبدیل ہو سکتا ہے، جب تم اپنی عادتیں بدل ڈالو۔'' شائستہ بیگم اپنے شوہر کے احساسات سے بے خبر تھی اور کئی ماہ سے مسلسل اپنے غرور کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''شائستہ بیگم! میں ایک مرد ہوں...... مردِ جانباز...... جس کا محبوب مشغلہ، لوگوں کے سر کاٹنا اور میدانِ جنگ کو زیر و زبر کر دینا ہے۔'' آج علاء الدین کی زبان کھلی تو پھر کھلتی ہی چلی گئی۔ ''میں تمہارے دربارِ حُسن کا گداگر نہیں کہ ہر وقت ریشمی آنچل سے لپٹا، جلوؤں کی بھیک مانگتا رہوں۔ میں تمہیں آخری بار ہدایت کرتا ہوں کہ جلد از جلد غرور و ناز کے اس پیرہن کو اتار دو اور اطاعت شعار بیوی کا لبادہ پہن لو...... ورنہ وقت ایک نئی تاریخ لکھے گا...... اور اس تاریخ میں تمہارا کردار ایک بدنصیب عورت کا کردار ہو گا...... جو شوہر کی رفاقتوں سے دُور ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر آنسو بہاتی رہے گی...... اور پھر ایک دن اپنی ناکام حسرتوں کا مرثیہ پڑھتی ہوئی قبر کی تاریکیوں میں گم ہو جائے گی۔''

علاء الدین خلجی کے ایک ایک لفظ سے خوفناک عزائم کا اظہار ہو رہا تھا...... مگر شائستہ بیگم نے شوہر کی سخت تنبیہہ کو کسی دیوانے کا ہذیان سمجھا اور بہت دیر تک ہنستی رہی۔ اسے اپنے محترم باپ کی بے پناہ طاقت پر یقین تھا۔ اس لیے وہ شوہر کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ شائستہ بیگم کا خیال تھا کہ وہ جب چاہے گی، سلطان جلال الدین خلجی سے کہہ کر علاء الدین کو اس کے منصب سے معزول کرا دے گی۔ اور پھر بے عہدہ و منصب شوہر اُس کے قدموں پر سر رکھ کر نظرِ کرم کی بھیک مانگنے لگے گا۔

❁---❁---❁

اس رات علاء الدین اپنی محبوبہ ماہِ رُو سے ملا تو بہت اُداس تھا۔ ماہِ رُو اسی موقع کی تلاش میں تھی۔ اُس نے جی کھول کر رسمِ دلداری ادا کی۔

''شہنشاہ! اس کنیز کے سوا کون ہے، آپ کے جذبوں کو سمجھنے والا؟''

علاء الدین نے پُر خمار نظروں سے ماہِ رُو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہارے ہی آنچل کے سائے میں سکون ملتا ہے...... اگر یہ آنچل نہ ملا تو جذبوں کی تیز دھوپ میرے بدن اور میری روح کو جلا کر راکھ کر دے گی۔''

ماہِ رُو ایک ذہین دوشیزہ تھی۔ اس نے علاء الدین کی جذباتی شکست و ریخت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

''شہنشاہ! آپ جس کے سائے میں سکون پاتے ہیں، اب وہی آنچل دریدہ ہونے والا ہے۔'' یہ کہتے کہتے ماہِ رُو کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

اپنی محبوبہ کی بات سن کر علاء الدین چونک اُٹھا۔ ''آخر تم کیا کہنا چاہتی ہو ماہِ رُو؟...... کس کا ہاتھ ہے جو تمہارے آنچل کی طرف بڑھنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ کیا اُسے نہیں معلوم کہ تم میری پسند ہو...... میرے دنوں کی رازدار ہو...... اور میری راتوں کی امین ہو۔'' علاء الدین، شراب کے نشے میں غرق تھا اور اُس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''شہنشاہ! یہ کیسے ممکن ہے کہ قصرِ شاہی کے مکین میرے اور آپ کے رشتے سے باخبر ہو جائیں؟'' ماہِ رُو کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں تیزی آ گئی تھی۔ ''میں تو آپ کی خاطر یہ رُسوائی بھی برداشت کر لوں گی کہ میری محبت کے چرچے عام ہو جائیں ...... مگر میرے بھائی الغ خان کا کیا ہو گا جو اپنی بہن کے غیر یقینی مستقبل سے ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ کئی امیرزادوں نے اپنے رشتے بھیجے ہیں۔ آخر میں کہاں تک انکار کروں گی؟ اور الغ خان کو اپنے انکار کی کیا وجہ بتاؤں گی؟'' ماہِ رُو بڑے درد انگیز لہجے میں اپنی حالتِ زار بیان کر رہی تھی۔

علاء الدین خلجی کے چہرے پر فکر و پریشانی کے رنگ اُبھر اُبھر کر ڈوب رہے تھے۔

''شہنشاہ! اب میری شادی کے مسئلے کو زیادہ دنوں تک ٹالا نہیں جا سکتا۔'' ماہِ رُو نے بڑی ہوشیاری سے علاء الدین کے دل و دماغ پر ایک جذباتی ضرب لگائی ...... اور اپنے محبوب کے ردِعمل کا انتظار کرنے لگی۔

علاء الدین یکایک سنبھل گیا اور اس کے چہرے سے جذباتی ہیجان کی علامتیں غائب ہو گئیں۔ ''تم کیا چاہتی ہو ماہِ رُو؟'' اب اُس کے لہجے سے گہرا سکون جھلک رہا تھا۔

''امیرزادوں کی تو حیثیت ہی کیا، اگر کوئی فاتح عالم بھی یہ رشتہ لے کر آئے تو میں اُسے حقارت سے ٹھکرا دوں۔'' اچانک ماہِ رُو کا لہجہ پُرجوش ہو گیا تھا۔ ''کسی غیر کی بیوی بننے سے تو بہتر ہے کہ میں ساری زندگی اپنے شہنشاہ کی کنیز رہوں...... اور پھر اسی اعزاز کو اپنے سینے پر سجائے ہوئے قبر میں چلی جاؤں۔''

کنیز سے مراد داشتہ تھی۔ ماہِ رُو نے مبہم انداز میں اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

علاء الدین نے بہت غور سے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھا پھر خلجی سردار کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اُس نے ماہِ رُو کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے معطر رومال سے خشک کرتے ہوئے کہا۔

''میرے دل کا حکمراں...... پورے ہندوستان کا حکمراں۔''

ماہِ رُو، علاء الدین کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہی۔

❀---❀---❀

پھر کچھ دن بعد خلجی سردار کے ان الفاظ کا مفہوم بھی واضح ہو گیا۔ علاء الدین نے ماہِ رُو سے صاف صاف کہہ دیا۔

''میں اپنے اور تمہارے اس رشتے کو شرعی حیثیت دینے کے لیے تیار ہوں۔''

فرطِ حیرت سے ماہِ رُو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُسے علاء الدین کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''شہنشاہ! کہیں میری سماعت میں خلل تو واقع نہیں ہو گیا ہے؟''

''میں نے جو کچھ کہا، تم نے وہی سنا۔'' علاء الدین کے چہرے سے جلال کی کیفیت نمایاں تھی۔

''شہنشاہ! کہیں میں خوشی سے مر نہ جاؤں۔'' ماہِ رُو جوشِ مسرت میں رونے لگی۔ اور پھر اُس نے بے اختیاری کے عالم میں علاء الدین کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

خلجی سردار نے ماہِ رُو کو اُٹھایا اور پھر سرگوشیوں کے انداز میں کہنے لگا۔ ''مگر میری ایک شرط ہے۔''

''مجھے ہزار شرطیں منظور ہیں۔'' ماہِ رُو پر سرشاری کا غلبہ تھا۔

''یہ شادی ہمیشہ ایک راز ہی رہے گی تاوقتیکہ میں خود اس رشتے کا اعلان نہ کروں۔'' علاء الدین خلجی نے اپنی شرط پیش کرتے ہوئے کہا۔

ماہِ رُو نے چونک کر خلجی سردار کی طرف دیکھا۔

''میں یہ شادی صرف تمہارے سکون کے لیے کر رہا ہوں تا کہ تمہیں میرے وعدوں پر اعتبار آ جائے۔ اور تمہارا بھائی الغ خان اپنی بہن کے مستقبل کو محفوظ سمجھ کر مطمئن ہو جائے۔'' علاء الدین خلجی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہیں بھی اس راز کو اپنے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ رکھنا ہو گا۔''

ماہِ رُو نے شادی کے اقرار کو غنیمت جانا اور سر جھکا دیا۔ اُسے برسوں سے یہی اندیشے پریشان کر رہے تھے کہ کہیں علاء الدین اپنے وعدوں سے منحرف نہ ہو جائے...... اور پھر اُس کی پوری زندگی خوں گشتہ تمناؤں کا ماتم کرتے ہوئے نہ گزر جائے۔''

دوسرے دن دہلی کے مضافاتی علاقے میں ایک فوجی سردار غیاث الدین بیگ کے مکان پر کچھ پُراسرار سی سرگرمیاں نظر آ رہی تھیں۔ پہلے ایک پالکی آ کر رُکی۔ غیاث الدین بیگ نے کہاروں کو اشارہ کیا کہ وہ پالکی لے کر مکان کے اندر چلے جائیں۔ تھوڑی دیر بعد غیاث الدین بیگ کی بیوی نے پالکی کا پردہ ہٹا کر ایک خوبصورت دوشیزہ کا استقبال کیا۔ یہ ماہ رُو تھی جو دُلہن کے سرخ جوڑے میں ملبوس تھی۔

غیاث الدین بیگ اپنے مکان کے دروازے پر اکیلا ٹہل رہا تھا۔ اُسے کسی کے آنے کا انتظار تھا۔ پھر چند سپاہی ایک باریش شخص کو لے کر حاضر ہوئے جو اپنی ظاہری وضع قطع سے کوئی مذہبی عالم نظر آ رہا تھا۔ غیاث الدین بیگ نے اس شخص کو بھی مکان کے اندر پہنچا دیا۔

آخر میں دو برق رفتار گھوڑے دروازے پر رُکے۔ ان شہسواروں میں ایک علاء الدین خلجی تھا...... اور دوسرا ماہِ رُو کا بڑا بھائی الغ خان تھا۔

کچھ دیر بعد قاضی حسام الدین نے علاء الدین اور ماہِ رُو کا نکاح پڑھایا۔ الغ خان نے سکون کی سانس لی کہ اُس کی بہن کا مستقبل محفوظ ہو گیا تھا۔

علاء الدین خلجی نے اپنی شبِ عروسی، غیاث الدین بیگ کے گھر پر گزاری۔ جب ماہِ رُو شوہر کے سامنے جلوہ نما ہوئی تو اس کے ہونٹوں پر ایک اُداس مسکراہٹ تھی......اور چہرے پر سہمی سہمی خوشیوں کا بجھا رنگ۔

علاء الدین نے بڑے پُر جوش انداز میں رسمِ دلداری ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''اُداس مت ہو ماہِ رُو! ابھی ایک اور رات آئے گی، جس کے آگے دن کے اُجالے بھی ماند پڑ جائیں گے۔''

''شہنشاہ! میں شکایت کہاں کر رہی ہوں؟'' ماہِ رُو نے ایک خاص ادائے محبوبانہ کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر اس مسکراہٹ کے پیچھے ایک محرومی کا، ایک خلش کا ہلکا ہلکا عکس لرز رہا تھا۔

''ابھی ہماری شادی کا جشن باقی ہے ماہِ رُو!'' یہ کہتے کہتے علاء الدین کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ اُبھر آیا تھا۔ ''وہ جشن جس کی گونج ہندوستان کے گوشے گوشے میں سنائی دے گی۔''

ماہِ رُو بہل گئی......اور اس جشن کا خواب دیکھنے لگی، جس کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔

❀---❀---❀

شائستہ بیگم کے غرورِ حکمرانی میں دم بہ دم اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ علاء الدین خلجی بھی سرکشی پر اُتر آیا۔ پہلے وہ شب بسری کے لیے اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا..... پھر اُس نے وہ کمرہ بھی چھوڑ دیا جہاں اُس کی متکبر اور نخوت پسند بیوی ایک خود مختار ملکہ کی طرح حکم چلاتی تھی۔ اب علاء الدین کی راتیں اپنی دوسری بیوی ماہ رو کے ساتھ گزرتی تھیں۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ علاء الدین نے شائستہ بیگم سے رسمی گفتگو بھی بند کر دی۔ اگر کبھی میاں بیوی کا آمنا سامنا ہو جاتا تو علاء الدین خلجی کترا کر نکل جاتا۔ شائستہ بیگم نے شروع میں شوہر کی اس بے رُخی کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ نادان عورت سمجھتی تھی کہ علاء الدین نے اپنی برتری منوانے کے لیے یہ روش اختیار کی ہے۔ نتیجتاً شائستہ بیگم نے بھی تغافل اور بے نیازی کا سخت مظاہرہ کیا..... وہ علاء الدین کی انا کو مضروب کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھی۔

تاجدار بیگم نے بھی بیٹی کا گھر برباد کرنے کے لیے بڑا بے رحمانہ کردار ادا کیا۔ وہ شوہر اور بیوی کے درمیان پیدا ہونے والی تلخیوں کی چنگاری کو محبت، یا کم سے کم مصلحت کے پانی کے چند چھینٹوں سے بجھا سکتی تھی مگر اس عاقبت نااندیش عورت نے اس چنگاری کو یہاں تک ہوا دی کہ وہ بھڑکتا ہوا شعلہ بن گئی۔ ایسا شعلہ جسے اب دریا بھی سرد نہیں کر سکتا۔ علاء الدین کی فطرت یہ تھی کہ اگر کسی کی طرف سے اس کے دل میں گرہ پڑ جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس گرہ کو نہیں کھول سکتی تھی...... دوسری طرف تاجدار بیگم کا مزاج یہ تھا کہ وہ اپنے اقتدار کو لازوال سمجھتی تھی۔ وہ اسی اقتدار کی بنیاد پر اپنے داماد کو شائستہ بیگم کے قدموں میں جھکا دینا چاہتی تھی۔ یہ ایک مرد کی انا اور ایک عورت کے جابرانہ اقتدار کی جنگ تھی۔ اس جنگ میں نہ علاء الدین خلجی ہارنا چاہتا تھا......اور نہ ملکۂ ہندوستان اور اس کی خودسر بیٹی شائستہ بیگم۔

یہ سرد جنگ کئی ماہ تک جاری رہی۔ اس دوران تاجدار بیگم اور شائستہ بیگم نے سلطان جلال الدین خلجی

سے مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ دونوں عورتیں مل کر علاء الدین کو غلام بنانے کی کوششیں کرتی رہیں...... مگر علاء الدین بھی اپنے انداز کا ایک سرکش شخص تھا۔ ایک بار شائستہ بیگم کے حریمِ ناز سے اُٹھ کر گیا تو دوبارہ واپس نہیں آیا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا خسر فرمانروائے ہندوستان ہے جس کے ایک اشارے پر اس کی زندگی کا خاتمہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اپنی ان تمام تر مجبوریوں کے باوجود علاء الدین نے شائستہ بیگم کے طاقتور وجود کی مکمل نفی کر دی تھی۔

پھر جب یہ فاصلے اپنی انتہا کو پہنچ گئے تو شائستہ بیگم کے پندار کا قد آور بت لرزنے لگا۔ اس نے اپنی رازدار کنیزوں کو تنہائی میں طلب کرنے کے بعد حکم دیا۔

''تم میرے شوہر علاء الدین کی حرکات وسکنات پر گہری نظر رکھو۔''

تمام کنیزوں نے شدید حیرت اور خوف کے عالم میں شائستہ بیگم کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے شہزادی عالیہ؟...... کہاں والئ ہندوستان کے عظیم المرتبت داماد...... اور کہاں ہم ادنیٰ کنیزیں؟...... اگر اُنہیں شک بھی ہو گیا تو ہم بے کس و مجبور عورتوں کو قبر کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔'' کنیزوں نے دبے دبے لہجے میں شائستہ بیگم کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

''تم کس کا نمک کھاتی ہو؟'' یکایک شائستہ بیگم غضب ناک نظر آنے لگی۔

''آپ کا اور آپ کے بابا محترم کا۔'' کنیزوں کے جسم بھی لرز رہے تھے اور زبانیں بھی۔

''تو پھر حقِ نمک ادا کرو اور مجھے بتاؤ کہ علاء الدین اپنی راتیں کہاں گزارتا ہے؟'' شائستہ بیگم کے قہر کی آگ پوری شدت سے بھڑک رہی تھی۔ ''اگر یہ کام تمہارے بس کا نہیں تو پھر قصرِ شاہی کے کسی سنسان گوشے میں اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھود لو۔'' یہ کہہ کر شائستہ بیگم اپنی خواب گاہ میں چلی گئی جہاں کئی ماہ سے علاء الدین خلجی کا سایہ تک نہیں پڑا تھا۔

❁---❁---❁

قصرِ شاہی کی کنیزوں پر نئی قیامت نازل ہو چکی تھی۔ اُن کے لیے نہ جائے اماں تھی، نہ راہِ فرار۔ وہ میاں بیوی کے جھگڑے سے دُور رہنا چاہتی تھیں مگر شائستہ بیگم نے اُنہیں دنیا کی سب سے خوف ناک آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اپنی مالکہ کا حکم ٹالنے کی سزا بھی موت تھی...... اور علاء الدین خلجی کی جاسوسی کرنے کی سزا بھی موت۔ اِدھر بھی موت تھی...... اور اُدھر بھی موت۔ ہر طرف موت ہی موت تھی۔

آخر کنیز دل آراء نے اپنی ساتھیوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''شاید شہزادہ علاء الدین ہماری خطاؤں کو معاف کر دیں مگر شہزادئ عالیہ کے یہاں معافی کا تصور تک موجود نہیں۔ اس لیے اپنی زندگی کا یہ جوا بھی کھیل کر دیکھ لو...... ورنہ بازی تو مات ہو ہی چکی ہے۔''

پھر چند کنیزیں اپنی جانوں پر کھیل کر علاء الدین کا تعاقب کرنے لگیں۔ علاء الدین، ماہِ رُو سے ملنے کے لیے بڑے پُر پیچ راستے اختیار کرتا تھا۔ پہلے وہ الغ خان کے مکان میں داخل ہوتا تھا، پھر ایک خفیہ

سرنگ کے ذریعے اس طویل و عریض باغ میں پہنچ جاتا تھا جو صرف بادشاہ اور شہزادوں کی سیر و تفریح کے لیے مخصوص تھا۔ اس باغ میں چھوٹے چھوٹے کمرے بھی تعمیر کیے گئے تھے۔ علاء الدین کسی ایک کمرے میں رات گزارتا اور صبح ہوتے ہی دربارِ سلطانی میں حاضر ہو جاتا۔

شائستہ بیگم کی کنیزیں، علاء الدین خلجی کی جاسوسی میں ناکام ہو چکی تھیں۔ آخر انہوں نے ایک نئی چال چلی اور وہ علاء الدین کو چھوڑ کر اُس کی کنیزِ خاص رباب کے پیچھے سائے کی طرح لگ گئیں۔ پھر ایک دن وہ رباب کا تعاقب کرتے کرتے اس باغ میں جا پہنچیں جہاں علاء الدین، ماہِ رُو سے محوِ گفتگو تھا۔

کئی ہفتوں کی اذیت ناک کشمکش کے بعد کنیزوں نے چین کا سانس لیا....اور پھر اُن کی کانپتی آوازوں نے اس راز کو فاش کر دیا جسے قصرِ شاہی کی دیواریں برسوں سے اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھیں۔

''شہزادیٔ عالیہ! الغ خان کی بہن، ماہِ رُو آپ کی رقیبِ خاص ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ آج کل وہی شہزادے کی شریکِ تنہائی ہے۔ اپنے گھر کی خبر لیجئے کہ اس گھر کو آگ لگ چکی ہے۔ ہماری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، وہ ناقابلِ بیان ہے۔''

کنیزوں کی زبان سے ماہِ رُو کا نام سن کر شائستہ بیگم کو کچھ دیر کے لیے سکتہ سا ہو گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ علاء الدین خلجی کسی عام کنیز کے نغمۂ رقص سے اپنے شبستان کو روشن کرتا ہو گا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سردار الغ خان کی چھوٹی بہن علاء الدین کی خلوتوں کی راز دار بن جائے گی۔ اسی تصور نے شائستہ بیگم کو چند لمحوں کے لیے ذہنی طور پر ماؤف کر دیا تھا۔ پھر جب اُس کی یہ کیفیت زائل ہوئی تو وہ کنیزوں پر برس پڑی۔

''تمہاری آنکھوں نے دھوکا تو نہیں کھایا؟.....اگر یہ فریبِ نظر ہوا تو اس کی سزا جانتی ہو؟''

کنیز دل آراء چند قدم آگے بڑھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ غلامانہ انداز میں بندھے ہوئے تھے اور گردن جھکی ہوئی تھی۔

''شہزادیٔ عالیہ! ہماری کیا مجال کہ ہم شہزادۂ مکرم پر تہمت طرازی کر سکیں۔ اگر یہ معلومات غلط ثابت ہوں تو پھر ہمارے سر کاندھوں سے جدا کر دیئے جائیں۔''

جب شائستہ بیگم کو اپنی کنیزوں کی فراہم کردہ اطلاعات پر یقین آ گیا تو وہ انتہائی غضب ناک انداز میں چیخنے لگی۔

''ماہِ رُو، قصرِ شاہی کی ایک معمولی ملازمہ......اور الغ خان، میرے باپ کے ٹکڑوں پر پلنے والا، بے ننگ و نام غلام......وہ تمام ہاتھ کاٹ کر پھینک دیئے جائیں گے جو میرے حریمِ ناز میں آگ لگانا چاہتے ہیں۔''

تمام کنیزیں شدتِ خوف سے لرز رہی تھیں۔ ''شہزادیٔ عالیہ! یہ تو بہت بڑے لوگوں کی جنگ ہے۔ اس میں ہم غریبوں کا کیا ہو گا؟'' دل آراء نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کے خوب صورت چہرے پر

موت کے سائے لرز رہے تھے۔ اگر شہزادۂ معظم کو پتہ چل گیا کہ یہ خبر ہم کنیزوں کے ذریعے آپ تک پہنچی ہے......'' دل آراء کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

''تمہیں انعامات سے سرفراز کیا جائے گا کہ تم نے اپنی شہزادیٔ عالیہ کی ازدواجی زندگی کو برباد ہونے سے بچالیا۔'' یکایک شائستہ بیگم کا لہجہ بدل گیا تھا۔ پھر اس نے تمام کنیزوں کو اپنی خلوت گاہ سے رخصت کر دیا مگر دل آراء کو روک لیا۔

پھر وہ سرگوشیوں میں اپنی کنیزِ خاص سے اس مقام کی تفصیلات پوچھنے لگی جہاں اُس کا شوہر علاء الدین اور الغ خان کی چھوٹی بہن ماہِ رُو چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔

❀---❀---❀

اس انکشاف کے بعد شائستہ بیگم نے نئی چال چلتے ہوئے اپنے جارحانہ روّیے میں نرمی پیدا کی....... اور علاء الدین خلجی کو آزمانے کے لیے مصنوعی طور پر رسمِ دلداری ادا کرنے کی کوشش کی۔ ایک دن جب علاء الدین دربارِ سلطانی میں موجود تھا، شائستہ بیگم کے ایک خدمت گار نے اس کے کان میں کہا۔

''شہزادیٔ عالیہ آپ کو یاد کر رہی ہیں۔''

خدمت گار کے ذریعے اپنی مغرور بیوی کا پیغام سن کر علاء الدین مسکرایا اور پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شہزادیٔ عالیہ سے کہنا کہ اگر ہمیں وقت ملا تو ضرور حاضر ہو جائیں گے۔''

شائستہ بیگم نے علاء الدین کا جواب سنا اور اس کے دلکش چہرے پر نفرت و غضب کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ ''اب میرے لیے اس کے پاس وقت بھی نہیں ہے؟'' شائستہ بیگم کے جی میں آئی کہ وہ اسی وقت دربارِ شاہی میں داخل ہو اور علاء الدین سے اس اندازِ تغافل کا سبب دریافت کرے......مگر اس نے فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور دربار کے برخاست ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

علاء الدین حسبِ وعدہ شام کے وقت اپنی بیوی کے پاس آیا اور طنزیہ انداز میں کہنے لگا۔

''آج ملکۂ عالیہ کو غلام کی یاد کیسے آ گئی؟''

شائستہ بیگم نے شوہر کے الفاظ کی نشتریت کو محسوس کر لیا۔ جواباً وہ بھی برہم ہو جانا چاہتی تھی مگر اس نے مصلحتاً نرم لہجہ اختیار کیا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا انتظار کرتے کرتے کمرے کے در و دیوار سو جاتے ہیں مگر میں جاگتی رہتی ہوں۔''

''تمہیں تو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا شائستہ بیگم!'' علاء الدین کے لہجے کی تلخی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ''اگر یہ بے جان پتھر بولنے لگیں کہ وہ میرا انتظار کر رہے تھے تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہو گا......لیکن تمہارے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ بلکہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ معلوم ہوتی ہے۔''

''آخر میں آپ کی بیوی ہوں اور میرے بھی کچھ حقوق ہیں۔'' علاء الدین کی بے نیازی دیکھ کر شائستہ بیگم اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔

''تم سب کچھ ہو سکتی ہو مگر بیوی نہیں۔'' علاء الدین نے آج اپنی مجبوریوں کے جال کے تمام پھندے کاٹ دیئے تھے اور وہ آزاد فضاؤں میں پوری توانائی کے ساتھ اُڑ رہا تھا۔''اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے والی عورت کو یہ نہیں معلوم کہ شوہر کے کیا حقوق ہوتے ہیں؟...... میرے ان خوب صورت موسموں کا حساب کون دے گا جو تمہاری کج ادائی کا مرثیہ پڑھتے ہوئے چلے گئے...... ان بے چین دنوں اور بے خواب راتوں کا شمار کون کرے گا جو تمہارے نخوت وغرور کی نذر ہو گئے؟..... شائستہ بیگم! آپ نے حقِ رفاقت ادا کرنے کے بجائے اپنی تمام صلاحیتیں مجھے ایک غلام ثابت کرنے پر صرف کر دیں۔ مگر میں، علاء الدین ہوں جسے غیر کی تو کیا، اپنی غلامی بھی منظور نہیں۔'' خلجی سردار نے ایک مختصر سے فقرے میں اپنی فطرت کی عکاسی کر دی تھی لیکن وہ تنگ نظر عورت، شوہر کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔

''کچھ بھی ہو۔ میں اُن لمحوں کا حساب چاہتی ہوں جو تم نے مجھ سے دُور رہ کر گزارے ہیں۔'' شائستہ بیگم نے مصلحت پسندی کا لبادہ اُتار پھینکا اور اپنے حقیقی لباس میں نظر آنے لگی جس کا ایک ایک تار غرور اور خود پرستی کے دھاگوں سے بُنا تھا۔

''میں تمہاری مرضی کا پابند نہیں ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے علاء الدین اُٹھا اور کمرے سے جانے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' شائستہ بیگم نے چیختے ہوئے کہا۔

''تم سوال کرنے کے حق سے محروم ہو چکی ہو۔'' علاء الدین جاتے جاتے رُک گیا۔

''مگر میرا ایک اختیار باقی ہے۔'' شائستہ بیگم نے اپنے چہرے سے بیوی کا خول نوچ پھینکا تھا اور اب وہ ایک جابر ملکہ کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔ ''تمہیں امیر توزک کے عہدے سے محروم بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''تمہیں اپنا یہ اختیار بہت پہلے استعمال کر لینا چاہیئے تھا۔'' علاء الدین تحقیر آمیز انداز میں ہنسا۔ ''بہر حال ابھی وقت ہے..... اپنا یہ شوق بھی پورا کر کے دیکھ لو۔ اگر مجھے معزول کر دیا گیا، تب بھی میں تمہارے پاس سفارش کے لیے نہیں آؤں گا۔'' یہ کہہ کر علاء الدین مڑا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل کر چلا گیا۔

اب شائستہ بیگم کو یقین آ گیا تھا کہ علاء الدین اُس کے حریمِ ناز سے بہت دُور جا چکا ہے۔ پھر اُس نے دل ہی دل میں قسم کھائی کہ وہ ماہِ رُو کے جذباتی سائبان کو جلا کر راکھ کر دے گی...... اور اپنے بے وفا شوہر کو محرومیوں کی آگ میں جلنے کے لیے تنہا چھوڑ دے گی۔

❀---❀---❀

پھر ایک روشن رات میں شائستہ بیگم نے اپنی کنیزِ خاص، دل آراء کو بھیج کر اس بات کی تصدیق کر ڈالی کہ علاء الدین اور ماہِ رُو باغ میں موجود ہیں...... اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر ایک دوسرے کی محبت میں کھوئے ہوئے ہیں۔

شائستہ بیگم نے اپنا سب سے قیمتی لباس پہنا۔ یہ لباس اُس کی ماں تاجدار بیگم کے لباس سے مشابہ تھا۔ سلطان جلال الدین خلجی نے اپنی بیوی کو ''ملکۂ جہاں'' کا خطاب دیا تھا۔ خلجی خاندان میں یہ رسم تھی کہ وہ

لوگ اپنی سب سے محبوب بیوی کو ''ملکۂ جہاں'' کے خطاب سے نوازتے تھے۔ شائستہ بیگم نے بھی آج ایک ملکہ ہی کی طرح لباس زیب تن کیا تھا تاکہ وہ ماہِ رُو کے سامنے اپنی ذاتی حیثیت کی بھرپور نمائش کر سکے۔

پھر شائستہ بیگم نے اپنی تمام کنیزوں کو طلب کیا۔ کنیزوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جب یہ خوبصورت عورتیں شائستہ بیگم کے محل نما مکان میں جمع ہوئیں تو ایسا لگتا تھا جیسے شائستہ بیگم نے اپنی نسوانی فوج کا ایک دستہ طلب کیا ہے۔

شائستہ بیگم شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ باغ کے دروازے تک پہنچی۔ وہاں علاء الدین کی کنیزِ خاص رُباب ایک پہرے دار کی حیثیت سے موجود تھی۔ رباب نے شائستہ بیگم کو دیکھا تو اُس کے ہوش اُڑ گئے۔

''شہزادیٔ عالیہ! خدا کے لیے آپ اندر نہ جائیں۔'' رباب نے دونوں ہاتھ اس طرح جوڑ دیئے جیسے وہ اپنی زندگی کے لیے شائستہ بیگم سے رحم کی بھیک مانگ رہی ہو۔

''کیوں......؟'' شائستہ بیگم نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔ ''باغ کے اندر کیا ہو رہا ہے جو تُو مجھے اُس سے دُور رکھنا چاہتی ہے؟''

''وہاں جا کر آپ کو مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا شہزادیٔ عالیہ!'' رباب نے گھبرا کر شائستہ بیگم کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

شائستہ بیگم نے رباب کے سر پر ایک ٹھوکر لگائی۔ ''تجھ سے تو بعد میں پوچھوں گی۔ جس کا دیا کھاتی ہے، اُسی کی بیٹی سے نمک حرامی کرتی ہے۔''

رباب کے دائیں رخسار اور ماتھے پر ہلکا ہلکا خون اُبھر آیا تھا۔ مگر وہ اپنی چوٹ کا احساس بھول کر اس خوفناک لمحے کا انتظار کر رہی تھی، جس کے آتے ہی قصرِ شاہی کا سکون درہم برہم ہو جائے گا۔

شائستہ بیگم نے اپنی کنیزوں کو اشارہ کیا اور تیزی کے ساتھ باغ کے اندر داخل ہو گئی۔ اُس کی بے چین نظریں اپنے بے وفا شوہر علاء الدین اور الغ خان کی بہن ماہِ رُو کو تلاش کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد شائستہ بیگم کی مضطرب نگاہیں درختوں کے ایک کنج پر جم گئیں جہاں سے کافوری شمعوں کی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

''تم یہیں ٹھہرو۔ جب تماشا شروع ہو جائے تو میرے قریب آ جانا۔'' اپنی کنیزوں کے لیے فرمان جاری کر کے، شائستہ بیگم دبے قدموں آگے بڑھی۔ درختوں کا کنج اس انداز کا تھا کہ باہر سے آنے والے شخص کو اندر کی کوئی چیز اس وقت تک نظر نہیں آ سکتی تھی جب تک کہ وہ قریب جا کر پتوں کی آڑ سے جھانکنے کی کوشش نہ کرے۔ شائستہ بیگم بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہی تھی۔

آخر وہ مغرور عورت اس مقام تک پہنچ گئی، جہاں اُس کا شوہر ایک کنیز کی زلفوں کے سائے میں سکون تلاش کر رہا تھا......اور ماہِ رُو بڑے ناز و ادا کے ساتھ علاء الدین خلجی پر اپنی محبتیں لُٹا رہی تھی۔

''ماہِ رُو! وہ دن زیادہ دُور نہیں، جب تم ہندوستان کے ایک ایک گوشے پر حکومت کرو گی۔'' علاء الدین

انتہائی پُر خمار لہجے میں بول رہا تھا۔ ''میرا وعدہ اسی طرح اٹل ہے جیسے اس وقت چاندنی کا وجود۔''
شائستہ بیگم کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اُس نے اپنی جوتی اُتاری اور انتہائی غضب ناک حالت میں ماہِ رُو کی طرف بڑھی۔ علاء الدین اور الغ خان کی بہن مستقبل کے خوابوں میں اس طرح گم تھے کہ اُنہیں شائستہ بیگم کی آمد کا احساس تک نہیں ہوا۔
پھر دو محبت کرنے والوں کا انہماک اس وقت زائل ہوا، جب شائستہ بیگم ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ ''پست خاندان کی ذلیل لڑکی! تُو اس عورت کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے گی، جس کی ایک جنبشِ نظر تجھے اور تیرے خاندان کو خاک میں ملا سکتی ہے؟'' یہ کہہ کر شائستہ بیگم نے ماہِ رُو کو اپنی جوتی سے پیٹنا شروع کر دیا۔
یہ صورتِ حال اس قدر تیزی سے پیش آئی تھی کہ علاء الدین اور ماہِ رُو حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ اُن کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ آنے والا کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟...... پھر جب دونوں کی آنکھوں کے سامنے حیرت و استعجاب کا غبار چھٹا تو معلوم ہوا کہ وہ شائستہ بیگم ہے جس نے ان کی خلوت پر شب خون مارا ہے۔ اتنی دیر میں ماہِ رُو کے سر اور چہرے پر کئی جوتیاں پڑ چکی تھیں۔ وہ اپنے دفاع میں شائستہ بیگم پر حملہ آور بھی ہو سکتی تھی یا کم سے کم اُس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ کو پکڑ سکتی تھی......لیکن ماہِ رُو کچھ بھی نہ کر سکی۔ غلامانہ حیثیت نے اُسے بالکل بے دست و پا بنا دیا تھا۔ وہ بار بار علاء الدین کی طرف دیکھ کر فریاد کے لہجے میں کہہ رہی تھی۔
''شہنشاہ! آپ دیکھ رہے ہیں؟''
واقعہ انتہائی نازک تھا......اور وقت بہت سنگین......مگر علاء الدین خلجی نے بے پناہ جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اس سے اپنی شریکِ حیات کی یہ ذلت برداشت نہ ہو سکی۔
''بس شائستہ بیگم!......بہت ہو چکا۔'' علاء الدین خلجی نے نہایت تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ ''ماہِ رُو میری بیوی ہے۔ تمہیں اس سے اپنے ذلت آمیز طرزِ عمل کی معافی مانگنی ہوگی۔''
''بیوی......؟'' حیرت کی شدت سے شائستہ بیگم کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''تُو نے پیروں کی جوتی کو سر پر سجا لیا۔ ایک لونڈی اور تیری شریکِ سفر؟'' اس انکشاف نے شائستہ بیگم کو پاگل بنا دیا تھا اور وہ شوہر کو بھی ایک غلام کی طرح مخاطب کر رہی تھی۔
علاء الدین اپنی اور ماہِ رُو کی یہ ذلت برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے شائستہ بیگم کا اُٹھا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔ شائستہ بیگم پر دیوانگی طاری تھی۔ اُس نے شوہر کے ہاتھ کو جھٹک کر دوبارہ ماہِ رُو کو مارنا چاہا۔ نتیجتاً علاء الدین پر بھی وحشت طاری ہو گئی۔ پھر اُس نے شائستہ بیگم کو اس قدر پیٹا کہ وہ لہولہان ہو گئی۔ پورے باغ میں جلال الدین خلجی کی بیٹی کی چیخیں گونج رہی تھیں جنہیں سن کر کنیزوں پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ شائستہ بیگم اپنی خدمت گزار عورتوں کو باغ میں اس لیے لائی تھی کہ وہ اُنہیں علاء الدین اور ماہِ رُو کا تماشا دکھا سکے......مگر وقت نے اس کے ساتھ ایسی چال چلی کہ وہ خود تماشا بن کر رہ گئی۔

شائستہ بیگم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ علاء الدین اس قدر سرکشی پر اُتر آئے گا۔ آخر اسی زخمی حالت میں شائستہ بیگم کو اپنی کنیزوں کے ہمراہ باغ سے فرار ہونا پڑا۔ اس جھگڑے کے دوران ایک نازک لمحہ وہ بھی آ گیا تھا جب علاء الدین نے اپنی تلوار کھینچ لی تھی...... اور ماہِ رُو نے پوری طاقت سے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''کیا کرتے ہیں شہنشاہ؟ غضب ہو جائے گا۔'' ماہِ رُو، علاء الدین کے آگے گڑگڑا رہی تھی۔

''میں اس قصے کو پاک ہی کیے دیتا ہوں۔'' علاء الدین کے ہونٹوں سے آگ برس رہی تھی۔ ''اس سے زیادہ اور کیا ہو گا، ماہِ رُو! جواب میں مجھے بھی قتل کر دیا جائے گا۔ اس لعنت زدہ زندگی سے تو موت بہتر ہے۔''

ماہِ رُو نے کسی کنیز کی طرح علاء الدین کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''شہنشاہ! آپ کو اپنے جاہ و جلال کی قسم! اس مشکل گھڑی کو گزر جانے دیجیے۔ آپ کو اپنی زندگی کی قیمت کا اندازہ نہیں۔ آپ ہندوستان کی تقدیر ہیں۔'' الغرض اسی انداز کی خوشامدانہ باتوں نے علاء الدین کے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا...... اور اُس نے اپنی شمشیرِ آب دار دوبارہ نیام میں رکھ لی۔

پھر جب یہ نفرت و قہر کا طوفان گزر گیا اور شائستہ بیگم باغ سے چلی گئی تو ماہِ رُو نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ''اب کیا ہو گا شہنشاہ؟ ہماری خلوتوں کا راز دربارِ شاہی تک چلا جائے گا۔''

''اب میں کسی سے نہیں ڈرتا۔'' علاء الدین کے چہرے پر خوف و ہراس کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا۔ ''میں نہیں جانتا کہ حالات کیا رُخ اختیار کریں گے؟ مگر مجھے تمہاری جدائی منظور نہیں۔ میرے نا آسودہ اور مضطرب جذبوں نے تمہارے ریشمی آنچل کے سائے میں قرار پایا ہے، تم نے میرے عشقِ شوریدہ کی پکار سنی ہے، اس لیے میں کسی بھی صورت میں تم سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔''

علاء الدین کے دعووں کے باوجود ماہِ رُو سہمی ہوئی تھی..... اُسے ایک بار پھر اپنا مستقبل تاریک ہوتا نظر آ رہا تھا۔

❁---❁---❁

تاجدار بیگم آتش فشاں بنی بیٹی کے کمرے میں ٹہل رہی تھی...... اور کنیزیں شائستہ بیگم کے زخموں پر مرہم لگا رہی تھیں۔

''مادرِ گرامی! اُس نے مجھ پر تلوار بھی کھینچی تھی۔'' شائستہ بیگم رو رو کر اپنی رُودادِ غم سنا رہی تھی۔ ''علاء الدین نے میرے ہوتے ہوئے دوسری شادی کی اور پھر اُس نے اُس غلام زادی کے سامنے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ اس قدر بے رحمی سے زدوکوب کیا کہ کوئی شریف النفس انسان اپنے جانوروں کے ساتھ بھی یہ سلوک روا نہیں رکھے گا۔''

''اُسے اُس کے ہر گناہ کی سزا ملے گی جانِ مادر!'' تاجدار بیگم نے بیٹی کے زخمی ماتھے کو بوسہ دیتے

ہوئے کہا۔ ''اب میں کسی سے کیا گلہ کروں؟ یہ سب تمہارے بابا محترم کی مہربانیاں ہیں جن کی سزا تم بھگت رہی ہو۔''

پھر دوسرے دن جب دربار برخاست ہونے کے بعد سلطان جلال الدین اپنی خواب گاہ میں پہنچا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ملکۂ جہاں (تاجدار بیگم) اپنی بیٹی کے ساتھ موجود تھی۔ والئ ہندوستان نے بڑی حیرت سے شائستہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹی! تمہارے چہرے پر یہ زخم کیسے ہیں؟...... کیا تم گر گئی تھیں؟'' مشفق و مہربان باپ، بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر بے قرار نظر آنے لگا۔

''شائستہ گری نہیں، اسے گرایا گیا ہے۔'' تاجدار بیگم غضب ناک نظر آ رہی تھی۔

سلطان جلال الدین نے استفہامیہ نظروں سے ملکۂ جہاں کی طرف دیکھا۔

''شائستہ کے چہرے پر نظر آنے والے زخم، تمہارے محبوب بھتیجے علاء الدین کے تشدد کا نتیجہ ہیں۔'' تاجدار بیگم کے غصے میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

سلطان جلال الدین خلجی کے چہرے پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔ ''یہ شرفاء کے طریقے تو نہیں ہوتے۔'' پھر فرمانروائے ہند، بیٹی سے اس واقعے کی تفصیل پوچھنے لگا۔

شائستہ بیگم نے اپنی نازیبا حرکات پر پردہ ڈالتے ہوئے علاء الدین خلجی اور ماہِ رُو کی شادی کی داستان سنا ڈالی۔

جلال الدین خلجی کے چہرے پر اُبھرنے والی ناگواری کا رنگ مزید گہرا ہو گیا۔ ابھی وہ اس پیچیدہ مسئلے کے حل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ تاجدار بیگم چیخ اُٹھی۔

''علاء الدین کو اسی وقت اس کے عہدے سے معزول کر دو...... اس پر دباؤ ڈالو کہ وہ ماہِ رُو کو طلاق دیدے...... اور پھر ان سب کنیزوں کے سامنے شائستہ بیگم سے معافی مانگے جن کی موجودگی میں اس جانور نے میری پھول جیسی بیٹی کو بے رحمی کے ساتھ پیٹا تھا۔''

تاجدار بیگم نے ایک ہی زبان میں تین مطالبات پیش کر دیئے تھے۔

سلطان جلال الدین خلجی نے فی الوقت اس بات کو ٹالنا چاہا مگر تاجدار بیگم کسی سرکش اور ضدی بچے کی طرح مچل گئی۔ ''مجھے ابھی چاہیے فرمانِ شاہی۔''

فرمانروائے ہند نے ایک اچٹتی نظر بیوی کے چہرے پر ڈالی جو غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر وہ بیٹی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اگر عورت چاہے تو اپنی ازدواجی زندگی کو پُرسکون بنا سکتی ہے۔''

''بابا محترم! آپ کی بے جا محبت نے علاء الدین میں سرکشی پیدا کر دی ہے۔ آپ اس کے سر سے اپنا دستِ کرم کھینچ کر تو دیکھئے۔ پھر اُسے پتہ چل جائے گا کہ وہ کون ہے اور کہاں کھڑا ہے۔'' شائستہ بیگم کو سخت اور اونچے لہجے میں بولنے کی عادت تھی۔ اس لیے وہ باپ کے سامنے بھی اسی انداز سے گفتگو کر رہی تھی۔

''میں تمہاری بات پر غور کروں گا۔'' سلطان جلال الدین خلجی نے سرسری لہجے میں کہا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس واقعے میں ذاتی طور پر ملوث ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔'' بہت سے انتظامی امور میری توجہ کے منتظر ہیں۔''

ملکۂ جہاں اور شائستہ بیگم، سلطان کا اشارہ سمجھ گئی تھیں۔ مجبوراً کھڑی ہو گئیں...... مگر تاجدار بیگم نے جاتے جاتے بھی شوہر کو تنبیہہ کر دی۔''میں اس معاملے میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ اگر آپ نے علاء الدین کے جرائم کی معقول سزا تجویز نہیں کی تو پھر میں خود کوئی قدم اُٹھاؤں گی..... اور پھر آپ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائیں گے۔''

❁---❁---❁

جلال الدین خلجی کو بیٹی کے چہرے پر زخموں کے نشانات دیکھ کر دلی تکلیف ضرور پہنچی تھی۔ مگر وہ شائستہ بیگم کی سخت مزاجی سے بھی واقف تھا۔ اس لیے اس معاملے میں مداخلت سے گریز کر رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ جلال الدین کی چھوٹی بیٹی، علاء الدین کے چھوٹے بھائی الماس بیگ سے بیاہی گئی تھی۔ سلطان نہیں چاہتا تھا کہ اس کی مداخلت سے دونوں بیٹیوں کی گھریلو زندگی متاثر ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ چار چار شادیاں کرنا شہزادوں اور امیرزادوں کا مزاج بن چکا تھا۔ پھر کس طرح علاء الدین پر دباؤ ڈالتا کہ وہ ماہِ رُو کو طلاق دیدے۔ آخر ماہِ رُو بھی ایک بڑے فوجی سردار کی بہن تھی۔ طلاق کی صورت میں الغ خان کے دل میں بھی غبار آ جاتا...... اور پھر یہ غبار سیاسی انتشار کی صورت میں نمودار ہوتا۔

جلال الدین خلجی کسی قسم کے انتشار کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ عمر کی اس منزل سے گزر رہا تھا جہاں انسان کی قوتِ فیصلہ جواب دے جاتی ہے۔ جلال الدین کا بھی یہی حال تھا۔ بظاہر پورے ہندوستان پر اس کی حکمرانی تھی مگر درپردہ وہ ایک کمزور فرماں روا تھا۔ اُس میں سلطان غیاث الدین بلبن جیسا جلال و جبروت نہیں تھا کہ لوگ اس کے تصور ہی سے سہمے رہتے۔ ترک امراء مسلسل اس کے خلاف سازشیں کر رہے تھے مگر وہ ان سازشوں کا قلع قمع کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ مزید یہ کہ اسے اپنے دوستوں کی بھی پہچان نہیں رہی تھی۔ نتیجتاً وہ شدید ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔ داماد اور بیٹی کے جھگڑوں نے اسے مزید اُلجھا کر رکھ دیا تھا۔ اب گھریلو اُلجھنوں کے گرداب سے نکلنے کی ایک ہی صورت تھی کہ سلطان اس معاملے میں لاتعلقی اختیار کر لے۔ سو جلال الدین خلجی نے بیوی اور بیٹی کی باتوں کو اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

❁---❁---❁

شوہر کا اندازِ بے نیازی دیکھ کر تاجدار بیگم اور بھی غضب ناک ہو گئی۔ اس نے شائستہ بیگم کو تسلیاں دیتے ہوئے کہا۔

''اگر باپ، بیٹی کی خوشیوں سے بے خبر ہو گیا تو کیا غم ہے؟ ابھی تیری ماں تو زندہ ہے۔ وہ تیرے

خوابوں کو بچانے کے لیے قصرِ شاہی کے در و دیوار ہلا دے گی۔ میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گی، جب تک علاء الدین کو اس کے ماضی میں لے جا کر کھڑا نہ کر دوں۔ اگر وہ باعزت طور پر زندہ رہنا چاہتا ہے تو اُسے ماہِ رُو کو طلاق دے کر تیری غلامی قبول کرنی ہو گی۔''

شائستہ بیگم خود بھی علاء الدین اور ماہِ رُو سے اپنی توہین کا انتقام لینے کے لیے انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ ماں کی باتیں سن کر رونے لگی۔

''مادرِ گرامی! چہرے کے زخم میری رُوح میں اُتر آئے ہیں۔ جن کی سوزش اور خلش مجھے سونے نہیں دیتی۔''

تاجدار بیگم نے بیٹی کو اپنے نئے لائحۂ عمل کے مطابق مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''علاء الدین کو اپنی بارگاہ میں حاضری کا پابند کرو۔''

''وہ میری کب سنتا ہے مادرِ گرامی!'' شائستہ بیگم کے آنسوؤں میں کچھ اور روانی آ گئی تھی۔ ''میں ہزار بار اس پر یہ پابندی عائد کر چکی ہوں مگر اس نے ایک بار مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔''

''اب وہ تمہارے پاس آئے گا اور سر کے بل آئے گا۔'' تاجدار بیگم نے نہایت تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

پھر ملکۂ جہاں نے ایک اور عجیب چال چلی۔ اس نے شاہی محرر سے ایک حکم نامہ تحریر کرایا جس کا مضمون حسبِ ذیل تھا۔

''امیر توزک، علاء الدین خلجی کو تنبیہہ کی جاتی ہے کہ وہ شائستہ بیگم سے اپنے جارحانہ روّیے کی معافی مانگے۔ اس کے حقوق کا خیال رکھے۔ اور اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے مسلسل کوشش کرے۔''

تاجدار بیگم نے حکم نامے کے آخر میں تحریر کرایا تھا۔ ''علاء الدین کو نہایت سختی کے ساتھ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بیوی، شہزادی شائستہ بیگم کی خدمت میں پابندی سے حاضر ہو کر اس کی دلجوئی کیا کرے تاکہ یہ فاصلے قربتوں میں تبدیل ہو جائیں۔''

حکم نامہ تحریر کرانے کے بعد تاجدار بیگم نے شاہی محرر سے کہا کہ اس پر مہرِ سلطانی ثبت کر دی جائے۔

شاہی محرر نے کسی تکلف اور جھجک کے بغیر جواب دیا۔ ''ملکۂ جہاں خوب جانتی ہیں کہ حکم نامہ تحریری شکل میں آنے کے بعد سلطانِ معظم کے ملاحظے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ پھر سلطانِ ذی حشم اپنے دستِ مبارک سے مہر ثبت فرماتے ہیں۔''

''میں کون ہوں؟'' تاجدار بیگم نے سخت لہجے میں کہا۔

''آپ ملکۂ جہاں ہیں۔'' شاہی محرر، تاجدار بیگم کے طرزِ تخاطب پر حیران نظر آ رہا تھا۔

''مجھ میں اور سلطانِ معظم میں کوئی فرق نہیں۔'' تاجدار بیگم کے چہرے اور لہجے سے شاہانہ جاہ و جلال نمایاں تھا۔ ''میں نے حکم نامہ ملاحظہ کر لیا۔''

شاہی محرر نے کانپتے ہاتھوں سے حکم نامے پر مہرِ سلطانی ثبت کر دی۔

''ملکۂ جہاں! اس غلام کی زندگی کا سوال ہے۔'' مہر ثبت کرنے کے بعد شاہی محرر نے لرزتی ہوئی

آواز میں کہا۔ اس کے اعصاب پر ایک نامعلوم خوف طاری تھا۔

''ہم تمہاری زندگی کی ضمانت دیتے ہیں۔'' ملکۂ جہاں نے بڑی رعونت کے ساتھ کہا جیسے وہ انسانوں کی زندگی اور موت پر قادر ہو۔

❁---❁---❁

علاء الدین خلجی، ماہِ رُو کے جلووں میں گم تھا کہ اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے؟'' علاء الدین نے چیخ کر کہا۔ اُسے سرشاری کے لمحات میں کسی کی مداخلت ناگوار گزری تھی۔

''میں شہزادئ عالیہ کی کنیز، دل آراء ہوں۔'' کمرے کے باہر سے ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز اُبھری۔

''کیوں آئی ہو؟'' علاء الدین نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''اپنی شہزادئ عالیہ سے کہہ دو کہ ہم یہاں موجود نہیں ہیں۔''

''میں حکمِ سلطانی لے کر حاضر ہوئی ہوں۔'' کنیز دل آراء کی آواز سے ہلکا ہلکا خوف جھلک رہا تھا۔

حکمِ سلطانی کی بات سن کر علاء الدین سنبھل گیا۔ ''اندر آ جاؤ۔'' خلجی سردار نے نرم اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

کنیز دل آراء ڈری ڈری علاء الدین کی خلوت میں داخل ہوئی۔ اس وقت امیر توزک ساغر و صراحی سے دل بہلا رہا تھا...... اور اس کی محبوب بیوی ساقی گری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

کنیز دل آراء نے حکمِ سلطانی، علاء الدین کے سپرد کیا اور اُلٹے قدموں واپس چلی گئی۔

علاء الدین فکر و پریشانی کے عالم میں حکم نامہ پڑھنے لگا۔ اس دوران میں ماہِ رُو کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ''حکم نامے میں کیا لکھا ہے شہنشاہ؟...... مجھے تو بتایئے۔''

علاء الدین نے حکم نامے کی آخری سطریں پڑھ کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''خود ہی پڑھ لو کہ اس میں کیا لکھا ہے؟'' علاء الدین نے حکم نامہ، ماہِ رُو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ماہِ رُو نے شدید گھبراہٹ کے عالم میں حکمِ سلطانی پڑھا اور پھر اُس کا خوبصورت چہرہ دھواں دھواں نظر آنے لگا۔ ''اب کیا ہوگا شہنشاہ؟''

''ایسے ہزار حکم نامے بھی مجھے اُس مغرور عورت کے قریب نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے باپ کی طاقت کے سہارے میرے جسم کو پابند کر سکتی ہے...... مگر دل و دماغ اُس کی قید سے ہمیشہ آزاد رہیں گے۔ محبت تو دل سے کی جاتی ہے ماہِ رُو!..... اور میرے دل پر تمہاری ہی حکمرانی ہے۔'' یہ کہہ کر علاء الدین، ماہِ رُو کی زلفوں سے کھیلنے لگا...... جو اس وقت کسی زہریلی ناگن کی تصویر پیش کر رہی تھیں۔

❁---❁---❁

علاء الدین وقت گزاری کے لیے شائستہ بیگم کے شبستان میں چلا جاتا...... مگر دونوں کے راستے الگ الگ تھے۔ شائستہ بیگم اپنے اقتدار کی طاقت کے ذریعے شوہر کو غلام بنانا چاہتی تھی...... مگر علاء الدین یہ

زنجیر پہننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ کسی مسافر کی طرح سرائے میں اپنی رات گزارتا...... اور صبح ہوتے ہی درباری ذمے داریوں میں مصروف ہو جاتا۔ دربار برخاست ہونے کے بعد وہ اپنی دوسری بیوی، ماہِ رُو کے پاس پہنچتا۔ دل کی باتیں کرتا، شراب پیتا اور پھر ایک اجنبی کی طرح شائستہ بیگم کے محل میں چلا جاتا۔ شائستہ بیگم بگڑے ہوئے تعلقات کو سنوارنے اور شوہر کی دلجوئی کرنے کے بجائے اس بات سے ہی خوش ہو جاتی کہ اس نے علاء الدین اور ماہِ رُو کو جدا کر دیا ہے...... اور یہ اس کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

ملکۂ جہاں تاجدار بیگم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ دن رات شوہر کے کان بھرتی رہتی تھی۔

''علاء الدین ایک آزاد مملکت کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اگر آپ نے اُس کے اختیارات کم نہیں کیے تو صورتِ حال پریشان کُن بھی ہو سکتی ہے۔'' تاجدار بیگم ایک نہایت شاطر اور ذہین عورت تھی۔ اس نے اپنے داماد علاء الدین کی سرکشی کا بغور جائزہ لیا تھا...... اور پھر اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ یہی سرکشی بڑھتے بڑھتے بغاوت کا رنگ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ تاجدار بیگم نے ان ہی اندیشوں کے پیشِ نظر شوہر کو مشورہ دیا تھا کہ وہ علاء الدین کے اختیارات محدود کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھے۔

سلطان جلال الدین خلجی نے تاجدار بیگم کی باتوں کو نہایت بے پروائی سے سنا۔ وہ ان سارے واقعات کو بیوی، شوہر اور ساس کے گھریلو جھگڑوں کے تناظر میں دیکھ رہا تھا۔ آخر سلطان نے روزانہ کی تلخیوں سے نجات پانے کے لیے علاء الدین کو دہلی سے دُور کڑہ (مانک پور) کی جاگیر پر بھیج دیا۔

جب علاء الدین نے یہ خبر سنی تو اس نے ماہِ رُو کے سامنے اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''آخر مجھے دو منحوس عورتوں کے سائے سے نجات مل ہی گئی۔''

پھر وہ ماہِ رُو کو ساتھ لے کر کڑہ (مانک پور) چلا گیا۔

تاجدار بیگم کے سارے منصوبے ناکام ہو گئے۔ ''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا سلطانِ معظم!'' ملکۂ جہاں کے چہرے پر شدید ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔ ''آپ نے علاء الدین کو پابند کرنے کے بجائے نئی آزادیاں بخش دیں۔ اب وہ قفس سے چھوٹا ہوا ایک پرندہ ہے۔ اتنا اونچا اُڑے گا کہ آپ دیکھتے رہ جائیں گے۔''

ملکۂ جہاں، علاء الدین کی باغیانہ فطرت کی ترجمانی کر رہی تھی...... مگر سلطان جلال الدین خلجی امورِ سلطنت میں عورتوں کی مداخلت پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لیے فرمانروائے ہندوستان نے بیگم کو جھڑک دیا۔

''آپ کو کیا معلوم کہ حکومتوں کے انتظامی امور کیا ہوتے ہیں؟'' سلطان جلال الدین خلجی کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔ ''آپ اپنے مشوروں کو محفوظ رکھیں...... اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔''

تاجدار بیگم اپنا سا منہ لے کر رہ گئی...... اور سلطان جلال الدین خلجی، سیاسی ہنگاموں میں اُلجھتا ہی چلا گیا۔

❀---❀---❀

کڑہ پہنچ کر ماہِ رُو بہت خوش تھی...... مگر علاء الدین ہمہ وقت کسی گہرے خیال میں کھویا رہتا تھا۔ ماہِ رُو نئے نئے انداز سے اُس کی دلداری کرتی لیکن وہ اپنی محبوب بیوی سے دُور رہنے کی کوشش کرتا۔

''شہنشاہ! کہیں میری نظریں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہیں؟'' ماہِ رُو محبوبانہ انداز کے ساتھ شوہر سے شکایت کرتی۔ ''آزاد فضا میں آتے ہی آپ بدلے بدلے نظر آ رہے ہیں۔ اس سے تو دہلی کی قید بہتر تھی کہ آپ میرے قریب تھے۔''

''مجھے پریشان نہ کرو ماہِ رُو!..... میں برسوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔'' علاء الدین بیزاری سے جواب دیتا۔

''آپ مجھے اس خواب میں شریک کیوں نہیں کرتے؟'' ماہِ رُو دلبرانہ لہجے میں کہتی۔

''میں اپنے خواب میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔'' یہ کہتے کہتے علاء الدین کی آواز سے سختی کا اظہار ہونے لگتا۔ کئی ماہ تک اُس کی یہی کیفیت رہی۔ وہ شراب بھی پیتا تو بڑی بے دلی کے ساتھ پیتا۔

کڑہ میں رہ کر علاء الدین نے ایک عجیب کام یہ کیا کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے معتوب امراء جو تلاشِ معاش میں دربدر مارے مارے پھرتے تھے، اُنہیں خلجی سردار نے اپنی ملازمت میں داخل کر لیا۔ اس طرح ہزاروں تجربہ کار سپاہی علاء الدین کی فوج میں شامل ہو گئے۔

❁---❁---❁

پھر ایک دن علاء الدین سات ہزار کا لشکر لے کر کڑہ سے چندیری پہنچا اور اس علاقے کو جی بھر کے لوٹا۔ مقامی لوگوں نے فاتح سردار کو بتایا کہ راجہ دیوگڑھ کے پاس اس قدر دولت ہے کہ سیم و زر کا اتنا بڑا ذخیرہ آج تک ہندوستان کے کسی بادشاہ یا راجہ نے نہیں دیکھا۔

علاء الدین، ایلچپور کے راستے سے آگے بڑھا۔ پھر دو دن کے لیے ایک مقام پر ٹھہرا اور دیوگڑھ (دکن) پہنچ گیا۔ یہاں کا راجہ، رام دیو اپنے بیٹے سنگل دیو کے ساتھ دیوگڑھ سے باہر گیا ہوا تھا۔ علاء الدین نے ایک مختصر سی جنگ کے بعد دیوگڑھ پر قبضہ کر لیا۔

پھر رام دیو اور سنگل دیو اپنے لشکروں کے ساتھ دوبارہ دیوگڑھ پر حملہ آور ہوئے۔ ہندو فوج کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس سے پہلے کہ مسلمانوں کو شکست ہو جاتی، اچانک سپہ سالار نصرت خان ایک ہزار تازہ دم سپاہیوں کے ساتھ آ پہنچا۔ رام دیو سمجھا کہ مسلمانوں کے ایک اور بڑے لشکر نے اس کی فوجوں کو محاصرے میں لے لیا ہے۔ نتیجتاً ہندو سپاہی خوف زدہ ہو کر میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے اور راجہ رام دیو نے علاء الدین کی شرائط پر مسلمانوں سے صلح کر لی۔

پھر جب محاصرے کے پچیس روز بعد علاء الدین، دیوگڑھ سے کڑہ (مانک پور) روانہ ہوا تو اس کے ساتھ اتنے جواہرات، مال و اسباب، ہاتھی اور گھوڑے تھے کہ آج تک دہلی کے کسی بادشاہ نے اتنی دولت نہیں دیکھی تھی۔

کڑہ پہنچ کر علاء الدین نے ہیروں کا سب سے قیمتی ہار اپنی محبوب بیوی ماہِ رُو کو پہنایا۔ دہلی سے آنے کے بعد پہلی بار علاء الدین نے اسی پرجوش محبت کا مظاہرہ کیا، جس کا تصور ابتدائے عشق میں ماہِ رُو کو

سرشار کر دیا کرتا تھا۔

''شہنشاہ اب تو کوئی ایسا خواب نہیں دیکھ رہے جو آپ کو مجھ سے دُور کر دے؟'' ہیروں کا ہار پہن کر ماہِ رُو کچھ مغرور سی نظر آ رہی تھی۔

''شہنشاہوں کے خوابوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ مقبروں میں دفن ہو جاتے ہیں۔'' علاء الدین نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا اور ماہِ رُو سے جامِ سرخ طلب کرنے لگا۔

❁---❁---❁

اس وقت سلطان جلال الدین خلجی گوالیار کے مقام پر سیر و شکار میں مصروف تھا۔ اسی دوران اُسے علاء الدین کے دیوگڑھ پر حملے اور غیر معمولی مالِ غنیمت حاصل کرنے کی خبریں موصول ہوئیں۔ پریشان کُن بات یہ تھی کہ علاء الدین نے سلطان کی اجازت کے بغیر دیوگڑھ پر فوج کشی کی تھی اور پھر فتح حاصل کرنے کے بعد دارالحکومت کو اس کامیابی کی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ بھتیجے کے اس طرزِ عمل سے جلال الدین خلجی پریشان نظر آنے لگا۔ اُس نے اپنے امراء سے طویل مشورے کیے۔ امراء نے اشاروں میں سمجھایا کہ بغاوت کے آثار پیدا ہو چکے ہیں اس لیے بڑی ہوشیاری سے علاء الدین کو دہلی طلب کیا جائے۔ اگر وہ کسی حیل و حجت کے بغیر مالِ غنیمت لے کر دارالحکومت پہنچ جاتا ہے تو اس کی وفاداری پر یقین کر لیا جائے......ورنہ اس کی حرکات وسکنات پر گہری نظر رکھی جائے۔

جلال الدین خلجی کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ مخلصین کے مشورے اُسے مطمئن نہ کر سکے اور وہ ذہنی انتشار کے ساتھ دہلی چلا گیا۔

ابھی وہ دارالحکومت پہنچا ہی تھا کہ کڑہ سے علاء الدین نے فرمانروائے ہند کے نام ایک خط تحریر کیا جس کے ہر لفظ سے انتہائی عاجزی و وفاداری کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں ایک مدتِ دراز سے حضور کے قدموں سے دُور رہا ہوں......اور راستے بند ہونے کی وجہ سے مراسلت کا سلسلہ بھی منقطع رہا ہے.....اس لیے میں اور میرے ساتھی، عزت مآب کے عتاب سے بہت خوفزدہ ہیں۔ اگر سرکار اپنے قلمِ خاص سے میرے نام ایک محبت بھرا فرمان تحریر کر دیں تو میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھوں گا.....اور کسی تاخیر کے بغیر تمام مالِ غنیمت لے کر بارگاہِ عالیہ میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

بھتیجے کا خوشامدانہ خط پڑھ کر سلطان جلال الدین خلجی بہل گیا.....اور پھر اُس نے اُسی روز فرمانِ شاہی تحریر کرایا۔ اس مکتوبِ خاص میں علاء الدین کے بچپن سے لے کر جوانی تک کے وہ سارے واقعات درج کیے گئے تھے جو سلطان جلال الدین خلجی کی بے پناہ محبت کے آئینہ دار تھے۔

فرمانِ شاہی لے کر جانے والے قاصدوں نے کڑہ پہنچ کر صورتِ حال کا جائزہ لیا تو ہر طرف بغاوت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شاہی سفیر فوری طور پر دہلی واپس آنا چاہتے تھے مگر علاء الدین نے ان دونوں پر سخت پہرے بٹھا دیئے۔

اس دوران علاء الدین کا چھوٹا بھائی الماس بیگ جو سلطان کا دوسرا داماد تھا، چچا کے دل میں بڑے بھائی کی محبت کے نقوش گہرے کرتا رہا۔ الماس بیگ بار بار اپنے خسر سے کہتا۔

''علاء الدین سے سلطان کی ناراضی کی خبر بہت مشہور ہوگئی ہے۔ اس لیے مجھے خوف ہے کہ کہیں میرا بھائی ندامت کی وجہ سے خودکشی نہ کر لے۔ سلطانِ معظم کی اجازت کے بغیر علاء الدین کا دیوگڑھ جانا اور وہاں سے کوئی عریضہ ارسال نہ کرنا خود اس کے نزدیک بھی ایک بہت بڑا جرم ہے۔''

الماس بیگ کی چرب زبانی نے سادہ دل بادشاہ کو بہت زیادہ متاثر کیا۔

کچھ دن بعد علاء الدین نے ایک خط چھوٹے بھائی کے نام تحریر کیا۔ ''مجھ پر سلطانِ عالی مقام کے اتنے احسانات ہیں کہ اگر لکھوں تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ وہ میرے چچا ہی نہیں بلکہ باپ بھی ہیں اور میری جان کے مالک بھی۔ سلطانِ معظم کی ناراضی کے سبب زندگی میرے لیے ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ اگر تمہیں یہ بات اچھی معلوم ہوگئی ہو کہ چچا محترم میرے قتل کا فیصلہ کر چکے ہیں تو فوراً مجھے لکھو تا کہ میں زہر کھا کر اس لعنت زدہ زندگی کا خاتمہ کرلوں یا کسی دوسرے ملک جا کر اپنا منہ گنوالوں۔''

الماس بیگ نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ سلطان کو علاء الدین کا خط دکھایا اور ایسی فریب کارانہ گفتگو کی کہ جلال الدین خلجی کو اپنے بھتیجے کے لکھے ہوئے ایک ایک حرف پر اعتبار آ گیا۔

علاء الدین نے اس خط کے ساتھ الماس بیگ کو ایک اور خط بھی ارسال کیا تھا۔

''اگر بادشاہ دولت کے لالچ میں گرفتار ہو کر کسی طرح اس طرف تنہا چلا آئے تو ہمارا کام بن جائے گا۔''

بڑے بھائی کی اس ہدایت کے مطابق الماس بیگ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

''مناسب یہی ہے کہ جلالت مآب اکیلے ہی کڑہ کا سفر اختیار کریں۔ اس سے پہلے کہ میرا بھائی خودکشی کر لے یا کسی دوسرے ملک چلا جائے، آپ وہاں پہنچ کر اُسے تسلی دیں۔ اگر حضور ایسا کریں گے تو ہم جیسے جاں نثاروں کو پہلے سے بھی زیادہ ممنونِ احسان پائیں گے۔''

جلال الدین پر الماس بیگ کی باتوں کا ایسا جادو چڑھا کہ وہ بے اختیار ہو گیا۔

''میرے عزیز بیٹے! تم اسی وقت کڑہ روانہ ہو جاؤ۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے آ رہا ہوں۔ علاء الدین کو میری طرف سے دلاسا دو کہ آج بھی اُس کی محبت میرے دل میں موجزن ہے۔ خبردار! اُسے خودکشی نہ کرنے دینا۔''

❁---❁---❁

الماس بیگ اسی وقت کشتی میں سوار ہو کر کڑہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ سات روز بعد وہ نہایت والہانہ انداز میں علاء الدین سے ملا اور بڑے بھائی کو مبارکباد دیتے ہوئے بولا۔

''ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ تیر نشانے پر بیٹھا۔''

علاء الدین نے سرشاری کے عالم میں اپنے مشیروں سے پوچھا۔ ''میں لکھنوتی (بنگال) چلا جاؤں یا

مجھے کڑہ ہی میں قیام کرنا چاہیے؟'' الماس بیگ کی آمد سے پہلے وہ بنگال جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔
''فی الحال شہزادے کو لکھنوتی جانے کا ارادہ ترک کر دینا چاہیے۔'' سلطنت کے دوسرے نمک حرام جو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے علاء الدین سے آ ملے تھے، ایسے نازک موقع پر ان کی احسان فراموش زبانیں اپنے آقائے نعمت کے خلاف زہر اُگل رہی تھیں۔ ''مال و دولت کے لالچ میں بادشاہ اکیلا ہی یہاں آئے گا۔ پھر طالع آزمائی کے لیے یہی بہترین لمحات ہوں گے۔ سب سے پہلے سلطان کا کام تمام کر دیا جائے۔ پھر جب اس کا بیٹا ارکلی خان تخت نشیں ہو کر ملکی انتظامات کی طرف توجہ کرے تو پھر ہمیں کسی پس و پیش کے بغیر آگے بڑھ کر بنگال پر قبضہ کر لینا چاہیے۔''

❀---❀---❀

سلطان جلال الدین خلجی کے وفادارانِ سلطنت اُسے بار بار سمجھاتے رہے کہ وہ دہلی میں ٹھہر کر حالات کا انتظار کرے...... مگر جلال الدین کے دل و دماغ پر دیوگڑھ (دکن) کی وہ دولت مسلط تھی جو آج تک کسی بادشاہِ دہلی کے خزانے میں جمع نہیں ہوئی تھی۔ سلطان نے ہمدردوں کے مشوروں کو جھٹلا دیا اور پھر پانچ سو سواروں کے ساتھ کشتی کے ذریعے کڑہ کی طرف روانہ ہوا۔ ملک احمد حبیب، سلطان کا سب سے زیادہ ذہین اور معتبر وزیر تھا۔ اس نے کئی بار سلطان کو سمجھایا تھا کہ کڑہ کا سفر اس کے لیے نہایت خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے...... مگر ہوسِ زر نے جلال الدین خلجی کی آنکھوں پر گہرے پردے ڈال دیئے تھے، اس لیے اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ صرف سیم و زر کے سکّوں کی جھنکار سن رہا تھا، باقی آوازوں کی طرف سے اس نے اپنی سماعتیں بند کر لی تھیں۔

پھر جب علاء الدین کو سلطان کی آمد کی خبر ملی تو اس نے اپنی فوج کو حکم دیا۔ ''تمام سپاہی مسلح ہو کر گھوڑوں اور ہاتھیوں کو بھی آراستہ کریں تاکہ سلطانِ معظم کا شایانِ شان استقبال کیا جا سکے۔''

اس کے ساتھ ہی علاء الدین نے اپنے چھوٹے بھائی الماس بیگ کو خصوصی ہدایت دیتے ہوئے کہا۔
''جہاں تک ممکن ہو، سلطان کو اس کے ساتھیوں سے الگ کر کے تنہا کنارے تک لایا جائے۔''

الماس بیگ تیزی سے دریا کی طرف روانہ ہوا اور سلطان کی خدمت میں پہنچ کر زمیں بوس ہو گیا۔ اس وقت تمام کشتیاں کنارے سے دُور دریا کے اندر آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ سلطان نے اپنے چھوٹے بھتیجے اور داماد کو اُٹھا کر گلے سے لگایا۔

''حضور! اگر میں ایک دن کی بھی تاخیر سے کڑہ پہنچتا تو علاء الدین خودکشی کر چکا ہوتا۔ میں نے آپ کی سابقہ کرم نوازیوں کے حوالے دے کر بڑی مشکل سے اسے اس خوف ناک ارادے سے باز رکھا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے دل میں عزت مآب کی دہشت موجود ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ آپ کے خدمت گاروں کو دیکھ کر ملک سے فرار نہ ہو جائے۔''

اپنی بدبختی کے سبب جلال الدین خلجی، الماس بیگ کی باتوں کے طلسم میں کچھ ایسا جکڑ گیا تھا کہ اپنی

جگہ سے جنبش تک نہ کر سکتا تھا۔ اس نے باقی کشتیوں کو دریا کے اندر ہی روک دیا...... اور اپنی کشتی لے کر کنارے کی طرف بڑھا جس میں چند مسلح مصاحب سوار تھے۔

پھر جیسے ہی جلال الدین خلجی کی کشتی کنارے پر پہنچی، الماس بیگ نے ایک اور چال چلی۔

''سلطانِ معظم! آپ اپنے ان مصاحبوں کو بھی غیر مسلح کر دیں۔ اگر انہیں دیکھ کر علاء الدین بدگمان ہو گیا تو وہ آپ کی عنایات سے مایوس بھی ہو سکتا ہے۔''

عربی کی مشہور کہاوت ہے کہ جب موت آتی ہے تو آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ سلطان جلال الدین خلجی کا بھی یہی حال تھا۔ الماس بیگ کی تمام چالیں سیدھی سادی تھیں مگر جلال الدین کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ اُس نے سوچے سمجھے بغیر اپنے مصاحبوں کو ہتھیار الگ کر دینے کا حکم دے دیا۔

تھوڑی دیر بعد علاء الدین اپنے جسم پر ہتھیار سجائے ہوئے نمودار ہوا۔ خلجی سردار کے پیچھے اُس کا لشکر تمام ساز و سامان، ہاتھیوں اور گھوڑوں کے ساتھ موجود تھا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر جلال الدین خلجی کا ایک امیر، ملک خرم رکیک گھبرا گیا۔ اُس نے تند و تیز لہجے میں الماس بیگ کو مخاطب کر کے کہا۔ ''ہم لوگ تمہاری خواہش کے مطابق یہاں تک بالکل نہتے آئے ہیں...... مگر تم لوگ تو آمادۂ جنگ نظر آتے ہو۔''

الماس بیگ نہایت شاطر اور حاضر دماغ نوجوان تھا۔ اس نے ایک ہی لمحے میں نیا بہانہ تراش لیا۔

''میرے بھائی کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے لشکر کو آراستہ کر کے سلطانِ ذی حشم کے ملاحظے کے لیے پیش کر دے اور خود حاضرِ خدمت ہو کر عاجزانہ سلام پیش کرے۔''

نوشتۂ دیوار انتہائی جلی حروف میں لکھا گیا تھا مگر بدنصیبی کا اندھیرا چھا جانے کے باعث جلال الدین خلجی اس عبارت کو نہ پڑھ سکا۔ بس شکایت آمیز لہجے میں اتنا ہی کہہ سکا۔

''میں تو اس قدر طویل سفر طے کر کے اس سے ملنے کے لیے آیا ہوں..... حالانکہ روزے سے ہوں۔ علاء الدین سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہ کشتی میں بیٹھ کر تھوڑی دُور تک میرے استقبال کے لیے آتا۔''

الماس بیگ نے فوراً ہی دوسرا بہانہ تراش لیا۔ ''علاء الدین پسند نہیں کرتا کہ وہ خالی ہاتھ عزت مآب کی خدمت میں حاضر ہو۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ نادر و نایاب جواہرات، قیمتی گھوڑے اور ہاتھی لے کر آپ کی قدم بوسی کو حاضر ہو۔ علاء الدین نے آپ کے افطار کا بھی اہتمام کیا ہے۔ اُس کی عاجزانہ درخواست ہے کہ آپ اُس کے مکان پر روزہ کشائی کریں تاکہ وہ اس اعزاز پر زندگی بھر فخر کر سکے۔''

اتنے میں علاء الدین اپنے چچا محترم کے قریب پہنچ گیا۔ پھر وہ بڑے والہانہ انداز میں آگے بڑھا اور اس نے جلال الدین کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ بھتیجے کی یہ سعادت مندی دیکھ کر مہربان چچا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جلال الدین نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر اُٹھایا اور محبت بھرے انداز میں علاء الدین کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی۔

''میں نے تجھے بڑے لاڈ پیار سے پال کر اتنا بڑا کیا ہے...... اور اپنے بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھا ہے۔ تیرے بچپن کی بُو اب تک میرے کپڑوں میں بسی ہوئی ہے۔ پھر تیرے دل میں یہ باطل خیال کیسے پیدا ہوا کہ میں تیرا برا چاہتا ہوں؟'' یہ کہہ کر سلطان جلال الدین خلجی نے علاء الدین کا ہاتھ پکڑا اور کشتی کی طرف روانہ ہوا۔

علاء الدین نے اپنے بائیں جانب گردن کو ہلکا سا موڑا اور ان لوگوں کو آنکھ کا اشارہ کیا جو سلطان کے قتل کے لیے متعین کیے گئے تھے۔ سمانہ کے ایک نمک حرام شخص، محمود بن سالم نے آگے بڑھ کر جلال الدین خلجی پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ فرمانروائے ہندوستان پر حملہ ہوتے ہی علاء الدین خلجی اپنے لشکر کی طرف لوٹ گیا۔

جلال الدین خلجی زخم کھا کر کشتی کی طرف بھاگا۔ وہ بڑے دردناک انداز میں چیخ رہا تھا۔

''اے بدبخت علاء الدین! تُو نے یہ کیا، کیا؟''

سلطان ابھی کشتی تک پہنچنے نہیں پایا تھا کہ دوسرا نمک حرام تلوار لے کر اپنے آقائے نعمت پر جھپٹا۔ یہ شخص اختیارالدین تھا، جس پر جلال الدین خلجی کے ہزاروں احسانات تھے۔ اختیارالدین نے سلطان کو کشتی تک جانے نہیں دیا۔ اس نے کنارے کے قریب ہی جلال الدین خلجی کو زمین پر گرا دیا اور بڑی بے رحمی کے ساتھ اپنے فرمانروا کا سر کاٹ لیا۔

اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا اور روزہ کشائی میں چند لمحات باقی تھے۔ سلطان جلال الدین خلجی نے اپنے ہی خون سے افطار کر لیا۔

پھر اُس کا کٹا ہوا سر علاء الدین کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ علاء الدین کے ہونٹوں پر بڑی سفاکانہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں بہیمانہ چمک تھی۔ اس کے خوابوں میں جلال الدین کے خون نے حکمرانی کا رنگ بھر دیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اپنے شفیق و مہربان چچا کو شاہی اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کر سکتا تھا۔ مگر علاء الدین فطرتاً درندہ تھا۔ رعایا کے دلوں پر اپنی ہیبت قائم کرنے کے لیے اس نے اپنے بزرگ سے وہ سنگ دلانہ سلوک کیا جو درندے بھی شکار ہونے والے جانوروں کے ساتھ روا نہیں رکھتے۔

سلطان جلال الدین خلجی کا سر نیزے پر بلند تھا اور علاء الدین کے نقیب کڑہ (مانک پور) کی گلیوں میں چیختے پھر رہے تھے۔

''یہ اس شخص کی سزا ہے جو بے وفا دنیا پر عاشق تھا۔''

❁---❁---❁

زہرِ عشق

موجودہ ہندوستان کا صوبہ ''راجستھان'' قدیم زمانے میں ''راجپوتانہ'' کے نام سے مشہور تھا۔ اس علاقے میں ہندوؤں کی سب سے بہادر قوم راجپوتوں کی اکثریت تھی۔ ''راجپوتانہ'' چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا...... اور ان ریاستوں کے حکمراں نسلاً راجپوت تھے۔ اجمیر اور چتوڑ سب سے زیادہ طاقتور ریاستیں تھیں۔ اجمیر کا حکمراں سمراٹ پرتھوی راج چوہان تھا۔ وہ اپنی ریاست کو ناقابلِ تسخیر سمجھتا تھا...... اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پرتھوی راج چوہان کا قلعہ تاراگڑھ سطح زمین سے سینکڑوں فٹ بلندی پر واقع تھا...... اور یہاں تک کسی دشمن کی رسائی تقریباً ناممکن تھی۔

پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ شہاب الدین غوری کے لشکر نے ''اجمیر'' کو پامال کر ڈالا۔ پرتھوی راج کو زنجیریں پہنا دی گئیں...... اور سالار سید حسین مشہدی نے تاراگڑھ کی تمام بلندیوں سے گزر کر قلعے کے دل میں اسلام کا پرچم نصب کر دیا۔ جہاں پرتھوی راج چوہان تختِ شاہی پر بیٹھ کر احکام دیا کرتا تھا، آج اسی مقام پر حضرت سیّد حسین مشہدیؒ کا مزارِ مبارک مرجع خاص و عام ہے۔

ہندوستان پر اسلامی حکومت قائم ہو جانے کے بعد برسوں تک ''چتوڑ'' اور ''رنتھبور'' کے قلعے ناقابلِ تسخیر رہے۔ پھر ایک دن سلطان علاء الدین خلجیؒ اُفقِ سیاست پر نمودار ہوا اور اس کے شوقِ تسخیر و جہاں بانی نے چتوڑ اور رنتھبور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ راجپوتوں کی دستارِ غرور کو پارہ پارہ کر دیا...... اور راجپوتانہ چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا۔

علاء الدین کے مرتے ہی راجپوتوں نے دوبارہ سر اُٹھانا شروع کیا اور بعض ریاستوں نے اپنی گردنوں سے اسلامی سلطنت کا طوقِ غلامی اُتار پھینکا۔ پھر ایک طویل عرصے تک اقتدار کی یہ کشمکش جاری رہی یہاں تک کہ شہنشاہ ظہیر الدین بابر نے سلطان ابراہیم لودھی سے عنانِ سلطنت چھین کر مغلوں کی مضبوط حکومت قائم کر دی۔

وہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کا دورِ حکومت تھا۔

ان دنوں راجپوتانہ کی ایک چھوٹی سی ریاست جودھپور پر راجہ ویرول کی حکمرانی تھی۔ (بعض مؤرخین نے ویرول کے بجائے رتن سنگھ بھی تحریر کیا ہے) راجہ ویرول ایک قوم پرست حاکم تھا۔ وہ ہندوؤں خصوصاً راجپوتوں کی عظمتِ رفتہ کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اسے مسلمان حکمرانوں سے شدید نفرت تھی۔ راجہ ویرول چاہتا تھا کہ تمام راجپوت ریاستیں آپس میں متحد ہو کر مغلوں کے مقابل صف آراء ہو جائیں اور راجپوتانہ کی آزادی برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ اُس کی تقریریں بڑی پُرجوش ہوا کرتی تھیں۔ وہ راجپوتوں کے خون کو گرمانا چاہتا تھا...... مگر اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ وقت بہت آگے نکل چکا ہے۔ راجپوتوں کے خون کی گرمی مغلوں کے عظیم الشان لشکر کی یلغار کو نہیں روک سکتی تھی...... لیکن ویرول پر ایک جنون سا طاری تھا...... اور اسی جنون کے زیر اثر وہ مسلمانوں کے خلاف مسلسل زہر اُگلتا رہتا تھا۔

پھر اس وقت راجہ ویرول کی بے چینیوں میں مزید اضافہ ہو گیا جب اس کے یہاں پہلی لڑکی پیدا ہوئی۔ یہ 1550ء کا واقعہ ہے۔ راجہ ویرول اپنے تخت کے وارث کا خواب دیکھ رہا تھا مگر قدرت نے اس کے خواب کو منتشر کر دیا۔ وہ کئی دن تک اس صدمے سے نڈھال رہا۔ راجپوت اپنی جاہلانہ رسموں کی وجہ سے بیٹی کی پیدائش کو انتہائی بدشگونی اور ذلت تصور کیا کرتے تھے۔ دوسروں کی بیٹیاں بیاہ کر لانا ان کے یہاں ایک قابل فخر کارنامہ سمجھا جاتا تھا...... مگر اپنی بیٹیوں کی شادی کے وقت ان کی گردنیں شرم سے جھکی ہوتی تھیں۔

راجہ ویرول نے بھی بڑی اذیت کے ساتھ نومولود بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ کرشنا اپنے خدوخال کے اعتبار سے ایک خوبصورت لڑکی تھی...... مگر راجپوت باپ کی نظروں میں وہ دنیا کی سب سے بدصورت مخلوق تھی۔

ہندوؤں کی قدیم ترین رسم کے مطابق جو بیسویں صدی میں بھی اُسی زور و شور سے جاری ہے، راجہ ویرول نے راج جوتشی (شاہی نجومی) پنڈت امرناتھ کو طلب کیا کہ کرشنا کی جنم کنڈلی تیار کی جا سکے۔

پنڈت امرناتھ کئی دن تک کاغذ سیاہ کرتا رہا۔ اس کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ راجہ ویرول خاموشی سے پنڈت امرناتھ کی کیفیات کا جائزہ لیتا رہا۔ آخر وہ خاموش نہ رہ سکا۔

"پنڈت جی! کیا ستاروں کے پاس میری بیٹی کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے؟"

امرناتھ گھبرا گیا۔ "نہیں مہاراج! ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھر یہ دفتر کیسا ہے؟" راجہ ویرول نے کاغذ کے اُس ڈھیر کی طرف اشارہ کیا جو پنڈت امرناتھ کے سامنے بکھرا ہوا تھا۔

"دراصل...... مہاراج!...... بات یہ ہے کہ......" پنڈت امرناتھ رُک رُک کر بول رہا تھا۔ اُس کی زبان کی لکنت کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ "راج کماری کا زائچہ بہت اُلجھا ہوا ہے۔ تمام ستاروں کی چالیں کچھ عجیب سی ہیں۔"

راجہ ویرول، امرناتھ کی ہچکچاہٹ دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ درباری نجومی کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

''پنڈت جی! اس سے زیادہ درِ بھاگیہ (بدقسمتی) کی بات کیا ہو گی کہ بھگوان نے مجھے راج کنور (ولی عہدِ سلطنت) سے محروم رکھا......اور میرے کاندھوں پر پہاڑ جیسا بوجھ ڈال دیا۔ آپ کا گیان جو کچھ کہتا ہے، اسے بے جھجک بیان کر دیں۔''

پنڈت امرناتھ کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر آہستہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''راج کماری ایک مشکل زندگی بسر کریں گی۔''

''کیا اس کی شادی ہو جائے گی؟'' راجہ ویرول نے گھبرا کر پوچھا۔ آخر وہ باپ تھا......اور ایک باپ اپنی بیٹی کی ازدواجی زندگی کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند رہتا ہے۔

''شادی ہو بھی سکتی ہے......اور ٹوٹ بھی سکتی ہے۔'' پنڈت امرناتھ بہت محتاط لہجے میں بول رہا تھا۔ ''ستارے تو یہی کہتے ہیں کہ راج کماری کی پوری زندگی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔''

راجہ ویرول ایک مرد تھا۔ اس نے اپنی پریشانیوں کو شراب کی صراحی اور خوبصورت عورتوں کے رقص میں ڈبو دیا......مگر اس کی رانی للیتا کی پریشانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ وہ اکثر تنہائی میں سوچا کرتی تھی کہ اگر تخت کا وارث اس دنیا میں نہیں آیا تو حکومت جے مل کے قبضے میں چلی جائے گی۔ جے مل، راجہ ویرول کا چھوٹا بھائی تھا اور اپنے بڑے بھائی سے بہت محبت کرتا تھا......مگر دولت و اقتدار دنیا کی سب سے خوفناک چیزیں ہیں۔ ان کی طلب میں انسان دنیا کے ہر رشتے کو قتل کر دیتا ہے۔ رانی للیتا یہی سوچ کر اُداس رہا کرتی تھی۔

راج کماری کرشنا کی پرورش بڑے ناز ونعم کے ساتھ ہوتی رہی......مگر راجہ ویرول کی محبت میں وہ جوش نہیں تھا جو ایک بیٹے کے لیے ہوتا ہے۔ اس نے بیٹی کی پیدائش کو محض ایک جبر سمجھ کر قبول کیا تھا۔

رانی للیتا نے پابندی کے ساتھ مندروں میں جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ کثرت سے صدقہ و خیرات کرتی تھی۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتی تھی۔ دن رات، برہمنوں کی سیوا میں لگی رہتی تھی......اور یہ سب اس لیے تھا کہ تخت کا وارث دنیا میں آ سکے۔

پانچ سال بعد 1555ء میں رانی للیتا نے ایک اور خوبصورت لڑکی کو جنم دیا۔ راج بھون (قصرِ شاہی) کے در و دیوار لرزنے لگے۔ جیسے ریاست جودھپور زلزلے کی زد میں ہو۔ راجہ ویرول کے لیے یہ خبر قیامت سے کم نہیں تھی۔ وہ کئی دن تک اپنا غم بھلانے کے لیے شراب پیتا رہا۔

اس موقع پر جے مل نے اپنے بھائی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بھائی جی مہاراج! جب دھرتی والے، آکاش کے فیصلے کو بدلنے کی طاقت نہیں رکھتے تو پھر آپ کیوں اُداس ہوتے ہیں؟''

''مجھے جودھپور کا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے، جے مل!'' راجہ ویرول نے نہایت شکستہ لہجے میں کہا۔

''بھگوان آپ کو سو سال کی عمر دے۔'' جے مل نے بڑے بھائی کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''جب تک آپ زندہ ہیں، اس وقت تک جودھپور کے مستقبل کو کوئی خطرہ نہیں۔''

''میں اپنے بعد آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' راجہ ویرول کی کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے کوئی مضبوط چٹان ٹوٹ کر بکھر رہی ہو۔

''آپ تو صرف آج کی باتیں کرتے تھے، پھر یہ کل کہاں سے آ گیا؟'' جے مل ایک ہوش مند نوجوان تھا۔

''ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی ہے میرے بھائی!'' راجہ ویرول ایک مضبوط اعصاب رکھنے والا راجپوت تھا...... مگر تخت کے وارث سے محرومی اور دو لڑکیوں کی پیدائش نے خوف زدہ کر دیا تھا۔ ''تم نہیں جانتے کہ لڑکیوں کا بوجھ کیا ہوتا ہے۔'

''آپ انہیں لڑکیاں کیوں سمجھتے ہیں؟'' جے مل نے شکستہ دل بھائی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''وہ دونوں آپ کے بیٹے ہیں۔''

راجہ ویرول، چھوٹے بھائی کی بات سن کر مسکرایا...... مگر اُس کی یہ مسکراہٹ غموں کے ہزار پردوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ ''رات کو دن فرض کر لینے سے سورج نہیں نکل آتا، جے مل!''

''سورج کا تصور ہی اندھیروں کے دُکھوں کو کم کر دیتا ہے بھائی جی مہاراج!'' جے مل نے ایک طاقتور دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کو اپنی تاریخ یاد نہیں کہ چتوڑ کا راجہ رتن سنگھ گرفتار ہو گیا تھا...... اور علاء الدین خلجی، رانی پدمنی کے قدموں کی دھول کو بھی نہیں چھو سکا تھا۔ رانی پدمنی بھی تو ایک عورت تھی، راجپوت زادی تھی۔''

چھوٹے بھائی کی منطق سن کر راجہ ویرول کے بجھے ہوئے چہرے پر روشنی کی ہلکی سی لکیر نظر آئی۔

''آپ کو یاد ہوگا کہ صدیوں بعد اسی چتوڑ کی رانی کرن وتی نے بہادر شاہ گجراتی کا کس طرح مقابلہ کیا تھا؟'' جے مل نے چتوڑ کی تاریخ دہراتے ہوئے کہا۔ ''بے شک! رانی کرن وتی جنگ ہار گئی۔ مگر اس نے آگ کے شعلوں میں جل کر راجپوتوں کی روایت کو زندہ رکھا۔''

یہ جنگ مغل شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں کے دورِ حکومت میں ہوئی تھی۔ گجرات کا حاکم بہادر شاہ، چتوڑ پر کئی حملے کر چکا تھا۔ رانی کرن وتی نے مجبور ہو کر ہمایوں کے دربار میں ''راکھی'' بھیجی اور مغل شہنشاہ کو اپنا بھائی بنا لیا۔ ہمایوں نے اسی رشتے کو نباہنے کے لیے بہادر شاہ پر حملہ کیا..... مگر اس سے پہلے رانی کرن وتی نے خود کو بھڑکتی ہوئی آگ کے حوالے کر دیا اور جل کر راکھ ہو گئی۔

راجہ ویرول کے چھوٹے بھائی، جے مل نے اسی جنگ کی مثال پیش کرتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کو غم کے حصار سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

''آپ اپنی دونوں بیٹیوں کو بیٹوں کی طرح تربیت دیں۔ پھر آپ کا احساسِ محرومی دُور ہو جائے گا۔'' جے مل کی تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور راجہ ویرول اُداسیوں کے گرداب سے نکل آیا۔

❀---❀---❀

راجہ ویرومل نے پیدائش کے کئی دن بعد بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ یہ لڑکی کرشنا سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ ایک بار پھر راج جوتشی پنڈت امرناتھ کو طلب کیا گیا۔ ایک بار پھر بہت سے کاغذات پر مختلف لکیریں کھینچی گئیں...... اور ایک بار پھر پنڈت امرناتھ کے چہرے پر فکر کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے بڑے بڑے مہاراجاؤں کے زائچے بنائے تھے...... مگر ایسا عجیب زائچہ آج تک اس کی نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ راجہ ویرومل بہت غور سے امرناتھ کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اُبھرتے ڈوبتے رنگ غائب ہو گئے...... اور ایک مستقل رنگ ٹھہر گیا جو حیرت وخوشی کا رنگ تھا۔

''راج کماری کے زائچے میں راج یوگ تو نہیں ہے مگر پھر بھی بعض ستاروں کے زاویے بڑے عجیب ہیں۔'' پنڈت امرناتھ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ (راج یوگ ستاروں کے اس زاویے کو کہتے ہیں جس سے دولت و اقتدار کی نشاندہی ہوتی ہے)

''پنڈت جی! مجھے کیوں بہلا رہے ہو؟'' راجہ ویرومل نے اُداس لہجے میں کہا۔ ''اگر راج یوگ نہیں تو پھر سب کچھ بے کار ہے۔''

''نہیں مہاراج! دنیاوی دولت و اقتدار ہی سب کچھ نہیں ہے۔'' اس بار پنڈت امرناتھ کے لہجے میں غیر معمولی جوش تھا۔ ''راج کماری، راٹھور خاندان کا نام روشن کریں گی۔ ہندوستان میں بڑے بڑے راجے، مہاراجے آئے مگر آج دنیا ان کے نام بھی نہیں جانتی۔''

راج جوتشی کی بات سن کر راجہ ویرومل سنبھل گیا۔ ''ایسی کون سی خاص بات ہے راج کماری کے زائچے میں؟''

''کوئی بھی جوتشی اس مخصوص علامت کی طرف اشارہ نہیں کر سکتا...... مگر ستارے یہی کہتے ہیں کہ راج کماری کو غیر معمولی شہرت حاصل ہو گی۔ وہ راج گھرانے کی رسموں کے خلاف ودّیا اور کلا کی طرف مائل ہوں گی۔ پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ ہندوستان کے گلی کوچوں میں ان کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ وہ مر کے بھی امر رہیں گی۔''

پنڈت امرناتھ کی پیش گوئی سن کر راجہ ویرومل کے اُداس چہرے پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ پھر اس نے راج جوتشی سے اپنے دل کی بات بیان کر دی۔

''پنڈت جی! آپ نے میرا زائچہ دیکھ کر بہت دنوں پہلے کہا تھا کہ میرے یہاں دو لڑکے پیدا ہوں گے...... مگر آج میری آنکھیں تو کچھ اور دیکھ رہی ہیں''

''میں کیول گیانی ہوں مہاراج! اس جگ کا پالن ہار (پالنے والا) نہیں ہوں۔'' پنڈت امرناتھ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میرے گیان نے مجھے دو لڑکوں کی خبر دی تھی..... اب ودھاتا (خالق) نے انہیں لڑکیاں بنا دیا تو اس میں میرا کیا دوش ہے؟...... ویسے ابھی دھرتی بانجھ تو نہیں ہوئی ہے۔ دیوتاؤں کو پکارتے رہیے۔ کون جانے کہ کب مرادوں کی فصل پھوٹے اور آپ کی کامناؤں (خواہشوں) کا باغ ہرا بھرا

ہو جائے۔ برہما کی شکتیاں اُپار (لامحدود) ہیں۔''

راجہ ویرول نے اپنی رانی للیتا کو پنڈت امرناتھ کی پیش گوئی سے باخبر کر دیا۔ پھر اس خوبصورت لڑکی کا نام ''میرا'' رکھ دیا گیا۔

راج کماری میرا، بچپن ہی سے بہت ذہین تھی۔ ایک بار جو کچھ سن لیتی، اسے ہمیشہ یاد رکھتی۔ راجہ ویرول نے اپنے چھوٹے بھائی جے مل کی ہدایت کے مطابق دونوں لڑکیوں کو اس وقت کے مروّجہ علوم کے ساتھ ساتھ فنونِ سپاہ گری کی بھی تعلیم دینا شروع کی۔ راج کماری کرشنا تو ان فنون میں دلچسپی رکھتی تھی مگر راج کماری میرا کو کتابوں کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ راجہ ویرول اس پر سختی کرتا تو وہ صاف صاف کہہ دیتی۔

''پتا جی! گھوڑے پر چڑھنا اور تلوار چلانا میرے بس کی بات نہیں۔''

راجہ ویرول کو پنڈت امرناتھ کی پیش گوئی یاد آ جاتی اور وہ راج کماری میرا کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا۔

پھر ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے راج گھرانے کے لوگوں کو چونک جانے پر مجبور کر دیا۔ راج بھون کے باغیچے میں راج کماری میرا، پنڈت سندر داس سے کوئی مذہبی کتاب پڑھ رہی تھی کہ اچانک اُسے بین کی آواز سنائی دی۔ کوئی سپیرا، راج محل سے دُور سانپوں کا تماشا دکھاتا ہوا گزر رہا تھا۔ بین کی آواز نے راج کماری میرا کو مدہوش کر دیا۔ وہ کتاب چھوڑ کر راج محل کے دروازے کی طرف چیختی ہوئی بھاگی۔

''یہ کون ہے؟.......اسے میرے پاس بلاؤ۔''

محل کے محافظوں نے بڑی حیرت سے راج کماری کی طرف دیکھا۔ ''آپ کسے بلا رہی ہیں؟''

''تم سن رہے ہو؟'' میرا نے اس طرف اشارہ کیا، جدھر سے بین کی آواز آ رہی تھی۔ ''اسے جلدی سے روکو۔ ورنہ وہ چلا جائے گا۔'' راج کماری میرا پر شدید اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔

''راج کماری! وہ تو سپیرا ہے۔ بچوں کو سانپوں کا تماشا دکھا رہا ہے۔'' راج محل کے ایک محافظ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں بھی دیکھوں گی سانپوں کا تماشا۔ بلاؤ اُسے۔'' راج کماری کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

محل کے محافظ نے فوری طور پر ایک ملازم کو نندو سپیرے کے تعاقب میں دوڑایا...... اور اسی وقت راجہ ویرول کو بھی خبر کر دی گئی کہ راج کماری سانپوں کا تماشا دیکھنا چاہتی ہے۔ راجہ ویرول اور رانی للیتا نے اپنی بیٹی کی اس خواہش کو بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا...... اور پھر نندو مداری کو راج محل میں طلب کر لیا گیا۔

نندو مداری کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس طرح راج محل میں داخل ہوگا۔ وہ کچھ دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے مہاراجہ ویرول اور رانی للیتا کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گھبرا کر جودھپور کے حکمراں کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔

''مہاراج! بس ایک بار میرے اس پاپ کو شما (معاف) کر دیں۔ میں آئندہ ادھر سے نہیں گزروں گا۔ یہ ظالم پیٹ مجھے گلیوں گلیوں پھراتا ہے۔''

راجہ ویرول، سپیرے کی وحشت پر مسکرایا۔ ''تُو نے کوئی پاپ نہیں کیا ہے۔ راج کماری تیری بین سننا چاہتی ہیں۔''

نندو مداری کی جان میں جان آئی اور اس نے راجہ ویرول کے قدم چھو کر اپنا سر راج کماری میرا کے کومل چرنوں پر رکھ دیا۔

''تم ہمیں سانپوں کا تماشا دکھاؤ۔ ہم تمہیں بہت سا انعام دیں گے۔'' راج کماری میرا نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا۔

پھر نندو مداری نے ایسی بین بجائی کہ راج محل کی پوری فضا پر سحر سا طاری ہو گیا۔ پٹاری سے آدھا جسم نکالے ہوئے کالا ناگ بھی جھوم رہا تھا......اور راج کماری میرا بھی۔ سپیرے کے فن نے راجہ ویرول، رانی للیتا اور پنڈت سندرداس کو بھی متاثر کیا تھا......مگر راج کماری میرا کی تو حالت ہی غیر ہو گئی تھی۔ اُس پر جذب و مدہوشی کا غلبہ تھا۔

پھر جب نندو مداری نے تھک کر بین اپنے ہونٹوں سے الگ کی تو راج کماری میرا بھی ہوش میں آئی۔

''بس راج کماری!......اب آپ کا یہ داس تھک گیا ہے۔''

''تم کل پھر آنا نندو! ہم تمہارا انتظار کریں گے۔'' راج کماری میرا سحر زدہ سے لہجے میں بول رہی تھی۔ ''پتا جی! آپ نندو کو بہت سا انعام دیں۔ ہم نے اس سے وعدہ کیا ہے۔''

راجہ ویرول نے بیٹی کو خوش کرنے کے لیے نندو مداری کو اتنا انعام دے دیا کہ وہ زندگی بھر کے لیے فکرِ روزی سے آزاد ہو گیا۔ سپیرے نے باری باری راجہ، رانی اور راج کماری کے چرن چھوئے اور لرزتے قدموں کے ساتھ چلا گیا۔

❁---❁---❁

راج کماری میرا دوسرے دن بھی نندو مداری کا انتظار کرتی رہی مگر سپیرا لوٹ کر نہیں آیا......وہ آتا بھی کیسے کہ راجہ ویرول نے اپنے خدمت گار کے ذریعے اُسے تنبیہہ کرا دی تھی کہ وہ آئندہ راج محل کے قریب سے بھی نہ گزرے......اور اگر گزرے تو بین بجائے بغیر خاموشی سے چلا جائے۔ نندو مداری کا انتظار کرتے کرتے رات ہو گئی۔ پھر جب وہ نہیں آیا تو راج کماری میرا، ماں باپ کے سامنے ضد کرنے لگی۔

''سپیرے کو بلایا جائے۔ میں اُس کی بین سننا چاہتی ہوں۔''

بیٹی کی اس خواہش نے ماں باپ کو پریشان کر دیا۔ پھر دونوں نے میرا کے استاد پنڈت سندر داس سے مشورہ کیا۔

''مہاراج! اس دن کے واقعے سے ایک خاص اشارہ ملتا ہے کہ راج کماری فطری طور پر موسیقی کی

طرف مائل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کے اس شوق کو دبایا نہیں جا سکتا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہم ایک راجپوت زادی کو سنگیت کلا کے حوالے کر دیں؟'' راجہ ویرول کے لہجے سے ناخوشگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''ہم تو چاہتے تھے کہ وہ شمشیروں کی جھنکار سنے۔ پھر ستار اور بین کی آوازیں بیچ میں کہاں سے آ گئیں؟''

''مہاراج! آپ انسانی فطرت کو نہیں بدل سکتے۔'' پنڈت سندرداس نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔ ''موسیقی کا رسیا بارش کا جلترنگ چاہتا ہے، مور اور پپیہے کی تانیں سنتا ہے۔ اسے تیر و تبر اور تلواروں کی آوازوں سے وحشت ہوتی ہے۔''

''ہم اُس کی فطرت کو بدل کر چھوڑیں گے۔'' راجہ ویرول برہم نظر آ رہا تھا۔ ''ہم آپ سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ کتابوں سے ہٹ کر راج کماری میرا کو جنگ و جدل کا درس دیا کریں۔ اسے عظیم راجپوتوں کی شجاعت کے قصے سنایا کریں۔ میرا کے کچے ذہن پر موسیقی کی چھاپ نہ لگنے دیں۔ وہ پہلے ہی کھوئی رہتی ہے۔ بین کی آوازیں سن کر تو وہ سو جائے گی یا پھر کسی سانپ کی طرح جھومنے لگے گی۔''

''میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا مہاراج!'' یہ کہہ کر میرا کا استاد پنڈت سندرداس چلا گیا.......اور راجہ ویرول گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

❀---❀---❀

راج کماری میرا دوسرے دن بھی نندو مداری کا انتظار کرتی رہی.......مگر وہ نہیں آیا.......تیسرے دن بھی یہی ہوا۔ اور آتا بھی کیسے کہ راج محل کی گلیاں اُس کے قدموں پر حرام کر دی گئی تھیں۔

❀---❀---❀

راج بھون میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ راج کماری میرا نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اُس کی ضد تھی کہ یا تو نندو مداری کو راج محل میں لایا جائے یا پھر وہ خود سپیرے کے گھر جائے گی۔ راجہ ویرول کو اندازہ نہیں تھا کہ کمسن میرا اس قدر سرکش ثابت ہو گی۔ آخر باپ نے بیٹی کی جان بچانے کے لیے نندو مداری کو راج محل میں طلب کر لیا......اور تنہائی میں اسے سب کچھ سمجھا دیا۔

پھر جب سپیرا، میرا کی خدمت میں حاضر ہوا تو راج کماری کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس کی مزاج پُرسی کرتی رہی۔

''اب میں ٹھیک ہوں راج کماری!'' نندو مداری رونے لگا۔ ایک اچھوت کو پہلی بار یہ اعزاز حاصل ہوا تھا کہ اس کے لیے راج محل کے دروازے کھولے گئے تھے.......اور یہ سب کچھ ایک کمسن لڑکی کی ضدوں کی وجہ سے ہوا تھا.......ورنہ کہاں راجہ بھوج......اور کہاں گنگو تیلی؟

کچھ دیر تک نندو مداری نے بڑے والہانہ انداز میں بین بجائی.......اور پھر یہ کہہ کر چلا گیا۔

''راج کماری! یہ داس جودھپور سے بہت دُور جا رہا ہے......اس لیے آئندہ آپ کی خدمت میں

حاضر نہیں ہو سکے گا۔'' راجہ ویرول نے مداری کو یہی حکم دیا تھا۔
پھر نندو سپیرا چلا گیا......اور اپنی بین میرا کے سپرد کر گیا۔ راج کماری کی یہی خواہش تھی۔

❀---❀---❀

راج کماری میرا اکثر تنہائی میں نندو مداری کی دی ہوئی بین بجاتی تھی۔ راجہ ویرول نے بیٹی کا یہ رنگ دیکھا تو پنڈت سندرداس سے مشورہ کرتے ہوئے کہا۔
''پنڈت جی! ہمیں اس لڑکی نے پریشان کر رکھا ہے۔ اب وہ سب کچھ بھول کر بے سُرے انداز میں بین بجا رہی ہے۔''
''مہاراج! میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ راج کماری کا رجحان سنگیت کلا کی طرف ہے۔'' پنڈت سندرداس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''بہتر تو یہی ہے کہ آپ اسے راج دربار کے کسی اعلیٰ سنگیت کار سے موسیقی کی تعلیم دلائیں۔
''پھر تو راجپوت زادی ایک گائیکہ (مطربہ) بن کر رہ جائے گی۔'' راجہ ویرول بری طرح اُلجھ کر رہ گیا تھا۔
''سنگیت تو ہمارے دھرم کا ایک حصہ ہے۔'' پنڈت سندرداس نے موسیقی کے حق میں ایک مضبوط دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''مذہبی تعلیم راج کماری کو گائیکہ بننے نہیں دے گی۔ ان کی سنگیت کلا کو ''کیرتن'' اور ''بھجن'' تک محدود رکھیے۔''
آخر راجہ ویرول نے اپنے دربار کے سب سے بڑے سنگیت کار، من موہن کو یہ ذمے داری سونپ دی۔ من موہن نے میرا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''بین ایک اچھا ساز ضرور ہے مگر راج کماریوں کو زیب نہیں دیتا۔ آپ ستار بجائیں کہ یہ سب سازوں کا سرتاج ہے۔''
میرا نے اپنے گرو من موہن کی بات مان لی اور بڑی دلجمعی کے ساتھ ستار سیکھنے لگی۔ موسیقی کی تعلیم و تربیت کے دوران من موہن بھجن گایا کرتا تھا اور ان بھجنوں میں کرشن جی کی تعریف ہوا کرتی تھی۔
کرشن جی ہندوؤں کے مشہور دیوتا ہیں۔ اکثر ہندو انہیں براہِ راست بھگوان کا اوتار (نمائندہ) خیال کرتے ہیں۔ ہندو تاریخ کے مطابق شری کرشن، نند نامی شخص کے یہاں پیدا ہوئے اور اُن کی ماں کا نام یشودھا تھا۔ مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ کی تحقیق کے مطابق تمام ہندو اس بات پر متفق ہیں کہ شری کرشن، مشہور شہر متھرا میں پیدا ہوئے۔ البتہ ان کے خاندان اور ماں باپ کے بارے میں شدید اختلافات موجود ہیں۔
شری کرشن کے حوالے سے یہ روایت بھی بہت شہرت رکھتی ہے کہ جب وہ پیدا ہوئے تو متھرا پر راجہ کنس کی حکومت تھی۔ نجومیوں نے راجہ کنس کو بتایا کہ اسی شہر میں ایک لڑکا کرشن پیدا ہوگا اور اسی کے ہاتھوں راجہ کی موت واقع ہوگی۔ یہ پیش گوئی سنتے ہی راجہ کنس بدحواس ہوگیا اور اس نے احکام جاری کر دیئے کہ کرشن کے پیدا ہوتے ہی اُنہیں قتل کر دیا جائے۔ کچھ دن بعد اس دنیا میں کرشن کا ظہور ہوا۔ راجہ

کنس کے سپاہی اُنہیں تلاش کرتے رہے مگر وہ کسی نہ کسی طرح بچ گئے۔ پھر گیارہ سال تک نند نامی شخص کے یہاں پرورش پاتے رہے۔ اسی بات سے لوگوں کو دھوکا ہوا کہ وہ نند کے بیٹے تھے۔ بہرحال کرشن اپنی نوجوانی کی منزل کو پہنچے اور انہوں نے اپنے جادوئی عملیات کے ذریعے متھرا کے راجہ کنس کو قتل کر دیا..... اور اس کے باپ راجہ اوگرسین کو تخت پر بٹھا دیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ راجہ اوگرسین تو برائے نام حکمراں تھا۔ درپردہ کرشن جی ہی حکومت کر رہے تھے۔ ان کے جادوئی عملیات اور طلسمات کی ہندوستان بھر میں اس قدر شہرت ہوئی کہ توہم پرست قوم ان کے خدا ہونے پر ایمان لے آئی...... اور بے شمار گھروں میں ایک انسان کی پوجا ہونے لگی۔

شری کرشن نے اپنی زندگی کے ابتدائی بتیس سال بہت عیش و عشرت میں گزارے۔ اس سلسلے میں لاتعداد عجیب وغریب قصے آج تک مشہور ہیں۔ ہندی زبان کے عظیم شاعر سورداس، کرشن جی کے عاشق تھے۔ سورداس بظاہر اندھے تھے مگر ان کے دل کی آنکھوں نے اپنے بھگوان شری کرشن جی کے نئے نئے پیکر تراشے ہیں۔ سورداس مختلف ناموں کے ساتھ کرشن جی کو یاد کیا کرتے تھے۔ شیام...... موہن...... کنہیا...... کرشن مراری...... گھنشیام...... گردھر گوپال...... نند لال...... یہ سب کرشن جی کے القاب اور خطابات ہیں۔

سورداس کا ایک مشہور بھجن ہے جسے آج بھی کروڑوں ہندو بڑے ذوق وشوق سے گاتے ہیں۔

''شیام ہمارے چور۔''

سورداس نے اپنی شاعری میں اپنے دیوتا کی جو تصویر کھینچی ہے، اس کے مطابق شری کرشن جی کے خدوخال دلکش تھے مگر اُن کا رنگ گہرا سانولا بلکہ کسی حد تک کالا تھا۔ شری کرشن بچپن ہی سے بڑے نٹ کھٹ اور شریر تھے۔ مکھن چرا کر کھا جایا کرتے تھے۔ سورداس اپنے دیوتا کی اس ادا پر فخر کرتے ہوئے علی الاعلان کہا کرتے تھے....... ''شیام ہمارے چور۔''

شری کرشن، بندرابن میں رہا کرتے تھے۔ جب جوان ہوئے تو بے شمار گوپیاں اُن کے عشق میں مبتلا ہو گئیں۔ خود کرشن جی بھی گوپیوں سے چھیڑ چھاڑ کیا کرتے تھے۔ رادھا گورے رنگ کی ایک خوبصورت دوشیزہ بھی کرشن جی کی محبت میں گرفتار تھی۔ چونکہ کرشن جی کالے تھے، اس لیے ہندو شاعروں کے بقول وہ گوری رادھا کے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

یشومتی میّا سے بولے نند لالہ
رادھا کیوں گوری ، میں کیوں کالا

(یہاں نند لالہ سے مراد کرشن جی ہیں، یعنی نند کے بیٹے)

الغرض جب کرشن جی کے بتیس سال عیش و عشرت میں گزر گئے تو دوسرے راجہ انہیں تباہ کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ بہار کے راجہ جراسنگھ نے ایک طرف سے اور ملیچھوں (نیچ قوم) کے راجہ کالیوں

نے متھرا پر حملہ کر دیا۔ شری کرشن ان دو طرفہ حملوں کی تاب نہ لا سکے اور وہ متھرا سے فرار ہو کر دوارکا چلے گئے جو احمد آباد (گجرات) سے دو سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ شری کرشن نے اٹھہتر (78) سال دوارکا کے آس پاس کے علاقے میں گزارے اور اپنے دشمنوں سے بچنے کی کوشش کرتے رہے...... مگر ان کی تمام تدبیریں رائیگاں گئیں۔ پھر ایک دن رانی گندھاری کی بد دعا سے شری کرشن کو بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ دنیا کے دوسرے لوگوں کی نظر میں وہ ایک فانی انسان تھے اور قدرت کے قانون کے مطابق انہیں موت آ گئی...... مگر عام ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ شری کرشن جی نے جان بوجھ کر روپوشی اختیار کر لی ہے...... اور وہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

راج کماری میرا کا استاد من موہن ان ہی کرشن جی کے بھجن گایا کرتا تھا۔ موسیقی کی تعلیم کے دوران میرا، کرشن جی کے بارے میں مختلف سوالات کیا کرتی تھی...... اور من موہن بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے دیوتا کے اوصاف بیان کیا کرتا تھا۔ نتیجتاً معصوم میرا کے دل و دماغ پر شری کرشن جی کی عقیدت کے اثرات مرتب ہونے لگے۔

پھر جوانی کی منزل کو پہنچتے پہنچتے یہی عقیدت محبت میں تبدیل ہو گئی۔ راج کماری میرا باقاعدگی سے مندر جانے لگی۔ وہ گھنٹوں شری کرشن جی کی مورتی کے سامنے آنکھیں بند کیے بیٹھی رہتی۔ میرا اپنی بڑی بہن راج کماری کرشنا کے ساتھ مندر جایا کرتی تھی۔ کرشنا کو پوجا پاٹھ سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو بس چھوٹی بہن کا ساتھ دینے کے لیے مندر جاتی۔ ہاتھ جوڑ کر شری کرشن کی مورتی کو پرنام (سلام) کرتی۔ پھر کچھ دیر کے لیے مورتی کے پیروں پر سر رکھ دیتی.... اور مندر سے نکل کر سیر و تفریح میں مشغول ہو جاتی۔ کئی گھنٹے بعد واپس آتی اور چھوٹی بہن کو شری کرشنا کے تصور میں غرق پاتی تو برا سا منہ بنا کر کہتی۔

"بس بہت ہو چکا میرا! اب واپس چلو...... تم تو اس طرح آنکھیں بند کیے بیٹھی ہو جیسے تمہیں دنیا میں کوئی کام ہی نہیں ہے۔"

راج کماری میرا، راج محل واپس چلی جاتی...... مگر اس طرح کہ اس کے چہرے سے اذیت و کرب کا رنگ نمایاں ہوتا تھا۔ اگر اسے ماں باپ کی سرزنش کا خیال نہ ہوتا تو وہ دن رات کرشن جی کی مورتی کے سامنے کسی بھکارن کی طرح پڑی رہتی۔

ایک دن حسبِ معمول راج کماری کرشنا سیر و تفریح کر کے مندر واپس آئی تو میرا، شری کرشن کی مورتی کے سامنے رقص کے سے انداز میں جھوم رہی تھی۔ کرشن کچھ دیر تک تو چھوٹی بہن کی یہ حالت دیکھتی رہی، پھر اس نے میرا کو جھنجوڑ ڈالا۔

"یہ کیا حرکت ہے میرا؟"

میرا نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر ناگواری کا ہلکا سا رنگ اُبھر آیا تھا۔ "میں آکاش پر اُڑ رہی تھی۔ تم مجھے پھر دھرتی پر اُتار لائیں۔"

''میرا! تجھے کیا ہو گیا ہے؟..... جوانی میں جوگن بن گئی ہے؟'' راج کماری کرشنا چھوٹی بہن کا مذاق اُڑا رہی تھی۔

''ہاں! میں جوگن بن گئی ہوں کرشنا!'' میرا کے لہجے میں بڑی سرشاری تھی۔

''کس کی جوگن؟'' کرشنا نے تمسخر کے انداز میں کہا۔

''اپنے سوامی کی۔'' یہ کہتے کہتے راج کماری میرا کے چہرے پر عجیب سا رنگ اُبھر آیا تھا۔

''تُو نے ہمیں بتایا تک نہیں اور چوری چھپے اپنے سوامی کو من میں بسا کر بیٹھ گئی۔'' کرشنا نے میرا کو چھیڑا۔

''مجھے کسی سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے سوامی کو تو دنیا جانتی ہے۔'' میرا کے لہجے سے عجیب سی سرشاری جھلک رہی تھی۔ ''تم بھی دیکھ لو۔ وہ رہے میرے سوامی۔'' میرا نے کرشن جی کی مورتی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ وہ مورتی تھی جس میں شری کرشن بانسری بجا رہے تھے۔

راج کماری کرشنا، چھوٹی بہن کی بات سن کر حیرت زدہ رہ گئی۔ ''تُو پاگل ہے میرا!...... دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی ہے، انہیں سوامی نہیں بنایا جاتا۔''

(سوامی سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ یہ کبھی براہِ راست ''خدا'' کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے..... کبھی مالک کے مفہوم میں۔ ہندو عورتیں جوشِ عقیدت میں اپنے شوہروں کو بھی ''سوامی'' کہہ کر پکارتی تھیں، اس لیے راج کماری کرشنا نے بھی ''سوامی'' کا وہی مفہوم لیا اور اپنی چھوٹی بہن کی روش پر سخت اعتراض کیا)

''اگر تمہاری نظروں میں یہ پاگل پن ہے تو پھر پاگل پن ہی سہی۔'' راج کماری میرا نے بے نیازانہ کہا۔ ''تمہیں راج گھرانے کی رسمیں مبارک...... اور مجھے میرا سوامی۔''

راج کماری کرشنا چھوٹی بہن کی اس کیفیت کو دماغی خلل سمجھ رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کسی دن میرا کے بارے میں ماں باپ سے بات کرے گی مگر حالات نے اسے اتنی مہلت نہیں دی...... اور ایک دن ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے جودھپور کی تاریخ ہی بدل ڈالی۔

❁---❁---❁

ایک دن راج کماری میرا، مندر میں پوجا کر رہی تھی اور کرشنا حسبِ معمول اس باغ میں ٹہل رہی تھی جہاں یہ مندر واقع تھا۔ اچانک کسی طرف سے ایک شہسوار آیا اور کرشنا کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔ اس وقت کرشنا کا آنچل ڈھلکا ہوا تھا اور وہ بے حجابانہ انداز میں باغ کی سیر کر رہی تھی۔ شہسوار گھوڑے سے نیچے اُتر آیا۔

''لڑکی! تم کون ہو؟'' شہسوار نے باوقار لہجے میں پوچھا۔

''یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتی ہوں۔'' کرشنا کے لہجے سے بھی راجپوتی جلال ظاہر ہو رہا تھا۔

''میں رانا بھوج راج ہوں۔ اودے پور کا راج کنور (ولی عہدِ سلطنت) ہوں۔'' شہسوار نے بطور فخر کہا۔

''میں بھی راج کماری کرشنا ہوں۔ راجہ ویرمل کی بیٹی۔'' کرشنا کے چہرے سے بھی خاندانی عظمت

اور نسلی برتری نمایاں ہو رہی تھی۔

''راج کماری ہو تو آنچل سر پر ڈالو۔'' راج کنور بھوج راج نے کسی قدر تحکم آمیز لہجے میں کہا۔
''راجپوت زادیوں کو تو چاند اور سورج بھی بے پردہ نہیں دیکھتے۔''

بھوج راج کے لہجے میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ راج کماری گھبرا سی گئی اور اس نے شرماتے ہوئے اپنا آنچل سر پر ڈال لیا۔

''اب دیکھو کہ تم کتنی خوب صورت لگ رہی ہو۔'' بھوج راج کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں گہری چمک۔

راج کماری ایک اجنبی نوجوان کے سامنے کچھ بے اختیاری سی ہو گئی۔ اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔
''کل پھر آؤ گی یہاں؟'' راج کنور بھوج راج نے ایک عجیب سوال کر ڈالا تھا۔
''میں تو روز ہی آتی ہوں۔'' راج کماری کرشنا سنبھل گئی۔ ''بھگوان کی پوجا کرنے کے لیے۔''
بھوج راج نے ایک بار پھر راج کماری کرشنا کو گہری نظروں سے دیکھا۔ ''کل تم میرے لیے آؤ گی۔''
''میں کسی کی پابند نہیں ہوں۔'' یکایک راج کماری کرشنا کے لہجے میں سختی آ گئی تھی۔ ''میں آزاد بھی ہوں اور حکم دینے کا منصب بھی رکھتی ہوں۔''
''یہ حکم نہیں، درخواست ہے۔'' بھوج راج کے لہجے میں محبت کی نرمی اور شیرینی تھی۔ یہ کہہ کر راج کنور گھوڑے پر سوار ہوا اور واپس جانے لگا۔ گھوڑے کی رفتار بہت سست تھی۔ بھوج راج مڑ مڑ کر راج کماری کرشنا کو دیکھ رہا تھا...... اور کرشنا کی نظریں بھی جانے والے کا مسلسل تعاقب کر رہی تھیں۔

❁---❁---❁

اُس رات راج کماری کرشنا سکون کی نیند نہیں سو سکی۔ بار بار اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ اودے پور کا راج کنور، بھوج راج سرگوشیوں میں اس سے کہہ رہا تھا۔
''کل تم میرے لیے مندر آؤ گی۔''

راج کماری کرشنا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی...... مگر کمرے میں کوئی موجود نہ ہوتا۔ ''بھگوان! یہ میں کس عذاب میں پھنس گئی ہوں؟'' کرشنا خود کلامی کے انداز میں کہتی۔ پھر بھوج راج کے تصور کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتی۔

''میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔ وہ کون ہوتا ہے مجھے بلانے والا؟''
ساری رات اسی کشمکش میں گزر گئی۔ کرشنا اپنے منتشر خیالوں سے جنگ کرتی رہی۔
پھر صبح ہوئی تو جودھپور کی راج کماری سختی کے ساتھ اپنے ارادے پر قائم رہی...... مگر جب میرا نے اس سے مندر جانے کے لیے کہا تو کرشنا بے اختیاری کے عالم میں چھوٹی بہن کے ساتھ چلی گئی۔
راج کنور بھوج راج مقررہ وقت پر باغ میں پہنچا جہاں راج کماری کرشنا ٹہل رہی تھی۔ غیر محسوس طور

پر اسے بھی آنے والے کا انتظار تھا۔

بھوج راج گھوڑے سے اُتر کر کرشنا کے قریب آیا اور فاتحانہ انداز میں بولا۔ ''آخر تمہیں میری خاطر آنا ہی پڑا۔''

''میں پوجا کے لیے آئی تھی۔'' راج کماری کرشنا کے انداز سے بے رُخی جھلک رہی تھی۔

''تو پھر مندر میں جاؤ اور پوجا کرو۔ یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' بھوج راج نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میری چھوٹی بہن، میرا پوجا کر رہی ہے۔ میں اسی کے انتظار میں کھڑی ہوں۔'' کرشنا مسلسل بے نیازی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

پھر دونوں کی ملاقاتیں روزانہ کا معمول بن گئیں۔ بھوج راج اور کرشنا ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پھر جب ان کو ہوش آیا تو ایک خوفناک صورتِ حال ان کے سامنے کسی طاقتور رقیب کی طرح چٹان بنی کھڑی تھی۔

اودے پور اور جودھپور پڑوسی ریاستیں تھیں جن میں ایک طویل عرصے سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ اودے پور کا حکمراں رانا کُمبھ اور جودھپور کا حاکم راجہ ویرول ایک دوسرے کا نام سننے کے بھی روادار نہیں تھے۔

''راج کنور! ہم ایسے راستے پر چل پڑے ہیں جو زہریلے کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ پھر یہ سفر کیسے طے ہو گا؟'' راج کماری کرشنا پر شدید اضطرابی کیفیت طاری تھی۔

''میں اس راستے میں اپنی محبت کے گلاب بچھا دوں گا راج کماری!'' بھوج راج نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

''اس جنم میں تو یہ ممکن نہیں۔'' راج کماری کرشنا نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ ''شاید اگلے جنم میں ہمارا ملن ہو جائے گا۔''

''نہیں کرشنا! ہمارا ملن اسی جنم میں ہو گا۔'' یہ کہہ کر راج کنور بھوج راج چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں یقین کی گہری چمک تھی...... مگر راج کماری کرشنا کی آنکھوں میں آنسو تھے...... اور تاحدِ نظر مایوسیوں کا غبار پھیلا ہوا تھا۔

❀---❀---❀

''راج کنور! تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اودے پور کے رانا کُمبھ نے بھوج راج کی بات سن کر کہا۔ ''ہم تمہارے لیے اپنے دشمن کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے جائیں گے؟''

''اب دشمنی نبھانے کا وقت نہیں رہا پتا جی مہاراج!'' اودے پور کے ولی عہد نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں راج کماری کرشنا کو زبان دے چکا ہوں۔ اگر راجپوت کا وچن پورا نہیں ہوا تو میں اپنی زبان کاٹ کر جودھپور بھیج دوں گا۔''

بھوج راج اس معاملے میں اس قدر جذباتی تھا کہ آخر رانا کُمبھ کو بیٹے کی ضد کے آگے سر جھکانا پڑا۔

پھر اس کا بڑا بیٹا رانا اودے کرن، بھوج راج کا رشتہ لے کر جودھپور پہنچا۔ رانا اودے کرن کی آمد پر پوری ریاست میں انتہائی حیرت کا اظہار کیا گیا۔ پھر جب اودے پور کے ولی عہد نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو راجہ ویرول اُس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ جودھپور کے حاکم کو اس انقلاب پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''انقلاب آ چکا ہے مہاراج!'' رانا اودے کرن نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ انقلاب چوہانوں اور راٹھوروں کی تاریخ بدل ڈالے گا۔ راج کنور بھوج راج اور راج کماری کرشنا کی شادی راجپوت اتحاد کی علامت ہوگی۔ دونوں ریاستیں مل کر مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کی ہوسِ ملک گیری کا مقابلہ کریں گی...... اور پھر راجپوتانہ کی سربلند پہاڑیاں اس کے خوابوں کا مدفن بن جائیں گی۔''

راجہ ویرول بھی بہت دن سے راجپوت اتحاد کے خواب دیکھ رہا تھا۔ رانا کمبھ نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو اس نے بھی سرِتسلیم خم کر دیا۔ پھر بھوج راج اور کرشنا کی شادی کی تاریخ طے پا گئی۔ دونوں طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ یہ ایک ایسی مسرت انگیز خبر تھی کہ راج کماری کرشنا جوشِ جذبات میں اپنی چھوٹی بہن میرا سے لپٹ کر رونے لگی۔

''بھگوان دنیا بھر کے سکھ تمہارے قدموں میں ڈال دے۔'' راج کماری میرا نے بڑی بہن کو دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ ''تم کیسی خوش نصیب ہو کہ تمہیں تمہارے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ لیکن ذرا اس سے تو پوچھو جو برسوں سے زندگی کے خارزار میں اپنے خواب کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ تعبیر تو کیا، اس کا ہلکا سا عکس بھی نظر نہیں آتا۔'' میرا نے دبے لفظوں میں اپنے دل کا درد بیان کیا تھا...... مگر کرشنا، بھوج راج کے تصور میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ وہ چھوٹی بہن کی باتوں کا مفہوم سمجھ ہی نہیں سکی۔

❀---❀---❀

جب یہ شادی طے ہوئی تھی، اس وقت راجہ ویرول کا چھوٹا بھائی جے مل جودھپور سے باہر گیا ہوا تھا۔ پھر وہ شادی سے ایک روز پہلے واپس آیا...... اور ہنگامہ خیز جشن کی تیاریاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''بھائی جی مہاراج! آپ میرا انتظار نہیں کر سکتے تھے؟'' جے مل نے انتہائی ناگوار لہجے میں کہا۔ ''میرے جیتے جی یہ شادی ممکن نہیں۔ میں اپنی بھتیجی کو دشمن کے بیٹے کے حوالے نہیں کر سکتا۔ کرشنا میری بیٹیوں جیسی ہے۔''

''میں نے یہ شادی راجپوت اتحاد کے لیے کی ہے۔'' راجہ ویرول نے چھوٹے بھائی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آپ بہت سادہ ہیں بھائی جی مہاراج!'' جے مل کا لہجہ طنز آمیز تھا۔ ''رانا کیا جانے کہ قبیلوں کا میل کیا ہوتا ہے اور وطن دوستی کسے کہتے ہیں؟...... اس نے تو راجپوت اتحاد کی آڑ میں آپ کے ساتھ خوفناک کھیل کھیلا ہے۔ وہ ہماری بیٹی بیاہ کر ہمیں زندگی بھر ذلیل کرنا چاہتا ہے۔''

''اب کچھ نہیں ہو سکتا جے مل! میں رانا کو زبان دے چکا ہوں۔'' راجہ ویرول نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہتا ہوا جے مل اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''اگر کرشنا اس گھر سے رخصت ہوئی تو میں بھی ہمیشہ کے لیے راج محل سے رخصت ہو جاؤں گا۔''

''مردوں نے اپنے قول کی خاطر بہت کچھ چھوڑا ہے، جے مل! اگر تم بھی چھوٹ گئے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہو گی۔'' راجہ ویرمل نے چھوٹے بھائی کی ضد کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔

جے مل بھی راجپوت تھا۔ غصے میں راج محل چھوڑ کر چلا گیا۔

اودے پور سے بارات آ چکی تھی ...... اور جودھپور کے مضافاتی علاقے میں ایک بڑے زمیندار کے مکان میں ٹھہری ہوئی تھی۔

شادی کا دن آیا تو راج بھون میں کہرام برپا ہو گیا۔ راج کماری کرشنا نے زہر کھا کر خودکشی کر لی تھی۔

❀---❀---❀

راج کماری کرشنا نے مرنے سے پہلے اپنے باپ راجہ ویرمل کے نام ایک جانگداز خط تحریر کیا تھا۔

''پتا جی! جب آپ راجپوت اتحاد کی باتیں کرتے تھے تو ایسا لگتا تھا جیسے پہاڑی چٹانوں میں خوبصورت پھول کھلے ہوں۔ بے شک! آپ مہان ہیں اور میں نے آپ کی مہانتا (عظمت) کے سائے میں بچپن سے لے کر جوانی تک بہت حسین اور دلفریب خواب دیکھے تھے۔ پھر یہ خواب اس وقت بکھر گئے جب چاچا جی (جے مل) نے چوہانوں اور راٹھوروں کے درمیان قائم ہونے والے نئے رشتے سے انکار کر دیا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد افسوس ہو رہا ہے کہ جب دو بھائی آپس میں متحد نہیں ہو سکتے تو پھر لاکھوں راجپوت کس طرح دل سے دل ملا سکتے ہیں؟ چوہان، چوہان رہیں گے ...... اور راٹھور، راٹھور۔ انسان کا بنیادی فرض یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے گھر کی طرف دیکھے۔ آپ اودے پور اور جودھپور کے سیاسی اتحاد کی طرف دیکھ رہے ہیں اور میں اپنے گھر کی طرف جہاں ایک خوفناک طوفان آیا ہوا ہے۔ ایک ہی دیوار کی اینٹیں آپس میں اس قدر شدت کے ساتھ متصادم ہیں کہ راج بھون کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے ...... اور اس زلزلے کی وجہ صرف میری ذات ہے۔ چاچا جی ایک کٹر راجپوت ثابت ہوئے۔ وہ اپنے قبیلے اور ذات کے خول سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں۔ مجبوراً میری بے قرار روح کو جسم کی قید سے باہر نکلنا پڑے گا تا کہ یہ خاندانی اتحاد برقرار رہے۔ آخر میں آپ سے التجا ہے کہ جب میں اس دُکھوں بھرے سنسار سے بہت دُور چلی جاؤں تو میری ارتھی (جنازے) کو اودے پور اور جودھپور کی سرحد پر رکھ کر آگ لگا دینا۔ پھر تھوڑی سی راکھ ہوا میں اُڑا دینا تا کہ میری خاک کے کچھ ذرّے دونوں ریاستوں کی مٹی میں مل جائیں۔ ایک کمزور عورت راجپوت اتحاد کے لیے بس اتنا ہی کر سکتی تھی۔'' .... آپ کی بیٹی کرشنا۔

راجہ ویرمل ایک نہایت شجاع اور مضبوط اعصاب رکھنے والا راجپوت تھا ...... مگر بیٹی کا خط پڑھ کر چیخ اٹھا۔ پھر وہ کرشنا کی لاش سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی پتھر میں شگاف پڑ گیا ہو اور اس سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہوں۔

''بیٹی! تُو نے قبیلے اور خاندان کی رسموں کو تو بچا لیا...... مگر بوڑھے باپ کو جیتے جی مار ڈالا۔'' راجہ ویرمل، بیٹی کی لاش سے لپٹ کر زار و قطار رو رہا تھا۔ ''تُو نے ریاست جودھپور کی تاریخ اپنے خون سے لکھ ڈالی۔ کاش! راجپوتانہ کے لوگ تیری اس خونی تحریر کا مفہوم سمجھ سکیں۔''

❀---❀---❀

چالیس دن کا سوگ منانے کے بعد راجہ ویرمل نے اپنی چھوٹی راج کماری میرا کو کنور بھوج راج سے بیاہ دیا۔ شادی سے پہلے ماں باپ نے بیٹی سے اُس کی مرضی کے بارے میں پوچھا تو راج کماری میرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھگوان کی مرضی کے آگے کس کی مرضی چلی ہے؟ میری بھی وہی مرضی ہے جو میرے دیوتا کی مرضی ہے۔ میں تو کاغذ کی ایک ناؤ ہوں۔ میرا مانجھی مجھے جدھر لے جائے گا، اسی طرف چلی جاؤں گی۔''

دنیا دار ماں باپ سمجھ ہی نہیں سکے کہ ان کی گیانی بیٹی کیا کہنا چاہتی ہے؟ بالآخر راج کماری میرا، بابل کا گھر چھوڑ کر پیا کے دیس چلی گئی۔

کنور بھوج راج اپنی منگیتر کرشنا کے مرنے کے بعد بہت اُداس رہا کرتا تھا...... مگر جب کرشنا کی چھوٹی بہن میرا اُس کی بیوی بن کر آئی تو وہ چالیس دن پرانے دُکھوں کو بھول گیا۔

''میرے اور تمہارے رشتے کی بنیاد کرشنا کی یادیں ہیں۔'' کنور بھوج راج نے اپنی دُلہن کے قریب آتے ہوئے کہا۔

''میں تو ہر وقت کرشنا ہی کی یادوں میں کھوئی رہتی ہوں۔'' راج کماری میرا کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی تو بھوج راج اس کی آواز کے ترنم پر حیران رہ گیا۔ میرا کے لہجے میں شہد کی سی مٹھاس تھی...... اور اس ہلکی سی بارش کا ترنم تھا جب پانی کے قطرے کسی جھیل یا درخت کے پتوں پر برستے ہیں۔

''میرے تو خواب بھی کرشنا کے لیے ہیں۔ سوتے جاگتے جدھر بھی دیکھتی ہوں، کرشنا ہی کو پاتی ہوں۔''

''ویسے تو کرشنا کی یادیں ہمیشہ ہی ہمارے دلوں میں محفوظ رہیں گی...... مگر آج کی رات ان یادوں کو بھلا دینا ہی اچھا ہے۔'' کنور بھوج راج نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

''راج کنور! مجھے چھونا نہیں۔'' میرا کے لہجے میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔

''کیوں؟'' بھوج راج نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ بیوی کے اس طرزِ عمل کو ادائے محبوبانہ سے تعبیر کر رہا تھا۔

''مجبوری ہے راج کنور!...... بہت بڑی مجبوری ہے۔'' میرا نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔ ''میرے اور آپ کے درمیان ایک دیوار ہے، جسے کسی بھی حال میں گرایا نہیں جا سکتا۔''

''کیسی دیوار؟'' کنور بھوج راج نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ ''ساری دیواریں تو گرائی جا چکی ہیں۔ ہمیں اس وقت دیوتاؤں کا آشیرواد بھی حاصل ہے اور دنیا کے قانون کی پناہ بھی۔ اب ہمیں کوئی بھی نہیں روک سکتا۔''

''میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔'' میرا نے سرشاری کے لہجے میں کہا اور آنکھیں کھول دیں۔ ''میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ کسی دوسرے کی محبت کو اپنے دل میں جگہ نہیں دوں گی۔ راج کنور! آپ بھی اس دروازے پر دستک نہ دیں جو بہت سال پہلے بند ہو چکا ہے۔ اب وہ دروازہ کبھی نہیں کھلے گا۔ شما چاہتی ہوں کہ آپ اتنی دُور چل کر آئے۔ میری بنتی (التجا) ہے کہ آپ خاموشی کے ساتھ لوٹ جائیں۔'' یہ کہہ کر راج کماری میرا نے شوہر کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

کنور بھوج راج سنجیدہ ہو گیا۔ بات اب مذاق کی حدود سے نکل گئی تھی۔ اس نے میرا کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو الگ کر دیا۔ ''مجھے بتاؤ کہ تم کسے چاہتی ہو؟''

''وہی تو ہے جس کے ساتھ بچپن سے کھیلی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے راج کماری میرا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔

بھوج راج کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ جب اس نے بیوی کا گھونگھٹ اُلٹا تھا، اس وقت میرا کے چہرے پر حیاء کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا...... پھر راج کماری نے ایک اجنبی کا ذکر کیا تو اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی اور شدتِ جذبات سے رخسار گلابی ہو گئے۔

''کون ہے وہ جو تمہارے ساتھ بچپن سے کھیلا ہے؟'' کنور بھوج راج کے لہجے میں ناخوشگواری کا رنگ شامل ہو گیا تھا۔

''بچپن کیا، وہ تو اس وقت بھی میرے پاس موجود ہے۔'' راج کماری میرا نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''میرا مرن جیون (موت و حیات) تو اُسی کے ساتھ ہے۔ جب دنیا والے میرے فانی جسم کو آگ میں جلا ڈالیں گے، تب بھی وہ مجھ سے جدا نہیں ہوگا، میری راکھ کے ایک ایک ذرّے میں سما جائے گا۔''

ایک اجنبی کے ساتھ اپنی بیوی کا والہانہ عشق دیکھ کر کنور بھوج راج کے دل و دماغ جل اُٹھے۔ ''میں پوچھتا ہوں وہ کون ہے جو ایک راجپوت کی خلوت میں داخل ہو گیا ہے؟'' اب کی بار بھوج راج کے لہجے میں تحکم بھی تھا اور غصہ بھی۔

''اس کے سوا کون ہو سکتا ہے جس کے ماتھے پر مور مکٹ سجا ہوا ہے۔'' میرا نے شوہر کے غصے کو ایک معمولی بات کی طرح نظرانداز کر دیا اور بہت شوخ انداز میں مسکراتی رہی۔ ''وہ میرے کرشن کے سوا کون ہو سکتا ہے؟....... ہاں! وہی تو ہے۔ بندرابن کی گوپیوں کا کنہیا....... ماکھن چور..... نٹ کھٹ نند لالہ۔'' میرا نے ایک ہی زبان میں اپنے دیوتا شری کرشن کی ساری صفات بیان کر دی تھیں۔

بھوج راج نے سکون کی سانس لی۔ ''تم نے تو مجھے بدحواس کر دیا تھا میرا!'' بھوج راج نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ جب تم مور مکٹ والے کرشنا سے اتنی محبت کرتی ہو تو پھر تمہارے ماں باپ نے اس کے ساتھ تمہاری شادی کیوں نہیں کر دی؟'' بھوج راج نے اپنی دُلہن سے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

''میری شادی تو ہو چکی اس کے ساتھ۔'' میرا کے لہجے میں ناقابلِ بیان کیف و نشاط کی آمیزش تھی۔

''بارات کب آئی تھی؟...... اور تمہاری شادی میں کون کون شریک تھے؟'' بھوج راج نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

''کوئی نہیں آیا تھا بارات میں۔ ہم دونوں کے سوا شادی میں کوئی نہیں تھا۔'' میرا کے لہجے کی سرشاری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ''اس نے مجھے سویکار (قبول) کر لیا...... اور میں نے اُسے۔ بس! یہی تو شادی ہوتی ہے۔''

کنور بھوج راج نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، پھر ہیروں سے مرصع ایک قیمتی ہار اپنی بیوی کے گلے میں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میرا! یہ ہماری محبت کا پہلا تحفہ ہے۔ اسے قبول کر لو۔''

دوسرے ہی لمحے راج کماری میرا نے وہ قیمتی ہار گلے سے اُتار دیا۔ ''راج کنور! آپ کے اس تحفے کا بہت بہت شکریہ۔ ایک جوگن کو ان چیزوں سے کیا غرض اسے تو بس گیندے کے پھولوں کا ہار کافی ہے۔ یہ میری طرف سے دان (خیرات) کر دو۔ بہت سے غریبوں کا بھلا ہو جائے گا۔''

کنور بھوج راج اپنی سہاگ رات تباہ کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے بیوی کے طرزِ عمل پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ پھر بھی اس نے دبے لفظوں میں شکایت کرتے ہوئے کہا۔

''تم میری محبت کے تحفے کو غریبوں میں تقسیم کرنے کے لیے کہہ رہی ہو؟ کیا شاہی خزانہ خالی ہو گیا ہے؟ بہت دولت ہے میرے پاس دان پن (صدقہ و خیرات) کرنے کے لیے۔ جتنا جی چاہے، اپنے ہاتھوں سے بانٹ دو۔''

''وہ ساری دولت راج گھرانے کی ہے۔ اُس پر میرا کوئی ادھیکار (حق) نہیں۔'' راج کماری میرا نے بے نیازانہ کہا۔ ''یہ تحفہ میرا ہے اور میں اسے تقسیم کرنے کا حق رکھتی ہوں۔''

بیوی کی دلیل سن کر کنور بھوج راج لاجواب سا ہو گیا۔ تاہم اس نے میرا کی اس حرکت پر شدید احتجاج کیا۔ ''تمہاری نظروں میں میرے تحفے کی یہ قدر و قیمت ہے؟''

''اگر دنیا کا راج پاٹھ بھی مل جائے تو میری نظروں میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔'' شوہر کے غصے میں احتجاج کے باوجود میرا کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ''مجھے تو بس کرشنا کی محبت چاہئے۔ اُس کی مُرلی کی ایک تان پر سنسار کا سارا دھن قربان۔'' یہ کہہ کر میرا پھولوں کی سیج سے نیچے اُتر آئی اور شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''بہت رات ہو گئی ہے۔ اب آپ سو جائیے۔''

''تم کہاں سوؤ گی؟'' کنور بھوج راج نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔

''پتھر کا فرش میرا بستر ہے۔'' میرا پر جذب کی سی کیفیت طاری تھی۔ ''یہ پتھر کا فرش اور قیمتی قالین بھی میری مجبوری ہے...... ورنہ جوگن کو تو مٹی کا فرش اور چٹائی کا بستر چاہئے۔''

کنور بھوج راج کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ یہ کہتا ہوا حجلۂ عروسی سے نکل گیا۔ ''میں جا رہا ہوں۔ تم اپنے کرشنا کو بلا لو۔''

راج کماری میرا مسکرائی۔ ''میرا سوامی (مالک شوہر) تو ہر وقت میرے ساتھ ہے، اسے بلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو ہر سانس میں شامل ہے، میرے جسم میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔''

بھوج راج نے کمرے سے نکلتے وقت اپنی بیوی کے یہ الفاظ سنے اور اس کے چہرے پر شدید اذیت و کرب کے سائے پھیل گئے۔

❋---❋---❋

کنور بھوج راج نے اپنی شادی کی پہلی رات کھلے آسمان کے نیچے، باغیچے میں گزاری۔ آسمان سے گرنے والی شبنم، راج کنور کے سر کو بھگو رہی تھی مگر اس کے دل میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ بھوج راج اس آگ کو بجھانے کے لیے رات بھر شراب پیتا رہا۔ آتشیں سیال نے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ کو سرد کرنے کے بجائے تیز تر کر دیا تھا۔

اسی دوران راج محل کی ایک داسی شکنتلا ادھر آ نکلی۔ یہ وہ خوب صورت کنیز تھی جو اپنے دلکش خدوخال سے بھوج راج کے شبستان کو روشن کیا کرتی تھی۔ اس نے اپنے آقا کو اس حال میں دیکھا تو قریب چلی آئی۔

''راج کنور! اس وقت تو آپ کو کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔'' شکنتلا نے بڑے ناز و ادا کے ساتھ کہا۔

''اندر بہت حبس تھا۔'' بھوج راج نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے کھلی ہوا میں چلا آیا۔''

شکنتلا نے اپنے آقا کو خوش کرنے کے لیے جامِ شراب لبریز کرنا چاہا...مگر بھوج راج نے انکار کر دیا۔

''شکنتلا! اب تُو ہمارے قریب نہ آنا۔ بیتے ہوئے دنوں کو بھول جا۔''

شکنتلا مسکراتے ہوئے چلی گئی۔ پھر بھوج راج نے آخری جام بھرا اور حلق سے اُتار لیا۔ کثرتِ شراب نے اس کے حواس چھین لیے تھے۔ آخر وہ اسی باغیچے میں سو گیا۔

راج کنور کی آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کی تیز کرنیں چاروں طرف پھیل گئی تھیں......اور مہارانی پدما، بیٹے کو جھنجوڑ کر پوچھ رہی تھی۔

''بیٹے! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کیا تم نے ساری رات یہیں گزاری ہے؟''

''رات کے پچھلے پہر ٹہلتا ہوا ادھر آ نکلا تھا۔'' بھوج راج نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ''ٹھنڈی ہواؤں نے سلا دیا۔''

ماں نے بیٹے کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''بھوج راج! تمہیں دُلہن پسند آئی؟''

''بہت زیادہ!'' راج کنور جبراً مسکرایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

❋---❋---❋

پھر بھوج راج نے کئی راتیں باغیچے میں شراب پیتے گزار دیں......اور راج محل میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے خوش نہیں ہیں۔ راج کماری میرا ہر وقت کھوئی کھوئی، اُداس رہتی تھی۔ اُس کا افسردہ چہرہ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی غم اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ ایک دن بھوج راج

کمرے میں پہنچا تو میرا آنکھیں بند کیے ایک دردناک گیت گا رہی تھی۔

''بادل ہر طرف سے جھوم جھوم کر آئے ہیں مگر وہ ہری (کرشن) کا کوئی پیغام نہیں لائے...... پرندے اپنی شیریں آوازوں سے سننے والوں کے دلوں میں جوش پیدا کر رہے ہیں۔ کوئل چیخ رہی ہے...... ایسی تاریکی میں بجلی چمک چمک کر ان عورتوں کو خوفزدہ کر رہی ہے جن کے شوہر باہر ہیں...... ہوائیں مسلسل موسیقی سے لبریز ہیں...... بارش مسلسل ہو رہی ہے...... اور جدائی کی گھڑیاں کالے سانپ کے مانند ڈرا رہی ہیں...... مگر میرا کا دل ہری کے خیال میں کھویا ہوا ہے۔''

راج کماری کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے...... اور دلکش چہرے پر درد کی گہری پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

بیوی کی زبان سے جدائی کا یہ گیت سن کر بھوج راج کو غصہ آ گیا اور اس نے میرا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''تم کس کا گیت گا رہی تھیں؟''

راج کماری میرا نے چونک کر شوہر کی طرف دیکھا۔ ''میں غیروں کی دی ہوئی چیز پسند نہیں کرتی۔ یہ گیت میں نے خود لکھا ہے۔'' اچانک میرا کے لہجے سے سرشاری جھلکنے لگی تھی۔

''پھر جھوٹ کیوں بولتی ہو؟'' بھوج راج کا لہجہ انتہائی تند و تیز تھا۔ ''تمہارا شوہر تو تمہارے قریب کھڑا ہے۔ پھر تم کس کی جدائی میں آنسو بہا رہی ہو؟''

''راج کنور! میں آپ سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ میرا سوامی کوئی اور ہے۔'' راج کماری نے اسی والہانہ لہجے میں کہا جیسے کوئی فراق زدہ عورت اپنے محبوب کو پکارتی ہے۔ ''میں اپنی روح، اپنا جسم، سب کچھ اس کے حوالے کر چکی ہوں۔''

بے حیائی کی یہ گفتگو سن کر بھوج راج کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور اس نے بیوی کے منہ پر اس قدر زوردار تھپڑ مارا کہ میرا زمین پر گر پڑی اور اس کا سر پتھر کے فرش سے ٹکرایا۔

شدید چوٹ کے باوجود میرا اُٹھ کر بیٹھ گئی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ ''راج کنور! اگر آپ میرے جسم کے ٹکڑے کر ڈالیں، تب بھی میں اپنے سوامی کی محبت سے انکار نہیں کروں گی۔''

''کس پاگل عورت کو میرے حوالے کر دیا گیا ہے؟'' بھوج راج چیختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

❁---❁---❁

پھر یہ بات عام ہو گئی کہ جودھپور کی راج کماری میرا ذہنی مریضہ ہے۔ راج محل میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ آخر میرا کی ذہنی آزمائش کے لیے اسے راج گرو دھرم داس کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ ایک خفیہ قسم کا اجلاس تھا جس میں اودے پور کا حاکم رانا کمبھ، رانی پدما، ولی عہد اودے کرن اور بھوج راج شامل تھے۔

راج گرو دھرم داس نے میرا سے اس کے سوامی (کرشن) کے بارے میں کئی سوالات کیے۔ جواب میں میرا نے اپنے وہ گیت دہرا دیئے جو اس نے شری کرشن کی محبت میں ڈوب کر لکھے تھے۔ ایک گیت کا

عنوان ''محبوب'' تھا۔

''موہن (شری کرشن) کے حُسن و جمال نے میرا من موہ لیا ہے۔ مجھے بازار اور راستے میں اس کا خیال ستایا کرتا ہے...... اس کا جسم سراپا حُسن ہے...... اس کی آنکھیں کیا ہیں، کھلے ہوئے خوب صورت پھول ہیں...... اس کی نظر بلا کی دلفریب ہے...... اس کا تبسم بے حد شیریں ہے...... وہ جمنا کے ساحل پر گائیں چراتا ہے...... اور اپنی محبت آفرین بانسری بجایا کرتا ہے..... میں اپنا جسم، اپنی روح اور اپنی دولت اس کے سپرد کرتی ہوں...... اور اس کے کنول جیسے قدموں پر دن رات سجدے کرتی ہوں۔''

راج گرو اور راج گھرانے کے دوسرے افراد نے میرا کا گیت سنا۔ سب کے چہروں پر حیرت کے آثار تھے...... مگر بھوج راج شدید اذیت میں مبتلا تھا۔ اس کی بیوی اپنے دیوتا کے عشق میں مبتلا تھی...... مگر شوہر سے مسکرا کر بات کرنے کی بھی روادار نہیں تھی۔ میرا کے اس طرزِ عمل نے راج کنور کو غضب ناک کر دیا تھا۔

''مہاراج! آپ نے سنا؟'' بھوج راج کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔

''سنا بھی ہے اور سمجھا بھی ہے۔'' راج گرو نے میرا کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کرشن جی تو ہمارے بھی دیوتا ہیں۔ مگر راج کماری، من موہن کی محبت میں کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ گئی ہیں۔''

''تو پھر آپ انہیں سمجھائیں کہ دیوتا کسے کہتے ہیں اور پتی دیوتا کیا ہوتا ہے؟'' راج کنور بھوج کے لہجے سے بدستور تلخی جھلک رہی تھی۔

''دیکھو بیٹی!'' راج گرو نے میرا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دیوتا بھکتی اپنی جگہ...... مگر پتی بھکتی (شوہر کی عبادت) کا بھی اونچا مقام ہے۔ جب تک پتی دیو کو راضی نہیں کرو گی، اس وقت تک بھگوان بھی تم سے راضی نہیں ہوں گے۔ اگر تم خود کو ایک پتی ورتا پتنی (شوہر کی تابعدار بیوی) ثابت نہ کر سکیں تو پھر سب کچھ اکارت جائے گا...... اور دنیا تمہیں خیانت کرنے والی عورت کے نام سے پکارے گی۔''

میرا سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی جیسے اس نے راج گرو کی باتیں سنی ہی نہ ہوں۔

❁---❁---❁

بھوج راج کا خیال تھا کہ راج گرو کی نصیحتوں کے بعد میرا کے روّیے میں تبدیلی آ جائے گی...... مگر وہ سرمست عشق، گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ کرشن جی کی محبت میں غرق ہوتی چلی گئی۔ اس نے اپنے آراستہ کمرے کو پوجا پاٹھ کا استھان بنا کر رکھ دیا تھا۔ دیواروں پر مختلف پتھروں کی مالائیں لٹک رہی تھیں... ہر گوشے میں مٹی کے لوٹے اور پیتل کے طباق رکھے ہوئے تھے...... اور کمرہ ہر وقت لوبان کے دھوئیں سے بھرا رہتا تھا۔

ایک دن بھوج راج غصے میں بھرا ہوا اندر آیا۔ میرا حسبِ دستور آنکھیں بند کیے اپنے سوامی (کرشن جی)

کو پکار رہی تھی۔

''جب تمہاری شادی پتھر کی ایک مورتی سے ہو چکی تھی تو پھر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟'' بھوج راج نے چیخ کر کہا۔

میرا نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور بڑے اطمینان کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں نے راجپوتوں کی آن بچانے کے لیے تم سے شادی کی۔ اس سے پہلے میری بہن کرشنا نے بھی راجپوتوں کی اونچی ناک پر اپنی جان قربان کر دی تھی۔ وہ پھول جیسی جان تھی، زہر پیتے ہی مر گئی۔ زہر تو میرے جسم میں بھی داخل ہو چکا ہے..... مگر میں ایک سخت جان عورت ہوں۔ ابھی میرے مرنے کا وقت نہیں آیا ہے۔''

اس کے بعد بھوج راج نے اپنی بیوی سے کوئی بات نہیں کی۔ اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے چلا گیا۔

پھر راج کنور نے دوسرا کمرہ آراستہ کر لیا جہاں شکنتلا اور راج محل کی دوسری خوبصورت داسیاں اس کی غمگسار تھیں۔ بھوج راج شادی سے پہلے بھی شراب پیا کرتا تھا..... مگر جب سے اس کی ازدواجی زندگی ناکام ہوئی تھی، وہ شب و روز نشے میں ڈوبا رہتا تھا۔

❋---❋---❋

راج کماری میرا کے عشق کی سرشاری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک دن وہ ساس اور خسر سے اجازت لے کر راج محل کے باہر ایک غیر آباد مندر میں پوجا کے لیے چلی گئی۔ پھر جب اس کی نظر کرشن جی کی مورتی پر پڑی تو وہ بے اختیار ہو کر رقص کرنے لگی۔ اس وقت مندر میں کوئی دوسرا متنفس موجود نہیں تھا۔

پھر جب میرا، پوجا کے لیے روزانہ مندر جانے لگی تو رانا کمبھ نے بہو کی خاطر مندر کو نئے انداز سے سجا دیا۔ نتیجتاً قرب و جوار کے دوسرے پجاری بھی پوجا کے لیے مندر آنے لگے۔ وہ سب کے سب میرا کے احسان مند تھے کہ اس کی وجہ سے برسوں بعد ان پر مندر کے دروازے کھلے تھے۔ میرا کے جذب کی کیفیت میں دم بہ دم اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے لکھے ہوئے بھجن گاتی اور گھنٹوں بڑے والہانہ انداز میں کرشن جی کی مورتی کے سامنے ناچتی رہتی۔ پجاریوں میں بھی ہر قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ ایک خوبصورت عورت کو رقص کرتے ہوئے دیکھتے تو خود بھی ناچنے لگتے۔ بظاہر تو یہی محسوس ہوتا کہ پجاریوں پر بھی جذب و مستی کی کیفیت طاری ہے..... مگر دراصل ناچنے والوں کا نقطۂ نظر کچھ اور ہوتا تھا۔

پھر یہ خبر پوری ریاست میں مشہور ہو گئی کہ رانا کمبھ کی بہو بیراگن ہو گئی ہے اور وہ سینکڑوں پجاریوں کے سامنے بے حجابانہ رقص کر رہی ہے۔ یہ خبر سن کر اودے پور کے حاکم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

آخر ایک دن وہ اپنی بیوی رانی پدما، ولی عہدِ سلطنت اودے کرن اور کنور بھوج راج کو لے کر مندر پہنچا۔ اس وقت وہاں سینکڑوں پجاری جمع تھے..... اور راج کماری اس طرح مست و بے خود ہو کر ناچ رہی تھی کہ اسے اپنے گرد و پیش کی خبر بھی نہیں تھی۔ رانا کمبھ غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے تمام پجاریوں کو جبراً مندر سے بھگا دیا اور میرا کو زبردستی شاہی رتھ میں ڈال کر راج محل پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد مندر پر تالے

ڈال دیئے گئے۔

❀---❀---❀

پھر رانا کمبھ نے اپنے سدھی راجہ ویرول کو ایک طویل خط تحریر کیا۔

"ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تم اس طرح ہم سے انتقام لو گے۔ تم نے جان بوجھ کر اپنی پاگل بیٹی کو بھوج راج سے بیاہ دیا۔ تمہاری لڑکی میرا یا تو ذہنی مریضہ ہے یا پھر انتہائی درجے کی بے حیا۔ اپنی آنکھوں سے آ کر دیکھو کہ میرا کس طرح ناچ ناچ کر راج گھرانے کی آبرو سرِعام نیلام کر رہی ہے۔"

بیٹی کے بارے میں ایسی شرم ناک باتیں پڑھ کر راجہ ویرول کے دل میں تیز درد اُٹھا اور وہ تھوڑی ہی دیر میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ جے مل ناراض ہو کر جودھپور سے دُور چلا گیا تھا۔ بھائی کی موت کی خبر سن کر وہ راج بھون پہنچا......اور راجہ ویرول کی لاش کے قریب کھڑے ہو کر چیخنے لگا۔

"میں نے بھائی جی مہاراج کو منع کیا تھا کہ وہ رانا خاندان سے کوئی رشتہ نہ جوڑیں۔ یہ سمبندھ (تعلق) ہمارے پریوار (خاندان) کے لیے اشبھ (منحوس) ثابت ہوا۔ دیکھ لیا تم لوگوں نے راجپوت اتحاد کا نتیجہ؟......کرشنا زہر کھا کر مر گئی......اور بھائی جی مہاراج کو ان کے دل نے کھا لیا۔"

پھر راجہ ویرول کی ارتھی اُٹھی۔ سدھیانے کے لوگ بھی شریک ہوئے......اور غم زدہ میرا بھی اپنے باپ کا آخری دیدار کرنے کے لیے جودھپور آئی۔

چتا کو آگ لگنے اور دوسری رسوم ادا ہونے کے بعد رانا کمبھ نے میرا کے چچا راجہ جے مل سے اس کی بھتیجی کے بارے میں گفتگو کی۔

"اب یہ آپ کا دھن ہے۔ جیسے چاہیں استعمال کریں۔" راجہ جے مل نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں آپ سے کبھی کوئی شکایت نہیں کروں گا۔"

چچا کی بے رحمانہ گفتگو سن کر میرا شدتِ کرب سے رو پڑی۔ "آپ بھی میری بات نہیں سمجھتے چاچا جی!"

"جو عورت شوہر کے حقوق ادا نہیں کرتی، وہ دنیا اور دھرم دونوں کے قانون میں مجرم ہے۔" راجہ جے مل نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

میرا اپنی ماں للیتا سے لپٹ کر روتی رہی......مگر ایک بیوہ عورت اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ راجہ ویرول کی موت کے بعد ریاست جودھپور کا اقتدار جے مل کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا اور اب رانی للیتا بھی دیور کے رحم و کرم پر تھی۔

آخر عشق کی ماری میرا، میکے کی یادوں کو دل کے آنچل میں سمیٹے سسرال واپس چلی گئی۔

❀---❀---❀

بھوج راج، میرا کے غم کو بھلانے کے لیے دن رات شراب کے نشے میں غرق رہتا تھا۔ ایک رات اُس پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ بے ہوشی کی حالت میں چلا گیا۔ بھوج راج کے دماغ کی شریان پھٹ

گئی تھی...... اور اس کی ناک سے خون جاری تھا۔ ریاست اودے پور کے تمام ماہر طبیبوں اور ویدوں کو طلب کر لیا گیا...... مگر وہ سب مل کر بھی جانے والے کو نہیں روک سکے۔ کنور بھوج راج تین دن بے ہوش رہ کر دنیا سے چلا گیا۔

اس دوران میرا نے شوہر کی زندگی کے لیے برت (روزہ) بھی رکھا...... لیکن جب کسی انسان کے دن پورے ہو جاتے ہیں تو پھر کوئی دوا اور کوئی دعا کام نہیں آتی۔ بھوج راج کو جانا تھا،، سو چلا گیا۔ دنیا والوں کی نظر میں میرا بیوہ ہو گئی۔ راج محل کی عورتوں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی چوڑیاں توڑ ڈالے...... لیکن میرا کے ہاتھوں میں چوڑیاں ہی کہاں تھیں؟ اس نے تو بہت پہلے تمام زیوروں اور آرائش کی دیگر چیزوں کو اپنے بدن سے الگ کر دیا تھا۔

میرا کا جیٹھ رانا اودے کرن، بھاوج کی مجنونانہ حرکتوں سے بہت نالاں رہتا تھا مگر چھوٹے بھائی کی وجہ سے اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ پھر جیسے ہی بھوج راج کا انتقال ہوا، اودے کرن نے میرا سے نجات حاصل کرنے کے لیے نئی ترکیب ڈھونڈ نکالی۔

''راج کنور دنیا سے جا چکا ہے، اس لیے تم بھی یہ سنسار چھوڑ دو۔'' اودے کرن نے بھاوج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں اس سنسار کو کبھی کا چھوڑ چکی ہوں۔'' میرا نے اُداس لہجے میں کہا۔

''تمہیں آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جلنا ہوگا۔'' اودے کرن نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہی ایک پتنی کا دھرم ہے کہ وہ پتی کے ساتھ ہی ستی ہو جاتی ہے۔'' قدیم ہندوستان میں صدیوں سے یہ وحشیانہ رسم جاری تھی کہ شوہر کے ساتھ بیوی کو بھی آگ میں جلنا پڑتا تھا۔ بہت سی عورتیں موت کے خوف سے بھاگ کھڑی ہوتی تھیں...... مگر ہندو دھرم کے نگہبان ان مجبور عورتوں کو پکڑ کر زبردستی بھڑکتی ہوئی چتا پر بٹھا دیتے تھے۔ پھر وہ درماندہ اور عاجز مخلوق، آگ کی خوراک بن جاتی تھی۔ رانا اودے کرن نے بھی اسی رسم کا حوالہ دیتے ہوئے بھاوج کو جل جانے کا حکم دیا تھا۔

''میں کیوں ستی ہو جاؤں؟'' میرا نے انتہائی جرأت کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میرا سوامی زندہ ہے اور اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔'' راج کماری میرا علی الاعلان شری کرشن کو اپنا شوہر کہتی تھی۔

میرا کے جواب پر رانا اودے کرن، خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ دوسری عورتوں کی طرح میرا کو بھی جبراً بھڑکتی ہوئی چتا پر بٹھا سکتا تھا...... مگر میرا کوئی مجبور عورت نہیں تھی۔ ابھی اس کا چچا راجہ جے مل زندہ تھا۔ اودے کرن کی اس ظالمانہ حرکت سے دونوں ریاستوں میں جنگ بھی چھڑ سکتی تھی۔ اس خیال سے رانا خاموش ہو گیا...... اور کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔

❁---❁---❁

پھر وقت نے ایک اور کروٹ لی۔ رانا اودے کرن فطرتاً حریص، خودغرض اور جابر و سفاک انسان

تھا۔ تاج و تخت کے لالچ میں اس نے اپنے بوڑھے باپ رانا کمبھ کو زہر دے کر ہلاک کر دیا...... اور خود ریاست اودے پور کا مطلق العنان حکمران بن بیٹھا۔ اب اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ رانا نے مزید رُسوائیوں سے بچنے کے لیے اپنی بھاوج میرا کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ پہرے دار بھی نسلاً راجپوت تھے...... مگر جب میرا رات کے پچھلے پہر اپنے سوامی کے فراق میں دردناک گیت گایا کرتی تھی تو سخت دل نگہبانوں کی آنکھیں بھی بھیگ جاتی تھیں۔

ایک رات راجہ اودے کرن نے بھی میرا کا گیت سنا، پھر اُس نے شدید غیظ و غضب کے عالم میں مجبور و بے کس بھاوج کو اس قدر زدو کوب کیا کہ میرا کے جسم پر نیل پڑ گئے مگر اُس نے اُف تک نہیں کی۔

''تمہارے یہ تازیانے میرے جسم پر زخموں کی گلکاریاں کر سکتے ہیں...... مگر روح کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ میری روح میرے دیوتا کی پناہ میں ہے۔''

یہ منظر دیکھ کر راجہ اودے کرن خوف زدہ ہو گیا۔ تازیانوں کی مار کھا کر ایک عورت کا مسکرانا بڑی عجیب بات تھی۔ اودے کرن کے مشیروں نے بھی اسے یہی مشورہ دیا۔ ''راج کماری کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر تشدد کے دوران اس کی موت واقع ہو گئی تو نیا سیاسی طوفان اُٹھ کھڑا ہو گا۔ جودھپور کے لوگ اپنی بیٹی کے خون کا انتقام لیں گے۔''

اور پھر میرا راج محل سے نکل کر مندر چلی گئی۔ طویل قید و بند سے نجات پانے کے بعد وہ اپنے سوامی (کرشن جی) کے سامنے اس قدر جھوم کر ناچی کہ دیکھنے والوں کو مندر کے بام و در بھی رقصاں نظر آنے لگے۔

پھر میرا نے ریاست اودے پور چھوڑ دی اور تیرتھ یاترا کے لیے پیدل ہی نکل کھڑی ہوئی۔ وہ شہر شہر گھومتی، پُرسوز آواز میں بھجن گاتی اور شری کرشن کی مورتی کے سامنے دیوانہ وار رقص کرتی۔ اب راجپوتانہ کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے علاقے بھی کرشن کی دیوانی سے آشنا ہو گئے۔ بعض اوباش انسانوں نے ایک خوب صورت عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش بھی کی..... مگر جب وہ لوگ میرا کے قریب پہنچے تو نامعلوم خوف و دہشت کا شکار ہو گئے۔ ایک نادیدہ طاقت میرا کا حصار کیے ہوئے تھی۔

پھر یہ صدمۂ فراق کی ماری عورت متھرا پہنچی جو شری کرشن کی جنم بھومی تھی۔ اس نے یہاں قدم قدم پر سجدے کیے اور متھرا کی خاک کو بوسے دیئے۔ کرشن جی کی مختلف مورتیاں پوجی جاتی ہیں..... مگر راج کماری میرا جس مورتی کی عاشق تھی، اُسے ''رنچھور'' کہتے ہیں۔ یہ مورتی متھرا کے ایک مندر میں موجود تھی۔

ایک دن میرا اسی مورتی کی پوجا کر رہی تھی کہ یکایک وہ مورتی شق ہو گئی...... اور میرا اس میں سما گئی۔ اس وقت مندر کے دوسرے پجاری بھی موجود تھے۔ یہ منظر دیکھ کر پجاریوں پر دہشت طاری ہو گئی۔ پھر یہ خبر متھرا کے گرد و نواح میں پھیل گئی...... اور لوگ قطار در قطار اس کے درشن کو آنے لگے۔ بھینٹیں چڑھائی جانے لگیں...... اور نذرانے پیش کیے جانے لگے...... مگر میرا نے ان مادی چیزوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ خود راج محل کے عیش و آرام ترک کر کے بیابانوں کی خاک چھاننے نکلی تھی۔ پھر

یہ چھوٹے چھوٹے تحفے اس کی نظروں میں کیونکر سماتے؟

❁---❁---❁

پھر وقت نے ایک اور کروٹ لی۔ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے چتوڑ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ریاست جودھپور پر قبضہ کر لیا۔ میرا کا چچا راجہ جے مل مغلوں کا مقابلہ کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ اس وقت میرا اپنے آبائی وطن سے دُور کسی مندر میں شری کرشن کی مورتی کے سامنے والہانہ انداز میں رقص کر رہی تھی۔ پھر جب اُسے اس الم ناک واقعے کی خبر ملی تو وہ دھواں دھواں چہرے اور بہتی آنکھوں کے ساتھ جودھپور پہنچی۔ وہاں جا کر میرا کو معلوم ہوا کہ اس کی ماں رانی للیتا، بچپن کی سکھیاں اور راج گھرانے کی دوسری خواتین مغل شہنشاہ اکبر کے حملے کے وقت اگنی کنڈ (آتشیں حصار) میں کُود گئیں۔ میرا نے دُور سے راج محل کو دیکھا، ماتر بھومی (مادر وطن) کی خاک کو اپنے چہرے پر ملا اور آنسو بہاتی چتوڑ چلی گئی۔

اس وقت اکبر چتوڑ ہی میں مقیم تھا۔ میرا کے آتے ہی پوری ریاست میں دھوم مچ گئی۔ اس کے بھجن سننے کے لیے مندروں میں پجاریوں کی بھیڑ لگ گئی۔ اکبر کے جاسوس گلی گلی گھوم رہے تھے۔ مخبروں نے اپنے شہنشاہ کو خبر دیتے ہوئے کہا۔

''وہ ایک خوب صورت جوگن ہے اور چتوڑ کے عوام اس کے گیتوں کے دیوانے ہیں۔''

مغل شہنشاہ اکبر نے مقامی لوگوں سے تفتیش کی تو اسے پتہ چلا کہ جوگن میرا کوئی عام عورت نہیں، وہ راجہ ویرول کی بیٹی اور کنور بھوج راج کی بیوہ ہے۔ اس نے شری کرشن کے عشق میں سنسار تیاگ دیا ہے...... اور گلی گلی اپنے دیوتا کو پکارتی پھرتی ہے۔ اکبر خود بھی موسیقی کا دلدادہ تھا۔ ہندوستان کے عظیم ترین گائیک اور سنگیت کار میاں تان سین اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔ اکبر، میرا کے گیتوں کی تعریف سن کر بے قرار ہو گیا۔

پھر ایک دن مغل شہنشاہ، میاں تان سین کے ساتھ عام شہریوں کے لباس میں چتوڑ کے مندر پہنچ گیا۔ وہاں سینکڑوں پجاری جمع تھے اور میرا آنکھیں بند کیے گا رہی تھی۔

''اے ماں! میں جس کرشن کا گیت گاتی ہوں، اس کی صفات نے میری روح کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے...... اس کی محبت کا تیز تیر میرے جسم کے اندر پیوست ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے پہلے جب وہ تیر میرے بدن میں چبھا تو مجھے خبر تک نہ ہوئی...... لیکن اب وہ ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے...... میں دعا، دوا اور افسوں، سب کچھ کر چکی مگر وہ درد کسی طرح کم نہیں ہوتا...... اے ماں! ہے کوئی ایسا جو میرے اس درد کی دوا کرے۔''

میرا کی پُرسوز آواز اور ہجر و فراق میں ڈوبا ہوا کلام...... مندر کی فضاؤں پر ایک سحر سا طاری تھا۔ مغل شہنشاہ اکبر اور موسیقارِ اعظم، میاں تان سین بھی راج کماری میرا کے گیت میں کھو کر رہ گئے تھے۔ پھر

جب میرا خاموش ہوئی تو سامعین کی بے خودی بھی ختم ہوئی۔ اکبر نے اپنے گلے کا قیمتی ہار اُتار کر بڑی عقیدت کے ساتھ میرا کو پیش کیا۔

''تمہاری مہان کلا کے لیے، ایک چھوٹے سے آدمی کی طرف سے، ایک چھوٹی سی بھینٹ۔'' مغل شہنشاہ اکبر، ہندو پجاریوں کی نظر سے اپنے آپ کو چھپانا چاہتا تھا۔

''میرا نے قیمتی ہار کو دیکھا پھر اکبر پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ''نہ کوئی چھوٹا آدمی میرے گیتوں کو سمجھ سکتا ہے......اور نہ اتنا قیمتی تحفہ پیش کر سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر میرا نے اکبر کا دیا ہوا ہار پہن لیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ میرا نے مغل شہنشاہ کو پہچان لیا تھا مگر اس نے پجاریوں کے سامنے اس کا انکشاف نہیں کیا۔

❁---❁---❁

پھر میرا، چتوڑ سے نکل کر اپنی سسرال اودے پور چلی گئی......اور اس مندر میں جا پڑی جہاں وہ پہلی بار کرشن جی کے سامنے ناچی تھی۔ ہندو جاسوسوں نے راجہ اودے کرن کو چتوڑ کے مندر میں پیش آنے والے واقعات کی تمام تفصیلات بتا دیں۔ جنہیں سن کر اودے پور کا حاکم آگ بگولا ہو گیا۔ میرا کے باپ اور چچا مر چکے تھے......ریاست مغلوں کے قبضے میں چلی گئی تھی......اور اب اس مجبور عورت کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ راجہ اودے کرن کو اسی دن کا انتظار تھا۔ وہ میرا سے راج گھرانے کی توہین کا شدید انتقام لینا چاہتا تھا۔

آخر بے گناہ میرا کو گرفتار کر کے راج گرو کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ راج گھرانے کے علاوہ اودے پور کے تمام معززین عدالت میں جمع تھے......اور اس باغی عورت کا انجام دیکھنے کے لیے بے چین تھے جس نے راجپوتوں کے دھرم کو ہندوستان کے گلی کُوچوں میں بدنام کیا تھا۔

''راج کماری میرا! تمہارا پہلا جرم یہ ہے کہ تم نے اپنے آنجہانی شوہر اور راج گھرانے کا دھرم قبول کرنے سے انکار کیا۔'' راج گرو نے میرا کے خلاف فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔

''میرا دھرم تو ایک ہی ہے، کرشن کی پوجا۔'' میرا نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔

''تم نے اپنے پتی بھوج راج کی زندگی میں کہا تھا کہ اس شادی سے پہلے تمہاری ایک شادی ہو چکی تھی۔'' راج گرو نے میرا کے دوسرے جرم کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس اعتراف کا صاف مطلب ہے کہ تمہارے دو شوہر تھے۔''

راج کماری میرا نے بڑی بے باکی سے جواب دیا۔ ''میرے تو گردھر گوپال، دوسرا نہ کوئے۔''

(''گردھر گوپال'' بھی کرشن جی کا ایک لقب ہے)

''تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی؟'' راج گرو برہم ہو گیا۔ اس نے بھی جانبدارانہ روش اختیار کر لی تھی۔

''کرشن کے سوا دنیا میں کوئی مرد ہی نہیں ہے جس سے میں شرم کروں۔'' یہ کہتے کہتے میرا جھوم اُٹھی۔

میرا کے اس جواب نے عدالت میں بیٹھے ہوئے تمام راجپوتوں کو غضب ناک کر دیا تھا۔ حاضرین کی

اکثریت اونچی آوازوں کے ساتھ میرا کو بے حیائی کے طعنے دے رہی تھی...... مگر آتشِ فراق میں پل پل جلنے والی بیراگن ہر طنز، ہر طعنے اور ہر دشنام سے بے نیاز تھی۔

راج گرو کے چہرے سے بھی شدید ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔ ''راج کماری میرا! تمہارے گرو ہونے کی حیثیت سے اس مقدمے کے فیصلے کی ذمے داری بھی ہمیں سونپی گئی ہے..... ہم چاہتے ہیں کہ....''

ابھی راج گرو کی بات مکمل ہونے نہیں پائی تھی کہ راج کماری میرا درمیان میں بول اُٹھی۔ ''معاف کیجئے! آپ ان لوگوں کے گرو ہو سکتے ہیں مگر میرے نہیں۔'' راج کماری میرا نے اپنے سسرال والوں اور دیگر حاضرینِ عدالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے گرو تو سنت رائے داس ہیں۔'' رائے داس، راجپوتانہ کا ایک چمار تھا..... لیکن اس کے عادات و خصائل سادھوؤں جیسے تھے۔ اپنے مذہب کے مطابق رائے داس ایک نیک سیرت انسان تھا۔ پوجا پاٹھ کے علاوہ دن رات مخلوقِ خدا کی خدمت میں لگا رہتا تھا۔ راج کماری میرا، سنت رائے داس کو اپنا گرو کہتے ہوئے فخر محسوس کرتی تھی۔

اپنے مقابلے میں ایک نیچ ذات والے کا نام سن کر راج گرو غصے سے پاگل ہو گیا۔ ''ایک چمار کی صحبتوں نے تمہیں گمراہ کر دیا، راج کماری میرا!'' راج گرو غضب ناک لہجے میں بول رہا تھا۔ ''اسی کم ذات نے تمہیں برہمنوں کے بنائے ہوئے قوانین سے بغاوت پر اُکسایا۔ یہاں تک کہ تم اس حال کو پہنچ گئیں۔''

''سنت رائے داس نے مجھے سیدھے راستے پر لا کھڑا کیا اور مایا موہ سے مکتی دی۔'' میرا نہایت بے باکی سے اپنے گرو کا دفاع کر رہی تھی۔

راج گرو شدید غصے کی حالت میں مسندِ انصاف پر کھڑا ہو گیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ''راج کماری میرا! تم جسے پریم کہتی ہو، وہ کھلی ہوئی واسنا (ہوس) ہے...... اور اس ہوس نے تمہیں غیر مردوں تک پہنچایا۔ تم دھرم کی بھی باغی ہو اور ملک کی بھی۔ تمہارے گلے میں راجپوتوں کے سب سے بڑے دشمن اکبر کا دیا ہوا قیمتی ہار اس وقت بھی موجود ہے۔ تم نے راج گھرانے کی عزت و آبرو کو سرِ راہ نیلام کیا۔ تمہارا کوئی جرم بھی قابلِ معافی نہیں اس لیے تمہاری پہلی اور آخری سزا موت ہے۔''

راج گرو کا فیصلہ سن کر راجہ اودے کرن اور حاضرینِ عدالت کے چہرے خوشی سے دمک اُٹھے۔ معزز برہمنوں اور عزت مآب پنڈتوں نے فاتحانہ نعرہ بلند کیا۔ ''جے سیا رام۔''

لوگوں کا خیال تھا کہ موت کی سزا سن کر ایک بے سہارا اور کمزور عورت شدتِ خوف سے لرز اُٹھے گی...... مگر سب لوگ اس وقت حیران رہ گئے جب میرا کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ اُبھر آئی۔ درشن پیاسی میرا نے آسمان کی طرف دیکھا اور نہایت سرشاری کے لہجے میں کہا۔

''اے دلِ بے قرار! تجھے مبارک ہو کہ یومِ وصال آ پہنچا..... آخر میرے سوامی نے مجھے اپنی بارگاہِ ناز میں بلا ہی لیا۔''

❁---❁---❁

پھر راج کماری میرا کو زہر سے لبریز پیالہ پیش کیا گیا، جسے اُس تشنہ لب نے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اُتار لیا۔ ایک عورت کی یہ استقامت دیکھ کر راجپوت سورما بھی لرز اُٹھے...... اور راجپوت خواتین کے منہ سے تو چیخیں نکل گئیں...... میرا نے بڑی ہمت سے زہر کی ہلاکت خیز تلخی کو برداشت کیا...... اور کچھ دیر ٹہلتے ہوئے اپنے یہ اشعار پڑھتی رہی۔

''میں اپنے مالک سے محبت کرتی ہوں...... اور اس امر کے اظہار میں مجھے بالکل شرم محسوس نہیں ہوتی...... کیونکہ لوگوں نے مجھے اس کے سامنے اعلانیہ رقص کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے...... دن میں مجھے بھوک نہیں لگتی اور رات کو نیند نہیں آتی...... کیونکہ ایک علمِ مخفی نے مجھ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے...... میرے تمام عزیز و اقارب مجھے شہد کی مکھیوں کی طرح گھیر لیتے ہیں...... اور مجھے میرے ارادے سے باز رکھنا چاہتے ہیں...... لیکن میں اپنے سوامی (شری کرشن) کی لونڈی ہوں..... مجھے کسی بات کی پروا نہیں...... چاہے دنیا میرے بارے میں کچھ بھی کہے۔''

یہ کہتے کہتے میرا زمین پر گر پڑی۔ زہر نے اس کے دل و جگر کا کام تمام کر دیا تھا۔ پریم دیوانی جوگن کے منہ سے تازہ تازہ خون بہہ رہا تھا...... اور وہ اپنے عشق میں سرخرو ہو گئی تھی۔

''بتا دے سکھی! کون گلی گئے شیام۔'' میرا کے ہونٹوں کو آخری بار جنبش ہوئی..... اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

راجپوتانہ کے برہمن اور راجپوت ایک سرمستِ عشق کو اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر وہ میرا کی محبوبیت کو مٹانے میں ناکام رہے۔ آج کوئی نہیں جانتا کہ راج گرو کون تھا جس نے میرا کو سزائے موت سنائی تھی...... کسی کو نہیں معلوم کہ رانا اودے کرن، کنور بھوج راج، راجہ ویرو مل اور راجہ جے مل کہاں دفن ہیں...... مگر میرا آج بھی کروڑوں انسانوں کے دلوں میں زندہ ہے۔

وہ ہندی زبان کی عظیم شاعرہ ہے جسے محبوبیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس نے راج کماری ہوتے ہوئے بھی اپنے نفس کے خلاف ایک خوفناک جنگ لڑی اور اس میں کامیاب رہی۔ اگر اُسے کسی مسلمان صوفی کی صحبت میسر آ جاتی تو وہ اپنے وقت کی کامل عارفہ ہوتی۔

پھر بھی میرا سوزِ عشق کی ایسی علامت ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ چار سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی میرا کا یہ بھجن سن کر بے شمار آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

''اے ری میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کوئے۔''

بھیگنے والی آنکھوں اور سلگتے ہوئے دلوں میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہیں...... وہ آنکھیں عشاق کی آنکھیں ہیں...... اور وہ دل عشاق کے دل ہیں۔

❀---❀---❀

پری چہرہ

گردشِ وقت بھی کیا عجیب چیز ہے۔ ہاتھ پھولوں پر بھی رکھو تو جل جاتا ہے۔ غیاث بیگ کا بھی یہی حال تھا۔ ایک زمانے میں اس کا شمار ایران کے اکابرین میں ہوتا تھا۔ غیاث بیگ، شاہ طہماسپ کے زمانے میں خراسان کا حاکم تھا...... اور اُسے شاہِ ایران کے حلقۂ مصاحبت میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ اپنے حصے کا مالیہ شاہی خزانے میں داخل نہ کرا سکا۔

شاہ طہماسپ نے غیاث بیگ کو بلا کر فہمائش کی۔ ''یاد رکھو کہ جو حاکم دنیاوی معاملات میں کھرا نہیں ہوتا، وہ شہنشاہ کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ اور جب کوئی عزت دار انسان گر جائے تو بڑی مشکل سے اُبھرتا ہے۔''

غیاث بیگ سر جھکائے دربار سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اس نے تمام سال بڑی محنت کی مگر بدقسمتی سے اس بار بھی وہ مالیہ داخل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

شاہ طہماسپ نے غیاث بیگ کو دربار میں طلب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنے کارندوں کو ایک مہلت ضرور دیتے ہیں تاکہ وہ اصلاحِ حال کر سکے۔ مملکتِ ایران زیادہ دنوں تک مالی خسارہ برداشت نہیں کر سکتی۔''

یہ کہہ کر شاہِ ایران نے غیاث بیگ کی طرف دیکھا۔ ''کیا اس سال بھی تم وہی عذر پیش کرو گے غیاث بیگ؟''

غیاث بیگ ندامت کے پسینے میں نہایا ہوا تھا، اپنی نشست سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''شاہِ والا کا اقبال بلند ہو۔ غلام اس سال بھی اپنا وعدہ وفا کرنے سے قاصر ہے۔''

''اس کی وجہ؟'' شاہِ ایران پُرجلال لہجے میں بولا۔

''میری بدنصیبی شاہِ والا! اس کے سوا کچھ نہیں۔'' غیاث بیگ نے شرمسارانہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے بہت تدبیریں کیں مگر ایک بھی بارآور ثابت نہ ہو سکی۔ شاید گردشِ وقت میرے سر اور گھر پر سایہ فگن ہے۔''

''جب نحوست کسی شخص کو گھیر لے تو متعلقین بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔'' شاہِ ایران نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔ ''ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے کسی لفظ یا عمل سے تمہاری دل آزاری ہو۔ بہتر یہی ہے کہ تم علاقہ

خراسان کے انتظامات سے خوشی کے ساتھ دستبردار ہو جاؤ۔ ہمارا یہ مزاج نہیں کہ ہم اپنے دیرینہ خدمت گار کو جبراً اس عہدہ و منصب سے الگ کر دیں۔''

غیاث بیگ، شاہ طہماسپ کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ وہ بجھے چہرے کے ساتھ، امراء کی قطار سے اُٹھ کر تختِ شاہی کے قریب پہنچا، پھر نصف قد تک جھک کر شاہِ ایران کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ اس کے بعد اپنی دستار جو عہدہ و منصب کی پہچان تھی، اسے اتار کر شاہ طہماسپ کے قدموں میں رکھ دی۔

''میں شاہِ والا کے سامنے شرمسار ہوں کہ اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔''

یہ کہہ کر غیاث بیگ لڑکھڑاتے قدموں سے واپس چلا گیا۔ اب وہ مملکتِ ایران کا ایک عام انسان تھا جس کی قبائے ذات پر ناکامی کا ایک بڑا داغ نمایاں تھا۔

❀---❀---❀

خراسان کی حاکیت کا منصب چھوڑ کر غیاث بیگ کی مالی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا، ناکامی اس کا مقدر بن جاتی تھی۔ اس وقت غیاث بیگ کا ایک جوان لڑکا ابوالحسن تھا اور دو نوعمر لڑکیاں۔ بیوی شاہ بیگم تھی جو اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی تھی۔

غیاث بیگ نے ایک دن شاہ بیگم سے مشورہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ سرزمینِ ایران مجھ پر تنگ ہو چکی ہے۔''

''آپ ایسا نہ سوچیں۔'' وفادار بیوی نے شوہر کو حوصلہ دلاتے ہوئے کہا۔ ''عروج و زوال تو اس کائنات کا مقدر ہے۔ وقفہ طویل سہی مگر یہ خراب دن بھی گزر جانے والے ہیں۔''

''میں لوگوں سے قرض مانگتے مانگتے تھک گیا ہوں۔'' غیاث بیگ نے نہایت شکستہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے اپنے دورِ اقتدار میں جن لوگوں کو نوازا تھا، آج وہ مجھ سے نظریں بچا کر گزرتے ہیں۔''

پھر ایک دن غیاث بیگ، خراسان کے بازار سے گزر رہا تھا کہ اسے ایک مجذوب الحال شخص نظر آیا۔ جو بہت دیر سے پلکیں جھپکائے بغیر سورج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بہت سے لوگ اُس کے گرد جمع تھے اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

''بابا! خدا کے لیے ہماری طرف دیکھو۔''

مجذوب، لوگوں کی چیخوں سے بے نیاز، بدستور نظریں جمائے، دہکتے ہوئے سورج کو گھور رہا تھا۔ غیاث بیگ بھی اس مجذوب سے واقف تھا۔ عوام میں یہ مجذوب ''بابا نوری'' کے نام سے مشہور تھے۔ غیاث بیگ، بابا نوری کو ایک مخبوط الحواس اور غیر متوازن انسان سمجھتا تھا...... اور ایک پاگل شخص سے لوگوں کی اس والہانہ عقیدت کو دیکھ کر ہنسا کرتا تھا...... مگر آج صورتِ حال مختلف تھی۔ غیاث بیگ کو مالی پریشانیوں نے تماشا بنا کر رکھ دیا تھا۔ یہی بے چارگی اسے انسانی ہجوم تک لے گئی۔ پھر غیاث بیگ لوگوں کی بھیڑ

سے گزرتا ہوا بابا نوری مجذوب تک پہنچ گیا۔ لمبے بکھرے ہوئے بال، سبز لباس، چہرے پر اضطراب اور آنکھوں میں وحشت۔ یہ تھا بابا نوری مجذوب کا ظاہری حلیہ...... غیاث بیگ نے مجذوب کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں سورج کی روشنی سے متصادم تھیں۔ غیاث بیگ نے بھی بابا نوری کی تقلید میں چمکتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں چند لمحوں کے لیے بھی سورج کی تیز روشنی کی تاب نہ لا سکیں......اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ آج غیاث بیگ کو اندازہ ہوا کہ بابا نوری مجذوب کوئی عام انسان نہیں ہیں۔ پلکیں جھپکائے بغیر سورج کو دیکھنا مشکل ترین کام تھا۔

''بابا نوری! بہت دیر ہو گئی۔ اب تو ہماری طرف دیکھو۔'' انسانی ہجوم نے ایک بار پھر چیخنا شروع کر دیا۔ غیاث بیگ بڑے انہماک سے بابا نوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے۔

پھر اچانک بابا نوری مجذوب نے اپنا زاویہ بدلا۔ اب اُن کا رُخ غیاث بیگ کی طرف تھا۔

''ایران میں تیرے لیے کچھ نہیں ہے۔ چپ چاپ ہندوستان چلا جا۔''

انسانی ہجوم سمجھا کہ بابا نوری مجذوب ان سے مخاطب ہیں۔

''بابا! ہم ہندوستان کیسے جائیں؟...... ہمارا وہاں کوئی نہیں ہے۔'' بہت سے لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

''بے خبر! میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔'' بابا نوری مجذوب نے غیاث بیگ کی طرف دیکھا۔

بابا کی سرخ نظریں غیاث بیگ کے جسم میں پیوست ہو کر رہ گئیں۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اس کے پورے بدن میں آگ لگ گئی ہے۔

''بابا! میں ہندوستان کس طرح جا سکتا ہوں؟'' غیاث بیگ نے لرزتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو میرے لیے ایک اجنبی سرزمین ہے۔ وہاں کون میرا پرسانِ حال ہو گا؟''

''تو پھر مر جا۔'' بابا نوری مجذوب نے غضب ناک لہجے میں کہا اور ایک طرف بھاگتے ہوئے چلے گئے۔

وہاں موجود لوگوں نے غیاث بیگ کو گھیر لیا......اور لعن طعن کرنے لگے۔

''تُو نے بابا کو نظر انداز کر دیا۔ اب تیرا اس زمین پر کوئی ٹھکانہ نہیں۔ تُو بہت جلد مر جائے گا۔ کیونکہ بابا کی دعائیں، بددعائیں کبھی نامقبول نہیں ہوئیں۔''

یہ اُس کی زندگی کا عجیب واقعہ تھا۔ بابا نوری مجذوب اُسے جانتے تک نہیں تھے مگر انہوں نے اشاروں کنایوں میں سب کچھ کہہ دیا تھا۔ غیاث بیگ اسی قسم کے خیالات میں اُلجھا ہوا گھر پہنچا اور اس نے سارا واقعہ اپنی بیوی، شاہ بیگم کو سنا دیا۔

''اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟'' شاہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو ایک ہدایتِ غیبی ہے جو منزل کی طرف آپ کی رہنمائی کر رہی ہے۔''

''میں ایک مجذوب الحال شخص کی بات کو ہدایتِ غیبی کیسے سمجھ لوں؟'' غیاث بیگ تذبذب کا شکار تھا۔
''اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔'' شاہ بیگم نے شوہر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''بزرگوں کا قول ہے کہ اکثر گھر اور شہر کی تبدیلی سے مقدر بھی بدل جاتا ہے۔''

❀---❀---❀

آخر غیاث بیگ اپنی بیوی، ایک لڑکے اور دو لڑکیوں کے ساتھ قسمت آزمائی کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے آٹھ اونٹ سواری اور بار برداری کے لیے خریدے۔ پھر کچھ دن بعد ہی غیاث بیگ کو ایک ایسا قافلہ مل گیا جو ہندوستان کی طرف جا رہا تھا۔ اس خانہ بدوش خاندان کا خیال تھا کہ ترکِ وطن کے بعد ان کی تقدیر بھی بدل جائے گی۔ غیاث بیگ اور شاہ بیگم نئی منزل کے خواب لے کر رواں دواں تھے کہ راستے میں ایک اور حادثہ پیش آیا۔ اچانک غیاث بیگ کے چھ اونٹ مر گئے جبکہ بظاہر انہیں کوئی بیماری لاحق نہیں تھی۔ غیاث بیگ اور شاہ بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ نوعمر لڑکے، ابوالحسن کا چہرہ شدتِ غم سے دھواں ہو گیا...... اور دونوں کمسن بچیاں زار و قطار رونے لگیں۔
''بابا جان! اب ہم یہ دشوار و طویل سفر کس طرح جاری رکھ سکیں گے؟'' ابوالحسن نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔
''میں کیا بتاؤں؟'' غیاث بیگ نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ سب اُس بابا نوری مجذوب کا کیا دھرا ہے۔ اگر وہ پاگل انسان مجھے یہ گمراہ کن مشورہ نہ دیتا تو آج میں عزیز و اقارب کے درمیان پُرسکون زندگی گزار رہا ہوتا۔'' غیاث بیگ ایک بدعقیدہ انسان تھا۔ وہ بزرگانِ دین کو دنیا دار اور شعبدہ باز سمجھتا تھا...... اور ان کی شان میں نہایت گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا تھا۔
''اس میں بابا نوری کا کیا قصور ہے؟'' شاہ بیگم نے مجذوب کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا بابا نوری نے تم سے کوئی نذر طلب کی تھی یا اپنے مشورے کی قیمت مانگی تھی؟''
بیوی کی اس دلیل کے سامنے غیاث بیگ خاموش ہو گیا...... مگر دل ہی دل میں بابا نوری کو برا بھلا کہتا رہا۔
چھ اونٹ مر جانے کے بعد صرف دو اونٹ باقی رہ گئے تھے۔ ایک اونٹ پر سامان لاد دیا جاتا تھا...... اور دوسرے اونٹ پر پانچ افراد کا کنبہ سفر کیا کرتا تھا۔ ایک وقت میں پانچوں افراد اونٹ پر سوار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے غیاث بیگ اور اس کی بیوی شاہ بیگم، اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلا کرتے تھے۔ کبھی شاہ بیگم، بچوں کے ساتھ بیٹھ جاتی...... اور کبھی غیاث بیگ۔ الغرض سخت دشواریوں کے ساتھ یہ سفر جاری رہا۔
پھر ایک رات غیاث بیگ، اس کی بیوی اور بچے سوئے ہوئے تھے کہ چوروں نے سارا اناج اور کھانے کی دوسری چیزیں لوٹ لیں۔ اب یہ مختصر سا قافلہ اور بھی پریشان ہو گیا۔

❀---❀---❀

پھر جب یہ لوگ قندھار کے قریب پہنچے تو ایک اور پریشانی نے اُنہیں گھیر لیا۔ ایران سے رخصت ہوتے وقت شاہ بیگم حاملہ تھی۔ قندھار کی حدود میں داخل ہوتے ہی اس کے یہاں ایک حسین و جمیل لڑکی کی ولادت ہوئی۔ نوزائیدہ بچی اپنے خدوخال سے پری معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی اسی خوب صورتی کو دیکھ کر ماں باپ نے بیٹی کا نام مہرالنساء رکھ دیا۔

پھر وہ سنگین لمحہ بھی آ گیا، جب شاہ بیگم نے زار و قطار روتے ہوئے شوہر سے کہا۔ ''میرے پاس دودھ نہیں ہے جو اپنی بچی کو پلا سکوں۔''

غیاث بیگ یہ وحشت خیز خبر سن کر بدحواس ہو گیا۔ ''پھر کیا ہوگا؟'' غموں کی اس تاریک رات میں غیاث بیگ کا پورا وجود ایک سوال بن کر رہ گیا۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ راستے کی صعوبتوں، مشقتوں، دُکھوں اور فاقوں نے شاہ بیگم کو اتنا کمزور کر دیا تھا کہ اس کے جسم میں خون نہیں بن رہا تھا۔ نتیجتاً دودھ کی افزائش بھی نہیں ہو رہی تھی۔ غیاث بیگ کے پاس چند پیسے بچے تھے جن سے اس نے بچی کے لیے گھٹی وغیرہ کا انتظام کیا......اور انتظار کرنے لگا کہ شاید ماں کا دودھ اُتر آئے۔ اسی کشمکش میں دو دن گزر گئے......مگر دودھ کے چند قطرے بھی نہیں اُترے۔

آخر تیسری رات شاہ بیگم نے شوہر کی منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر مہرالنساء کو دودھ نہیں ملا تو وہ مر جائے گی۔''

''تم مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟'' انتہائی قوتِ برداشت کے باوجود غیاث بیگ بھی رو پڑا۔

''مہرالنساء کو اللہ کے سپرد کر دو۔'' شاہ بیگم نے نہایت شکستہ لہجے میں کہا۔ ''شاید کوئی آسودہ حال شخص ہماری بچی پر مہربان ہو جائے۔''

غیاث بیگ کو کسی طرح بھی اپنی بچی سے جدائی گوارا نہیں تھی۔ مگر اس نے دل پر پتھر رکھ لیے۔ پھر مہرالنساء کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر خیمے سے نکلا۔ پورا قافلہ سویا ہوا تھا۔ غیاث بیگ چوروں کی طرح آگے بڑھتا رہا۔ پھر وہ قافلہ سالار ملک مسعود کے خیمے کے سامنے ٹھہر گیا۔ اندھیرے میں مہرالنساء کی طرف دیکھا جس کا معصوم چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ غیاث بیگ کی آنکھوں سے چند آنسو مہرالنساء کے رخساروں پر ٹپک گئے۔ مجبور باپ کھل کر رو بھی نہیں سکتا تھا۔ تین دن کی بچی کو سینے سے لگایا اور پھر ملک مسعود کے خیمے کے دروازے پر رکھ دیا۔ جگر گوشے کو اپنے آپ سے جدا کرنے کے بعد غیاث بیگ تیزی سے پلٹا۔ ہر قدم پر اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کا پورا جسم کھوکھلا ہے......اور وہ اپنی روح قافلہ سالار کے دروازے پر چھوڑ آیا ہے۔

❁---❁---❁

کچھ دیر بعد مہرالنساء نے رونا شروع کر دیا۔ بچی کی آواز سن کر ملک مسعود کا ملازم باہر نکل آیا۔ کچھ دیر تک شدید حیرت کے عالم میں اس لاوارث بچی کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر ترس کھا کر مہرالنساء کو اپنے آقا

کی خدمت میں لے گیا۔
بچی کا دلکش چہرہ دیکھتے ہی ملک مسعود بے قرار ہو گیا۔ ''وہ ماں باپ کتنے مجبور ہوں گے جنہوں نے اس چاند کے ٹکڑے کو اپنی آغوش سے الگ کیا۔'' یہ کہہ کر ملک مسعود نے مہرالنساء کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا ''اسے قدرت کا انعام سمجھو۔'' قافلہ سالار نے اپنے ملازم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی ایسی عورت تلاش کرو جو اس بچی کی دایہ کے فرائض انجام دے سکے۔''
ملازم نے پورا قافلہ ڈھونڈ مارا مگر اسے شاہ بیگم کے سوا ایسی کوئی عورت نہ مل سکی جو بچی کو دودھ پلا سکے۔ آخر ملک مسعود، مہرالنساء کو لے کر شاہ بیگم کے پاس پہنچا اور درخواست گزاری کے انداز میں کہنے لگا۔
''میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔ کل رات اللہ نے غیب سے مجھے یہ بچی عطا کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی نگہداشت کرو۔''
شاہ بیگم نے اپنی مجبوریاں بیان کیں اور فاقہ کشی کی زندگی کا حوالہ دیا۔
ملک مسعود نے فوری طور پر اس خاندان کے ہر فرد کے لیے سواری کا انتظام کیا اور مالی امداد بھی کی۔ قوت بخش غذا کھاتے ہی شاہ بیگم کے دودھ اُتر آیا اور وہ ایک دایہ کی حیثیت سے ملک مسعود کے خیمے میں رہنے لگی۔
غیاث بیگ اور شاہ بیگم کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ مگر وہ گردشِ وقت کو ٹالنے کے لیے اپنی بچی کے خدمت گار بن کر سفر کرتے رہے۔ آخر یہ قافلہ دارالحکومت آگرہ پہنچ گیا۔ اس وقت ہندوستان پر مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کی حکومت تھی۔

❁---❁---❁

مہرالنساء کی وجہ سے غیاث بیگ اور اس کے بیوی بچے بھی ملک مسعود کے گھر مقیم تھے۔ ایک دن شاہ بیگم اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور اس نے ملک مسعود کو پوری تفصیل کے ساتھ اپنی دردناک کہانی سنا ڈالی۔ ''میں ہی اس خوب صورت بچی کی حقیقی ماں ہوں۔''
جب ملک مسعود کو معلوم ہوا کہ غیاث بیگ اپنے دورِ اقتدار میں خراسان کا حاکم رہ چکا ہے تو وہ بہت حیران ہوا۔ پھر اس نے ایک عزت دار شخص کی پذیرائی کرتے ہوئے غیاث بیگ کو دربارِ اکبری میں پیش کر دیا۔
مغل شہنشاہ اکبر نے غیاث بیگ کو شاہی ملازموں میں شامل کر لیا۔ پھر وہ ترقی کرتے کرتے ایک اعلیٰ منصب پر پہنچ گیا۔
اس دوران مہرالنساء گھریلو تعلیم حاصل کرتی رہی۔ وہ غیاث بیگ اور شاہ بیگم کی آنکھوں کا تارا تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنی بچی کو انتہائی خوش بختی کی علامت سمجھتے تھے...... کیونکہ مہرالنساء کی پیدائش کے بعد ہی ان کے حالات میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی۔ غیاث بیگ نے مہرالنساء کی تعلیم و تربیت کے لیے

بہترین اساتذہ مقرر کیے تھے۔ مہرالنساء فطرتاً ایک ذہین لڑکی تھی۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں وہ ایسی دلنشیں گفتگو کرتی تھی کہ سننے والے حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ اسے شاعری سے بھی بے حد شغف تھا.....اور وہ کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتی تھی۔

ان تمام صفات کے علاوہ مہرالنساء کی سب سے بڑی خوبی اُس کا دلکش چہرہ تھا جو قلعۂ معلیٰ کی عورتوں میں موضوعِ بحث بنا رہتا تھا۔ ملک مسعود کی بیوی کو شاہی محل میں آنے جانے کی اجازت تھی۔ مہرالنساء بھی اس کے ہمراہ شاہی تقریبات میں شریک ہوا کرتی تھی۔ وہ جب بھی ایسی کسی تقریب میں جاتی، خاندانِ شاہی کی بیگمات اور امیرزادیاں اسے دیکھ کر حسد کی آگ میں جل اُٹھتیں۔ یہاں تک کہ قصرِ شاہی میں مہرالنساء کے حُسن کے چرچے عام ہو گئے۔

❁---❁---❁

یہ ولی عہدِ سلطنت شہزادہ سلیم کا دورِ جوانی تھا۔ سلیم سے پہلے اکبر کے کئی بچے پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے۔ آخر مغل شہنشاہ، مشہور بزرگ شیخ سلیم چشتی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا......اور پھر آپ کی دعاؤں سے اکبر کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ مغل شہنشاہ نے اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے بیٹے کا نام حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے نام پر رکھا۔ چونکہ شہزادہ سلیم ہزاروں منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اس لیے مہارانی جودھا اور شہنشاہ اکبر اس کی بہت ناز برداری کیا کرتے تھے۔ (واضح رہے کہ مہارانی جودھا بائی ایک راجپوت عورت تھی۔ اکبر سے شادی کے وقت بھی وہ ہندو تھی اور مرتے وقت بھی وہ اپنے مذہب پر قائم رہی۔ شہزادہ سلیم ایک ہندو ماں اور مسلمان باپ کا بیٹا تھا۔ تاہم اسے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے عشق کی حد تک عقیدت تھی)

شہزادہ سلیم فطرتاً ایک حُسن پرست نوجوان تھا۔ فنونِ جنگ سیکھنے سے زیادہ اس کا رجحان رقص و موسیقی اور شاعری کی طرف تھا۔ وہ چھوٹی سی عمر میں اپنے باپ شہنشاہ اکبر کی کیف و نشاط کی محفلوں کو چھپ چھپ کر دیکھا کرتا تھا۔ نتیجتاً اس کی سماعتوں میں پازیبوں اور گھنگھروؤں کی جھنکاریں نقش ہو کر رہ گئیں۔

مغل شہنشاہوں کی بدترین رسم یہ تھی کہ جب شہزادے جوان ہو جاتے تھے تو پہلی بار باپ اپنے ہاتھ سے بیٹے کو شراب پلاتا تھا...... بادہ نوشی کی یہ قبیح رسم ادا کرنے کے لیے ایک شاندار تقریب منعقد کی جاتی تھی......اور بڑے بڑے امراء اور وزراء اس تقریب میں شریک ہوا کرتے تھے۔ شہزادہ پہلا جام شہنشاہ کے ہاتھ سے پیتا......اور پھر تمام عمر شغلِ مے نوشی کرتا رہتا۔ اگرچہ شہنشاہ بابر نے پانی پت میں رانا سانگا کے مقابل ہوتے وقت شراب کے تمام برتن توڑ دیئے تھے اور بادہ نوشی ترک کر دی تھی......لیکن اس کے بیٹے ہمایوں نے اس رسم کو جاری رکھا۔ پھر تمام مغل شہزادوں نے اپنے باپوں کے ہاتھ سے شراب پی...... مگر اورنگزیب عالمگیر واحد شہزادہ تھا جس نے اپنے باپ، شاہ جہاں کے ہاتھ سے شراب نہیں پی

ذوقِ حُسن پرستی، سلیم کے مزاج میں شاہانہ شائستگی کے ساتھ موجود تھا۔ محل کی کئی کنیزیں مراعات حاصل کرنے کے لیے سائے کی طرح شہزادے کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ مگر سلیم کسی کنیز سے بے تکلف نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی ایک خوب صورت مطربہ، نشاط آفریں کبھی کبھی شہزادے کی بارگاہِ جلال میں کسی قدر گستاخ ہو جاتی تھی...... اور سلیم اُس کے اندازِ محبوبی کو ہنس کر نظرانداز کر دیتا تھا۔

مغل شہزادے کی اس محتاط روی کی وجہ قطب الدین کوکلتاش کی صحبتیں تھیں۔

قطب الدین، شہزادہ سلیم کا بچپن کا دوست بھی تھا اور دودھ شریک بھائی بھی۔ شہزادہ سلیم اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ آپس میں دونوں بہت زیادہ بے تکلف تھے۔ شہزادہ سلیم، قطب الدین کوکلتاش سے نہ صرف مشورے کیا کرتا تھا بلکہ اپنے اکثر راز بھی اس سے کہہ دیا کرتا تھا۔

قطب الدین فطرتاً نہایت ذہین اور شجاع نوجوان تھا۔ جب وہ قصرِ شاہی کی خوب صورت کنیزوں کو شہزادے کے شبستاں میں دیکھتا تو شدید ناگواری محسوس کرتا۔ پھر جب وہ ہوش رُبا کنیزیں ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتیں تو قطب الدین کوکلتاش، سلیم کی خدمت میں حاضر ہوتا اور دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔ مغل شہزادہ بڑی حیرت سے اپنے دوست اور دودھ شریک بھائی کو دیکھتا، پھر انتہائی بے تکلفانہ انداز میں کہتا۔

''قطب الدین! یہ کیا حرکت ہے؟''

قطب الدین کوکلتاش نہایت ادب سے سر جھکا دیتا۔ ''اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟''

شہزادہ سلیم اسے محبت آمیز لہجے میں ڈانٹ دیتا۔ ''کیا اب تمہیں بھی ہم سے اجازت لینی پڑے گی؟''

''شہزادۂ محترم! یہ دستورِ شاہی ہے۔ زمین و آسمان بدل سکتے ہیں مگر اس دستور کو نہیں بدلا جا سکتا۔'' قطب الدین کوکلتاش کا لہجہ طنز سے پاک ہوتا۔

''بس بس.....! ہماری شان میں قصیدے پڑھنا چھوڑو اور اپنا مقصد بیان کرو۔'' شہزادہ سلیم بے تکلفی پر اُتر آتا۔

پھر قطب الدین کوکلتاش نہایت ہوشیاری کے ساتھ حُسن پرست شہزادے کو نصیحتیں کرنا شروع کر دیتا۔

''تین پشتوں سے شہنشاہیت آپ کے گھر کی کنیز ہے۔ پھر یہ ادنیٰ کنیزیں آپ کی خلوت میں کیوں داخل ہوتی ہیں؟''

شہزادہ سلیم اپنے دوست کی بات سن کر مسکرانے لگتا۔ ''یہ خوب صورت کنیزیں تو شہنشاہیت کی شان بڑھاتی ہیں۔''

''محترم شہزادے! یہ کنیزیں شہنشاہ کے عروج و جلال میں اضافہ نہیں کرتیں۔'' قطب الدین کوکلتاش اپنی منطق پیش کرتا۔ ''یہ دلکش چہرے، بادشاہوں کے کارِ جہاں بانی میں خلل ڈالتے ہیں۔ ایک کامیاب حکمران کبھی کسی کنیز کا ریشمی آنچل تلاش نہیں کرتا۔ وہ تو ہمیشہ تپتی ہوئی دھوپ میں کھڑا رہ کر اپنے وقار کی

نگہبانی کرتا ہے۔ یہ بات ایک مرد کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی عورت کے حُسن کا پرستار ہو۔"
قطب الدین کوکلتاش مختلف مثالیں دے کر شہزادہ سلیم کو خوبصورت کنیزوں سے دُور رکھنے کی کوشش کرتا۔ مغل شہزادہ اپنے دوست کی باتیں سن کر مسکرا دیتا۔
"قطب الدین! تم تو ہمیں آغازِ جوانی ہی میں بوڑھا بنا دینا چاہتے ہو۔ تمہاری یہ بے رنگ اور خشک تقریریں ہمارے مزاج پر بہت گراں گزرتی ہیں۔ مگر کیا کریں کہ تم ہمارے دوست ہو۔"
قطب الدین کوکلتاش خاموش ہو جاتا اور پھر کسی دوسرے مناسب موقع کا انتظار کرنے لگتا۔
اسی دوران میں مطربہ نشاط آفریں، شہزادے سلیم کے بہت قریب آ گئی تھی۔ وہ ایک سحر انگیز آواز کی مالک تھی۔ نشاط آفریں جب بھی مغل شہزادے کی خلوتِ خاص میں کوئی غزل چھیڑتی تو سلیم کو ایسا لگتا جیسے اس کی آواز کے ساتھ بام و در رقص کر رہے ہوں۔ نشاط آفریں مغل شہزادے سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ ہمیشہ وہ ایسی غزل گاتی جس سے ایک عاشق کے سلگتے ہوئے جذبوں کا والہانہ اظہار ہوتا۔ شہزادہ سلیم، نشاط آفریں کے اشاروں اور کنایوں کو خوب سمجھتا تھا...... مگر قطب الدین کوکلتاش کی نصیحت اُس کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو روک لیتی تھی۔ کیونکہ نشاط آفریں ایک پیشہ ور گانے والی لڑکی تھی۔

❁---❁---❁

ایک دن شہزادہ سلیم قصرِ شاہی کے سبزہ زار میں ٹہل رہا تھا کہ اُس کی نظر مہرالنساء پر پڑی۔ کچھ دیر کے لیے مغل شہزادے کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔ اس کی آنکھوں نے آج تک حُسن و دلکشی کا ایسا بے مثال نمونہ نہیں دیکھا تھا۔ مہرالنساء تیز قدموں سے محل کے اس حصے کی طرف جا رہی تھی جہاں شاہی بیگمات رہا کرتی تھیں۔ شہزادہ سلیم نے اس مجسمۂ حُسن تک پہنچنے کی بہت کوشش کی مگر فاصلہ زیادہ تھا۔ اس لیے مہرالنساء، ولی عہدِ سلطنت کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سلیم بہت دیر تک اجنبی دوشیزہ کی واپسی کا انتظار کرتا رہا مگر مہرالنساء واپس نہیں آئی۔ مغل شہزادہ مایوس ہو کر چلا گیا۔
اس رات سلیم پچھلے پہر تک جاگتا رہا۔ مطربہ نشاط آفریں حسبِ معمول وقت پر آئی مگر شہزادہ سلیم نے خلافِ عادت اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔
"شہزادۂ عالم پر یہ کنیز قربان۔ اس بے التفاتی کی وجہ؟ کیا نصیبِ دشمناں، آج کچھ طبیعت ناساز ہے؟" نشاط آفریں نے بے قرار ہو کر سلیم کے قدموں پر سر رکھ دیا۔
مغل شہزادہ اپنے اس راز میں مطربہ کو شریک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے نشاط آفریں کو اپنی خلوت سے رخصت کر دیا۔ پھر بہت دیر تک اس اجنبی دوشیزہ کے تصور میں گم رہا جس نے شہزادہ سلیم کے ہوش اُڑا دیئے تھے۔
"یہ کس دنیا کی مخلوق ہے جو راستہ بھول کر قصرِ شاہی میں چلی آئی ہے؟"

چونکہ مہرالنساء ایرانی نژاد دوشیزہ تھی، اس لیے اس کے نقش و نگار مقامی لڑکیوں سے مختلف تھے.......
اور اسی انفرادیت نے مغل شہزادے کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہے۔

❀---❀---❀

پھر یوں ہوا کہ سلیم کے شوقِ دید میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ پابندی سے سبزہ زار کے اس گوشے میں چلا جاتا، جہاں اس نے پہلی بار مہرالنساء کو قصرِ شاہی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ مہرالنساء کئی دن تک غیر حاضر رہی......اور سلیم ذہن پر نقشِ انتظار کا بوجھ لیے آتا اور جاتا رہا۔ اگر مغل شہزادہ چاہتا تو مہرالنساء کی جستجو کے لیے کنیزوں کی ایک فوج مقرر کر دیتا......لیکن یہ ایک نازک معاملہ تھا جسے سلیم خود اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہتا تھا۔

پھر کئی دن بعد حُسن کا سورج دوبارہ طلوع ہوا۔ مغل شہزادے کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تاریکیاں ایک آن میں چھٹ گئیں۔ سلیم تیزی سے اجنبی دوشیزہ کے تعاقب میں بڑھا۔ مہرالنساء اپنے خیالات میں غرق چلی جا رہی تھی۔ یکایک مغل شہزادے نے اسے پکارا۔

''لڑکی! ٹھہرو۔'' سلیم کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اگرچہ تختِ ہندوستان کا وارث تھا۔ لیکن حُسن کے رُعب و جلال نے اسے ایک درخواست گزار بنا کر رکھ دیا تھا۔

مہرالنساء ایک اجنبی مرد کی آواز سن کر مڑی۔ اس کے چہرے پر ناز و غرور کی ایک عجیب سی تحریر لکھی ہوئی تھی۔ مہرالنساء نے ایک نگاہِ غلط انداز سے شہزادہ سلیم کی طرف دیکھا۔

''کیا ہے؟'' مہرالنساء کا لہجہ بڑا بے نیازانہ تھا۔ جیسے وہ ولی عہدِ سلطنت سے نہیں قصرِ شاہی کے کسی عام خدمت گار سے مخاطب ہو۔

''لڑکی! ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟'' شہزادہ سلیم نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ایرانی دوشیزہ کے حُسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ولی عہدِ سلطنت کی آواز میں اب بھی ہلکی سی لرزش تھی۔

''مگر تم کون ہو مجھ سے یہ بات پوچھنے والے؟'' مہرالنساء نے انتہائی پُراعتماد لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر فکر و پریشانی کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا۔

''میں اس محل کا مالک ہوں۔'' شہزادہ سلیم نے اپنی قوتِ ارادی کو سمیٹتے ہوئے کہا جو ایک پری وش نازنین کے سامنے بکھرتی جا رہی تھی۔ ''اس کے ایک ایک گوشے پر میرا ہی حکم چلتا ہے۔ میں ولی عہدِ سلطنت شہزادہ سلیم ہوں۔

مغل شہزادے کا خیال تھا کہ یہ تعارف سن کر اجنبی دوشیزہ گھبرا جائے گی اور اپنے طرزِ تخاطب پر اس سے معافی مانگنے لگے گی......مگر یہ محض خیال آرائی تھی۔ مہرالنساء نے ولی عہدِ سلطنت کی موجودگی کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

''ہوسکتا ہے کہ تم قصرِ شاہی کے مالک ہو...... مگر میں اپنی مرضی کی مالک ضرور ہوں۔'' مہرالنساء کی بے نیازی میں اور بھی شدت آ گئی تھی۔ ''اس لیے میں ضروری نہیں سمجھتی کہ اپنے بارے میں کچھ بتاؤں۔'' یہ کہہ کر مہرالنساء بادِ صبا کے تیز جھونکے کی طرح گزر گئی...... اور شہزادہ سلیم دیکھتا ہی رہ گیا۔ مغل سلطنت کے ولی عہد کو محسوس ہوا کہ اجنبی دوشیزہ کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ غرورِ حُسن اُسے اُڑائے لیے جا رہا ہے۔

❀---❀---❀

ایک تو مہرالنساء کا حُسنِ جہاں سوز، دوسرے ادائے بے نیازی..... غرض ان دونوں چیزوں نے شہزادہ سلیم کو اپنا اسیر کر لیا۔ اگر مہرالنساء پہلی ملاقات میں شہزادہ سلیم سے متاثر ہو جاتی تو ممکن تھا کہ ولی عہد اُسے زیادہ اہمیت نہ دیتا...... مگر جب ایرانی دوشیزہ اس طرح بے نیازانہ چلی گئی تو شہزادے کے شوقِ طلب کو بھی ٹھیس لگی...... اور اس کی انانیت بھی مجروح ہوئی۔ نتیجتاً سلیم، مہرالنساء کی یادوں میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔ اور ہر وقت کھویا کھویا سا رہنے لگا۔

قطب الدین کوکلتاش نے شہزادے کا یہ حال دیکھا تو خاموش نہ رہ سکا۔

''کیا شہزادۂ عالم کسی بت کی محبت میں گرفتار ہو گئے؟'' قطب الدین کوکلتاش نے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ بت ہی ایسا ہے۔'' سلیم مسکرایا۔ ''اگر تم بھی اسے دیکھ لیتے تو کسی حیل و حجت کے بغیر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیتے۔''

''میں تو شہزادۂ عالم سے یہی عرض کروں گا کہ اپنے منصب کو پہچانیں۔'' قطب الدین کوکلتاش نے عرض کیا۔ ''میں کسی بت کی موجودگی سے انکار نہیں کرتا...... مگر یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ صاحبِ عالم، تختِ شاہی سے اُتر کر ایک عام عورت کے قدموں میں بیٹھ جائیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ بت آپ کو ڈھونڈتا پھرتا اور آپ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے قرار رہتا۔''

''قطب الدین! تم ہمیں اندازِ سیاست سکھا رہے ہو۔ آئینِ حکومت کے رموز سمجھا رہے ہو۔'' شہزادہ سلیم نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ''سیاست اور محبت میں بڑا فرق ہے۔ سیاست میں تاج و تخت حاصل کرنے کے لیے خونریز جنگیں لڑی جاتی ہیں...... مگر محبت کی جنگ میں ہمیشہ عاشق ہی ہارتا ہے...... اور محبوب فاتح قرار پاتا ہے۔''

''کیا آپ یہ جنگ ہار چکے ہیں؟'' قطب الدین کوکلتاش کے لہجے میں ہلکا سا طنز شامل تھا۔

''ہارے تو نہیں ہیں مگر ہار جانے کو جی چاہتا ہے۔'' شہزادہ سلیم کی گفتگو میں اس کے دل کی خلش جھلک رہی تھی۔

''میں یہ ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ عظیم مغلوں کا وارث ایک شکست خوردہ عاشق کہلائے۔'' قطب الدین کوکلتاش کے ایک ایک لفظ سے گہرا خلوص جھلک رہا تھا۔

''فی الحال تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم اس اجنبی دوشیزہ کے بارے میں ہمیں ساری معلومات فراہم کرو۔''
یکایک شہزادہ سلیم کا لہجہ تحکم آمیز ہو گیا تھا۔

قطب الدین کے چہرے پر اذیت و کرب کا رنگ اُبھر آیا۔

شہزادہ سلیم نے فوراً ہی اپنے دوست کی دلی کیفیت کا اندازہ کر لیا اور پھر انتہائی نرم لہجے میں بولا۔
''قطب الدین! یہ ہمارا حکم نہیں ہے، ایک دوست کی درخواست ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس نازک کام کے لیے کسی دوسرے شخص کا انتخاب کریں، پھر یہ راز طشت ازبام ہو جائے اور ہم ظلِ سبحانی کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت سے پیش کر دیئے جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اس امانت کا بوجھ اُٹھا لو گے اور اپنے سینے کو ہمارے رازوں کا مدفن بنا لو گے۔ ہم کسی دوسرے شخص پر اس طرح اعتبار نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری مجبوری ہے۔''

قطب الدین کوکلتاش نے سر جھکا دیا۔ شہزادے کی وارفتگی نے اسے بھی مجبور کر دیا تھا۔

❀---❀---❀

پھر کئی دن کی تحقیق و جستجو کے بعد قطب الدین نے شہزادہ سلیم کو ایرانی دوشیزہ کے بارے میں مختصر معلومات فراہم کر دیں۔

''لڑکی کا نام مہرالنساء ہے۔ اس کا باپ غیاث بیگ کسی زمانے میں خراسان کا حاکم تھا۔ گردشِ وقت سے تنگ آ کر ہندوستان پہنچا اور اب ظلِ سبحانی کے سایۂ کرم میں آسودہ زندگی گزار رہا ہے۔''

''مہرالنساء!'' شہزادہ سلیم نے ایرانی دوشیزہ کے نام کو دہرایا اور اس کے چہرے پر غیر معمولی چمک اُبھر آئی۔ ''قطب الدین! اس کے ماں باپ نے بیٹی کا نام رکھتے وقت صحیح ترین لفظ کا انتخاب کیا تھا۔ واقعی وہ مہرالنساء ہے...... مگر ہم اسے ''مہرو'' کہہ کر پکاریں گے۔'' سلیم کے لہجے سے انتہائی سرشاری جھلک رہی تھی۔

''صاحبِ عالم! وہ آپ کے ایک ادنیٰ ملازم کی لڑکی ہے۔'' قطب الدین کوکلتاش نے سلیم کو خمارِ عشق سے نجات دلانے کے لیے ایک عقلی دلیل پیش کی۔ ''لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے؟''

سلیم نے مسکراتے ہوئے اپنے دوست اور دودھ شریک بھائی کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے شراب کا ایک جام لبریز کیا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ ''قطب الدین! لوگ کیا کہیں گے؟''

''بڑی عجیب عجیب باتیں کریں گے۔'' قطب الدین بہت آہستہ لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔ ''کہنے والوں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے؟ وہ تو صاف صاف کہیں گے کہ سورج ایک شمع سے روشنی حاصل کرنے کے لیے، آسمان سے زمین پر اُتر آیا ہے۔ یہ تو آفتاب کی توہین ہو گی صاحبِ عالم! آپ تو خود سورج ہیں۔ ہندوستان کے کروڑوں عوام آپ کی ذات سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ پھر یہ کیا کہ......''

شہزادہ سلیم نے مسکراتے ہوئے قطب الدین کی بات کاٹ دی اور مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کا یہ مشہور شعر پڑھا۔

بندۂ عشق شدی، ترکِ نسب کن جامی

کندریں راہ ، فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

(جامی! تُو عشق کا بندہ بن جا اور نسب نامے کو ترک کر دے..... کیونکہ اس راستے میں فلاں ابنِ فلاں کی کوئی حیثیت نہیں ہے)

قطب الدین کوکلتاش خاموش ہو گیا۔ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ مہرالنساء کے حُسن کا جادو سلیم کے سر چڑھ کر بول رہا ہے اور ایک سحر زدہ شخص کو عقل کی کوئی بات بھی سمجھائی نہیں جا سکتی۔

❁---❁---❁

آخر شہزادہ سلیم کی وارفتگی رنگ لائی۔ وہ شہزادگی کے تمام آداب کو بالائے طاق رکھ کر ایک عام عاشق کی طرح مہرالنساء کا انتظار کرنے لگا۔ مہرالنساء اپنی نوعمری ہی میں ایک ذہین دوشیزہ تھی۔ اس نے ولی عہدِ سلطنت کی رنگین مزاجی کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس لیے شہزادہ سلیم کی عشق باز نظروں سے دُور ہی دُور رہا کرتی تھی۔ اگر کبھی آمنا سامنا ہو جاتا تو ایک ادائے ناز کے ساتھ سلام کر کے گزر جاتی۔ سلیم کا خیال تھا کہ اس کی ذاتی شخصیت مہرالنساء کو بھی عشق کی زنجیروں میں جکڑ لے گی مگر طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ایرانی دوشیزہ ہواؤں کی طرح آزاد رہی۔ مہرالنساء کی اس بے نیازی اور بے رُخی نے سلیم کی آتشِ شوق کو کچھ اور بھڑکا دیا۔

عام طور پر تو یہی مشہور ہے کہ شہزادہ سلیم اور مہرالنساء شاہی باغ کے ایک سنسان گوشے میں چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔ اکثر مؤرخوں نے اس واقعے کو بہت اُچھالا ہے کہ ایک دن مہرالنساء سبزہ زار میں کھڑی تھی۔ شہزادہ سلیم اپنی محبوبہ کو تلاش کرتے کرتے ادھر آ پہنچا۔ اس وقت ولی عہدِ سلطنت کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت کبوتر تھا۔ سلیم نے وہ کبوتر مہرالنساء کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اسے مضبوطی سے پکڑ لو۔ ورنہ یہ اُڑ جائے گا۔ میں اس کے ساتھی کبوتر کو لے کر آتا ہوں۔''

مہرالنساء نے ولی عہدِ سلطنت کا دیا ہوا کبوتر لے لیا اور اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد شہزادہ سلیم واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں دوسرا کبوتر موجود تھا۔ شہزادے نے بڑی حیرت سے مہرالنساء کی طرف دیکھا جو خالی ہاتھ کھڑی تھی۔

''مہرو! وہ کبوتر کہاں گیا؟'' سلیم نے اپنی محبوبہ سے پوچھا۔

''اُڑ گیا۔'' مہرالنساء نے بڑی سادگی سے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیسے اُڑ گیا؟'' شہزادہ سلیم نے حیران ہو کر پوچھا۔

مہرالنساء نے شہزادے کے ہاتھ سے دوسرا کبوتر لے لیا اور پھر دوسرے ہی لمحے اسے چھوڑتے ہوئے

کہا۔''اس طرح اُڑ گیا۔''

مؤرخین نے لکھا ہے کہ شہزادہ سلیم، مہرالنساء کی اس سادگی پر قربان ہو گیا اور اس نے پوری شدت کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کر ڈالا۔

بعض مؤرخین کے نزدیک اس قسم کے واقعات درست نہیں ہیں۔ مہرالنساء کو شہزادہ سلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اوّل و آخر ایک مغرور لڑکی تھی جسے اپنے حُسن پر بہت ناز تھا۔ اُسے یہ دیکھ کر عجیب سی لذت کا احساس ہوتا تھا کہ ہندوستان کا ولی عہدِ سلطنت اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔

مہرالنساء کے اسی اندازِ تغافل نے مغل شہزادے کو ایرانی دوشیزہ کا دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ مہرالنساء جس قدر بے رخی اختیار کرتی، سلیم اس قدر پُر جوش ہو جاتا۔ شہزادے نے کئی چالیں چلیں مگر مہرالنساء اُس کے دام میں نہیں آئی۔

آخر ایک دن یہ مغرور ایرانی دوشیزہ، سلیم کو تنہائی میں نظر آ گئی۔ مغل شہزادے نے اسے روکتے ہوئے کہا۔''مہرو! تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے بغیر میری کیا حالت ہے؟ میں سکون سے سو بھی نہیں سکتا۔''

''اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔'' مہرالنساء نے اسی بے رخی سے جواب دیا۔

''میں تمہاری زبان سے اپنی محبت کا اقرار سننا چاہتا ہوں۔'' سلیم بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔

مہرالنساء چند لمحوں تک خاموش کھڑی رہی، پھر چپ چاپ آگے بڑھنے لگی۔

سلیم نے اُس کا راستہ روک لیا۔''مہرو! تم اس طرح نہیں جا سکتیں۔ اب مجھ میں زیادہ تابِ انتظار نہیں ہے۔''

''شہزادے! میرا راستہ چھوڑ دیجیے۔'' مہرالنساء نے تلخ لہجے میں کہا۔

مہرالنساء کے اس جواب پر سلیم مشتعل ہو گیا اور اس نے آگے بڑھ کر ایرانی دوشیزہ کو آغوش میں لے لیا۔

مہرالنساء کو اندازہ نہیں تھا کہ مغل شہزادہ اچانک اس جارحیت پر اُتر آئے گا۔ چند لمحوں کے لیے اُسے سکتہ سا ہو گیا۔ پھر وہ سنبھلی اور مزاحمت پر اُتر آئی۔ ممکن تھا کہ مغل شہزادے کی یہ جارحیت کچھ دیر اور جاری رہتی کہ اتنے میں ایک شاہی کنیز ادھر سے گزری۔ سلیم نے گھبرا کر مہرالنساء کو چھوڑ دیا اور سرگوشی میں بولا۔

''آج رات میں سبزہ زار میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

مہرالنساء تیز قدموں سے شاہی حرم سرا کی طرف چلی گئی۔

❁---❁---❁

شہزادہ سلیم رات بھر مہرالنساء کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آئی۔

دوسرے دن محل میں ہلچل سی مچ گئی۔ مہرالنساء، شہنشاہ اکبر کی بیگمات کے پاس پہنچی اور شہزادہ سلیم کی شکایت کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''مجھے آگرہ سے کہیں دُور بھیج دیجیے۔ اب قصرِ شاہی میں اس کنیز کا گزارہ ممکن نہیں۔''

''آخر کیوں؟'' سلیم کی ماں رانی جودھا بائی نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''یہ ادنیٰ کنیز، شہزادۂ عالم کی بدنظری کو برداشت نہیں کر سکتی۔'' یہ کہتے کہتے مہرالنساء کا سرخ و سفید چہرہ دُھواں ہو گیا تھا۔

یہ انکشاف سن کر رانی جودھا بائی اور دوسری بیگمات حیرت زدہ رہ گئیں۔ پھر سلیم کی ماں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''مہرالنساء! یہ بات ظلِ سبحانی کے کانوں تک نہیں پہنچنا چاہئے۔ ہم سلیم کو سمجھا دیں گے۔ وہ ایک نادان لڑکا ہے۔''

اس وقت اکبر کی جاسوس عورتیں بھی وہاں موجود تھیں۔ ایک جاسوسہ مغل شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی۔

''ظلِ سبحانی! شہزادۂ عالم کی خبر لیجئے کہ وہ امورِ سلطنت کے بجائے محل کی کنیزوں میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔''

اپنی جاسوس کنیز دلارام کی زبانی یہ انکشاف سن کر مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر سناٹے میں آ گیا۔

دلارام قصرِ شاہی کی حسین ترین کنیز تھی جسے اکبر کی بارگاہِ خاص میں رسائی حاصل تھی۔ مغل شہنشاہ، دلارام پر بہت زیادہ اعتبار کرتا تھا۔ اسی وجہ سے مہارانی جودھا اور دوسری بیگمات، دلارام سے حسد کرتی تھیں۔

''تُو جھوٹ تو نہیں بول رہی ہے دلارام؟'' شہنشاہ اکبر کا لہجہ سخت تھا۔

''کنیز کی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے شہنشاہ کے سامنے سچ بولتی ہے۔'' دلارام نے نصف قد تک خم ہوتے ہوئے کہا۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ ہماری ساری احتیاطی تدابیر ناکام ہو گئیں۔'' مغل شہنشاہ کے لہجے میں غصہ بھی تھا اور دکھ بھی۔

''ظلِ الٰہی کی ایک ایک تدبیر کارگر تھی مگر صاحبِ عالم شدتِ جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔'' دلارام نے جھجکتے جھجکتے سارا واقعہ بیان کر دیا۔

''غیاث بیگ کی بیٹی مہرالنساء کی بے باکی نے اس معاملے کو اور بھی سنگین بنا دیا ہے۔ ابھی تو بات صرف شاہی بیگمات تک محدود ہے...... اگر اس غلام زادی کی زبان بہک گئی تو دشمنانِ سلطنت بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیں گے۔''

''تیرے شہنشاہ کے جیتے جی یہ کیسے ممکن ہے دلارام؟'' شہنشاہ اکبر کے ایک ایک لفظ سے غرورِ شاہی جھلک رہا تھا۔ ''وہ نادان شہزادہ عظیم مغلوں کی وراثت کو ایک کنیز کے قدموں پر کس طرح ڈال سکتا ہے۔ بالفرض اگر ایسا ہو گیا تو قیامت ٹوٹ پڑے گی دلارام!'' شدتِ غضب سے اکبر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

اپنے شہنشاہ کی یہ حالت دیکھ کر دلارام گھبرا سی گئی۔ ''سارے جہاں میں ظلِ سبحانی کے فہم و فراست کی دھوم ہے۔ صاحبِ عالم کی نادانی کسی بڑی سزا کی مستحق نہیں ہے۔ بس ذرا سی فہمائش، معمولی سی تنبیہہ۔''

دلارام کو یہ خوف لاحق تھا کہ اگر شہزادہ سلیم کو اس مخبری کا پتہ چل گیا تھا تو وہ خود بھی ولی عہدِ سلطنت کے غضب سے محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ شہنشاہ اکبر نے اپنی کنیزِ خاص کے چہرے سے اس کے اندیشوں کا اندازہ کرلیا۔ ''درمیان میں تیرا نام نہیں آئے گا دلارام! ہم اپنے جاسوسوں کا راز کسی دوسرے پر فاش نہیں کرتے تو مطمئن رہ۔ تیرے اوپر کوئی حرف نہیں آئے گا۔'' اکبر نے دلارام کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

دلارام اُلٹے قدموں واپس چلی گئی اور مغل شہنشاہ ساری رات جاگتا رہا۔

❁---❁---❁

دوسرے دن اکبر نے مہرالنساء کو خلوت میں طلب کرلیا۔ مغل شہنشاہ اس دوشیزہ کو دیکھنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے ولی عہدِ سلطنت نے اخلاقی حدود عبور کر کے اپنے خاندانی منصب کو رُسوا کرنے کی کوشش کی تھی۔

مہرالنساء کانپتے جسم کے ساتھ فرمانروائے ہندوستان کے سامنے سر جھکائے کھڑی رہی اور شہنشاہ اکبر اُس کے سراپا کا جائزہ لیتا رہا۔

''ظلِّ سبحانی! کیا کنیز سے کوئی گستاخی سرزد ہوگئی ہے؟'' مہرالنساء نے ڈرتے ڈرتے زبان کھولی۔

''ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ غیاث بیگ کی بیٹی کتنی بڑی ہوگئی ہے؟'' شہنشاہ اکبر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جب دارالحکومت میں آئی تھی تو چند دنوں کی شیرخوار بچی تھی۔''

''اب ظلِّ سبحانی کے ٹکڑوں پر پل کر بڑی ہوگئی ہوں۔'' مہرالنساء اپنی فطری ذہانت کے باعث اس راز تک پہنچ گئی تھی کہ شہنشاہ کی خدمت میں اس کی طلبی بے سبب نہیں ہے۔

''تجھے قصرِ شاہی کے کسی فرد سے کوئی شکایت تو نہیں ہے؟'' اکبر نے اشارتاً ایک ایسا سوال کر ڈالا تھا جس کا جواب بہت مشکل تھا۔ مغل شہنشاہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مہرالنساء میں کس قدر جرأت و بے باکی ہے؟

مہرالنساء نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھ لیا۔ ''جو لوگ ظلِّ سبحانی کے سایۂ کرم میں رہتے ہیں، انہیں کوئی خوف نہیں ہوتا۔''

مغل شہنشاہ ایک سولہ سالہ دوشیزہ کی حاضر دماغی اور جواب کی برجستگی پر حیران رہ گیا۔ شاہی بیگمات کے سامنے شہزادے کی دراز دستی کا قصہ بیان کرنے والی لڑکی نے والیٔ ہندوستان کے سامنے بڑی ذہانت سے ولی عہدِ سلطنت کے جرم پر پردہ ڈال دیا تھا۔

اکبر نے مہرالنساء کو انعام سے سرفراز کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تجھے کبھی کوئی شکایت ہو تو براہِ راست اپنے شہنشاہ سے فریاد کرسکتی ہے۔''

مہرالنساء نے تین بار اکبر کی خدمت میں فرشی سلام پیش کیا اور شہنشاہ کی عنایتِ خسروانہ کا شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔

مہرالنساء کے جاتے ہی اکبر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بہت دیر تک اضطراب کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ پھر خود کلامی کے انداز میں کہنے لگا۔

''اسے دیکھ کر سلیم گمراہ ہو سکتا ہے......اور پھر یہی لڑکی مغل سلطنت کے لیے ایک سنگین خطرہ بھی بن سکتی ہے۔''

مہرالنساء کا بے پناہ حُسن دیکھ کر شہنشاہ اکبر بھی حیرت زدہ رہ گیا تھا......اور پھر اسی حیرت نے خوفناک اندیشوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔

❁---❁---❁

شہزادہ سلیم باپ کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا......اور مغل شہنشاہ کے چہرے پر قہر و غضب کے آثار پوری شدت کے ساتھ نمایاں تھے۔

''سلیم! تمہارا جرم یہ ہے کہ تم نے ہماری ہدایات کو یکسر فراموش کر دیا اور سرکشی کے راستے پر چل پڑے۔'' اکبر کے لہجے سے انتہائی آمریت جھلک رہی تھی جیسے وہ اپنے فرزند سے نہیں، کسی عام انسان سے مخاطب ہو۔

''سلیم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' ولی عہدِ سلطنت کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''جب تک ظلِ سبحانی کے احکام میرے رہنما ہیں، میں کسی غلط راستے پر نہیں چل سکتا۔''

''تم مہرالنساء نام کی لڑکی کو جانتے ہو؟'' اشاروں کنایوں میں بات کرنے کے بجائے مغل شہنشاہ براہِ راست گفتگو پر اُتر آیا تھا۔

مہرالنساء کا نام سن کر چہرہ زرد پڑ گیا......اور بارِ ندامت سے اس کی گردن مزید جھک گئی۔

''کیا ہم نے اس دن کے لیے تمہاری پیدائش کی دعائیں کی تھیں؟'' یہ کہتے کہتے اکبر کی نظروں میں وہ منظر گھوم گیا جب مغل شہنشاہ نے آگرہ سے اجمیر شریف تک کا طویل سفر پیادہ پا طے کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں آبلوں سے بھر گئے تھے۔ پھر اکبر نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روضۂ مبارک پر حاضر ہو کر بیٹے کی پیدائش کے لیے رو رو کر دعائیں کی تھیں۔ آج وہ سلیم کو اسی زمانے کی یاد دلا رہا تھا۔

سلیم کیا جواب دیتا۔ وہ تو شرم کے بوجھ سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

''مہرالنساء! کیا ہے؟'' اکبر کے قہر کی آگ مزید بھڑک اُٹھی تھی۔ ''تمہارے باپ کے ادنیٰ خادم کی بیٹی......بیگماتِ شاہی کی ایک حقیر کنیز۔''

سلیم خوف زدہ ہونے کے ساتھ حیران بھی تھا کہ سبزہ زار کے ایک گوشے کا راز شہنشاہ کی خلوتوں تک پہنچ کیسے گیا؟

''عظیم مغلوں کا وارث دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اتنی پستی میں اُتر جائے گا؟'' اکبر آتشیں لہجے میں بول رہا تھا۔ ''تم بزرگوں کی دستارِ فضیلت کو ایک کنیز کے قدموں پر رکھنا چاہتے ہو؟ بخدا ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ یہ تمہاری پہلی لغزش ہے جس سے ہم نے چشم پوشی اختیار کر لی ہے لیکن اس جرم کا اعادہ کیا گیا تو ہماری دی ہوئی سزا بہت سخت ہو گی۔''

سلیم لرزتے قدموں سے واپس چلا گیا۔ اور شہنشاہ اکبر اپنے محبوب بیٹے کو مہرالنساء کے فتنے سے بچانے کے لیے منصوبہ بندی کرنے لگا۔

❀---❀---❀

وقت ضائع کیے بغیر مغل شہنشاہ نے مہرالنساء کے باپ غیاث بیگ کو بھی اپنے حضور میں طلب کر لیا۔

بے وقت طلبی پر غیاث بیگ حیران و پریشان نظر آ رہا تھا۔ ''ظلِ الٰہی کے مزاج کیسے ہیں؟'' غیاث بیگ کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ عام طور پر یہی ہوتا تھا کہ جب بھی کسی امیر یا وزیر کو طلب کیا جاتا تو وہ اندیشوں اور وسوسوں میں گھر جاتا۔ مزاجِ شاہی برہم ہوا تو طلب کیے جانے والا اپنے عہدہ و منصب سے ہاتھ دھو بیٹھا...... اور اگر فرمانروا کے چہرے پر خوشی کے آثار روشن ہوئے تو بلائے جانے والے پر عروج و ترقی کے نئے دروازے کھل گئے۔ غیاث بیگ جب اکبر کی خلوت میں داخل ہوا تھا تو فرمانروائے ہند کے چہرے پر بے حد سنجیدگی چھائی ہوئی تھی جسے فکرمندی کے مماثل قرار دیا جا سکتا تھا۔ اپنے آقائے نعمت کا یہ رنگ دیکھ کر غیاث بیگ پریشان ہو گیا تھا...... اور اسے کسی نامعلوم خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔

اکبر نے فوری طور پر غیاث بیگ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ نتیجتاً اس کی سانسیں رکنے لگیں۔

''یقیناً مزاجِ شاہ برہم ہے۔ اور اس کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔'' غیاث بیگ نے دل ہی دل میں سوچا اور اس کے اندیشوں نے نئی شکل اختیار کر لی۔ غیاث بیگ پلکیں جھپکائے بغیر اکبر کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ یہ بھی گستاخی تھی لیکن غیاث بیگ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔

''ظلِ الٰہی! کیا اس خادم سے کوئی کوتاہی سرزد ہو گئی ہے؟'' غیاث بیگ نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ اب کی بار اس کی آواز سے کچھ زیادہ لرزش نمایاں تھی۔

''تجھ سے تو کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے مگر تیری ذات ایک بڑے ہنگامے کا سبب بن سکتی ہے۔'' اکبر نے پُرجلال لہجے میں کہا۔

جیسے ہی مغل شہنشاہ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، غیاث بیگ کسی تامل کے بغیر سجدے میں چلا گیا۔ ''یہ حقیر کمزور بھی ہے اور نادان بھی۔'' غیاث بیگ سجدے میں پڑا فریاد کر رہا تھا۔ ''اب شہنشاہ کا کرم ہی اس غلام کی اس خطا کو معاف کر سکتا ہے جو نادانستہ طور پر اس سے سرزد ہو گئی ہے۔''

اکبر نے غیاث بیگ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ شہنشاہ نے اپنے غلام کو امان دے دی ہے اور اسے [illegible] دیا گیا ہے۔

غیاث بیگ سیدھا ہوا۔ اب وہ فرمانروائے ہند کے سامنے دست بستہ اور دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔

''تیری بیٹی جوان ہو گئی ہے غیاث بیگ!'' اکبر کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''یہ سب ظلِ الٰہی کی کرم فرمائی کا نتیجہ ہے کہ اس خانہ بدوش کو دیارِ ہند میں امان ملی۔'' غیاث بیگ گداگرانہ انداز میں مغل شہنشاہ کے سارے احسانات شمار کر رہا تھا۔

''شاہی محلات کی فضاؤں کا کوئی اعتبار نہیں۔'' اکبر نے غیاث کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگرچہ ہمارے جاہ و جلال کے پہرے بہت سخت ہیں...... لیکن جوانی کی سرمستیاں نئے نئے بہانے تراش لیتی ہیں۔ منصب و اقتدار کے نشے میں غرق کسی بھی وزیر زادے کے قدم تیرے کوچۂ آبرو کی جانب بڑھ سکتے ہیں۔ حادثہ کسی بھی وجہ سے رونما ہو لیکن بادشاہِ وقت اس سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ مہرالنساء ہماری بھی بیٹی ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ وہ قصرِ شاہی سے سلامتی کے ساتھ رخصت ہو کر اپنے شوہر کے یہاں چلی جائے۔''

ہر چند کہ بات مبہم اشاروں میں کہی گئی تھی مگر غیاث بیگ سمجھ گیا تھا کہ فرمانروائے ہند کیا کہنا چاہتا ہے؟

''ظلِ الٰہی ہم سب کی تقدیروں کے مالک ہیں۔'' غیاث بیگ نے دست بستہ عرض کی۔ ''یہ غلام اپنے آقائے نعمت کے ہر فیصلے کو دل و جاں سے قبول کریں گے۔''

شہنشاہ اکبر کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر تحکم آمیز لہجے میں بولا۔ ''تُو اپنی لڑکی کے لیے کوئی مناسب رشتہ تلاش کر اور اس کام کو تیزی سے تکمیل تک پہنچا۔''

غیاث بیگ اُلٹے قدموں واپس جانے لگا تو اکبر نے اس دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مہرالنساء کو اپنے گھر کی چاردیواری تک محدود کر دے۔ شاہی تقریبات میں وہ اسی طرح شریک ہو سکتی ہے کہ تیری بیوی ہر قدم پر اس کی نگراں ہو۔''

❀---❀---❀

شہنشاہ نے اپنے اختیارات استعمال کر کے حُسن کو ایک کمرے تک محدود کر دیا تھا...... اور بے لگام عشق کو زنجیریں پہنا دی تھیں۔ اس پابندی سے مہرالنساء خوش تھی کہ اسے شہزادہ سلیم کی دراز دستیوں سے نجات مل گئی تھی۔ مگر ولی عہدِ سلطنت حکمِ شاہی سے بیزار تھا۔ اس نے اپنے دوست اور دودھ شریک بھائی قطب الدین کوکلتاش کو خلوت میں طلب کر کے سارا واقعہ سنا دیا۔

''میں نے تو پہلے ہی صاحبِ عالم سے عرض کیا تھا کہ اگر دھواں اٹھا تو لوگ یہ جاننے کی کوشش ضرور کریں گے کہ آگ کہاں لگی ہے؟'' قطب الدین نے ناصحانہ انداز میں عرض کیا۔

''آگ تو لگ چکی ہے قطب الدین!'' شہزادہ سلیم برہم نظر آ رہا تھا۔ ''اب یہ اسی کے دیدار سے بجھے گی، جس کے جلوؤں نے اسے بھڑکایا ہے۔''

''کیا آپ شہنشاہِ معظم کے حکم کو نظرانداز کر دیں گے؟'' شہزادے کے باغیانہ تیور کو دیکھ کر قطب الدین کوکلتاش کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''ہم کسی ایک کا حکم مان سکتے ہیں۔'' شہزادہ سلیم اضطراری حالت میں اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔

''کیا ظلِ الٰہی کے علاوہ ہندوستان میں کوئی اور بھی حکمراں ہے؟'' قطب الدین نے حیران ہو کر پوچھا۔

''مملکتِ ہند میں تو ایک ہی حکمراں ہے۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر۔'' شہزادہ سلیم نے بلند آواز میں کہا۔

''پھر......؟'' قطب الدین کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

''دوسرا حکمراں ہماری ذات کے اندر چھپا ہوا ہے۔'' شہزادہ سلیم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ حکمراں ہمارا دل ہے۔ ہم اس کے آگے کسی کے حکم کو تسلیم نہیں کرتے۔''

نوجوانی کی سرکشی مشہور ہے۔ قطب الدین کوکلتاش بھی شہزادہ سلیم کا ہم عمر تھا...... مگر قدرت نے اسے نوعمری میں بھی فہم و فراست اور ضبط و تحمل سے نوازا تھا۔ اس نے بہت غور سے شہزادے کی طرف دیکھا۔ سلیم کے چہرے پر سرکشی اور بغاوت کے آثار نمایاں تھے۔

''اس آگ کو یہیں بجھا دیجئے صاحبِ عالم!'' قطب الدین کوکلتاش نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ شعلے بھڑکے تو نہ جانے کیا کیا جل جائے گا؟''

سلیم جیسے عاشق مزاج نوجوان کے لیے ہر مشورہ رائیگاں تھا اور ہر نصیحت بے سود۔ ''جب ہمارا دل جل رہا ہے تو ہمیں بھی کسی کی پروا نہیں۔ جل جائے سب کچھ۔ خاکستر ہو جائے ہندوستان۔''

قطب الدین کوکلتاش مجبوراً خاموش ہو گیا۔ شہزادے کے سینے کی آگ اس انداز سے بھڑک رہی تھی کہ اس پر لفظوں کی بارش بے اثر تھی۔ اسے تو دیدار کی شبنم ہی بجھا سکتی تھی......اور شہزادے کو دیدار میسر نہیں تھا۔

شہنشاہ اکبر کی سخت ترین تنبیہہ کے باوجود ولی عہدِ سلطنت اس کوشش میں سرگرداں رہتا تھا کہ کسی طرح مہرالنساء کے چہرے کی ایک جھلک ہی دیکھ لے...... مگر مہرالنساء کو اس کے گھر کی چار دیواری میں قید کیا جا چکا تھا۔

❀---❀---❀

ان ہی دنوں ایک نوجوان علی قلی، ملتان سے آگرہ پہنچا اور مغل شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ علی قلی ملتان کے حاکم عبدالرحیم خان خاناں کا سفارش نامہ لے کر آیا تھا۔ عبدالرحیم خان خاناں، اکبر کے استاد بیرم خان مرحوم کا فرزند تھا۔ نہایت فاضل اور لائق انسان تھا۔ آج بھی عبدالرحیم خان خاناں کا شمار ہندی زبان کے اکابر شعراء میں ہوتا ہے۔

علی قلی نسلاً ایک ترک زادہ تھا۔ وہ کچھ عرصے تک شاہِ ایران طہماسپ صفوی کے دربار سے وابستہ رہا۔ پھر گردشِ زمانہ کے سبب ایران سے ملتان پہنچا۔ عبدالرحیم خان خاناں نے علی قلی کی ہنرمندی سے متاثر ہو کر اسے شاہی عملے میں شامل کر لیا۔ پھر کچھ دن بعد حاکمِ ملتان نے اپنی سفارشات کے ساتھ علی قلی کو شہنشاہ اکبر کی خدمت میں بھیج دیا۔

اکبر نے علی قلی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دراز قد اور دلکش خدوخال رکھنے والا نوجوان تھا۔

''بیٹھ جاؤ نوجوان!'' مغل شہنشاہ نے علی قلی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''حضورِ شاہ میں کھڑا رہنا ہی میرے لیے سب سے بڑی سعادت ہے۔'' علی قلی نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا۔

شہنشاہ اکبر، علی قلی کی شائستگی سے بہت متاثر ہوا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نوجوان! یہ تمہاری آزمائش تھی...... اور ہمیں خوشی ہے کہ تم اس امتحان میں بحسن و خوبی کامیاب ہو گئے۔“

علی قلی نے احترامِ شاہ میں سر جھکا دیا۔

”اگر تم ہمارے حکم پر بیٹھ جاتے تو بظاہر یہ بات درست ہوتی مگر مزاجِ شاہی پر گراں گزرتی۔“ مغل شہنشاہ، ترک نوجوان علی قلی کے طرزِ عمل سے بہت خوش تھا۔

علی قلی احتراماً کچھ اور خم ہو گیا۔

مغل شہنشاہ نے حاکمِ ملتان عبدالرحیم خان خاناں کے بھیجے ہوئے سفارش نامے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”عبدالرحیم نے لکھا ہے کہ تم ایک شجاع نوجوان ہو۔ شکار کا شوق رکھتے ہو اور ایک شیر کو اپنی تلوار سے ہلاک کر چکے ہو۔ یہ تو شجاعت و مردانگی کی ایک اعلیٰ دلیل ہے۔“

”حاکمِ ملتان ایک اعلیٰ ظرف انسان ہیں۔“ علی قلی نہایت شائستہ لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ ”خان خاناں نے ایک معمولی واقعے کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کر دیا ورنہ بے شمار انسان شکار کھیلتے ہیں اور شیروں کو بھی ہلاک کرتے ہیں۔“

مغل شہنشاہ کو علی قلی کا یہ انکسار بھی پسند آیا۔ ”ہمیں خوشی ہے کہ ہماری مملکت میں ایسے شجاع اور جانباز نوجوان بھی موجود ہیں۔“ اکبر نے علی قلی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ تم نے ایک یادگار کارنامہ انجام دیا ہے۔ شیر کے مقابل شیر ہی ٹھہرتا ہے۔“

”شاہِ والا کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔“ علی قلی نصف قد تک خم ہو گیا۔ ”آج مجھے اپنے فنِ سپہ گری کی حقیقی داد ملی ہے۔ میں اس مبارک ساعت پر ہمیشہ نازاں رہوں گا۔“

❁---❁---❁

پھر شہنشاہ اکبر کے حکم پر مہرالنساء کی شادی علی قلی سے طے کر دی گئی۔

قصرِ شاہی کے مکینوں کے لیے یہ ایک عام سی خبر تھی...... مگر شاہی بیگمات نے اس رشتے کے طے ہو جانے کے بعد سکون کی سانس لی۔ چند ماہ پہلے غیاث بیگ کے گھر سے جو سرخ آندھی اُٹھی تھی، وہ مغلیہ سلطنت کے ایک تناور درخت کو نقصان پہنچائے بغیر چپ چاپ گزر گئی تھی۔

شہنشاہ اکبر بہت زیادہ خوش تھا کہ اس نے اپنی ذہانت سے مغلیہ سلطنت کے مستقبل کو محفوظ کر دیا تھا۔

مگر شہزادہ سلیم کے روز و شب شدید اذیت کا شکار تھے۔ مہرالنساء اور علی قلی کی شادی کی خبر نے ولی عہدِ سلطنت کی نیندیں اُڑا دی تھیں۔ اس نے قطب الدین کوکلتاش کے سامنے اپنے دل کا درد بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔

''قطب الدین! شاہِ والا نے یہ فیصلہ میرے دل کے خلاف کیا ہے...... میری خاموشی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں نے اس فیصلے کو دل سے قبول کرلیا ہے۔''

''صاحبِ عالم! ایک باپ کی محبت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔'' قطب الدین کوکلتاش نے بڑی ذہانت سے اس جذباتی سیلاب کو روکنے کی کوشش کی جو دل کے کناروں کو توڑ کر باہر نکل جانے کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

''شاہِ والا کو صرف اپنے آپ سے محبت ہے۔'' شہزادہ سلیم نے قطب الدین کی کسی بھی دلیل کو قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ ''بابا محترم اگر مجھ سے محبت کرتے ہوتے تو میری بات سنتے...... میرے دل کی زبان کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ بے شک وہ با اختیار ہیں۔ ان کی بے پناہ طاقت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا...... مہرو کی قسمت کا فیصلہ جبراً کیا گیا ہے۔ شاہِ والا نے اس بات کا لحاظ نہیں رکھا کہ مہرالنساء میری مرکزِ نظر ہے۔ کسی دوسرے مرد کی آنکھیں اس کے چہرے کا طواف نہیں کرسکتیں۔''

قطب الدین کوکلتاش گھبرا گیا۔ ''پھر صاحبِ عالم کیا کریں گے؟''

''مجبور ہوں۔ اس لیے کچھ نہیں کرسکتا۔'' شہزادہ سلیم کے لہجے سے غصہ بھی جھلک رہا تھا اور شکستگی بھی۔ ''مگر قطب الدین! میں اتنا تو کرسکتا ہوں کہ اپنی اس شکست کو ہمیشہ یاد رکھوں۔''

چونکہ مہرالنساء اور علی قلی کی شادی مغل شہنشاہ کے ایماء پر کی گئی تھی، اس لیے اکبر اس شادی میں پیش پیش تھا۔

جب دونوں کا نکاح ہوگیا تو فرمانروائے ہندوستان نے علی قلی کو اس کی بہادری پر ''شیر افگن'' کا خطاب دیا۔

شہزادہ سلیم بھی شادی کی اس تقریب میں موجود تھا۔ شہنشاہ کی اس عنایتِ خاص پر ولی عہدِ سلطنت کا دل رنج والم کے غبار سے بھر گیا۔ وہ علی قلی کو اپنا رقیب سمجھ رہا تھا۔

شیر افگن کے خطاب کے ساتھ ہی علی قلی کو بنگال کی جاگیر بھی بخش دی گئی۔ شہزادہ سلیم نے باپ کی ان مسلسل عنایات کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

پھر جب علی قلی تقریب گاہ سے رخصت ہونے لگا تو اس نے نصف قد تک جھک کر فرمانروائے ہند کی خدمت میں سلام پیش کرتے ہوئے جوشِ عقیدت کے ساتھ اکبر کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

''میں شاہِ والا کی عنایاتِ خسروانہ پر آخری سانس تک ممنونِ کرم رہوں گا۔'' شیر افگن نے بلند آواز میں شہنشاہ اکبر کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے لہجے سے سپاہیانہ آہنگ کی جھلک نمایاں تھی۔

شہزادہ سلیم نے اس گفتگو کو سنا اور اس کے چہرے کا رنگ بگڑ گیا۔

پھر جب علی قلی نے ولی عہدِ سلطنت کی خدمت میں سلام پیش کیا تو شہزادہ سلیم اپنے جذبات پر قابو

پانے میں ناکام رہا۔ اس نے شدید ناگواری کا اظہار کیا اور اپنی نشست سے اُٹھ کر چلا گیا۔
شیر افگن نے شہزادے کی اس بے رخی کو شدت سے محسوس کیا مگر اس کی وجہ جاننے سے قاصر رہا۔

❀---❀---❀

مہر النساء کی شادی کے چند روز بعد ہی شہنشاہ اکبر نے راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے سلیم کی شادی کر دی۔ اس وقت شہزادے کی عمر سولہ سال کے قریب تھی۔ راجہ بھگوان داس ایک طاقتور راجپوت تھا۔ اکبر نے اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کے لیے شادی کے پردے میں نیا سیاسی کھیل کھیلا تھا۔ خود راجپوت بھی مغلوں کے ساتھ ایک خوفناک کھیل، کھیل رہے تھے۔ آخر اسی کھیل کھیل میں قصرِ شاہی ''مندر'' بنتا جا رہا تھا۔ پہلے مہارانی جودھا کے لیے محل میں ایک چھوٹا سا مندر تعمیر کیا گیا تھا۔ اب اسی مندر میں اس کی بہو بھی پوجا پاٹھ کیا کرتی تھی۔

کسی تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ شادی سے پہلے راجہ بھگوان داس کی بیٹی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اب اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ نکاح کس طرح ہوا اور شادی کے موقع پر کون سی رسمیں ادا کی گئیں۔ بہر حال راجہ بھگوان داس کی بیٹی شہزادہ سلیم کے حرم میں داخل ہو گئی۔

زیادہ تر راجپوتوں کا تعلق راجستھان سے ہے...... اور راجستھان آب و ہوا کے اعتبار سے ایک گرم علاقہ ہے۔ اسی وجہ سے یہاں کے لوگوں کے رنگ تانبے کی طرح سرخ ہوتے ہیں۔ راجہ بھگوان داس کی لڑکی تیکھے نقش و نگار رکھتی تھی مگر گہری سرخ رنگت کے باعث اس کا چہرہ زیادہ جاذبِ نظر نہیں تھا۔ اس لیے وہ اپنے حُسن پرست شوہر کو متاثر نہ کر سکی۔

اکبر کا خیال تھا کہ شادی کے بعد شہزادہ سلیم اپنے اس ماضی کو فراموش کر دے گا جو ایرانی دوشیزہ مہر النساء سے وابستہ تھا مگر جب خواصوں نے خبر دی کہ ولی عہدِ سلطنت اب بھی پرانی یادوں میں گم رہتے ہیں تو مغل شہنشاہ نے بیٹے کا دل بہلانے کے لیے نئی چال چلی

ابھی سلیم کی پہلی شادی کو کم و بیش ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا کہ مغل شہنشاہ نے ولی عہدِ سلطنت کی دوسری شادی کر دی۔ راجہ اودے سنگھ کا خاندان تمام ہندو راجاؤں میں سب سے زیادہ معزز و محترم تھا۔ اکبر نے اس شادی میں بہت زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ وہ بہ نفس نفیس بارات کے ساتھ آگرہ سے راجستھان پہنچا...... اور راجہ اودے سنگھ کی بیٹی کو بیاہنے آیا۔

سلیم کی دوسری بیوی بھی ہندو زادی تھی جو آخری سانس تک اپنے مذہب پر قائم رہی۔

تین سال بعد شہزادے کی تیسری شادی خواجہ حسن کی بیٹی سے ہوئی۔ یہ پہلی مسلمان لڑکی تھی جو سلیم کے شاہی حرم میں داخل ہوئی۔

راجہ بھگوان داس کی بیٹی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام سلطان بیگم رکھا گیا۔ تین سال بعد اسی راجپوت زادی سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سلطان خسرو رکھا گیا۔

خواجہ حسن کی بیٹی سے ایک لڑکا تولد ہوا جسے سلطان پرویز کے نام سے موسوم کیا گیا۔
1000ھ میں راجہ اودے سنگھ کی لڑکی سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام سلطان خرم رکھا گیا۔ یہ لڑکا بہت زیادہ خوب صورت تھا۔ اکبر نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ یہی خرم آگے چل کر ''شاہ جہاں'' کے نام سے تخت نشیں ہوا۔
تقریباً بائیس تئیس سال کی عمر میں وہ تین بیویوں کا شوہر، ایک لڑکی اور تین لڑکوں کا باپ بن چکا تھا۔ مگر ان تمام ہنگامہ خیزیوں میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی مہرالنساء کو فراموش نہ کر سکا...... اور بھولتا بھی کیسے کہ اس کی کوئی بیوی مہرالنساء کی طرح نہ تو حسین و جمیل تھی اور نہ شاعرانہ ذوق رکھتی تھی۔ آغازِ جوانی میں جو کانٹا شہزادے کے دل میں چبھا تھا، اس کی خلش آج بھی برقرار تھی۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر پائی جانے والی چیز، کھوئی جانے والی چیز سے بہتر ہو تو ماضی کا غم آہستہ آہستہ دھندلا ہو کر حال کی خوشیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو ماضی کی یادیں ہمیشہ لو دیتی رہتی ہیں۔ اور انسان بیتے دنوں سے پیچھا چھڑانے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ یہی حال شہزادہ سلیم کا تھا۔ اس کے تین تین شریکِ سفر تھے مگر کوئی ایک بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کس منزل کا مسافر ہے؟ اس کی منزل تو ارضِ بنگال تھی جہاں مہرالنساء، شیر افگن کے ساتھ پُرسکون زندگی گزار رہی تھی۔

❁---❁---❁

شیر افگن اپنی خوش بختی پر نازاں تھا کہ اسے مہرالنساء جیسی خوب صورت بیوی کی رفاقت حاصل تھی..... ماہ و سال تیزی سے گزر رہے تھے اور اب وہ ایک بچی کا باپ بھی بن گیا تھا..... مگر کبھی کبھی تنہائی میں اسے اپنی شادی کا وہ منظر یاد آ جاتا تھا جب شہزادہ سلیم نے اس کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کیا تھا۔ شیر افگن نے یہ راز جاننے کی بہت کوشش کی تھی کہ آخر اس کے لیے شہزادے کی آنکھوں میں نفرت کے جذبات کیوں موجزن تھے؟ مگر بظاہر اسے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آئی تھی۔
پھر شیر افگن کا ذہن سوچتے سوچتے ایک خاص مقام پر ٹھہر گیا تھا۔ ''یہ شادی شہنشاہ اکبر کے ایماء پر ہوئی تھی۔'' اور حالات کا یہی وہ زاویہ تھا جس نے شیر افگن کو مزید سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر یہ سوچ، اندیشوں میں بدلنے لگی تھی۔ آخر اس نے ایک دن اپنے دل کی بات مہرالنساء سے کہہ ڈالی۔
''تمہاری شادی میں شہنشاہ نے اتنی دلچسپی کیوں لی تھی؟''
مہرالنساء نے حیرت سے شوہر کی طرف دیکھا۔ ''اتنے سال بعد آپ کے ذہن میں یہ سوال کیوں آیا؟''
''یہ سوال تو مجھے پہلے ہی دن سے پریشان کرتا رہا ہے۔'' شیر افگن نے کسی تکلف کے بغیر اپنی ذہنی کشمکش کو بیوی کے سامنے بیان کر دیا۔
''میرے والد شہنشاہِ والا کے ملازم تھے، اس لیے میری شادی میں ظلِ الٰہی کی دلچسپی ایک فطری بات تھی۔ مہرالنساء شوہر کے ان سوالوں سے چونک گئی تھی۔ اس لیے اس نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

''شہزادہ سلیم بھی اس شادی سے خوش نہیں تھے۔'' شیر افگن نے بیوی کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

مہرالنساء نے بڑی ذہانت سے اپنے جذبات پر قابو رکھا اور سرسری انداز میں جواب دیا۔ ''میں شہزادے کی خوشی اور ناخوشی کی ذمے دار نہیں تھی۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ ولی عہدِ سلطنت بھی تمہاری طلب رکھتے ہوں؟'' شیر افگن بیوی سے عجیب عجیب سوال کر رہا تھا۔

مہرالنساء کچھ اور محتاط ہو گئی تھی۔ ''مجھے کسی کے دل کا حال معلوم نہیں۔ اگر شہزادے کسی نشے کی طلب رکھتے ہوتے تو انہیں روکنے والا کون تھا؟''

مہرالنساء نے اپنے دفاع میں ایک مضبوط دلیل پیش کی تھی۔ شیر افگن مزاجاً ایک سپاہی تھا۔ اس لیے لفظوں کے پیچ و خم کو سمجھنے سے قاصر رہا...... اور یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ اس کے اندیشے بے بنیاد تھے۔

اس واقعے کے بعد مہرالنساء کئی دن تک پریشان رہی...... مگر جب اس نے شوہر کے چہرے پر کسی قسم کی بے چینی کے آثار نہیں دیکھے تو وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ بنگال سے آگرہ بہت دُور ہے۔ اگر شیر افگن قصرِ شاہی پہنچ بھی گیا تو اسے کون بتائے گا کہ دس سال پہلے اس کے اور شہزادہ سلیم کے درمیان کیا واقعہ پیش آیا تھا؟

❋---❋---❋

پھر وقت نے ایک اور کروٹ لی۔ 1014ھ میں شہنشاہ اکبر کا انتقال ہو گیا اور شہزادہ سلیم اڑتیس سال کی عمر میں ''جہانگیر'' کے لقب سے تخت نشیں ہوا۔

اب وہ ایک مطلق العنان حکمراں تھا...... اور پورے ہندوستان میں اس کے حکم کو ٹالنے والا کوئی نہیں تھا۔ بے شمار دولت اس کے تصرف میں تھی مگر دل کی دنیا خالی خالی تھی۔ سر پر تاجِ شاہی سجاتے ہی شہنشاہ جہانگیر کو دل کی چوٹ یاد آ گئی...... وہ چوٹ جو اس نے سترہ سال پہلے سبزہ زار کے ایک گوشے میں مہرالنساء کے ہاتھوں کھائی تھی۔

رسمِ تاج پوشی ادا ہوتے ہی اس نے بنگال کے حاکم کو خفیہ طور پر لکھا۔ ''علی قلی کو حکم دیا جائے کہ وہ فوری طور پر دارالحکومت میں حاضر ہو تاکہ اسے بخشی ہوئی جاگیر کی توثیق کی جا سکے۔''

فرمانِ شاہی ملتے ہی حاکمِ بنگال نے شیر افگن کو دربار میں طلب کر کے جہانگیر کا حکم سنایا۔

شیر افگن نے بڑی حیرت سے فرمانِ شاہی سنا۔ پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ''ابھی میں اپنے ضروری کاموں میں مصروف ہوں۔ اس لیے حکمِ شاہی پر عمل کرنے سے قاصر ہوں۔''

حاکمِ بنگال نے بڑے تعجب کے ساتھ شیر افگن کا جواب سنا اور پھر تمام تفصیلات لکھ کر آگرہ ارسال کر دیں۔

شیر افگن کے طرزِ عمل کے بارے میں پڑھ کر شہنشاہ جہانگیر غضب ناک ہو گیا۔ ''کیا وہ کوئی خود مختار حکمراں ہے کہ ہمارے دیدار کو حاضر نہیں ہو سکتا؟''

اس کے بعد فرمانروائے ہند نے حاکم بنگال کے نام دوسرا خط تحریر کیا۔

''علی قلی پر ہماری اطاعت فرض ہے...... اور یہ اطاعت اس وقت تک قابلِ اعتبار نہیں، جب تک وہ ہمارے سامنے سجدہ ریز نہ ہو جائے۔''

واضح رہے کہ مرنے سے پہلے شہنشاہ اکبر نے ایک نیا مذہب ''دینِ الٰہی'' ایجاد کیا تھا۔ جس میں دیگر باطل رسموں کے علاوہ یہ رسم بھی نمایاں تھی کہ تمام حاضرینِ دربار، بادشاہ کو سجدہ کیا کرتے تھے۔ اکبر کے انتقال کے بعد جہانگیر نے بھی اس رسم کو جاری رکھا تھا۔ اور اسی رسم کے مطابق وہ شیر افگن کو بھی اپنے سامنے سجدہ گزار دیکھنا چاہتا تھا۔

حاکم بنگال نے شیر افگن کو دربار میں طلب کر کے دوسرا فرمانِ شاہی بھی سنا دیا۔

شیر افگن کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے با آواز بلند کہا۔ ''آج سے میں شاہی ملازم نہیں ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے تمام ہتھیار اُتار دیئے جن کا باندھنا سرکاری ملازم کے لیے ضروری تھا۔

''تم ملازم ہو یا نہ ہو مگر اس ملک کے ہر باشندے پر بادشاہ کو سجدہ کرنا فرض ہے۔'' حاکم بنگال نے سخت لہجے میں کہا۔

''آپ بادشاہ کو لکھ دیں کہ شیر افگن اس سجدے کو فرض نہیں سمجھتا۔'' یہ کہہ کر علی قلی تیز قدموں کے ساتھ چلا گیا۔

❀---❀---❀

شیر افگن شدید اضطراب کی حالت میں ٹہل رہا تھا اور مہر النساء بار بار اس بے قراری کا سبب پوچھ رہی تھی۔

آخر بہت دیر بعد شیر افگن کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور اس نے تمام واقعات بیوی کے گوش گزار کر دیئے۔

''رعایا کو ان مراحل سے تو گزرنا ہی پڑتا ہے۔'' مہر النساء نے شوہر کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ آگرہ چلے جائیں اور ان غلط فہمیوں کو دُور کر دیں جو آپ کے اور بادشاہ کے درمیان پیدا ہو گئی ہیں۔''

''یہ غلط فہمی تو اسی دن پیدا ہو گئی تھی جب میں نے تم سے شادی کی تھی۔'' شیر افگن کے لہجے سے شدید اذیت و کرب کا رنگ نمایاں تھا۔

''اب یہ غلط فہمی اس وقت دُور ہو گی، جب میں اپنے خون میں نہا جاؤں گا۔ اور تمہیں جبراً شاہی حرم میں داخل کر دیا جائے گا۔''

مہر النساء نے پُر زور الفاظ میں شوہر کے ان خیالات کی نفی کی مگر شیر افگن اپنی بات پر قائم رہا۔

''میں نے اپنی قبر کے لیے جگہ تلاش کر لی ہے۔ تم بھی خودکشی کے لیے تیار رہو۔ اب یہی ایک صورت ہے کہ ہم اپنی عزت و آبرو کو بچا سکیں۔''

مہرالنساء کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ پھر جب اس نے اپنی ماں کے سامنے یہ صورتِ حال بیان کی تو وہ جہاندیدہ عورت بھی فکرمند نظر آنے لگی۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شہنشاہ جہانگیر سترہ سال تک ماضی کی یادوں کو سینے سے لگائے رہے گا۔

❁---❁---❁

فرمانروائے ہند نے شیر افگن کا جواب سنا اور شدتِ غضب سے کانپنے لگا۔ پھر اسی حالتِ غیظ میں اس نے اپنے دودھ شریک بھائی قطب الدین کوکلتاش کو طلب کرتے ہوئے کہا۔

''قطب الدین! اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے زخموں پر مرہم رکھ لیں اور اس خلشِ دل کو مٹا ڈالیں جو ہمیں چین سے سونے نہیں دیتی۔''

شہنشاہ کی جنونی کیفیت کے باوجود قطب الدین نے جہانگیر کو سمجھانے کی کوشش کی..... مگر ایک عاشقِ شوریدہ سر کے لیے یہ مشورے بے اثر ثابت ہوئے۔

''ہم علی قلی کو ہر وقت اپنے سامنے سجدہ ریز دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ یہاں آنے سے انکار کرے تو اس کا سر لا کر ہمارے قدموں میں ڈال دو۔''

قطب الدین کوکلتاش نے سرِ تسلیم خم کر دیا...... کیونکہ جہانگیر صرف عاشقِ شوریدہ سر ہی نہیں، ایک مطلق العنان حکمراں بھی تھا۔

پھر جب قطب الدین، صوبے دار کی حیثیت سے بنگال روانہ ہونے لگا تو شہنشاہ جہانگیر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہم اس سلسلے میں کوئی معذرت قبول نہیں کریں گے۔ علی قلی کی موت کا بہانہ تلاش کرو تاکہ ہمارا دامن بے داغ رہے۔''

❁---❁---❁

شیر افگن کی بے قراریاں بڑھتی جا رہی تھیں اور وہ ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر جب یہ اضطراب حد سے بڑھ گیا تو اس نے مہرالنساء سے اپنے دل کا درد بیان کرتے ہوئے کہا۔

''اب مجھے اندازہ ہوگیا کہ ہماری شادی کے دن شہزادے کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت کا دریا کیوں اُمڈ آیا تھا؟ وہ تمہارا طلب گار تھا مگر وقت نے اسے شکست دے دی تھی۔ آج وقت شہنشاہ کی گرفت میں ہے اور میں ایک تنہا انسان ہوں۔ شاہی لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کسی نہ کسی دن مارا ہی جاؤں گا...... لیکن اگر تم ایک وعدہ کرلو تو میری موت آسان ہو جائے گی۔''

''کیسا وعدہ؟'' مہرالنساء نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ بھی اس صورتِ حال سے بہت خوف زدہ تھی۔
''میرے بعد تم شہنشاہ کی غلامی قبول نہیں کرو گی۔'' شیر افگن کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔ ''کاش! میری شمشیر تمہاری حفاظت کر سکتی۔''
''میں رسمِ وفا نبھانا خوب جانتی ہوں۔'' مہرالنساء نے شکستہ دل شوہر کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے بعد کسی دوسرے مرد کا ہاتھ میرے دامن تک نہیں پہنچ سکتا۔''
مہرالنساء کی ماں دروازے کی اوٹ سے بیٹی اور داماد کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے سائے لرزاں تھے۔ گردشِ وقت نے اسے ایک بار پھر خوف ناک آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

❁---❁---❁

قطب الدین کوکلتاش نے بنگال پہنچتے ہی شیر افگن کو دربار میں طلب کیا مگر اس نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔
آخر قطب الدین خود شیر افگن کی جاگیر میں پہنچا اور مصالحانہ روّیہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''شاہِ والا تمہیں اپنے روبرو دیکھنا چاہتے ہیں۔''
''میں کئی بار اپنا عذر پیش کر چکا ہوں۔'' شیر افگن نے بے نیازانہ کہا۔
ایک معمولی جاگیردار کی یہ سرکشی دیکھ کر قطب الدین کوکلتاش کو بھی غصہ آ گیا۔ ''تمہیں آخری بار تنبیہہ کی جاتی ہے کہ اپنی گردن میں شہنشاہ کا طوقِ غلامی ڈال کر دارالحکومت حاضر ہو جاؤ۔'' یہ کہہ کر قطب الدین کوکلتاش واپس جانے کے لیے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔ ''اسی میں تمہاری سلامتی ہے۔''
ابھی قطب الدین کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ شیر افگن نے نیمچہ (چھوٹی تلوار) نکال کر اسے حاکمِ بنگال کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وار اتنا کاری تھا کہ قطب الدین کی آنتیں باہر نکل آئیں اور وہ زمین پر گر پڑا۔
قطب الدین کے محافظ سپاہی، شیر افگن پر جھپٹے۔ بیک وقت کئی شمشیریں فضا میں لہرائیں۔ شیر افگن زخمی ہوا مگر گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا رخ اپنے مکان کی طرف تھا۔ قطب الدین کوکلتاش کے سپاہی، شیر افگن کے تعاقب میں تھے مگر وہ مردِ شجاع گھوڑے کو اُڑائے لیے جا رہا تھا تاکہ جلد از جلد گھر پہنچ کر مہرالنساء کو قتل کر دے اور اپنے عزت و ناموس کو شہنشاہ جہانگیر کی دراز دستی سے بچا سکے۔
جب شیر افگن اپنے خون میں نہایا ہوا گھر کے قریب پہنچا تو محلے میں ایک شور مچ گیا۔ مہرالنساء کی ماں دروازہ کھول کر باہر آئی۔ شیر افگن لڑکھڑاتا ہوا گھوڑے سے اُترا۔ اُس کی ساس نے یہ ہولناک منظر دیکھا تو گھبرا کر اندر چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ شیر افگن زخموں سے چُور تھا۔ جریانِ خون کے سبب اس کی توانائی زائل ہو چکی تھی۔ بمشکل اس نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا اور چکرا کر دروازے پر گر گیا۔
''مہرالنساء! دروازہ کھول دو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لینے آیا ہوں۔'' شیر افگن پوری طاقت سے چیخا۔ ''جلدی کرو۔ وہ جابر و غاصب تم تک پہنچنے ہی والے ہیں۔''

مہرالنساء کی ماں صورتِ حال کو سمجھ چکی تھی۔ جواباً اس نے بھی چیخ کر کہا۔ ’’تمہارے قتل کی خبر سننے کے بعد مہرالنساء نے کنویں میں کُود کر اپنی جان دے دی۔ اب وہ سارے غموں سے آزاد ہے۔ اسے کوئی خطرہ نہیں۔‘‘

شیرافگن کچھ دیر تک چیختا رہا لیکن مہرالنساء باہر نہیں آئی۔ اس کی ماں نے اسے سختی سے روک دیا تھا۔ ’’احمق مت بنو۔ وقت کی رفتار کو پہچاننے کی کوشش کرو۔‘‘

پھر جب قطب الدین کے سپاہی شیرافگن کے قریب پہنچے تو وہ مر چکا تھا۔ شہنشاہ کے نمک خواروں نے اس کی لاش پر اپنا غصہ اُتارا...... مگر وہ مردِ آزاد تھا اور آخری سانس تک آزاد ہی رہا۔

❁---❁---❁

پھر مہرالنساء ’’نور جہاں‘‘ بن کر شہنشاہ جہانگیر کی آغوش میں سمٹ گئی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مجبور تھی...... مگر تاریخ بتاتی ہے کہ نور جہاں ذہین ترین عورت تھی۔ اس نے اپنے حُسن کی پوری پوری قیمت وصول کی۔ شہنشاہ جہانگیر نے ایک جامِ شراب کے بدلے میں ہندوستان کی حکومت نور جہاں کے ہاتھوں فروخت کر دی تھی...... مگر جب موت کی آندھی چلی تو مے خانے کی بنیادیں خار وخس کی طرح بکھر گئیں۔ پھر نہ وہ بادہ خوار رہا...... اور نہ حشر اُٹھانے والا ساقی۔ دونوں پیوندِ خاک ہو گئے۔ نور جہاں، لاہور کے ایک سنسان گوشے میں دفن ہے اور اس کے لوحِ مزار پر اُسی کا لکھا ہوا ایک شعر درج ہے ؎

برمزارِ غریباں نے چراغے، نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزد ، نے صدائے بلبلے

(ہم غریبوں کے مزار پر نہ چراغ جلتا ہے، نہ پھول مہکتا ہے۔ نہ کوئی پروانہ اپنے پَر جلاتا ہے اور نہ کسی بلبل کی آواز سنائی دیتی ہے)

تاریخ میں عدلِ جہانگیری کے بہت چرچے ہیں مگر کوئی شخص شیرافگن کی قبر پر جا کر نہیں پوچھتا کہ اے مردِ غیرت مند! تجھے کس جرم میں قتل کیا گیا تھا؟



آواز کا قتل

ماہم اتکہ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کی دایہ تھی......اور دایہ کی حیثیت ایک ادنیٰ ذاتی خدمت گار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ مگر شہنشاہ کی ادائیں بھی نرالی ہوتی ہیں۔ جب وہ کبھی جھاڑو لگانے والے کو نوازتے ہیں تو اسے جاروب کشی کے ادنیٰ درجے سے اٹھا کر وزارت کے اعلیٰ منصب تک پہنچا دیتے ہیں......اور جب کسی خاندانی شخص کو ذلیل کرتے ہیں تو اُسے قبر میں اُتار دیتے ہیں......اور اگر زندہ رکھتے ہیں تو اس کا منہ کالا کر کے سرِ بازار پھراتے ہیں۔ صدیوں سے دنیا پرست بادشاہوں کا یہی طرزِ عمل رہا ہے۔

جب شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں کا انتقال ہوا تو اس وقت اکبر کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ بیرم خان جیسے مدبّر اور وفادارِ سلطنت کو اس کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ بظاہر ہندوستان کا فرمانروا اکبر تھا مگر درپردہ سارے امور کا نگراں بیرم خان تھا۔ اسی زمانے میں دایہ ماہم اتکہ نے خوشامد کے ذریعے اکبر کے حضور میں رسوخ حاصل کیا۔ ماہم اتکہ کا بیٹا ادھم خان، اکبر ہی کا ہم عمر تھا۔ اپنی ماں کی وجہ سے وہ بھی اکبر کے خاص حلقے میں داخل ہو گیا۔

دوسری طرف شمس الدین خان ''کوکہ'' تھا جس سے اکبر کی کوئی قرابت داری نہیں تھی مگر شمس الدین خان کی ماں نے اکبر کو دودھ پلایا تھا۔ اس لیے وہ حد درجہ اس عورت کا احترام کرتا تھا......اور اسی رشتے سے شمس الدین خان، فرمانروائے ہندوستان کا دودھ شریک بھائی تھا۔ اکبر اسی تعلق کے زیرِ اثر شمس الدین خان سے بہت محبت کرتا تھا۔

ادھم خان اور شمس الدین خان میں برادرانہ رشتہ تھا مگر ادھم خان اپنی پست فطرت کی وجہ سے شمس الدین خان کی عزت وتوقیر سے حسد کرنے لگا۔ اس کے شب و روز اسی منصوبہ بندی میں گزرتے تھے کہ کسی طرح شمس الدین خان کو بادشاہ کی نظروں سے گرا دے مگر ادھم خان اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ان ہی دنوں ایک انتہائی ناگوار واقعہ پیش آیا۔ مغل شہنشاہ اکبر اپنے اتالیق (استاد) بیرم خان کا سب سے زیادہ احترام کرتا تھا۔ اگر بیرم خان جیسا حقِ نمک ادا کرنے والا انسان موجود نہ ہوتا تو اکبر کو اپنا اقتدار

قائم رکھنے میں نہ جانے کتنی دشواریاں پیش آتیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مغل سلطنت کا کیا انجام ہوتا؟ مختصر یہ کہ بیرم خان کے اثرات سے دوسرے امرائے سلطنت نہ صرف جلتے تھے بلکہ خائف بھی رہتے تھے۔ اس لیے ہر امیر کی یہی خواہش تھی کہ اسے جلد از جلد بیرم خان سے نجات حاصل ہو اور وہ اپنے راستے سے اس بھاری پتھر کو ہٹانے کے بعد بارگاہِ شاہی میں نمایاں مقام حاصل کر سکے۔ بالآخر تمام امراء نے مل کر شہنشاہ اکبر اور بیرم خان کے درمیان بدگمانیوں کی ایک اونچی دیوار کھڑی کر دی۔ اگر مغل فرمانروا چاہتا تو بیرم خان کو زنجیریں پہنا کر حوالۂ زندان بھی کر سکتا تھا....... اور کسی سنسان گوشے میں اپنے اتالیق کا مقبرہ بھی بنوا سکتا تھا...... لیکن اکبر کو بیرم خان کی خدمات اور احسانات یاد تھے۔ اس لیے اس نے چشم پوشی سے کام لیا...... مگر ایک وہ مرحلہ بھی آ گیا جب بیرم خان اور اس کے حلیفوں نے مغل شہنشاہ سے جنگ کی اور عبرت ناک شکست کھائی۔

پھر بیرم خان نے اپنے ایک غلام جمال خان کے توسط سے اکبر سے اپنے تمام گناہوں کی معافی چاہی۔ مغل شہنشاہ نے انتہائی اعلیٰ ظرفی سے کام لیا اور اپنے امرائے سلطنت کو بیرم خان کے استقبال کے لیے بھیجا۔

پھر جب بیرم خان شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے اپنی پگڑی گلے میں ڈال لی اور اکبر کے قدموں پر گر کر زار و قطار رونے لگا۔

اپنے اتالیق کی یہ حالت دیکھ کر مغل بادشاہ اپنی نشست سے اُٹھا اور بیرم خان کے جھکے ہوئے سر کو اٹھایا۔ پھر اسے اُس کی پرانی جگہ پہ بٹھا کر نہایت محبت آمیز لہجے میں بولا۔

''میرا دل آپ کی طرف سے صاف ہو گیا۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ میرا استاد حاضرینِ دربار کے سامنے ندامت کے پسینے میں نہایا ہوا بیٹھا رہے۔''

یہ کہہ کر جلال الدین اکبر نے بیرم خان کو ایک قیمتی خلعت سے سرفراز کیا۔

پھر جب شہنشاہ کے اس طرزِ عمل سے بیرم خان کا احساسِ ندامت کسی قدر کم ہوا تو اکبر نے کہا۔ ''اگر آپ کو نظم و نسق کے کاموں سے دلچسپی ہو تو میں کالی اور چندیری کا علاقہ آپ کے سپرد کیے دیتا ہوں۔ اگر میری مصاحبت میں رہنا چاہتے ہیں تو یہ بڑی خوشی کی بات ہو گی...... اور اگر حرمین شریفین کی زیارت کا شوق رکھتے ہو تو میں آپ کو مکہ معظمہ بھجوائے دیتا ہوں۔''

بیرم خان نے بڑے عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔ ''میں حضور کی ذات سے جو اعتقاد اور خلوص و محبت رکھتا ہوں، اس میں ذرّہ برابر بھی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ مجھ سے جو گناہ سرزد ہوئے ہیں، ان کا کفارہ یہی ہے کہ میں حضور کی خدمت بجا لاؤں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرا مقصد پورا ہوا۔ بس اب تو یہی آرزو ہے کہ مقاماتِ مقدسہ میں حاضری دے کر حضور کی درازیٔ عمر اور بلند اقبالی کی دعا کرتا رہوں۔''

شہنشاہ اکبر نے بیرم خان کو حج کے لیے جانے کی اجازت دے دی اور پچاس ہزار کی کثیر رقم سفر خرچ

کے لیے عنایت کی۔

❁---❁---❁

بیرم خان، اکبر کے دربار سے اُٹھ کر چلا گیا۔ حاسدین کو یقین تھا کہ یا تو بیرم خان کو تختۂ دار پر کھینچ دیا جائے گا..... یا پھر ''خان خاناں'' کے آخری ایامِ زنداں کے گہرے اندھیروں میں بسر ہوں گے۔ (''خان خاناں'' بیرم خان کا خطاب تھا)

حاسدین کے دونوں اندازے غلط ثابت ہوئے۔ مغل شہنشاہ نے اپنے اتالیق کو نہ صرف معاف کر دیا تھا بلکہ اس پر مزید احسانات کی بارش کر دی تھی۔

دیگر اُمرائے سلطنت تو یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ بیرم خان زندہ تو بچ گیا ہے مگر اس کی حیثیت کمان سے چھوٹے ہوئے تیر سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ اپنی زندگی کے بقیہ دن یا تو مقاماتِ مقدسہ کی زیارت میں گزار دے گا...... یا اگر ہندوستان واپس آیا تو کسی دور دراز علاقے کی کوئی ویران سی جاگیر اُس کے حوالے کر دی جائے گی اور پھر اسے پہلے جیسی قربتوں کا اعزاز حاصل نہیں رہے گا۔ مختصر یہ کہ امرائے سلطنت کے راستے کا کانٹا ہٹ گیا تھا..... مگر یہی کانٹا ادھم خان کے دل میں برابر چبھ رہا تھا اور اس کی خلش بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

آخر دایہ کے کینہ فطرت لڑکے نے خان خاناں بیرم خان کے خلاف ایک ہلاکت خیز منصوبہ تیار کر لیا۔ ادھم خان، مبارک خان نامی ایک شخص سے ملا۔ مبارک خان کا باپ اس جنگ میں قتل ہوا تھا جو اکبر اور ہیمو بقال کے درمیان ہوئی تھی۔ اتفاق سے مبارک خان کے باپ کو بیرم خان کے نوکروں نے قتل کیا تھا۔ بات بہت پرانی ہو گئی تھی..... اور مبارک خان اس المناک واقعے کو فراموش بھی کر چکا تھا۔ مگر عیار ادھم خان نے اپنی شاطر اُنگلیوں سے ماضی کے زخموں کو کرید ڈالا۔

''تجھے اپنے باپ کی موت یاد ہے مبارک خان!'' ادھم خان نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں لوحانی افغان سے پوچھا۔

''وہ تو زندگی بھر کا ایک روگ ہے۔ میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں؟'' باپ کا نام سن کر مبارک خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تُو جھوٹا ہے مبارک خان!'' یکایک ادھم خان کا لہجہ تند و تیز ہو گیا۔

مبارک خان بڑی حیرت سے اس شخص کو دیکھنے لگا جسے مغل شہنشاہ کے حلقۂ خاص میں رسائی حاصل تھی۔ ''میں اپنے ذاتی غم کی نمائش نہیں کرتا۔ تمہیں میرے اس دکھ کا اندازہ نہیں ادھم خان!''

''اگر تُو سچا ہوتا تو اپنے باپ کے قاتلوں سے بدلہ لے چکا ہوتا۔'' ادھم خان بڑی ہوشیاری سے مبارک خان کے جذبات کو بھڑکا رہا تھا۔

''جنگ میں تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے ادھم خان!'' مبارک خان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''ایک قاتل ہوتا

ہے اور دوسرا مقتول۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میں اپنے باپ کے قاتلوں کو پہچانتا بھی نہیں۔''

''میں جانتا ہوں انہیں۔'' ادھم خان نے بڑے عیارانہ لہجے میں کہا۔

''کون ہیں وہ لوگ؟'' باپ کے قاتلوں کا ذکر سن کر مبارک خان کے چہرے پر رنج اور غصے کی ملی جلی کیفیت اُبھر آئی۔

''خان خاناں، بیرم خان کے ملازم۔'' ادھم خان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اب تجھ پر لازم ہے کہ تُو بیرم خان کا قتل کر دے گا اور اپنے سینے میں لگی ہوئی برسوں پرانی آگ کو اس کے خون سے بجھا دے۔''

''مگر اس میں خان خاناں کا کیا قصور تھا؟'' مبارک خان نے انتہائی سادگی سے پوچھا۔

''دراصل بیرم خان ہی تیرے باپ کا قاتل ہے۔'' ادھم خان بڑی ہوشیاری سے لوحانی افغان کو شیشے میں اُتار رہا تھا۔ ''اسی نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا تھا کہ وہ تیرے باپ کو قتل کر دیں اور انعام حاصل کریں۔''

مبارک خان گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر وہ رُک رُک کر کہنے لگا۔ ''مگر ادھم خان! یہ بات تمہیں برسوں بعد کیسے یاد آئی؟ تم نے اسی وقت کیوں نہیں بتایا، جب میرے سینے میں آتشِ انتقام بھڑک رہی تھی اور دل کے زخموں سے خون جاری ہو گیا تھا۔''

ادھم خان کے فریب کار ذہن نے ایک لمحے میں عذر تراش لیا۔ ''اس وقت میں مجبور تھا مبارک خان!''

''تمہیں کیا مجبوری لاحق تھی؟'' مبارک خان نے ایک اور سوال کیا۔

''اس وقت بیرم خان کو شہنشاہ کے حضور میں عزت و شرف حاصل تھا۔'' ادھم خان نے بڑی خوبصورتی سے مدلل جھوٹ بولا۔ ''اگر میں اس موقع پر یہ راز فاش کر دیتا تو تیرے ہاتھ خان خاناں کی گردن تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اب بادشاہ سلامت بیرم خان سے ناراض ہیں۔ تُو ان کی خفگی سے بھرپور فائدہ اُٹھا۔ ورنہ قسمت تجھے یہ موقع بار بار فراہم نہیں کرے گی۔''

ادھم خان کی پُر پیچ گفتگو سے مبارک خان کا ذہن منتشر ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت و کرب کا رنگ اُبھر اُبھر کر ڈوب رہا تھا۔

''تجھے ایک اہم بات بتاؤں مبارک خان!'' ادھم خان نے آہستہ سے کہا۔ ''اپنا کان اِدھر لا۔''

پھر ماہم اتکہ کے بیٹے نے لوحانی افغان سے سرگوشیوں میں کہا۔ ''شہنشاہ نے بظاہر بیرم خان کا قصور معاف کر کے اسے حج بیت اللہ جانے کی اجازت دے دی ہے مگر در پردہ جلالت مآب اس سے ناراض ہیں۔ ان کی شدید خواہش ہے کہ کوئی وفادارِ سلطنت غدار بیرم خان کا قصہ پاک کر دے۔''

''یہ کام تو شہنشاہ کے لیے بہت آسان ہے۔'' مبارک خان تذبذب کی حالت میں مبتلا تھا۔

''عالی جاہ، بیرم خان کے قتل کے لیے کھلا فرمان جاری نہیں کر سکتے۔'' ادھم خان کا فتنہ انگیز ذہن بڑی

تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ''اس طرح تو شہنشاہ کا دامن داغ دار ہو جائے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جو شخص اس غدار نمک حرام کو قتل کرے گا، اسے عزت پناہ جلال الدین اکبر بڑے انعام اور منصب سے نوازیں گے۔''

ایک تو باپ کی موت سے وابستہ اذیت ناک یادیں، دوسرے ادھم خان کی پُر فریب گفتگو کا طلسم اور تیسرے انعام کا لالچ۔ غرض ان ہی چیزوں نے لوحانی افغان کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو گرما دیا......اور اس نے ادھم خان سے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔

''اب مجھ پر آرام و سکون کی ایک سانس بھی حرام ہے جب تک میں اپنے باپ کے قاتل کو اس کے عبرت ناک انجام تک نہ پہنچا دوں۔''

ادھم خان بہت خوش تھا کہ اس کی چالوں نے ایک زنگ خوردہ لوہے کو گرم کیا، پھر پگھلایا اور آخر میں اپنی مرضی کے مطابق موڑ دیا۔

مبارک خان، ادھم خان کی خلوت سے نکلا تو اس کے دل و دماغ آتشِ انتقام میں جل رہے تھے۔ وہ ہر وقت بیرم خان کے تعاقب میں رہتا تھا مگر خدمت گاروں کی بھیڑ کے سبب اس کے چھوٹے ہاتھ، خان خاناں کے جسم تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

❁---❁---❁

مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے پُر جوش انداز میں بیرم خان کو رخصت کیا۔ خان خاناں گجرات کی طرف روانہ ہوا تا کہ کھمبایت کی بندرگاہ پہنچ کر بحری سفر اختیار کرے اور حجازِ مقدس میں حاضری دے۔

مبارک خان بھی بیرم خان کے اس قافلے میں ایک خدمت گار کی حیثیت سے شامل ہو گیا۔ سفر کے دوران اس نے کئی بار خان خاناں تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

آخر بیرم خان کا قافلہ گجرات کے نواحی علاقے میں خیمہ زن ہوا۔ بحری جہاز کے روانہ ہونے میں کئی دن تھے۔ اس لیے خان خاناں سیر و تفریح میں مشغول ہو گیا۔ یہاں بندرگاہ کے چاروں طرف ایک ہزار مندر تعمیر کیے گئے تھے۔ وہ چودھویں کی رات تھی۔ بیرم خان ایک بڑی کشتی میں سوار ہو کر مندروں کے نظارے سے لطف اندوز ہونے کے لیے دریا کی سیر کو نکلا۔ بیرم خان کی کشتی میں خدمت گاروں کے علاوہ کئی سازندے اور گانے والے بھی شامل تھے۔ مندروں میں بھجن گائے جا رہے تھے اور بیرم خان کی کشتی میں مطرب نغمہ سرا تھے۔ خوشگوار ہواؤں اور سمندر کی ہلکی ہلکی موجوں کا شور ایک عجیب آہنگ پیدا کر رہا تھا۔ بیرم خان رات بھر اس جشنِ موسیقی میں کھویا رہا......اور اسے خبر تک نہ ہو سکی کہ موت کا قزاق راستے میں گھات لگائے بیٹھا ہے۔

اس وقت موسیٰ خان لودھی اس علاقے کا حاکم تھا۔ مبارک خان نے یہاں پہنچ کر افغانوں کے ایک گروہ کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ افغانوں کی یہ جماعت رات کے اندھیرے میں ساحل کے قریب کمیں گاہوں

میں روپوش ہوگئی۔

رات گزرنے کے بعد بیرم خان کشتی سے اُتر کر اپنے خیمے کی طرف بڑھا۔ مبارک خان کنارے پر کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بڑے ادب سے خان خاناں کی خدمت میں سلام پیش کیا۔

بیرم خان نے امیرانہ وقار کے ساتھ سلام کا جواب دیا اور اپنی فیاضانہ عادت کے مطابق مبارک خان سے پوچھا۔ ''اے شخص! اپنی ضرورت بیان کرو۔ اگر میرے اختیار میں ہُوا تو تمہارا کام ضرور ہو جائے گا۔''

مبارک خان نے برق رفتاری کے ساتھ اپنی جیب میں چھپا ہوا خنجر نکالا اور پے در پے خان خاناں کے سینے پر تین وار کیے۔ وہ خنجر نکالتا اور بیرم خان کے سینے میں دوبارہ پیوست کر دیتا۔ مبارک خان پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ وہ خان خاناں پر حملے کے دوران وحشیانہ انداز میں چیخ رہا تھا۔

''میرے باپ کے قاتل! مجھے تیری زندگی کی ضرورت ہے۔''

بیرم خان کے خدمت گار اس غیر متوقع حملے سے گھبرا گئے تھے۔ جب تک وہ سنبھلے، کمیں گاہوں میں چھپے ہوئے دوسرے افغان بھی باہر نکل آئے اور بیرم خان کے خیموں پر حملہ آور ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ مبارک خان اسی ہنگامے میں فرار ہو چکا تھا۔ جب تک خدمت گار اور سپاہی بیرم خان کی خبر لیتے، وہ زخموں کی تاب نہ لا کر اسی جگہ مر چکا تھا۔

محمد امین دیوانہ اور بابا زنبور، بیرم خان کے چار سالہ بیٹے عبدالرحیم کو لے کر گجرات فرار ہو گئے۔ یہاں کے حاکم اعتماد خان نے عبدالرحیم کو اکبر کے پاس دارالحکومت آگرہ بھجوا دیا۔

یہ وہی بچہ ہے جو بڑا ہو کر اکبر کے نورتنوں میں شامل ہوا اور عبدالرحیم خان خاناں کے لقب سے تاریخی شہرت حاصل کی۔ ''رحیم'' تخلص اختیار کیا اور ہندی زبان میں ایسی شاعری کی کہ آج تک اس کا شمار ہندی کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے۔

بیرم خان کے قتل پر ادھم خان بہت خوش تھا۔ اس نے مبارک خان لوحانی کو انعام و اکرام سے نوازا۔ پھر کچھ دن بعد مبارک خان راستے میں مُردہ پایا گیا۔ اس کی موت زہر آلود خنجر کے گہرے زخموں کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ مبارک خان کے رشتے دار بہت دن تک اس کے قاتلوں کو تلاش کرتے رہے، پھر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ انہیں کیا پتہ چلتا کہ ادھم خان نے بڑے منظم طریقے سے مبارک خان کو قتل کرایا تھا۔ ایک دایہ کے عیار بیٹے نے بیرم خان کے خلاف کی جانے والی سازش کا آخری نشان بھی مٹا ڈالا تھا اور اب اس کے جرم پر گواہی دینے والا کوئی نہ تھا۔ اب ادھم خان کی آنکھوں میں نئی منزلوں کے خواب تھے۔

❀---❀---❀

جلال الدین اکبر اپنے اتالیق، خان خاناں کی موت کے زیر اثر کچھ دن سوگوار رہا۔ پھر وہ ''مالوہ'' کی جانب متوجہ ہوا۔

مالوہ ایک آزاد ریاست تھی۔ یہاں کا حاکم ایک جنگجو اور اولوالعزم شخص شجاعت خان تھا جس نے ابھی

تک مغل شہنشاہ کی اطاعت تسلیم نہیں کی تھی۔ اکبر نے ایک بار مالوہ کے دربار میں اپنا سفیر بھی بھیجا تھا اور شجاعت خان کو پیشکش کی تھی۔

''اگر تم مغل سلطنت کے نمک خواروں میں شامل ہو جاؤ تو پھر تم پر زمانے بھر کی نعمتوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ اور اگر تم نے سرکشی اختیار کی تو دنیا جانتی ہے کہ اکبر کی شمشیروں کی کاٹ بے مثال ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اپنی گردن میں ہمارا طوقِ غلامی پہن لو......ورنہ ہمارے برق رفتار گھوڑے، تاج کے ساتھ تمہارے سر کو روند ڈالیں گے۔''

جلال الدین اکبر کے خط کے جواب میں ریاست مالوہ کے حاکم شجاعت خان نے خط تحریر کیا تھا۔

''مغل شہنشاہ کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ یہ ریاست کسی حکمراں کی عنایتوں اور بخششوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ مالوہ کو میرے بزرگوں نے بزورِ بازو حاصل کیا ہے۔ واضح رہے کہ ابھی ہمارے بازو ناتوانی کا شکار نہیں ہوئے ہیں......اور ہماری شمشیروں کی آب و تاب ابھی تک باقی ہے۔ جب تک یہ دونوں چیزیں قائم ہیں، میرے ہونٹوں سے حرفِ انکار اُبھرتا رہے گا۔ اگر بادشاہ کو معرکہ آرائی کا شوق ہے تو سفارت بھیجنے کے بجائے اپنے لشکروں کو روانہ کریں۔ پھر وقت فیصلہ کر دے گا کہ مالوہ پر حکمرانی کا حق کسے حاصل ہے؟''

مغل شہنشاہ اکبر نے شجاعت خان کے خط کو بغور پڑھا۔ امرائے سلطنت کا خیال تھا کہ اکبر ایک چھوٹی سی ریاست کے حاکم کا جواب پڑھ کر غضب ناک ہو جائے گا......مگر خلافِ توقع وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اکبر کو کسی مناسب موقع کا انتظار تھا۔ پھر اکبر سلطنت کے دوسرے انتظامات میں مصروف ہو گیا......اور روز و شب کا قافلہ اپنی مقررہ رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔

❀---❀---❀

اب شجاعت خان بوڑھا ہو کر بسترِ علالت پر دراز ہو گیا تھا۔ اس کا بیٹا بازید خان جو تاریخ میں باز بہادر کے نام سے مشہور ہے، ایک عیش پرست نوجوان تھا۔ حکمرانی کے تقاضوں سے بے خبر باز بہادر ہمیشہ راگ رنگ کی محفلوں میں گم رہتا تھا۔ وہ اپنے وقت کا بہترین موسیقار تھا۔ اس لیے اس کی محفل، خوبصورت رقاصاؤں اور مطرباؤں سے آراستہ رہتی تھی۔

ایک دن باز بہادر سیر و تفریح کے لیے دریا کے کنارے سے گزر رہا تھا کہ کسی مطربہ کی آواز نے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں میں زنجیریں ڈال دیں۔ اس وقت باز بہادر سارنگ پور کا حاکم تھا۔ موسیقی کے رسیا نوجوان نے اس دلکش آواز کا تعاقب کیا۔ مطربہ قریب ہی واقع ایک مندر میں بھجن گا رہی تھی۔ باز بہادر آہستہ آہستہ مندر کی طرف بڑھا۔ اپنے حاکم کو آتے دیکھ کر پنڈتوں اور مندر کے دوسرے پجاریوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ مگر بھجن گانے والی کے انہماک میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ آنکھ بند کیے انتہائی پُرسوز لہجے میں بھجن گا رہی تھی جس نے باز بہادر پر سحر سا طاری کر دیا تھا۔

سارنگ پور کا حاکم چپ چاپ کھڑا مطربہ کا بھجن سنتا رہا۔ پھر جب بھجن مکمل ہو گیا تو مطربہ نے

آنکھیں کھولیں، دیوتا کے سامنے سر جھکایا اور واپس جانے کے لیے مڑی۔ بازید خان اس کے پیچھے کسی ستون کی طرح کھڑا تھا۔ مطربہ نے ایک خوبصورت نوجوان کو اتنے قریب دیکھا تو شرم وحیا سے سمٹ گئی۔

مطربہ کی گھبراہٹ دیکھ کر مندر کے بڑے پجاری نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی! یہ سارنگ پور کے حاکم ہیں۔ ہمارے اَن داتا، شہزادہ باز بہادر۔''

حاکمِ سارنگ پور کا نام سن کر مطربہ پر مزید گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ پھر وہ بے اختیارانہ انداز میں باز بہادر کے قدموں میں جھک گئی۔ باز بہادر نے دونوں بازو پکڑ کر مطربہ کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم جیسی مغنیہ کسی کے قدم چھونے کے لیے نہیں، دلوں پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔''

حاکمِ سارنگ پور کی زبان سے اپنے گانے کی تعریف سن کر مطربہ کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ باز بہادر کا شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔

❁---❁---❁

باز بہادر، پجاری کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے پنڈت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ مطربہ کون تھی؟''

''مہاراج! اس لڑکی کا نام رُوپ متی ہے۔'' پنڈت نے مطربہ کا غائبانہ تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''سندر داس کی بیٹی ہے۔ جس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے۔''

''اب یہ لوگ غریب نہیں رہیں گے۔'' باز بہادر اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''سندر داس سے کہو کہ وہ اپنی بیٹی کو ہمارے دربار میں بھیج دے۔ تاکہ ہماری ریاست کا گوشہ گوشہ اس کی دلکش آواز سے گونج اُٹھے۔'' یہ کہہ کر باز بہادر نے مندر کے پجاری کو انعام واکرام سے نوازا اور دل میں ایک عجیب سی خلش لیے ہوئے واپس چلا گیا۔

باز بہادر اپنے عشرت کدے میں رات بھر جاگتا رہا۔ اُس نے یکے بعد دیگرے کئی نامور اور کہنہ مشق مطرباؤں کو خلوت میں طلب کیا اور تھوڑی دیر ان کا گانا سن کر انہیں واپس لوٹا دیا۔

''رُوپ متی کی آواز کی کھنک کسی میں بھی نہیں ہے۔'' باز بہادر نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔ اور سامنے رکھی ہوئی صراحی سے اپنا جام لبریز کرنے لگا۔ ریاست مالوہ کے رنگین مزاج ولی عہد کو صبح کا انتظار تھا جب رُوپ متی جیسی حسین دوشیزہ اُس کے دربار میں داخل ہو گی اور وہ اس کے سحر کار نغموں میں کھو جائے گا۔

❁---❁---❁

سندر داس کے کوئی بیٹا نہیں تھا۔ جب طویل انتظار کے بعد لڑکی پیدا ہوئی تو شدتِ غم سے اُس کا چہرہ زرد ہوگیا۔ آج بھی بے شمار لوگ بیٹی کی پیدائش کو اچھی علامت نہیں سمجھتے۔ ہندوؤں میں خاص طور پر بیٹیوں کو بارِ گراں سمجھا جاتا تھا۔ لڑکی کی پیدائش پر سندر داس بھی اپنی کمر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ لڑکی کیا تھی،

چاند کا ٹکڑا تھی۔ اس لیے اُس کا نام رُوپ متی رکھا گیا۔ کچھ دن بعد رُوپ متی کا زائچہ پیدائش بنوایا گیا تو نجومی نے نہایت پُرجوش لہجے میں کہا۔

''سندرداس! تیری بیٹی بڑی بھاگیہ شالی (خوش نصیب) ہے۔ یہ تیرے سارے دلدر دُور کر دے گی۔ خالی گھر کو روپے پیسے سے بھر دے گی۔ اتنا نام کمائے گی کہ لوگ صدیوں تک تیرے گھرانے کو یاد رکھیں گے۔''

سندرداس اُس نجومی کی باتیں سن کر بیٹی کی پیدائش کے غم کو بھول گیا اور اچھے دنوں کا انتظار کرنے لگا۔

رُوپ متی بچپن ہی سے موسیقی کی طرف مائل تھی۔ وہ مندروں میں جاتی، پنڈتوں کے بھجن بہت غور سے سنتی اور خود بھی گانے کی کوشش کرتی۔ قدرتی طور پر اُس کی آواز نہایت دلکش تھی۔ پھر سارنگ پور کے ایک استاد سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور مندروں میں اپنی آواز کا جادو جگانے لگی۔

سندرداس اُس نجومی کی پیش گوئی کے مطابق ایک ایک دن گن رہا تھا مگر ابھی تک مایا (دولت) نے اُس کے گھر میں قدم نہیں رکھے تھے۔ بس اتنا ہوا کہ سارنگ پور کے ایک چھوٹے سے زمیندار نے ایک دن رُوپ متی کو مندر میں بھجن گاتے دیکھ لیا تھا اور اس کے عشق پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ پھر اُس زمیندار نے سندرداس کے گھر اپنا رشتہ بھیج دیا تھا۔ ایک معمولی انسان کے لیے سندرداس کا پیغام بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اُس نے اپنے کمزور کاندھوں سے بیٹی کا بوجھ اُتارنے کے لیے زمیندار کا رشتہ فوری طور پر قبول کر لیا تھا۔ وہ زمیندار جو عمر میں رُوپ متی سے دُگنا بڑا تھا اور جس کی بیوی تین بچے چھوڑ کر مر گئی تھی۔ زمیندار کی سب سے بڑی لڑکی، رُوپ متی سے بس دو تین سال ہی چھوٹی ہو گی۔ رُوپ متی کی ماں نے بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں شوہر سے شدید اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی چاند سی گڑیا کو اُس بوڑھے زمیندار کے گھر نہیں بھیجوں گی۔ وہاں تو وہ معصوم دوسروں کے بچے پالتے پالتے ہی مر جائے گی۔''

سندرداس نے وہی پرانے مردوں کی طرح اپنی آن اور زبان کا رونا رویا۔ ''بات پکی ہو چکی ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ رُوپ متی کو سسرال جانا ہی ہو گا۔''

''وہ سسرال جائے گی۔ مگر کسی اندھے کنوئیں میں نہیں۔'' ماں نے بڑے پُرجوش انداز میں بیٹی کی وکالت کی۔ مگر شوہر کے سامنے اس کی ساری منطق دھری کی دھری رہ گئی۔ پھر جب رُوپ متی کو پتہ چلا کہ اُس کے مقدر کا فیصلہ کیا جا رہا ہے تو اس نے ماں باپ کے سامنے صاف لفظوں میں انکار کرتے ہوئے کہا۔

''میری شادی ہو چکی ہے۔''

بیٹی کی زبان سے یہ انکشاف سن کر سندرداس اور اُس کی بیوی پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ''بے شرم! کہاں کی تُو نے شادی؟...... اور کون ہے تیرا پتی؟''

''میری شادی کلا مندر میں ہوئی ہے۔'' رُوپ متی نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''اور سنگیت میرا پتی ہے۔''

ماں باپ کی جان میں جان آئی۔

''سنگیت ہی میرا سب کچھ ہے۔'' رُوپ متی، ماں باپ کی موجودگی سے بے خبر بڑے والہانہ انداز

میں بول رہی تھی۔ اُس پر جذب کی سی کیفیت طاری تھی۔ ''سنگیت ہی میرا گیان ہے اور سنگیت ہی میری پوجا۔ اگر کسی نے مجھے کلا مندر سے دُور کرنے کی کوشش کی تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ بس مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔''

سندرداس، بیٹی کے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ پھر اُس نے زمیندار سے معذرت کر لی۔

''مردوں کی زبان ایک ہوتی ہے سندرداس!'' زمیندار نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں انکار کرنا تھا تو شروع ہی میں کر دیا ہوتا...... قبول کیے ہوئے رشتے ٹھکرائے نہیں جاتے۔ میں اپنی اس بے عزتی کو کبھی فراموش نہیں کروں گا۔'' زمیندار نے مبہم الفاظ میں سندرداس کو دھمکی دے دی تھی۔

جب سندرداس نے بیوی اور بیٹی کے سامنے اس دھمکی کا ذکر کیا تو رُوپ متی بے اختیار بول اُٹھی۔

''پتا جی! یہ مانا کہ میں ایک کمزور بالا (لڑکی) ہوں...... مگر یہ تو میرے بس میں ہے کہ میں اپنی جان گنوا دوں۔ کسی ایک کا کیا ذکر ہے، سارنگ پور کے سارے زمیندار مل کر بھی مجھ پر قابو نہیں پا سکتے۔''

رُوپ متی کے عزائم چٹان کی طرح تھے۔ مگر اوّل و آخر وہ ایک نرم و نازک لڑکی تھی۔ اُس کی عزت کے آبگینے پر ہلکی سی خراش بھی ماں باپ کو زندگی بھر رُلانے کے لیے کافی تھی۔ سندرداس اور اُس کی بیوی ایک انجانے خوف سے ہر وقت لرزتے ہی رہتے تھے۔

پھر ایک دن مندر کا بڑا پجاری اس کے گھر پہنچا اور جب پنڈت نے شہزادہ باز بہادر کا پیغام دیا تو سندرداس خوشی سے جھوم اُٹھا۔ اُسے نجومی کی پیش گوئی یاد آ گئی۔ لکشمی دیوی نے اچانک اُس کے گھر قدم رکھ دیا تھا۔ سندرداس اور اُس کی بیوی اس لیے بھی خوش تھے کہ اس طرح ان کی بیٹی کو تحفظ حاصل ہو جائے گا اور زمیندار کی دھمکیاں رائیگاں جائیں گی۔

❁---❁---❁

پھر رُوپ متی، شہزادہ باز بہادر کے جشنِ موسیقی میں شریک ہوئی جہاں بڑی تجربہ کار مطربائیں موجود تھیں۔ سارنگ پور کے حاکم نے رُوپ متی سے کوئی طربیہ گیت سنانے کی فرمائش کی۔

شرکائے محفل کا خیال تھا کہ یہ نوخیز اور نووارد مغنیہ مجلس کا شاہانہ جلال دیکھ کر گھبرا جائے گی...... اور نامور مطرباؤں کی موجودگی میں وہ اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ نہ کر سکے گی...... مگر جب رُوپ متی نے تان چھیڑی تو حاضرینِ مجلس حیرت زدہ رہ گئے۔

رُوپ متی کی آواز کیا تھی، کوئل کی کُوک تھی جس نے شہزادہ باز بہادر کے دربار میں ساون کے موسم کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ فضا پر ایک مستی سی طاری تھی اور ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ جیسے وہ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار میں نہا رہا ہو۔ شہزادہ باز بہادر، رُوپ متی کے حُسن و آواز میں اس طرح کھویا ہوا تھا کہ اسے اپنے گردوپیش کی بھی خبر نہیں تھی۔ پھر جب حسین مطربہ اپنی آواز کا جادو جگا چکی تو سارنگ پور کے حاکم نے رُوپ متی کو اپنے پاس بلایا...... اور اپنا قیمتی ہار اُتار کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ شہزادے کا عشرت کدہ

تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا..... اور رُوپ متی نے شرما کر سر جھکا لیا۔ باز بہادر کے دربار سے وابستہ دوسری گانے والیوں کے چہرے اُتر گئے تھے اور اُنہیں رُوپ متی کی موجودگی میں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تھا۔

❀---❀---❀

پھر وہ دن بھی آیا، جب شہزادہ باز بہادر نے رُوپ متی کو خلوت میں طلب کیا۔

"آج میں تمہیں راگ سناتا ہوں۔" سارنگ پور کے حاکم نے حسین مطربہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ......؟" رُوپ متی نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اُسے شہزادے کی گفتگو پر شدید حیرت ہوئی تھی۔

سارنگ پور کے جواں سال حاکم نے اپنے قریب رکھا ہوا ستار اُٹھایا اور آنکھیں بند کر کے اسے بجانے لگا۔ شہزادے کی بے قرار اُنگلیاں تاروں پر رقص کر رہی تھیں اور رُوپ متی سکتے کے سے عالم میں باز بہادر کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سارنگ پور کے حاکم کو موسیقی میں اس قدر مہارت حاصل ہو گی۔ پھر جب یہ فنی مظاہرہ اپنے عروج پر پہنچا تو روپ متی پر مدہوشی سی طاری ہو گئی۔ بار بار اُس کا دل چاہتا تھا کہ شہزادہ اسی طرح ستار کے تاروں کو چھیڑتا رہے اور وہ اُس کے سامنے والہانہ انداز میں رقص کرتی رہے......مگر شرم اور جھجک اُس کا دامن کھینچ رہی تھی۔

پھر جب شہزادہ باز بہادر کی اُنگلیاں رُک گئیں اور تار خاموش ہو گئے تو رُوپ متی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور بے اختیار ہو کر بولی۔

"راج کنور (شہزادے) کی کلا کے سامنے ہماری کیا حیثیت ہے؟" رُوپ متی کی آنکھوں میں عجیب سا نشہ تھا۔ "آپ تو سنگیت سمراٹ ہیں اور ہم آپ کے داس!"

رُوپ متی کے منہ سے اپنے لیے تعریفی الفاظ سن کر باز بہادر پر بھی خمار سا طاری تھا۔ وہ پہلے ہی نوخیز مطربہ کے حُسن کا اسیر ہو چکا تھا۔ آج جب رُوپ متی نے خود کو شہزادے کی داسی کہہ کر پکارا تو وہ بے خود سا ہو گیا اور انتہائی سرشاری کے لہجے میں بولا۔

"رُوپ! تم، تم ہو......سُر تو تمہارے ہی خوبصورت ہونٹوں پر سجتے ہیں۔"

"پھر یہ قربتیں اتنی بڑھیں کہ رُوپ متی، باز بہادر کے عشرت کدے میں محصور ہو کر رہ گئی۔ گاؤں کے لوگ رُوپ متی کا نام لے کر سندر داس پر طعنہ زنی کرنے لگے۔

"تیری بیٹی دن رات، راج بھون میں پڑی رہتی ہے۔"

"وہ درباری گائیکہ (مطربہ) ہے۔" سندر داس سخت الفاظ میں جواب دیتا۔ "اگر میری بیٹی راج بھون میں نہیں رہے گی تو کیا کسی جھونپڑی میں رہے گی؟"

"راج دربار میں داشتائیں رہتی ہیں۔" گاؤں کے لوگ تحقیر آمیز لہجے میں کہتے۔ "تیری بیٹی نے

راج کنور کے ہاتھوں اپنی آبرو بیچ دی ہے اور اپنا دھرم تیاگ دیا ہے۔ اب وہ ایک مسلمان کے اشارے پر ناچنے والی لونڈی ہے۔"

جب گاؤں کے لوگوں کی زبان درازیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تو ایک دن سندرداس نے بڑے کرب ناک لہجے میں رُوپ متی سے کہا۔ "بیٹی! یہ لوگ تیرے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تُو راج بھون چھوڑ دے اور اپنی کٹیا میں واپس چلی آ۔"

"میں لوگوں کی باتوں پر کان نہیں دھرتی۔" رُوپ متی نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔

"عورت ذات کے لباس پر کیچڑ کی ایک چھینٹ بھی پڑ جائے تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔" سندر داس بیٹی کو زمانے کے نشیب و فراز سمجھا رہا تھا۔

"مجھے راج بھون سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ میں مایا کی بھوکی ہوں۔" رُوپ متی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"پھر تیرا راج کنور سے کیا رشتہ ہے؟" بیٹی کی باغیانہ گفتگو سن کر باپ بھی جھنجلا گیا تھا۔

"وہی رشتہ جو ایک داسی اور پربھو (مالک) کے درمیان ہوتا ہے۔" رُوپ متی کے لہجے سے کسی قسم کی ندامت کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

بیٹی کی بے باکی دیکھ کر بوڑھا باپ حیران رہ گیا۔ پھر وہ چیخ کر بولا۔ "رُوپ! تجھے پتہ ہے کہ تُو کیا کہہ رہی ہے؟"

"میں پورے ہوش و حواس میں ہوں باپو!" رُوپ متی کے لہجے میں اور بھی بے باکی آ گئی تھی۔ "راج کنور! میرا دیوتا ہے اور میں اس کی داسی۔ ساری دنیا چھوڑ سکتی ہوں، اپنا جیون تیاگ سکتی ہوں مگر دیوتا کے چرنوں سے الگ نہیں ہو سکتی۔"

بغاوت مکمل ہو چکی تھی۔ سندرداس اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔

رُوپ متی، شہزادہ باز بہادر کے عشق میں دیوانگی کی حدوں کو چھو چکی تھی۔

اور باز بہادر کا بھی یہ حال تھا کہ اس نے روپ متی کی خاطر ساری دنیا کو بھلا دیا تھا۔

ابھی عشق و محبت اور رقص و موسیقی کا کھیل جاری تھا کہ مالوہ کے دارالحکومت مانڈو سے ایک تیز رفتار قاصد سارنگ پور پہنچا اور اس نے شہزادہ باز بہادر کے کانوں میں کہا۔

"آپ کے والد محترم شدید علیل ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اگلا لمحہ کیسی خبر لے کر آئے؟"

باپ کی علالت کی خبر سن کر باز بہادر بے قرار ہو گیا اور اس نے اسی وقت مانڈو جانے کا ارادہ کر لیا۔

❋---❋---❋

شجاعت خان کی تدفین کے فوراً بعد شہزادہ بازید خان کے سر پر تاج رکھ دیا گیا۔ پھر چالیس دن تک باپ کی موت کا سوگ منانے کے بعد باز بہادر نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ اپنی تاجپوشی کا جشن

منایا۔ رُوپ متی کو بطورِ خاص ایک حفاظتی دستے کی نگرانی میں سارنگ پور سے دارالحکومت ''مانڈو'' لایا گیا۔ رُوپ متی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اب اُس کا محبوب مالوہ کا مطلق العنان حکمراں بن چکا تھا۔ پھر وہ اس طرح نغمہ سرا ہوئی کہ تمام اُمرائے سلطنت جھوم جھوم اُٹھے۔

باز بہادر نے اپنے والد شجاعت خان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ستار بدست رہنے کے بجائے ہمیشہ شمشیر بکف رہے گا...... مگر حاکمِ مالوہ جلد ہی اپنے وعدوں کو فراموش کر بیٹھا۔ رنگین جام پیتے پیتے اور ستار بجاتے بجاتے باز بہادر کے بازو اپنی فطری توانائی سے محروم ہو چکے تھے۔ اب اس کے نرم و نازک ہاتھوں میں فولاد کی بھاری شمشیر اُٹھانے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ وہ لڑکپن سے ایک حُسن پرست شہزادہ تھا۔ اس لیے مقتلِ حیات کی طرف جانے کے بجائے وہ رُوپ متی کے حریمِ ناز میں سمٹ کر رہ گیا۔

باز بہادر کی خاندانی بیویوں کو ایک لمحے کے لیے بھی رُوپ متی کا وجود گوارا نہیں تھا...... مگر وہ شوہر کی سخت ہدایات کے آگے مجبور تھیں۔ باز بہادر نے اپنی تمام بیویوں سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

''جو شخص رُوپ متی کو محبوب رکھے گا، وہ میرے قریب تر رہے گا..... اور جس کے دل میں رُوپ متی کی طرف سے پرخاش ہوگی، وہ مجھ سے بہت دُور چلا جائے گا۔''

پھر باز بہادر نے رُوپ متی کے لیے دریا کے کنارے ایک خوبصورت مکان تعمیر کرایا جو انتہائی قیمتی سازوسامان سے آراستہ تھا۔ حاکمِ مالوہ اپنے روز و شب کے بیشتر لمحات اسی مکان میں رُوپ متی کے ساتھ گزارتا۔ اُمرائے سلطنت کو اپنے نئے حکمراں کا یہ انداز پسند نہیں تھا...... مگر وہ اپنے دستار و منصب کو بچانے کے لیے خاموش رہتے اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہتے۔ اگر حکومت کا کوئی وفادار اپنے جذبۂ جاں نثاری سے مجبور ہو کر باز بہادر کو سمجھانے کی کوشش کرتا تو اسے اس کے منصب سے معزول کر دیا جاتا۔ نتیجتاً ریاست کے بہی خواہ امیروں نے اپنے ہونٹوں پر قفل لگا لیے اور باز بہادر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

❁---❁---❁

مغل حکمراں کو اسی دن کا انتظار تھا۔ اکبر کے جاسوسوں نے اسے خبر دیتے ہوئے کہا۔

''شہنشاہ کی بلند اقبالی کے صدقے میں دشمن خود ہی اپنی شکست و بربادی کے سامان پیدا کر رہا ہے۔ باز بہادر ایک رنگیلا حاکم ہے۔ شراب، رقص اور موسیقی کے سوا اُسے کسی شے سے سروکار نہیں۔ ایک حسین مطربہ اُس کے دل و دماغ پر حکومت کرتی ہے۔''

اکبر اپنے جاسوسوں کی گفتگو سن کر مسکرایا۔ پھر اُس نے ادھم خان کی طرف دیکھا جو تختِ شاہی کے نیچے سرداروں کی قطار میں بیٹھا ہوا تھا۔

شہنشاہ کی نظر پڑتے ہی ماہم اتکہ کا بیٹا کھڑا ہو گیا۔ ''ظلِ سبحانی کے عزت و جلال کی قسم! اگر غلام کو اس جنگی مہم کی سالاری کا اعزاز بخشا گیا تو یہ اپنی خوش بختی پر ہمیشہ نازاں رہے گا۔''

''ادھم خان! یہ تیری جاں نثاری کی پہلی آزمائش ہے۔'' اکبر نے اپنے مصاحبِ خاص کو انتہائی پُرجلال لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تُو اس امتحان میں ثابت قدم رہا تو شہنشاہ کو اپنے اندازوں سے زیادہ مہربان پائے گا۔''

ادھم خان نے سر جھکا دیا۔ دوسرے سردارانِ فوج بھی مالوہ کی مہم کو سر کر کے جلال الدین اکبر کی نظروں میں سرخرو ہونا چاہتے تھے۔ مگر ادھم خان شب و روز کی مصاحبت اور بے جا خوشامد کے سبب اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔

❀---❀---❀

پھر چند روز بعد ہی ادھم خان ایک لشکرِ جرار لے کر مالوہ کی طرف روانہ ہوا۔

اس وقت باز بہادر، دارالحکومت مانڈو کو چھوڑ کر سارنگ پور میں مقیم تھا اور رُوپ متی کے نغموں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ عیش پرست حکمراں کو مغل لشکر کی آمد کی خبر اس وقت ملی جب دشمن سپاہی، سارنگ پور سے صرف دس میل کے فاصلے پر تھے۔ باز بہادر نے کیف و نشاط کی بساط لپیٹی اور ادھم خان سے مقابلے کے لیے شہر سے باہر نکلا۔

مغل فوجوں کا پہلا حملہ ہی کسی زلزلے کے مانند تھا صبح سے شام بھی نہ ہونے پائی تھی کہ باز بہادر کے سپاہیوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ مالوہ کے حاکم کو اپنی شکست صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے قلعے کی طرف پلٹا۔ اب اُسے اقتدار کی نہیں، اپنے جان و مال کی فکر تھی۔ باز بہادر نے شاہی خزانے کا دروازہ کھولا اور قیمتی جواہر سمیٹ لیے۔ پھر وہ اپنے بیوی بچوں اور خاندان کے چند قریبی افراد کے ساتھ ایک خفیہ راستے سے فرار ہو کر بیجا گیر کے گھنے جنگلوں میں داخل ہو گیا۔ یہ علاقہ اس وقت مالوہ کی حدودِ سلطنت میں شامل تھا۔

دوسرے دن ادھم خان نے سارنگ پور پر قبضہ کر لیا اور محافظوں نے کسی مزاحمت کے بغیر قلعے کے دروازے کھول دیئے۔ پھر جب ادھم خان قلعے میں داخل ہوا تو شاہی خزانہ خالی پڑا تھا۔ اُسے باز بہادر کی اس شاطرانہ چال پر سخت غصہ آیا۔ ادھم خان ایک لالچی انسان تھا۔ اس نے سیم و زر کی طلب میں مالوہ پر لشکر کشی کی تھی مگر جب وہ دریا کے کنارے پہنچا تو پانی خشک ہو چکا تھا۔ ادھم خان بہت دیر تک پیچ و تاب کھاتا رہا۔

''کیا باز بہادر نے کوئی اور اثاثہ نہیں چھوڑا ہے۔'' ادھم خان غضب ناک لہجے میں قلعے کے مکینوں سے پوچھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد باز بہادر کے خدمت گاروں نے سینکڑوں گانے والیوں اور سازندوں کو ادھم خان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''حضور! بس یہی لوگ سارنگ پور کے نوادر میں شامل ہیں۔''

ادھم خان نے بہت غور سے خوبصورت رقاصاؤں اور مطرباؤں کو دیکھا۔ پھر بڑے خوف ناک انداز میں قہقہہ لگایا۔ ''یہ ہے باز بہادر کا سرمایہ.....؟'' پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''ایک

ستار بجانے والے کا اثاثہ یہی ڈومنیاں ہو سکتی ہیں۔‘‘

اس کے بعد ادھم خان نے تمام گانے والی عورتوں کو اپنے مصاحبوں میں تقسیم کر دیا۔

’’حضور! ایک تحفۂ خاص آپ کے لیے بھی ہے۔‘‘ قلعے کے ایک خدمت گار نے دست بستہ عرض کیا۔

’’تحفۂ خاص؟‘‘ ادھم خان نے چونک کر پوچھا۔

’’باز بہادر کی محبوبہ!‘‘ خدمت گار نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔’’وہی فتنہ گر عورت باز بہادر کے دل پر حکمرانی کرتی ہے اور اسی کی وجہ سے سارنگ پور کے لوگوں کو یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔‘‘

’’کہاں ہے وہ؟‘‘ ادھم خان بے چین ہو گیا۔ اس نے پہلے بھی اکبر کے جاسوسوں کی زبانی اس عورت کی فتنہ سامانی کے قصے سنے تھے۔

خدمت گار، ادھم خان کو اس خوب صورت مکان تک لے گیا جو قلعے سے ملحق تھا۔

رُوپ متی اپنی چند کنیزوں کے ساتھ مکان کے دروازے پر کھڑی تھی اور اس کے چہرے سے شدید اضطراب جھلک رہا تھا۔ رُوپ متی کو اکبر کی فوجوں کے حملے کی خبر مل چکی تھی مگر اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ سارنگ پور کا لشکر اتنی جلد پسپائی اختیار کر لے گا۔ سپاہیوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ یہی سمجھی کہ باز بہادر نے اس کی حفاظت کے لیے فوجی دستہ بھیجا ہے۔

پھر جب ادھم خان اپنے سپاہیوں کے درمیان میں گھرا ہوا، مکان کے قریب پہنچا تو رُوپ متی صورتحال کو سمجھتے ہوئے تیزی کے ساتھ اندر چلی گئی۔

❁---❁---❁

ادھم خان اپنے سپاہیوں کے ہمراہ رُوپ متی کے محل نما مکان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اُس نے باز بہادر کی ایک کنیز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

’’رُوپ متی سے کہو کہ وہ خوش دلی کے ساتھ ایک فاتح کا استقبال کرے۔‘‘

یہ کنیز بھی باز بہادر کے حلقۂ اربابِ نشاط میں شامل تھی......اور رُوپ متی کی محبوبیت سے بے پناہ حسد رکھتی تھی۔ ادھم خان کے حکم پر کنیز، رُوپ متی کے محل میں داخل ہوئی اور بڑے طنزیہ انداز میں کہنے لگی۔

’’رانی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ محفلِ نشاط لٹ چکی ہے۔ یہ رنگا رنگ لباس ترک کر کے اپنے بدن پر ماتمی پیرہن سجا لیں۔‘‘

کنیز کی بات سن کر رُوپ متی کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔’’خاکم بدہن! کیا میرے دیوتا......؟‘‘ رُوپ متی نے شدتِ غم کے سبب اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

’’دیوتا کا کچھ پتہ نہیں۔ وہ قتل کیے جا چکے یا میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے۔‘‘ کنیز کا لہجہ بدستور طنز آمیز تھا۔

’’اپنے آقا کے بارے میں ایسی بات کرتے ہوئے تیری زبان نہیں لڑکھڑائی گلنار!‘‘ رُوپ متی نے

کنیز کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''رانی! اب آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' گلنار نے بے حسی کے ساتھ کہا۔''اب ادھم خان ہمارے جسم و جاں کے مالک ہیں۔ اور سلامتی اسی میں ہے کہ آپ ان کا پُر جوش استقبال کریں۔ وہ محل کے دروازے پر آپ کے منتظر ہیں۔''

''کون ادھم خان؟'' رُوپ متی غضب ناک ہوگئی۔

''مغل فوجوں کا سردار جس نے آپ کے دیوتا سے سارنگ پور کا اقتدار چھین لیا ہے۔'' گلنار تندو تیز گفتگو کر رہی تھی۔ حالانکہ شکست تو خود اُسے بھی ہوئی تھی......مگر رُوپ متی سے انتقام لینے کے لیے وہ اپنے آقائے نعمت باز بہادر کی بھی تذلیل کر رہی تھی۔

''ادھم خان سے کہہ دو کہ رُوپ متی اپنے دیوتا کے سوا کسی کا استقبال نہیں کرتی۔'' باز بہادر کی شکست نے رُوپ متی کو بدحواس کر دیا تھا مگر ادھم خان کا نام سن کر وہ سنبھل گئی اور اس کے لہجے کی سختی لوٹ آئی۔

کنیز گلنار واپس چلی گئی اور اُس نے رنگ آمیزی کے ساتھ رُوپ متی کی گفتگو دہرا دی۔

ادھم خان اپنی پست فطرت کی وجہ سے ایک مغضوب الغضب اور منتقم المزاج انسان تھا۔ رُوپ متی کا جارحانہ جواب سن کر ادھم خان مشتعل ہو گیا اور اجازت لیے بغیر اس عورت کے مکان میں داخل ہو گیا جو ریاست مالوہ میں ایک منفرد مقام رکھتی تھی اور باز بہادر کی محبوبہ کے منصب پر فائز تھی۔ ادھم خان بڑی حریصانہ نظروں سے رُوپ متی کی طرف دیکھ رہا تھا......اور وہ حسین مطربہ منہ پھیرے کھڑی تھی۔

''ادھم خان! ایک مرد کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ایک نامحرم خاتون کی خلوت میں اس طرح اجازت کے بغیر داخل ہو جائے۔'' رُوپ متی نے نہایت شائستہ لہجے میں کہا۔ اس قدر سنگین فضا میں بھی اس کی آواز کی فطری دلکشی برقرار تھی۔

رُوپ متی کے مترنم لہجے نے ادھم خان کے ذوقِ ہوس میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا اور نہایت جارحانہ انداز میں سارنگ پور کی مطربہ سے مخاطب ہوا۔

''رُوپ متی! یہ آداب عام مردوں کے لیے ہوتے ہیں۔''

ادھم خان کے ایک ایک لفظ سے فتح کا غرور جھلک رہا تھا۔''فاتح کے اپنے قوانین اور اپنے آداب ہوتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو تجھے عام لونڈیوں کی طرح اپنی بارگاہِ جلال میں طلب کرتے۔'' ادھم خان اس وقت اپنے آپ کو مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر سمجھ رہا تھا......''مگر ہم نے تیرے حُسن و جلال کی خاطر اپنا فاتحانہ انداز بدل دیا۔ اس لیے تجھ پر بھی لازم ہے کہ تُو ہمارے ذوقِ طلب کی شاندار پذیرائی کر۔''

رُوپ متی نہایت ذہین عورت تھی۔ اس نے ادھم خان کا چہرہ دیکھے بغیر سمجھ لیا تھا کہ فاتح سالار کس قسم کا انسان ہے اور اس سے کس انداز کی پذیرائی چاہتا ہے؟

''بے شک! آپ نے سارنگ پور والوں کے جسم فتح کر لیے مگر ان کے دلوں پر شہنشاہ باز بہادر کا

قبضہ ہے۔" یہ کہتے ہوئے رُوپ متی مڑی۔ اُس کے لہجے میں بڑی استقامت تھی۔

ادھم خان، باز بہادر کی محبوبہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس وقت رُوپ متی سرخ لباس میں ملبوس تھی۔ اس کا دلکش چہرہ کسی گلاب کی طرح مہک رہا تھا...... اور وہ سرخ جوڑے میں ایک ایسی دُلہن نظر آ رہی تھی، جسے اپنے محبوب یا شوہر کا انتظار ہو۔

ادھم خان چند لمحوں تک پلکیں جھپکائے بغیر رُوپ متی کے حُسنِ جہاں سوز کو دیکھتا رہا۔ پھر بڑے جارحانہ لہجے میں بولا۔ "شہنشاہ تو ہندوستان میں صرف ایک ہیں۔ جلالت مآب جلال الدین اکبر۔ باز بہادر تو اُن کا ادنیٰ غلام ہے۔ اہلِ سارنگ پور کو چاہئے کہ جس طرح اُن کے جسموں کو غلام بنایا گیا ہے اسی میں وہ اپنے دلوں کو بھی شہنشاہ کی غلامی کے لیے پیش کر دیں۔"

"میں سارنگ پور کے دوسرے مکینوں کی بات نہیں کرتی...... مگر مجھے دنیا کے کسی شہنشاہ کی غلامی قبول نہیں۔" رُوپ متی کا انداز باغیانہ تھا۔

ادھم خان کا خیال تھا کہ سارنگ پور کی مطربہ ایک کمزور اعصاب کی عورت ہو گی مگر جب اُس نے رُوپ متی کا مطمئن چہرہ دیکھا تو غضب ناک ہو گیا۔ "جو لوگ شہنشاہ اکبر کی غلامی تسلیم نہیں کرتے، ان کے ساتھ بڑا بے رحمانہ سلوک کیا جاتا ہے...... مگر ہم تجھے ایک عورت ہونے کی رعایت دیتے ہیں۔ اب تُو دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔ فاتح ادھم خان کا عشرت کدہ...... یا بھگوڑے باز بہادر کی یادوں کا ماتم کدہ؟"

یہ کہہ کر ادھم خان، سارنگ پور کے قلعے میں واپس چلا گیا...... اور رُوپ متی کو ایک علیحدہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اب اُس نے سرخ جوڑا اُتار کر سیاہ ماتمی لباس پہن لیا تھا۔ ادھم خان نے رُوپ متی کے کمرے کے باہر سپاہیوں کا پہرہ لگا دیا تھا تاکہ وہ باز بہادر کی طرح کسی خفیہ راستے سے فرار نہ ہو سکے...... اور کمرے کے اندر گلنار اُس کی نگرانی کر رہی تھی۔ حاکمِ مالوہ کے دل پر حکومت کرنے والی رُوپ متی اب ایک عام سی قیدی تھی۔

❁---❁---❁

سارنگ پور پر قبضہ کرنے کے بعد ادھم خان، باز بہادر کے دوسرے علاقوں کی طرف متوجہ ہوا۔ جنگ کا اصول ہے کہ جب سالار قتل ہو جائے یا میدانِ جنگ سے فرار ہو جائے تو باقی سپاہی بھی بد دِل ہو کر ہتھیار ڈال دیتی ہے اور صلح کا پرچم لہرا کر دشمن سے امان مانگ لیتی ہے۔ باز بہادر کے دوسرے قلعہ داروں کا بھی یہی حال تھا۔ اُن کا حاکم، بیجا گیر کے جنگلوں میں بھٹک رہا تھا۔ نتیجتاً "مانڈو" کے قلعہ دار نے بھی بڑی بے دلی سے جنگ کی...... اور جب ادھم خان نے بھرپور حملہ کیا تو باز بہادر کے امرائے سلطنت، مغل افواج کا مقابلہ نہ کر سکے...... اور معمولی سی مزاحمت کے بعد ان لوگوں نے "مانڈو" کا قلعہ دشمن کے حوالے کر دیا۔ "مانڈو" مالوہ کا دارالحکومت تھا۔ اسے اُردو زبان میں "مندو" کہا جاتا ہے۔

جب ''مانڈو'' کے قلعے پر مغل شہنشاہ کا پرچم لہرایا گیا تو ادھم خان نے سکون کا سانس لیا اور اس کے چہرے پر نخوت وغرور کا گہرا رنگ اُبھر آیا۔ پھر اس کم ظرف سالار نے اپنی تلوار لہراتے ہوئے کہا۔

''لوگو! مجھے پہچان لو۔ یہ میں ہوں، ادھم خان۔ جس نے مالوہ کی فوجوں پر مغل لشکر کی ہیبت بٹھا دی اور اس جنگی مہم کو چند دنوں میں انجام تک پہنچا دیا جو کئی سالوں میں بھی سر نہیں ہو سکتی تھی۔''

اکبر کے جاسوس سائے کی طرح ادھم خان کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے ادھم خان کی پُرغرور تقریر سنی اور ایک پرچہ تحریر کر کے دارالحکومت آگرہ بھیج دیا۔ جاسوسوں نے پرچے میں لکھا تھا۔

''ادھم خان ایک غیر ذمے دار شخص ہے۔ وہ شہنشاہ کی منصوبہ بندی کو اپنے نام سے منسوب کر رہا ہے۔''

اکبر نے جاسوسوں کا پرچہ پڑھا اور مسکرا کر رہ گیا۔ مغل شہنشاہ کے نزدیک یہ ایک طفلانہ حرکت تھی۔ اس لیے اکبر نے درگزر سے کام لیا۔

❋---❋---❋

مالوہ پر قبضہ کرنے کے بعد ادھم خان نے اپنی فتوحات کا شاندار جشن منایا۔ مالِ غنیمت کے طور پر باز بہادر کی بہت سی خوبصورت رقاصائیں اور گانے والیاں اس کے تصرف میں تھیں۔ ادھم خان نے رُوپ متی کو بھی حکم دیا تھا کہ وہ اس کی شان میں ایک بھرپور قصیدہ لکھے اور حاضرینِ دربار کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔

رُوپ متی کو اپنے دور کی ''رانی پدمنی'' کہا جاتا تھا۔ چتوڑ کی ملکہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بے پناہ حُسن کی مالک ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت اعلیٰ ادبی ذوق رکھتی تھی اور بڑے خوبصورت اشعار کہا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے سلطان علاء الدین خلجی، رانی پدمنی کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا اور پھر حکمراں نے چتوڑ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی..... مگر ہزار کوششوں کے باوجود سلطان علاء الدین خلجی، رانی پدمنی کو حاصل نہیں کر سکا تھا۔

جب مالوہ کے لوگوں نے شہزادہ باز بہادر کو رُوپ متی کی زلف گرہ گیر کا اسیر دیکھا تو بے اختیار اُنہیں علاء الدین خلجی اور رانی پدمنی کی داستان یاد آ گئی..... مگر عشق کے دونوں افسانوں میں بنیادی فرق یہ تھا کہ رُوپ متی خود بھی باز بہادر کے عشق میں فنا ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے سماج اور دھرم کی ساری رسموں کو بالائے طاق رکھ کر باز بہادر کی غلامی قبول کر لی تھی۔ کسی تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ رُوپ متی مسلمان ہو گئی تھی یا باز بہادر نے اس سے شرعی رشتہ قائم کر لیا تھا۔ عام طور پر یہی مشہور تھا کہ وہ باز بہادر کی محبوبہ ہے۔ مالوہ کی رعایا اپنے حکمراں کے خوف سے دل کی بات زبان پر نہیں لائی تھی مگر کہنے والے سرگوشیوں میں یہی کہتے تھے کہ وہ باز بہادر کی ''داشتہ'' ہے۔ اُڑتے اُڑتے یہ خبریں رُوپ متی کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی

تھیں۔ مگر وہ بڑے والہانہ انداز میں یہی کہتی تھی۔

''باز بہادر میرا دیوتا ہے......اور دیوتا اپنی داسی کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔''

ادھم خان نے بھی مقامی لوگوں کی زبانی رُوپ متی کی سرمستی کی یہ داستانیں سن رکھی تھیں۔ اب وہ اپنے آپ کو سلطان علاء الدین خلجی اور رُوپ متی کو رانی پدمنی سمجھ رہا تھا۔ اسی لیے ادھم خان نے رُوپ متی کو حکم دیا تھا کہ وہ اُس کی تعریف میں اشعار لکھے اور پھر ان شعروں کو اس انداز سے گائے کہ حاضرینِ دربار جھوم اُٹھیں۔

رُوپ متی نے ادھم خان سے معذرت کر لی۔ فاتح مالوہ کو رُوپ متی کا انکار گراں گزرا تھا۔ مگر وہ رات بھر جشن کے پُرکیف ہنگاموں میں مصروف رہا۔ پھر رات کے پچھلے پہر ادھم خان لڑکھڑاتے قدموں سے رُوپ متی کے کمرے کی طرف بڑھا۔

رُوپ متی حسبِ معمول سیاہ لباس پہنے ہوئے رنج والم کا مجسمہ بنی بیٹھی تھی۔ گلنار جو پہلے دن ہی ادھم خان کی غلامی قبول کر چکی تھی، تیزی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔

''ادھم خان آپ کی طرف آرہے ہیں۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' رُوپ متی نے شانِ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے جشنِ فتح میں شریک نہ ہوکر بڑی سنگین غلطی کی ہے۔'' گلنار، رُوپ متی کے سامنے اپنی ہمدردی اور وفاداری کا اظہار کر رہی تھی۔ ''ادھم خان نے آپ کے انکار کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ بھلائی اسی میں ہے کہ مالوہ کی شکست کو دل سے تسلیم کر لیں۔''

''جب تک میرا دیوتا زندہ ہے، میں کسی دوسرے کو فاتح تسلیم نہیں کروں گی۔'' رُوپ متی اسیری میں بھی آزاد نظر آرہی تھی۔

''جب دیوتا ہی کو داسی کا خیال نہیں......'' ابھی گلنار اپنی بات مکمل کرنے نہیں پائی تھی کہ رُوپ متی غضب ناک ہوگئی۔

''تجھے کیا پتہ کہ دیوتا کیا ہوتا ہے اور داسی کسے کہتے ہیں؟''

گلنار جواب دینا چاہتی تھی کہ ادھم خان کمرے میں داخل ہوا۔ گلنار فرشی سلام کرتے ہوئے اُلٹے قدموں واپس چلی گئی۔

''رُوپ متی! تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے بغیر یہ جشنِ فتح کس قدر بے کیف تھا۔'' نشے کی زیادتی کے سبب ادھم خان کی آواز بھی لڑکھڑا رہی تھی۔ ''کیسے ہوشربا رقص تھے......اور کیسے کیف آور نغمے تھے...... مگر پھر بھی دربار خالی خالی تھا......اور اس کی وجہ تم ہو۔''

رُوپ متی خاموش بیٹھی رہی۔

''تمہارے انکار نے ہمارا دل توڑ دیا۔'' یکایک ادھم خان کے چہرے پر سختی اُبھر آئی۔ ''اگر تمہاری جگہ

کوئی دوسری عورت ہوتی تو وہ اب تک اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ چکی ہوتی.....مگر تم ایک گلاب ہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری دراز دستیوں کے آگے پتّی پتّی ہو کر بکھر جاؤ۔''

ادھم خان کا چہرہ دیکھ کر رُوپ متی نے سمجھ لیا تھا کہ فاتح سالار کے دل و دماغ میں شیطان ناچ رہا ہے۔ اس نے اس مشکل گھڑی کو ٹالنے کے لیے ذہانت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''آپ خوب جانتے ہیں کہ سوگ میں ڈوبی ہوئی ایک عورت کیا شعر لکھے گی اور کیا نغمے گائے گی؟'' رُوپ متی کی آواز سے گہری افسردگی جھلک رہی تھی۔

''تم کس کا سوگ منا رہی ہو رُوپ متی؟'' ادھم خان نے مخمور نگاہوں سے باز بہادر کی محبوبہ کی طرف دیکھا جو سیاہ لباس میں اور بھی حسین نظر آ رہی تھی۔

''کیا آپ نہیں جانتے؟'' رُوپ متی نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

''جانتے ہیں۔'' ادھم خان قریب آ کر اس مسہری پر بیٹھ گیا جہاں رُوپ متی جلوہ افروز تھی۔ فاصلے کم ہوتے جا رہے تھے اور آج ادھم خان کی وحشتیں کسی اور طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ ''مگر تمہاری زبان سے سننا چاہتے ہیں۔'' ادھم خان نے رُوپ متی کا جھکا ہوا سر اپنے ہاتھ سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

رُوپ متی کانپ کر رہ گئی۔ اُس نے اُچٹتی ہوئی نظر سے فاتح سالار کی طرف دیکھا۔ ادھم خان شراب کے نشے میں غرق تھا۔ فاتح انسان ہوش کی حالت میں بھی نہایت خطرناک ہوتا ہے......اور اگر غلطی سے وہ شراب پی لے تو پھر نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی فتح مندی کا احساس کیا صورت اختیار کرے گا۔ رُوپ متی کو اپنا انجام قریب نظر آ رہا تھا۔ ادھم خان کے ہوس ناک ارادوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس نے خود کو دنیا کی مظلوم ترین عورت ثابت کرتے ہوئے کہا۔

''شدتِ غم نے میرے ہوش و حواس چھین لیے ہیں۔'' اچانک رُوپ متی کا لہجہ خوشامدانہ ہو گیا تھا۔ ''آپ اس عورت کی بدنصیبی کا اندازہ نہیں کر سکتے جو بھری دنیا میں تنہا رہ گئی ہے.....اور آج اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔''

''رُوپ متی! ہم تمہارے قدر داں ہیں۔'' ادھم خان کی سرمستیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ''تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ تم نے ایک بے وفا اور بزدل مرد سے محبت کی جو آزمائش کے وقت تمہیں گردابِ ہلاکت میں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ کاش! تم نے مجھ جیسے مردِ جانباز سے محبت کی ہوتی، پھر تمہیں احساس ہوتا کہ ادھم خان اپنی محبوبۂ دلنواز کی ناز برداری کس طرح کرتا ہے۔'' فاتح سالار بے تکلفی کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ ''مگر ابھی وقت ہے رُوپ متی! باز بہادر کو بھول جاؤ کہ وہ تمہارے عشق کے قابل تھا بھی نہیں۔''

باز بہادر کا نام سن کر ایک بار پھر رُوپ متی کے دل پر گہری چوٹ لگی تھی۔ وہ سارنگ پور کی شکست کے بعد مسلسل سوچ رہی تھی کہ باز بہادر قلعے سے فرار ہوتے وقت اسے کیوں بھول گیا تھا؟ پھر جب ہنگامۂ دار و گیر ختم ہو گیا تو رُوپ متی نے اپنے طور پر واقعے کی تحقیق کی تو اس پر یہ تلخ حقیقت منکشف ہوئی

کہ باز بہادر کے پاس شاہی خزانے سے لعل و جواہر سمیٹنے کا وقت تھا......اور اس موتی کی آبرو کا خیال تک نہیں تھا جو ریاست مالوہ میں سب سے نادر اور نایاب موتی تھا......اور یہ موتی خود رُوپ متی تھی۔ پھر باز بہادر نے اس موتی کو لٹیروں کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا تھا؟ یہ سوچ سوچ کر رُوپ متی کا دل ڈوب ڈوب جاتا تھا......مگر وہ دلِ ناداں کو یہ کہہ کر تسلیاں دے لیتی تھی کہ باز بہادر مجبور ہو گا......مگر ادھم خان کی زبان سے اپنے محبوب کی بے وفائی کا ذکر سن کر رُوپ متی کا چہرہ دھواں ہو گیا......اور جلتی ہوئی یادوں کا غبار اشک بن کر اس کی آنکھوں سے برسنے لگا۔

ادھم خان نے رُوپ متی کا یہ حال دیکھا تو سنبھل گیا۔ ''رُوپ متی! ان لوگوں سے زیادہ کوئی بدنصیب نہیں ہوتا جو برباد شدہ ماضی کا ماتم کرتے رہتے ہیں اور روشن و تابناک حال کو اپنے ہاتھوں سے گنوا دیتے ہیں۔''

رُوپ متی نے اپنے آنچل سے آنسو خشک کیے اور بہت محتاط لہجے میں کہنے لگی۔

''حالات کا تقاضا تو یہی ہے کہ مجھے ماضی کو فراموش کر دینا چاہئے۔ مگر صدمہ اتنا شدید ہے کہ اس کے حصار سے نکلنے میں کچھ وقت لگے گا۔''

''اب ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے رُوپ متی!'' ایک بار پھر ادھم خان کے دل و دماغ پر اس کے سفلی جذبات حملہ آور ہو گئے تھے۔ ''ہم تمہارے ریشمی آنچل کے سائے میں جشن کی فتح کی اس رات کو یادگار بنانا چاہتے ہیں۔''

''مجھے کچھ دن کی مہلت اور دے دیجئے۔'' فضا کی سنگینی اس درجے تک پہنچ گئی تھی کہ رُوپ متی کو گداگرانہ لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں کہ بہت جلد غم کے اس حصار سے باہر نکل آؤں گی۔ پھر آپ ایک اور جشنِ فتح کا اہتمام کیجئے گا۔ پھر رُوپ متی ایسا گیت گائے گی کہ صرف مالوہ کے رہنے والے ہی نہیں، ہندوستان کے بے شمار لوگ اس گیت کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔''

رُوپ متی کی بات سن کر ادھم خان کے چہرے پر غرور و فخر کا رنگ اُبھر آیا۔ ''میں اسی دن کا تو انتظار کر رہا ہوں۔''

❀---❀---❀

باز بہادر، بیجا گیر کے گھنے جنگلوں میں بیٹھ کر آئندہ کے لیے منصوبہ بندی کر رہا تھا......مگر ابھی اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ مغل فوجوں کا سامنا کر سکے۔

دوسری طرف ادھم خان، باز بہادر کے چھوڑے ہوئے اثاثے کا شمار کر رہا تھا۔ سیم و زر کے انبار کے علاوہ بہت سی نادر و نایاب چیزیں ہاتھ آئی تھیں۔ وہ فطرتاً ایک حریص انسان تھا۔ بیش قیمت ساز و سامان کو دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی۔ ادھم خان نے اکبر کی خدمت میں چند ہاتھی آگرہ روانہ کیے اور ساتھ ہی ایک خط بھی مغل شہنشاہ کے نام تحریر کیا۔

''ظلِ سبحانی کی بلند اقبالی کے صدقے میں غلام کو پے در پے فتوحات حاصل ہو رہی ہیں مگر افسوس! باز بہادر نے مالِ غنیمت کے نام پر ایک ذرّہ بھی نہیں چھوڑا۔ وہ سارنگ پور اور مانڈو کے قلعوں سے سارا قیمتی ساز و سامان لے کر فرار ہو گیا ہے۔ شہنشاہ مطمئن رہیں۔ میں باز بہادر کے دوسرے قلعوں پر حملہ کرنے جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ سارا خزانہ ان ہی قلعوں میں محفوظ ہو گا۔''

جلال الدین اکبر نے بڑی حیرت سے ادھم خان کا خط پڑھا۔ مغل شہنشاہ جانتا تھا کہ مالوہ ایک مالدار ریاست ہے...... مگر ادھم خان کی تحریر اس بات کی نفی کر رہی تھی۔ اکبر ابھی اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا کہ ایک جاسوس بھی آگرہ پہنچا اور اس نے انتہائی رازداری کے ساتھ شہنشاہ سے عرض کیا۔

''مالوہ کی جنگی مہم میں بے شمار مالِ غنیمت ادھم خان کے ہاتھ آیا ہے...... مگر وہ حریص اور بدعہد انسان ظلِ سبحانی کو اندھیرے میں رکھ کر تمام ساز و سامان غصب کر لینا چاہتا ہے۔''

یہ انکشاف سن کر اکبر غضب ناک ہو گیا۔ ''اب اس نمک حرام کے کیا ارادے ہیں؟''

''وہ قلعہ کا کرون فتح کرنا چاہتا ہے۔'' جاسوس نے اپنی اطلاع کے مطابق عرض کیا۔

''کیا ادھم خان مانڈو سے روانہ ہو چکا ہے؟'' اکبر نے اسی حالتِ قہر میں جاسوس سے دوسرا سوال کیا۔

''جب غلام مانڈو سے روانہ ہوا تھا تو ادھم خان تیاریوں میں مصروف تھا۔'' جاسوس نے دست بستہ عرض کیا۔ ابھی جاسوس کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ مغل شہنشاہ انتہائی بے قراری کے عالم میں خلوت سے باہر نکل آیا۔

❀---❀---❀

ابھی ادھم خان راستے ہی میں تھا کہ مغل شہنشاہ اکبر کسی طوفانِ بلاخیز کی طرح اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ اپنے حکمراں کو سامنے پا کر ادھم خان کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ اس پر کچھ دیر تک سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ ادھم خان کا کرون اور سارنگ پور کے درمیانی علاقے میں شہنشاہ کی موجودگی کو اپنے کسی خواب کا حصہ سمجھ رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک آنکھیں مل مل کر شہنشاہ کی طرف دیکھتا رہا۔

''نمک حرام! ہاں یہ میں ہی ہوں، تیرا آقائے نعمت۔'' اکبر نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

شہنشاہ کی پُر جلال آواز نے ادھم خان کے تصورات کا طلسم پارہ پارہ کر دیا۔ پھر وہ تیزی کے ساتھ گھوڑے سے اُترا اور اُس نے اپنا سر اکبر کے قدموں پر رکھ دیا۔

''ظلِ سبحانی! مجھے میرے نفس نے دھوکا دیا۔ پیدائشی مفلس ہوں، اس لیے دولت کے انبار دیکھ کر نیت بدل گئی۔'' ادھم خان کسی گداگر کی طرح گڑگڑاتے ہوئے زار و قطار رو رہا تھا۔ ''اگر آئندہ مجھ حقیر و ذلیل سے کوئی گناہ سرزد ہو تو میرا سر قلم کر دیجئے گا۔''

مغل شہنشاہ نے ادھم خان کے جھکے ہوئے سر پر ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر شدتِ خوف سے اس کا جسم لرز رہا تھا۔

''آئینِ سلطنت میں نمک حرامی کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔'' اکبر کے لہجے سے قہر کی آگ برس رہی تھی۔ ''مگر ہم پہلی بار تجھے اس لیے معاف کرتے ہیں کہ تیری ماں نے ہماری بہت خدمت کی ہے۔''

شہنشاہ کی زبان سے جاں بخشی کا اعلان سن کر ادھم خان نے دوبارہ زمین پر سر رکھ دیا۔

پھر جلال الدین اکبر سارا مالِ غنیمت اپنے ہمراہ لے کر آگرہ واپس چلا گیا۔ جاتے جاتے مغل شہنشاہ نے ملّا پیر محمد کو مالوہ کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔ حریصانہ فطرت نے ادھم خان کو یہ دن دکھائے کہ وہ خالی ہاتھ رہ گیا۔ اب اس کے قبضے میں رُوپ متی اور چند کنیزوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ ایک شکست خوردہ انسان کی حیثیت سے دارالحکومت کی طرف واپس جا رہا تھا۔

رُوپ متی ایک تماشا بن کر رہ گئی تھی۔ وہ ایک خانہ بدوش کے مانند تھی، جسے ادھم خان دربدر پھرا رہا تھا۔ حُسن اور آواز کی دولت سے مالا مال ہوتے ہوئے بھی وہ دنیا کی مفلس ترین عورت تھی۔ جس کی خاطر ماں باپ چھوڑے اور زمانے بھر کی رُسوائیاں مول لیں، اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ رُوپ متی کو باز بہادر پر بڑا ناز تھا۔ وہ ہندو دوشیزہ تھی مگر ایک مسلمان کو اپنا دیوتا سمجھتی تھی۔ رُوپ متی کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ باز بہادر اُسے دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس طرح فرار ہو سکتا ہے۔ اگر مالوہ کا حکمراں تنہا بھاگ جاتا تو رُوپ متی، باز بہادر کے فرار کو اس کی مجبوری سمجھ کر صبر کر لیتی...... لیکن جب سارنگ پور کی مطربہ کو پتہ چلا کہ باز بہادر، بیوی بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا ہے تو اس کے دل میں ایک طوفان سا اُٹھا۔ رُوپ متی کو اپنی ساری پرستش رائیگاں جاتی نظر آئی۔ باز بہادر بھی دیوتاؤں کے مجسموں کی طرح ایک پتھر کا بُت ثابت ہوا جس کے نزدیک محبت کے نرم و نازک جذبات کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اگرچہ رُوپ متی کا شیشۂ اعتبار پہلے ہی اقتدار کے بت سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا لیکن وہ پرستار و وفا شعار عورت پھر بھی اپنے دیوتا کا انتظار کر رہی تھی۔ رُوپ متی جب تک مالوہ کے دارالحکومت مانڈو میں مقیم تھی، اس فریب میں مبتلا رہی کہ اگر باز بہادر اُسے ادھم خان کی قید سے چھڑا نہ سکا تو کم سے کم کسی خفیہ پیغام کے ذریعے تسلیاں ضرور دے گا...... مگر فریب کا یہ طلسم اس وقت بکھر گیا جب ادھم خان اسے لے کر آگرہ پہنچا۔

اب رُوپ متی کو اس خوف ناک حقیقت پر یقین آ چکا تھا کہ وہ باز بہادر کی محبوبہ نہیں، داشتہ تھی۔ اگر محبوبہ ہوتی تو مالوہ کا حاکم اُسے جنسِ بازاری سمجھ کر ہوس کاروں کے نرغے میں کیوں چھوڑ جاتا۔

رُوپ متی، آگرے کے محل کے ایک آراستہ کمرے میں اُداس بیٹھی سوچ رہی تھی...... اور ادھم خان کا مطالبہ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ رُوپ متی کبھی طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کرتی، کبھی اپنی مجبوری کا مرثیہ پڑھتی اور کبھی خوشامدانہ انداز میں ادھم خان کے آگے ہاتھ جوڑ لیتی۔ ادھم خان چاہتا تو جارحانہ روش اختیار کر سکتا تھا مگر اس اوباش فطرت انسان کی شدید خواہش تھی کہ رُوپ متی اس کے سامنے خم ہو جائے۔ اس لیے آزادی و محکومی کا یہ تماشا طول کھینچتا جا رہا تھا۔

❀---❀---❀

دوسری طرف رُوپ متی کا دیوتا، باز بہادر اپنے بیوی بچوں اور مال و متاع کو بیجا گیر کے قلعے میں محفوظ کر کے برہان پور کے حاکم کے پاس پہنچا۔ اس وقت برہان پور کا حاکم میراں مبارک شاہ فاروقی تھا۔ اس نے نہ صرف باز بہادر کو سیاسی پناہ دے دی بلکہ ضرورت کے وقت فوجی مدد کا وعدہ بھی کر لیا۔ مبارک شاہ فاروقی کی حوصلہ افزائی سے باز بہادر تازہ دم ہو گیا اور خاندیس کو اپنا مرکز بنا کر مالوہ پر شب خون مارنے لگا۔

ملّا پیر محمد کو ان واقعات کی اطلاع ملی تو اس نے مانڈو سے کُوچ کر کے بیجا گیر کے مضبوط قلعے پر حملہ کیا۔ باز بہادر اس وقت خاندیس میں تھا۔ ملّا پیر محمد نے بیجا گیر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ باز بہادر کے بیوی بچوں کو گرفتار کر لیا اور تمام نمک خواروں کو چن چن کے قتل کر ڈالا۔ باز بہادر کو اس خونی انقلاب کی خبر ملی تو وہ خاندیس سے فرار ہو کر دوبارہ میراں مبارک شاہ فاروقی کے پاس برہان پور پہنچا۔

''حسبِ وعدہ میری مدد فرمائیے۔'' باز بہادر بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ ''اقتدار کے ساتھ میرے بیوی بچوں کی جانیں بھی خطرے میں ہیں۔''

''میں براہِ راست مغل شہنشاہ سے تصادم نہیں چاہتا۔'' مبارک شاہ فاروقی نے حالات و واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''کچھ دن انتظار کرو تاکہ ملّا پیر محمد کے عزائم مکمل طور پر بے نقاب ہو جائیں۔''

باز بہادر کی مایوسی کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے سمجھا کہ مبارک شاہ فاروقی اپنے وعدے سے انحراف کر رہا ہے۔ مگر اب کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں تھا۔ چار و ناچار باز بہادر، برہان پور ہی میں ٹھہر گیا۔

ملّا پیر محمد، باز بہادر کے وجود تک کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ بیجا گیر کو تباہ و برباد کر کے وہ خاندیس کی طرف بڑھا۔ یہاں مبارک شاہ فاروقی کی مختصر فوج تھی جو مغلوں کا لشکرِ جرار دیکھ کر فرار ہو گئی۔ ملّا پیر محمد نے اس علاقے میں قتل عام کا حکم جاری کر دیا۔

پھر اس نے اپنے وفادار فوجی دستوں کو حکم دیا کہ وہ خاندیس کی طرح برہان پور میں بھی قتل و غارت کا بازار گرم کریں تاکہ رعایا کے دلوں پر شہنشاہ جلال الدین اکبر کی ہیبت قائم ہو جائے۔

ملّا پیر محمد کا حکم سن کر فوجیوں کی ایک قلیل تعداد نے خاندیس سے برہان پور کی طرف کُوچ کیا۔ باقی سپاہی مالوہ کی طرف لوٹنے لگے۔ امراء پہلے ہی پیر محمد سے ناراض تھے، انہوں نے شاہی فوج کا طرزِ عمل دیکھ کر پیر محمد کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تیر، کمان سے نکل چکا تھا۔ کچھ فوجی دستے برہان پور کی طرف پیش قدمی کر چکے تھے۔

میراں مبارک شاہ فاروقی کو اسی دن کا انتظار تھا۔ جب برہان پور کے حاکم نے ملّا پیر محمد کے سپاہیوں کی پیش قدمی کی خبر سنی تو اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر برار کے حاکم تغال خان سے مدد طلب کی۔

تغال خان اپنے زمانے کا نامی گرامی سردار تھا اور اس کی بہادری کے قصے دُور دُور تک مشہور تھے۔ وہ میراں مبارک شاہ فاروقی کے ساتھ اپنا لشکر لے کر ملّا پیر محمد سے مقابلہ کرنے کے لیے برہان پور کے

مضافاتی علاقے کی طرف بڑھا۔ مغل فوج کا ایک بڑا حصہ پہلے ہی ملاّ پیر محمد کا ساتھ چھوڑ کر واپس جا چکا تھا۔ پھر جب اُسے مبارک شاہ فاروقی اور تغال خان کے لشکر کی آمد کی خبر ملی تو وہ خود بھی ناکام و نامراد واپس لوٹ گیا۔

تغال خان نے برق رفتاری سے اس کا تعاقب کیا اور ملاّ پیر محمد کے سر پر جا پہنچا۔ کچھ دیر تک خونریز معرکہ جاری رہا، مگر سپاہیوں کی کمی اور بد دلی کی وجہ سے ملاّ پیر محمد جنگ ہار گیا اور جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا۔ تغال خان نے صرف اپنی فتح پر قناعت نہیں کی۔ وہ ملاّ پیر محمد کا سر چاہتا تھا تا کہ اپنے علاقے کے معصوم لوگوں کی ہلاکتوں کا حساب لے سکے۔

فرشتۂ اجل کو اتنے قریب پا کر ملاّ پیر محمد بدحواس ہو گیا تھا۔ پھر ایک ایسا مرحلہ بھی آ گیا کہ پیر محمد نے اپنی جان بچانے کے لیے دریائی راستہ اختیار کیا مگر علماء، مشائخ اور ساداتِ عظام کا خونِ ناحق رنگ لا کر رہا۔ ملاّ پیر محمد دریائے نربدا کے خشک حصے سے گزر رہا تھا۔ یکایک ایک طرف سے باربردار اونٹوں کی قطار برآمد ہوئی۔ پیر محمد بدحواسی کے عالم میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اس کا گھوڑا اونٹوں سے ٹکرا گیا۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ ملاّ پیر محمد اُچھلا اور دریا میں جا گرا۔ وہاں پانی بہت زیادہ تھا اور ملاّ پیر محمد تیراکی کے فن سے ناآشنا۔ دریا میں گرتے ہی اس نے غوطے کھانے شروع کر دیئے۔ سپاہیوں نے اپنے سردار کی جان بچانے کی سرتوڑ کوششیں کیں۔ شاید وہ کامیاب بھی ہو جاتے مگر اسی دوران تغال خان کسی بھوکے باز کی طرح ان کے سروں پر آ پہنچا۔ خود کو موت کے منہ میں پا کر پیر محمد کے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے......اور مغل شہنشاہ کا ظالم استاد انتہائی بے کسی کے عالم میں دریائے نربدا کی بے رحم موجوں کی خوراک بن گیا۔

پھر باز بہادر نے تغال خان کی مدد سے دوبارہ مالوہ پر قبضہ کر لیا۔

❁---❁---❁

جب پیر محمد کی ہلاکت اور شاہی افواج کی شکست کی خبر آگرہ پہنچی تو اکبر کے چہرے پر رنج و ملال کے گہرے سائے لرزنے لگے۔ اسے اپنے استاد کی موت کا بے حد قلق تھا۔

مگر قصرِ شاہی میں ایک ذات ایسی بھی تھی جسے شاہی لشکروں کی شکست پر بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی اور اس کے تنِ مُردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ رُوپ متی تھی جو اپنے بے وفا محبوب کی فتح پر جھوم اُٹھی تھی۔

دوسری طرف ادھم خان تھا جس نے اکبر کے سامنے اُس کے استاد ملاّ پیر محمد کی موت پر بہت دیر تک آنسو بہائے تھے......مگر درپردہ اس کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ جس روز سے اکبر نے ادھم خان کو معزول کر کے پیر محمد کو مالوہ کا حاکم نامزد کیا تھا، اسی دن سے یہ کینہ فطرت انسان، پیر محمد کو اپنا دشمنِ جانی سمجھنے لگا تھا۔ پھر جب پیر محمد کی موت کی اطلاع آگرہ پہنچی تو ادھم خان نے اسے اپنی فتح سے تعبیر کیا۔ پھر وہ رُوپ متی کے کمرے میں لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا۔

''رُوپ متی! تُو نے ہمارے جشنِ فتح میں نہ کوئی گیت گایا اور نہ رقص پیش کیا......مگر آج قدرت نے ہمیں ایک اور موقع بخشا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تُو اپنے دلکش گیتوں اور رقص کی فتنہ سامانیوں سے ان لمحات کو رنگین تر بنا دے۔''

''سردار! مجھے ایک دن کی مہلت اور دے دیں۔'' رُوپ متی گڑگڑائی۔

''آج کیوں نہیں؟'' ادھم خان مچل گیا۔

''آپ جیسے سردار کی شان میں گیت لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔'' رُوپ متی نے مہلت مانگنے کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر اس گیت کی ایسی دُھن ترتیب دینا جو آپ جیسے فن کے خریدار کو مطمئن کر سکے۔'' رُوپ متی کے ایک ایک لفظ میں نفرتوں اور تلخیوں کا زہر چھپا ہوا تھا......مگر ادھم خان جیسا بوالہوس اور بدذوق انسان الفاظ کے نشتروں کو محسوس نہ کر سکا۔ ''اور پھر میں نے کئی ماہ سے ریاض بھی نہیں کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کبھی گانا گایا ہی نہیں تھا۔''

رُوپ متی کے پیش کردہ عذر میں بڑا وزن تھا۔ ادھم خان بہل گیا اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے واپس جانے لگا۔

''ایک درخواست اور ہے سردار!'' آج رُوپ متی سراپا التجا بنی ہوئی تھی۔

فیلِ مست کی طرح جھومتا ہوا ادھم خان مڑا۔ اس کی مخمور آنکھوں میں ایک فاتح کے جذبات کی چمک تھی۔ ''تم درخواست گزاری کی منزل سے گزر چکی ہو رُوپ متی!......اب تم ادھم خان کے دل کی حکمراں ہو......اور حکمراں ہمیشہ حکم ہی دیا کرتے ہیں۔''

''سردار! یہ کنیز اپنے مقام سے بخوبی آشنا ہے۔'' رُوپ متی نے مزید عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کنیز کی دلی خواہش ہے کہ کل رات وہ اپنے کمرے کے دروازے پر سردار کا استقبال کرے۔''

رُوپ متی کی التجا سن کر ادھم خان بہت زور سے ہنسا۔ ''یہ بھی کوئی خواہش ہے؟ ہم تو بارہا تیرے دروازے پر آئے ہیں۔ کل بھی آ جائیں گے۔'' ادھم خان نے بالآخر رُوپ متی کو فتح کر لیا تھا۔ اسی احساسِ غرور کے ساتھ وہ جھومتا ہوا چلا گیا۔

❀---❀---❀

ادھم خان کی کنیزیں رُوپ متی کے کمرے کو آراستہ کر رہی تھیں۔ بلور کے فانوس، ہاتھی دانت کے شمع دان، کافوری شمعیں، اطلس و کمخواب کے پردے، ریشم و مخمل کی چادریں، کاشان کے قالین الغرض نادر و نایاب چیزیں لا لا کر اس طرح سجائی جا رہی تھیں جیسے رُوپ متی ملکۂ ہند ہو اور ادھم خان فرماں روائے ہندوستان۔

کنیزیں اپنے کام میں مصروف رہیں......اور رُوپ متی ایک گوشے میں منہ چھپائے پڑی رہی۔ پھر

جب رات کے پچھلے پہر قصرِ شاہی کی کنیزیں چلی گئیں تو رُوپ متی کی آنکھوں کے آبشار اُبل پڑے۔ وہ صبح تک باز بہادر کو یاد کر کے روتی رہی۔ اس نے اپنے بے وفا محبوب کی جدائی میں آخری گیت گایا۔

❁---❁---❁

سورج نکل آیا تھا اور ادھم خان کی کنیزوں نے رُوپ متی کے کمرے میں سجاوٹ کے نئے رنگ بھرنے شروع کر دیئے تھے۔ دن اسی ہنگامہ آرائی میں گزر گیا۔ شام کے وقت رُوپ متی نے تمام کنیزوں کو اپنے کمرے سے رخصت کر دیا...... اور خود غسل کرنے چلی گئی۔

پھر جب وہ لباس بدل کر آئینے کے سامنے آئی تو اپنا حُسن دیکھ کر خود ہی شرما گئی...... مگر حیا کا یہ رنگ بہت عارضی تھا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کا پھول جیسا چہرہ چٹان کی طرح سخت تھا۔ رُوپ متی نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جن پر مہندی کا شوخ رنگ نمایاں تھا۔ پھر اس کی نظریں اس قیمتی ہیرے پر جم گئیں جو باز بہادر نے اپنی رسمِ تاجپوشی کے دن اُسے پیش کیا تھا۔ رُوپ متی محبوب کی نشانی دیکھ کر بے قرار ہو گئی۔ پھر اُس نے آتشِ فراق میں جلتے ہوئے ہونٹ ہیرے پر رکھ دیئے۔

قصرِ شاہی پر رات کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ یکا یک راہداری میں ہلکا سا شور بلند ہوا۔ ادھم خان، کنیزوں کے ہجوم میں رُوپ متی کے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ پھر جب وہ دروازے پر پہنچا تو رُوپ متی کو موجود نہ پا کر حیران رہ گیا۔

''حضور! اُنہیں آپ کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے۔'' ایک کنیز نے عرض کیا۔ ''وہ اپنے کمرے میں بہت دیر سے آپ کی منتظر ہیں۔''

ادھم خان کے چہرے پر فاتحانہ رنگ اُبھر آیا۔ وہ انتہائی بے قراری کے عالم میں اندر داخل ہوا۔ رُوپ متی دُلہن بنی ہوئی اپنے بستر پر دراز تھی اور اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ ادھم خان تیزی سے آگے بڑھا اور مسہری کے قریب پہنچ کر اس نے رُوپ متی کو آواز دی۔

رُوپ متی خاموش لیٹی رہی۔ ادھم خان نے رُوپ متی کے سکوت کو اس کے ناز و ادا سے تعبیر کیا۔ پھر وہ شوقِ طلب میں مسہری کے گرد گھوم کر، رُوپ متی کے سامنے آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہوش اُڑ گئے۔ رُوپ متی کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا...... اور سفید ریشمی تکیے پر بڑے بڑے سرخ داغ نظر آ رہے تھے۔

''رُوپ متی! یہ خون کیسا ہے؟'' ادھم خان چیخ اُٹھا۔

رُوپ متی نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تُو آ گیا ادھم خان!...... مجھے بہت دیر سے تیرا انتظار تھا۔'' رُوپ متی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

ادھم خان نے گھبرا کر رُوپ متی کے دونوں بازو پکڑ لیے اور اسے سہارا دے کر بٹھایا۔ ''یہ کیسا خون ہے رُوپ متی؟''

رُوپ متی کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا مگر پھر بھی اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''یہ خون نہیں ادھم خان! دُلہن کے چہرے کا غازہ ہے۔''

دُلہن کے چہرے کا غازہ؟'' ادھم خان پر وحشت طاری تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''تجھے یاد نہیں...... آج میری...... شادی ہے۔'' رُوپ متی کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ ''میں اپنے محبوب کے پاس جا رہی ہوں۔''

اب ادھم خان پر یہ خوفناک حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ رُوپ متی نے زہر کھا لیا ہے۔ ''تُو نے مجھ سے دھوکا کیا رُوپ متی!'' ادھم خان کے لہجے سے ایک شکست خوردہ انسان کے اذیت و کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔

''دھوکا نہیں، میں نے بغاوت کی۔'' شدید تکلیف کے باوجود رُوپ متی سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''میں نے اپنی آبرو کے تحفظ کی جنگ لڑی اور اس شان سے لڑی کہ ایک تنہا عورت نے تیرے ہزاروں سپاہیوں کو شکست دے دی۔ میں تجھ جیسے مردوں پر لعنت بھیجتی ہوں جو مجبور عورتوں کے جسموں کو پامال کر کے فاتح کہلاتے ہیں۔ لعنت ہو تیری فتح پر...... اور سلامتی ہو میری شکست پر...... مت چھوا اپنے غلیظ ہاتھوں سے میرے بدن کو۔'' رُوپ متی نے ادھم خان کو دُور کرنا چاہا مگر ناطاقتی نے اس کے ارادوں کا ساتھ نہیں دیا۔ پھر چند لمحوں بعد رُوپ متی کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ اپنے حجلۂ عروسی میں داخل ہو گئی تھی۔

ادھم خان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور اس کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔

پھر رات کی تاریکی میں انتہائی رازداری کے ساتھ سارنگ پور کی مطربہ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

❀---❀---❀

رُوپ متی کی موت کے چند روز بعد قصرِ شاہی ایک اور ہنگامے کی لپیٹ میں آ گیا۔ اکبر نے ادھم خان کے رشتے کے بھائی شمس الدین خان کوکہ کو ''خانِ اعظم'' کا لقب دے کر وکیلِ سلطنت کے اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا تھا۔ ادھم خان سے شمس الدین خان کی یہ شہرت و عزت برداشت نہ ہو سکی۔ کچھ دن تک تو وہ شمس الدین خان کی برائیاں کر کے مغل شہنشاہ کے کان بھرتا رہا مگر جب اکبر نے اس کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا تو ایک روز ادھم خان، شمس الدین خان کی خلوت میں شمشیرِ بے نیام کے ساتھ داخل ہوا۔ اس وقت خانِ اعظم نمازِ عشاء کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ ادھم خان نے بے خبری کے عالم میں شمس الدین خان پر کئی وار کیے۔ یہاں تک کہ خانِ اعظم خون میں نہا کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ ادھم خان کو بادشاہ سے قربت پر اتنا غرور تھا کہ وہ خانِ اعظم کو قتل کر کے وہیں کھڑا رہا۔

قصرِ شاہی میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ وہ شہنشاہ کے آرام کا وقت تھا۔ شور سن کر اکبرِ اعظم اپنی خواب گاہ سے نکلا۔ پھر جب اس نے خانِ اعظم کی لاش دیکھی اور ادھم خان کو موجود پایا تو غضب ناک لہجے میں

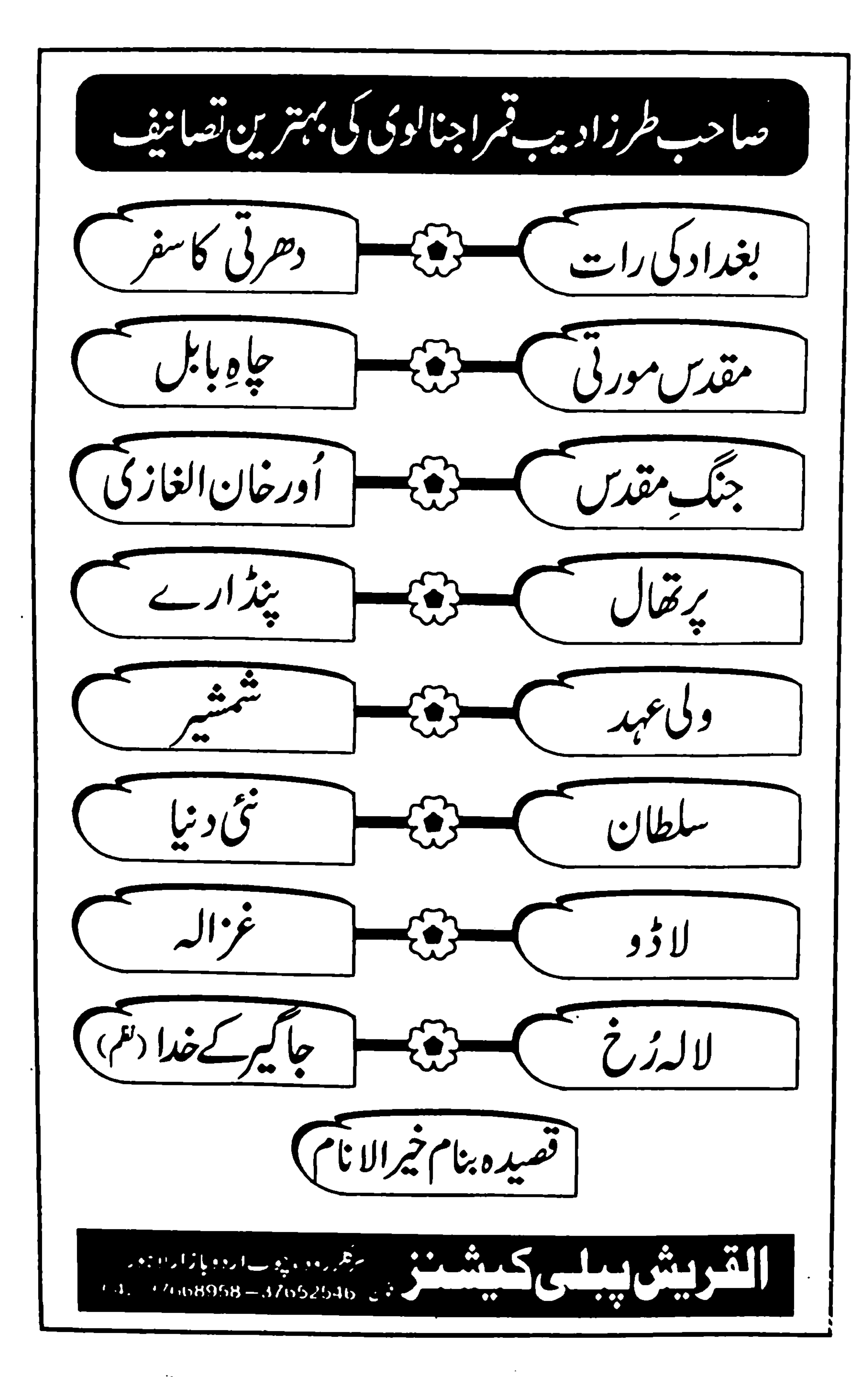
بولا۔ ''تُو نے کس جرم پر خانِ اعظم کو قتل کیا ہے؟'' اس دوران اکبر نے بھی اپنی تلوار کھینچ لی تھی۔
ادھم خان کو کوئی جواب نہ سوجھا تو اُس نے بے ادبی کے ساتھ اکبر کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ مغل شہنشاہ اس گستاخی پر اور بھی برہم ہو گیا۔ پھر اس نے ادھم خان کو دھکا دیا اور اس کے منہ پر دو زوردار تھپڑ مارے۔ ادھم خان چکرا کر زمین پر گر پڑا۔

''اس گستاخ و ناشکر گزار کی زندگی کا خاتمہ کر دو۔'' مغل شہنشاہ یہ حکم دے کر اپنی خواب گاہ میں واپس چلا گیا۔

ادھم خان کو اسی وقت قلعے کی سب سے بلند فصیل پر لے جا کر نیچے پھینک دیا گیا۔ سپاہیوں نے دیکھا کہ اتنی بلندی سے گرنے کے باوجود اُس کی سانسیں باقی ہیں۔ ادھم خان کو بے ہوشی کی حالت میں دوبارہ اسی جگہ لے جایا گیا۔ جلّادوں نے اُسے اُس کے قدموں پر کھڑا کیا اور دوبارہ دھکا دیا۔

آگرہ کے باشندوں پر برسوں دہشت طاری رہی۔ وہ ادھم خان کا عبرت ناک انجام یاد کر کے لرز جاتے تھے۔

(تمت بالخیر)



صاحب طرز ادیب قمر اجنالوی کی بہترین تصانیف
بغداد کی رات
دھرتی کا سفر
مقدس مورتی
چاہِ بابل
جنگِ مقدس
اُورخان الغازی
پرتھال
پنڈارے
ولی عہد
شمشیر
سلطان
نئی دنیا
لاڈو
غزالہ
لالہ رُخ
جاگیر کے خدا (نظم)
قصیدہ بنام خیر الانام
القریش پبلی کیشنز

صاحبِ طرز ادیب خان آصف کی بہترین تصانیف

اللہ کے ولی

اللہ کے سفیر

زندہ لوگ

دلوں کے مسیحا

سفیرانِ حرم

فقیہ اعظم (امام ابو حنیفہ رح)

بت شکن

فاتح اعظم صلاح الدین ایوبی

خاموش وفا

شعلوں کا کفن

ٹیپو سلطان

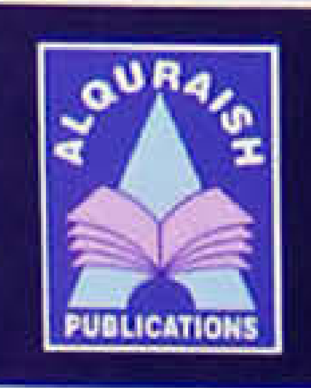
اندھیروں کے قافلے

شمشیر کا قرض

رضیہ سلطانہ

سر بُریدہ

خوب صورت سرورق، بہترین طباعت و کتابت



القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ، چوک اردو بازار لاہور۔ فون: 042-37652546, 37668958



Website: www.alquraish.com E-mail: info@alquraish.com